

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت حیدرآباد

• منازل

عابد علی خاں

• کاتب، محمد مظہر

جلد ۳ ـــــــــ شمارہ ۶

سنہ ۱۹۵۷ء

• زرِ سالانہ

ہند و پاک سے آٹھ روپے

ششماہی: پانچ روپے

قیمت

۵۰ نئے پیسے

ٹیلی فون: ۵۴۰۲

پرنٹر پبلشر سلیمان اریب • ۱۰ بورڈ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن • نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد

اس شمارے میں

پہلی بات

ہم "صبا" کو ہر ماہ بہ پابندی وبر وقت نکالنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن ناسازگار حالات کی عناں گیری برابر جاری ہے۔ اس دفعہ مالی مشکلات کے ساتھ کاغذ کی کمیابی بھی باعث تاخیر ہوئی۔

یہ دراصل جون کا شمارہ ہے لیکن ہم اسے جون اور جولائی کا مشترکہ شمارہ بنانے پر مجبور ہیں۔ مشترکہ شمارے کی حیثیت سے ہم چاہتے تھے کہ اس کی ضخامت بڑھا دی جائے لیکن تیس چالیس صفحات اور بڑھ جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اور دیر ہوتی اس لیے برائے نام چند صفحات کا اضافہ کیا جا رہا ہے امید ہے کہ قارئین ہماری مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے "صبا" کی توسیع اشاعت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے اور ہماری مالی حالت کو بہتر بنانے میں مدد کریں گے تاکہ یہ "معذرت خواہی" کا سلسلہ ختم ہو۔

اس تاخیر و تعویق کے باوجود یہ شمارہ کمیت کے لحاظ سے نہ سہی کیفیت کے لحاظ سے کافی وزنی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس کی بہت سی چیزیں — کیا مضامین، کیا منظومات اور کیا افسانے — بہت پسند کی جائیں گی۔

پچھلے شمارے میں فراق صاحب کی ایک غزل پر (جو "صبا" کے پچھلے سے پچھلے شمارے میں شائع ہوئی تھی) آپ نے اثر صاحب کی تنقید پڑھی تھی۔ فراق صاحب نے حسب توقع اس تنقید کا تفصیلی جواب بھیجا ہے اور اس کے علاوہ ایک خط اور میر کی ایک غزل پر دو غزلیں بھی۔ چونکہ یہ خط اور دو غزلہ پہلے آیا تھا اور اس کی کتابت ہو چکی تھی اور اثر صاحب کی تنقید پر برق موسوی صاحب کا ایک مفصل مضمون بھی موصول ہو چکا تھا اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی اس لیے فراق صاحب کے مضمون کے لیے گنجائش نکالی نہ جا سکی۔ ویسے بھی ہم نے اثر صاحب کی تنقید شائع ہونے کے بعد قارئین کا جو رد عمل ہے اور جو "بازگشت" میں دیا جا رہا ہے اس کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے ہمیں سوچنا ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے یا نہیں کیونکہ ہمارے یہ دونوں بزرگ — حضرت فراق و حضرت اثر معاف فرمائیں — باوجود اپنے بلند مرتبہ کے ایک دوسرے پر جب بھی کچھ لکھتے ہیں تو اس میں تنقید و اصلاح سے زیادہ ذاتیات کا پہلو آ جاتا ہے اور قابل اعتراض حد تک آ جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ آج کے زمانے میں فراق اور اثر کو انشا و مصحفی کی طرح نہ "لڑنا" اور نہیں "لڑوانا" چاہیے۔

اس شمارے میں

پہلی بات

ہم "صبا" کو ہر ماہ بہ پابندی و بروقت نکالنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن ناسازگار حالات کی عناں گیری برابر جاری ہے۔ اس دفعہ مالی مشکلات کے ساتھ کاغذ کی کمیابی بھی باعث تاخیر ہوئی۔

یہ دراصل جون کا شمارہ ہے لیکن ہم اسے جون اور جولائی کا مشترکہ شمارہ بنانے پر مجبور ہیں۔ مشترکہ شمارے کی حیثیت سے ہم چاہتے تھے کہ اس کی ضخامت بڑھادی جائے لیکن تیس چالیس صفحات اور بڑھانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اور دیر ہوتی اس لیے برائے نام چند صفحات کا اضافہ کیا جارہا ہے امید ہے کہ قارئین ہماری مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے "صبا" کی توسیع اشاعت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے اور ہماری مالی حالت کو بہتر بنانے میں مدد کریں گے تاکہ یہ معذرت خواہی کا سلسلہ ختم ہو۔

اس تاخیر و تعویق کے باوجود یہ شمارہ کمیت کے لحاظ سے نہ سہی کیفیت کے لحاظ سے کافی وزنی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس کی بہت سی چیزیں ـــ کیا مضامین، کیا منظومات اور کیا افسانے ـــ بہت پسند کی جائیں گی۔

پچھلے شمارے میں فراق صاحب کی ایک غزل پر (جو صبا" کے پچھلے سے پچھلے شمارے میں شائع ہوئی تھی) آپ نے اثر صاحب کی تنقید پڑھی تھی۔ فراق صاحب نے حسب توقع اس تنقید کا تفصیلی جواب بھیجا ہے اور اس کے علاوہ ایک خط اور زبر کی ایک غزل پر دو غزل بھی۔ چونکہ خط اور دو غزلہ پہلے آیا تھا اور اس کی کتابت ہوچکی تھی اور اثر صاحب کی تنقید پر برق موسوی صاحب کا ایک مفصل مضمون بھی موصول ہوچکا تھا اور اس کی کتابت بھی ہوچکی تھی اس لیے فراق صاحب کے مضمون کے لیے گنجائش نکالی نہ جاسکی۔ ویسے بھی صرف اثر صاحب کی تنقید شائع ہونے کے بعد قارئین کا جو ردعمل ہے اور جو "بازگشت" میں دیا جارہا ہے اس کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے ہمیں سوچنا ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے یا نہیں کیونکہ ہمارے یہ دونوں بزرگ ـــ حضرت فراق و حضرت اثر معاف فرمائیں ـــ باوجود اپنے بلند مرتبہ کے ایک دوسرے پر جب بھی کچھ لکھتے ہیں تو اس میں تنقید و اصلاح سے زیادہ ذاتیات کا پہلو آجاتا ہے اور قابل اعتراض حد تک آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ آج کے زمانے میں فراق اور اثر کو انشا و مصحفی کی طرح نہیں لڑنا اور نہیں لڑوانا چاہیئے۔

عالم خوندمیری

سخن گسترانہ بات

الٰہ آباد میں ادیبوں کے سمینار میں جہاں ادیبوں کی آزادی اور مملکت سے ان کے روابط پر بحث کی گئی وہیں یہ سوال بھی زیر بحث رہا کہ منصوبے کی کامیاب تکمیل میں ادیب کس حد تک اور کس حیثیت سے حصّہ لے سکتے ہیں۔ ادیب صرف ادیب نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ شہریوں کی حیثیت سے ملک کی تعمیر جدید میں انھیں اپنا بھی حصّہ ادا کرنا ہے جب سارا ملک نئے خطوط پر حرکت کر رہا ہو اور صدیوں کی طویل نیند کے بعد ایک نئی بیداری کی لہر دوڑ رہی ہو ادیب تعمیر اور تشکیل کے اس عظیم ڈرامہ سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ صرف شہری کی حیثیت سے نہیں بلکہ ادیب کی حیثیت سے بھی انھیں جوش اور ولولہ کے ساتھ حصہ لینا ہوگا۔ اور اس شعور کی تخلیق اور نشو و نما کے فرض کو ادا کرنا ہوگا جس کے بغیر منصوبہ بندی محض پیداوار کو بڑھانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ جائے گی، اور انسانی اقدار سے اس کا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ منصوبہ بندی کے پچھلے تجربوں میں اس پہلو کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی دولت میں اضافہ اور معاشی میعار میں ترقی کے ساتھ ساتھ انسانوں کے ذہنی افق میں وسعت پیدا نہ ہو سکی اس لحاظ سے ادیب منصوبہ بندی کے مسائل سے بے نیاز نہیں رہ سکتے لیکن الٰہ آباد کے اس سمینار میں ہندوستان کے بعض مصنفوں اور ادیبوں نے جن میں ہندی کے مشہور شاعر پنت جی جیسے ادیب بھی شامل ہیں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے خطرناک امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس سوال پر کہ ادیب اور مملکت کے روابط کس نوعیت کے ہوں، پنت جی کا خیال ہے کہ ادیب کو مملکت کے منشاء اور مملکت کے مقاصد سے انحراف نہیں کرنا چاہیے آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں اس سوال کا جواب آسان تھا، ادیب بھی دوسرے تمام انسانوں کی طرح ایک سامراجی نظام کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور ایک ایسی ظلم پرور مملکت سے تعاون اور اس کے مقاصد سے اتفاق کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن آزادی کے بعد اس ربط میں بنیادی تبدیلی آ گئی ہے۔ اس بات کو مانتے ہوئے بھی پنت جی کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، دنیا کی کوئی مملکت اتنی مثالی نہیں ہو سکتی کہ فرد اور مملکت کے تصادم کے امکانات ختم ہو جائیں اور مملکت فرد کی آزادی کی پوری طرح محافظ بن جائے۔ مملکت کا یہ رجحان کہ زیادہ سے زیادہ اقتدار مرکوز کر لیا جائے اور فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر تسلط حاصل کر لیا جائے ایک ایسا فطری رجحان ہے کہ جب تک معاشرہ کے تمام افراد اور خصوصاً باشعور افراد اس رجحان کے خلاف مسلسل مزاحمت نہ کریں اور اس رجحان سے ہمیشہ آگاہ نہ رہیں فرد کی آزادی

کا تحفظ ممکن نہیں، میرا خیال ہے کہ ایک وسیع جمہوری مملکت میں بھی جس میں سیاسی اور معاشی اقتدار محنت کرنے والے انسانوں کو حاصل ہو یہ خطرہ بہرحال موجود رہتا ہے سیاسی اور معاشی اقتدار کے اتحاد سے حاصل ہونے والی اخلاقی طاقت اقتدار کے سیاسی اور قانونی ذرائع سے ہٹ کر ایک نیا ذریعہ عطا کر دیتی ہے جب ایک ایسی وسیع جمہوری مملکت میں بھی یہ ضروری ہے کہ سماج اور مملکت، مملکت اور فرد کے درمیان حدِ فاصل برقرار رکھی جائے تو ظاہر ہے کہ کسی طبقاتی سماج میں مملکت کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ افراد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر تسلط حاصل کرے اور ادیب اور اہلِ فکر مملکت کے مقاصد کی تکمیل میں محض ایک ذریعہ بن جائیں۔

یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس اور الہ آباد کے سیمینار میں ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا، الہ آباد سیمینار کا یہ فیصلہ کہ حکومتی اداروں اور تنظیموں کو جیسے کل ہند ساہتیہ اکیڈمی ہے عصری ادب کی اشاعت کا حق نہ دیا جائے، ایک دانشمندانہ فیصلہ نظر آتا ہے، عصری ادب کی اشاعت کے فرض کی تکمیل خود ادیبوں کی تنظیموں کو کرنی چاہیئے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ سیاسی مقاصد اور سماجی مفروضات سے قطع نظر ایسی ادبی تنظیموں کی مالی امداد کرے۔ حکومت کی کوئی ایجنسی ادب اور تہذیب کے مسائل میں ایک واقعی خارجی اور بے غرضانہ نقطۂ نظر نہیں رکھ سکتی کبھی سماجی مفروضات مائل ہوں گے تو کبھی با اقتدار افراد کی ہمہ دانی، موزوں انتخاب کا راستہ روکے گی کبھی کسی ادبی تحریک کی مخالفت ایک ادیب کے حقیقی ادبی کارناموں کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ بن جائے گی تو کبھی کسی ادیب کے نام کی ترکیب کسی وزیر کی کبیدگیٔ خاطر کا باعث بنے گی۔ یہ محض اندیشے نہیں ہیں بلکہ ساہتیہ اکیڈمی کے مختصر سے دور میں ان اندیشوں کی توثیق ہونے لگی ہے۔ ابھی چند دنوں پہلے ساہتیہ اکیڈمی نے یہ فیصلہ کیا کہ عصری ادب کا ایک نمائندہ انتخاب شائع کیا جائے ــــ خود یہ بات غور طلب ہے کہ چند افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کیسے ایک نمائندہ انتخاب کے فرض کی تکمیل کر سکتی ہے ــــ سنا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مرکزی وزیر تعلیم کو ایک جدید اردو شاعر اختر الایمان کے نام کی ترکیب غلط نظر آئی اور اسی بنا پر ان کے کلام کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کبھی تو یہ کہا جاتا تھا کہ بھلا نام میں کیا رکھا ہے، اور اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نام ہی سب کچھ ہے ــــ اگر اختر الایمان زبان کے قواعد کے لحاظ سے غلط ہے تو گستاخی معاف ابوالکلام بھی اسی طرح ایک بے معنی سا نام معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایک دوسرا وزیر اسی بنا پر مولانا ابوالکلام کی ادبی حیثیت سے انکار کر دے کہ نام بامعنی ہونا چاہیئے تو ہمیں یقین ہے کہ مولانا ابوالکلام اس حماقت کو تسلیم کرنے پر کبھی اتفاق نہیں کریں گے۔ ادیبوں کے بارے میں عصری فیصلہ کبھی بھی قطعی قرار نہیں دیا جا سکتا، ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ آنے والے زمانے کا فیصلہ اکثر عصری فیصلے سے مختلف رہا ہے۔ ایک ادیب کی شہرت اور مقبولیت یا عدم مقبولیت محض ادبی معیارات کی پابند نہیں ہوتی موجودہ سماج میں ایسے غیر ادبی معیارات کی تعداد میں پرانے شاہی یا رئیسانہ سماج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، ایک حکومت ایک معمولی باغبان کو ماہر نباتیات بنا سکتی ہے تو دوسری

حکومت ایک معمولی شاعر کو شاعر اعظم کے اعلیٰ رتبہ تک پہنچا سکتی ہے۔ ایک ادبی تنظیم کے ادبی ناظم کو بین الاقوامی رتبہ حاصل ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے درجہ کے ناول نویس کو محض اس بنا پر غیر معمولی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کہ چند اتفاقات یا حادثات نے مستند پبلشر مہیا کر دیئے تھے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اور اسی قسم کے ایسے بہت سے غیر ادبی معیارات حقیقی ادب کے سرچشموں کو خشک نہ کر دیں اور ادیب شہرت اور مقبولیت کی خاطر ادبی تنظیموں کو زیادہ اور ادب کو کم اہمیت کا مستحق قرار نہ دیں۔ ظاہر ہے کہ منصوبوں اور اسی قسم کے دوسرے حکومتی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ادیبوں اشاعت اور لوگوں تک پہنچنے کے زیادہ مواقع حاصل رہیں گے اور ان ادیبوں کیلئے جو ایک حد تک گمنامی اور بے غرضی کو اچھے ادب اور آرٹ کی تخلیق کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں افلاس اور فاقہ کشی کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ ایلیا اہرن برگ نے اپنے ایک حالیہ ناول THAW میں ایسے دو فنکاروں کو پیش کیا ہے جن میں سے ایک فنکار محض اس بنا پر گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے کہ وہ خوبصورت مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن نئی نئی مشینوں کی مبالغہ آمیز عکاسی نہیں کر سکتا ۔۔۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خود اہرن برگ کی مقبولیت میں ان کی ادبی صحافت کو کہاں تک دخل ہے اور کس حد تک خالص ادبی معیارات کی بنا پر اہرن برگ مقبول ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ اندیشے اور خطرات ابتدائی منزل میں ہیں لیکن ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کو نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔ بدقسمتی سے بت شکن ادیبوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پرانی بت شکنی کے ثمرات سے مستفید ہو رہی ہے اور شاید انھیں یہ بات مناسب نظر نہ آتی ہو اور مصلحت ان کا دامن تھام لیتی ہو کہ ان رجحانات کے خلاف آواز بلند کریں۔ کیا نوجوان ادیب بھی خالص ادبی معیارات کے پرچم کو بلند رکھنے کی کوشش کریں گے یا مقبولیت اور شہرت کے آسان اور نسبتہً کم دقت طلب ذرائع اختیار کریں گے اس سوال پر بڑی حد تک ہمارے ادبی مستقبل کا انحصار ہے!!۔

مخدوم محی الدین

یورپ کا لکھنؤ — ویانا

ویانا میں لگ بھگ ایک سال رہنے کا موقع ملا۔ شاید اس لیے یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں اسے کسی قدر زیادہ جانتا ہوں، لوگوں کو ہر رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، گھروں میں، کارخانوں، دفتروں میں تفریح گاہوں، ناچ رنگ کی محفلوں میں، اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے رنگ (RING) پر مظاہرہ کرتے ہوئے بھی لوگوں کو زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور زندگی کی تاب نہ لاکر خودکشی کرتے بھی، پستی، بلندی شادی غمی کے نظارے، ذہن کے تہہ خانوں میں کچھ جاگ رہے ہیں، کچھ سو رہے ہیں جنھیں جگانا ہوگا اور یہ سب ایک نشست میں ہو نہیں سکتا، اس سے پہلے کیا یہ ضروری نہیں کہ خود آسٹریا کے بارے میں جس کی راجدھانی ویانا ہے مختصر طور پر کچھ کہا جائے؟ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے میں یہ تاریخی پس منظر مفید ہوگا۔

آسٹریا وسط یورپ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کی آبادی (۷۰) لاکھ سے زیادہ نہیں، جس کی زبان جرمنی ہے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہے جہاں سرمایہ دارانہ جمہوری نظام رائج ہے۔ رومنوں کے زمانے (سنہ ۹ء) سے لے کر ہاپسبرگ خاندان کے آخری بادشاہ (سنہ ۱۹۱۸ء) تک آسٹریا اور اس کی راجدھانی ویانا تجارت، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت کا گہوارہ اور دنیا کے لیے جاذب نظر رہے ہیں۔ اس کے شمال میں چکوسلواکیہ، مشرق میں ہنگری، جنوب میں اٹلی اور یوگوسلاویہ اور مغرب میں جرمنی اور سوئٹزرلینڈ ہیں۔ پہلی جنگ عظیم تک ہاپسبرگ خاندان کی شاہی رہی، جوزف آسٹریا کا شہنشاہ اور ہنگری کا بادشاہ رہا، آخری بادشاہ اور آخری شہنشاہ، جس کے زیر نگیں آسٹریا، ہنگری کے علاوہ پولینڈ، بوہیمیا (چکوسلواکیہ) بوسینہ (یوگوسلاو) وغیرہ کے اکثر حصے تھے۔ یہ شہنشاہ (۵) کروڑ انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ سنہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب فرانس کے زیر اثر یورپ کے اور ملکوں کی طرح ہنگری اور آسٹریا کے عوام نے بھی علم بغاوت بلند کیا، مگر انقلاب کامیاب نہ ہو سکا۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے بولشویک انقلاب روس نے سامراج پر ضرب کاری لگائی اور لیزی طاقتیں کمزور ہوئیں، عوام کو آگے بڑھنے کا حوصلہ اور موقع ملا۔ بہت سے ملکوں کی طرح آسٹریا نے سنہ ۱۹۱۸ء میں شاہی کو نیست و نابود کرکے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا۔

دو جنگوں کے بیچ میں آسٹریا میں بڑی اتھل پتھل ہوئی۔ دوسری جنگ کے بعد شکست خوردہ جرمنی نے فوجی طاقت کے بل بوتے پر ملک گیری اور انتقام کے جذبے سے پاگل ہوکر فاشزم اور ہٹلر کو جنم دیا، جس کے جھنڈے پر جرمن نسل کی برتری، کمیونسٹ دشمنی اور یہودیت دشمنی کے ساتھ دنیا کو تسخیر کرنے کا نعرہ تھا۔ آسٹریا جو شمال میں جرمنی سے ملا ہوا ہے اس اثر کی زد میں آئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ ویانا کے بہادر مزدوروں نے سنہ ۱۹۳۴ء میں اپنے حاصل شدہ حقوق اور جمہوریت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوکر ہتھیار اٹھالیے۔ مارکس ہاز" مزدوروں کی بستی جنگی قلعہ میں

بدل گئی، آسٹریا کے حکمران سرمایہ دار طبقہ نے ہٹلر سے سازباز کر کے ملک سے غداری کی اور سوشل ڈیموکریٹس نے فاشزم کے خلاف عوام کو تیار کرنے کے بجائے کیمونسٹ دشمنی کا شکار ہو کر فاشزم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ویانا کے ۰۰۰ا سے زائد مزدور مارے گئے اور ملک ہٹلر کے چنگل میں آ گیا، آسٹریا جرمنی کا ہی ایک حصہ قرار پایا۔ دوسری جنگ کے کامیاب اختتام یعنی ہٹلری فاشزم کے خاتمہ کے بعد از روئے معاہدہ سوویت یونین، امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے آسٹریا کو اپنے مشترکہ قبضہ میں لے لیا۔ ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے سوویت یونین نے آسٹریا کی حکومت سے فوجیں ہٹا لینے کا معاہدہ کیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ آسٹریا امن اور غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا رہے گا۔ بعد میں دوسری طاقتوں نے بھی معاہدے کیے، اب وہاں غیر ملکی فوجیں نہیں ہیں، آسٹریا ایک آزاد جمہوریہ ہے جہاں سرمایہ دارانہ نظام ہے آسٹریا کی راجدھانی ویانا وسطی یورپ کا حسین وجمیل شہر ہے جو اپنی عمارتوں کے طرز تعمیر، علم طب اور فن موسیقی، نفاست و نزاکت میں شہرہ آفاق ہے، یہ شہر لندن، پیرس اور ماسکو کے مقابلے میں چھوٹا ہے جس کی آبادی ۱۷ لاکھ ہے جس کے شمال اور مشرق میں ڈینوب بہتا ہے، جنوب اور مغرب میں آلپس کی پہاڑیوں کے سلسلے کی آخری حد ہے۔ پہاڑیوں پر انگور کے کھیت اور ویانا کے وہ مشہور جنگل (VIENNA WOODS) ہے جس نے عوام کے مزاج پر اور خاص کر شاعروں اور سنگیت کاروں تخیل اور فن پر ساحرانہ اثر ڈالا ہے۔

متحدین کے قبضہ کے زمانے میں ویانا، پانچ زون میں بٹا ہوا تھا، سوویت، امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور انٹرنیشنل زون، لوگ ایک زون سے دوسرے زون میں آ جا سکتے تھے۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی، ۱۹۵۵ء تک ویانا کے چہرے پر جنگ کی خراشیں موجود تھیں، ہٹلر نے جاتے جاتے اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ ویانا کے مشہور زمانہ آپیرا ہاؤس پر بمباری کر کے تباہ کر دیا تھا جو پچھلے برس درست ہونے کے بعد کھل گیا ہے جس کی پہلی رات کے لیے ایک سال پہلے سے ٹکٹ بک ہو چکے تھے۔ ویانا اپنی خوش مزاجی، نفاست و نزاکت میں مجھے یورپ کا لکھنو معلوم ہوتا ہے۔ جرمن جیسی زبان بھی جو سننے میں کرخت اور بولنے میں سخت معلوم ہوتی ہے ویانا میں آ کر نرمی اور مٹھاس پیدا کر لیتی ہے لوگ بات بات پر شکریہ، مہربانی اور آداب کرتے ہیں، شراب، موسیقی، رقص اور سیر و تفریح کے شیدائی ہیں، یورپ کے اور ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کی عورتیں پکوان میں تکلف کے لیے مشہور ہیں۔

ویانا میں ہی نہیں بلکہ پورے آسٹریا میں جتنی تعداد نازی پارٹی کے ممبروں کی تھی کسی اور ملک میں نہیں رہی اور فوج میں بھرتی بھی یہاں سے خوب ہوئی۔ میں نے وہ مقامات بھی دیکھے جہاں محبان وطن کو نازی گرفتار کر کے اذیت پہنچاتے اور بالآخر جیل بھیج دیتے یا مار ڈالتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ فاشزم کے مقبوضہ ملکوں میں سب سے کم مدافعت یہیں رہی۔ آسٹریا کی ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ ہٹلر کی فوج میں ویانا والوں کی مدافعت صرف ان کا جرمن لہجہ تھا اور کچھ نہیں۔ دو جنگوں نے اس خوش مزاج قوم کا تانا بانا بکھیر دیا ہے۔ اسے اپنے سو لین .. کی بہت قیمت

ادا کرنی پڑی ہے، یہاں کے لوک گیت ان کی خوش مزاجی اور غمگینی کے امتزاج کے اچھے آئینہ دار ہیں۔

ویانا کا ایک نفسیات کا پروفیسر خجالت کے لہجہ میں مجھ سے کہا کرتا تھا کہ "یار تم ویانا کا زوال دیکھ رہے ہو۔ عروج دیکھنے کے قابل تھا۔ موسیقی ابلتی تھی، تین سو آرکسٹرا تھے، تھیٹر، آپیرا، قہوہ خانے، ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں سے آباد رہتے تھے، شوخ اور چنچل حسین لڑکیاں بازوؤں میں چٹکیاں لے لے کر سرگوشیاں کرتی نظر آتی تھیں، نامہ و پیام عہد و پیمان ہوتے تھے اب دیکھو کیا حال ہو گیا ہے، پورے شہر میں تین آرکسٹرا کا پنپنا مشکل ہو گیا ہے اور قہوہ خانوں میں میں اور تم بیٹھے ہوئے ہیں کرسیاں خالی پڑی ہیں۔"

تیسری عالمی ٹریڈ یونین کانگریس کا ویانا کی طرف سے استقبال کرتے ہوئے ویانا کے ایک بزرگ مزدور رہنما نے دنیا کے نمائندوں سے کہا تھا۔ "ویانا کی حسین سڑکوں پر جب آپ چلیں گے تو ویانا کے تین لاکھ بے روزگار لڑکے لڑکیاں بھی آپ کے ساتھ چلتے ہوں گے آپ انھیں نہ بھولیے۔"

ویانا میں

صبح ۸½ بجے سے ۵½ بجے شام تک کام کرنے کے بعد "خوش ذائقہ" کھانے کی تلاش اور "وقت گذارنے" کا مسئلہ تو شروع شروع میں بلائے جان بنا ہوا تھا، سنیچر کے بارہ بجے سے سوموار کی صبح تک ہفتہ وار چھٹی کا گذارنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

ایشیا کے ایک ملک کو ایک ضروری خط، مزدوروں کی عالمی کانگریس کے سلسلہ میں بھجوانا تھا، میں نے اپنی اسٹینو ٹائپسٹ کو مسودہ لکھوا دیا۔ سنیچر کا دن تھا، کام ۱۲ بجے ختم ہو جاتا ہے، اس دن دفتر کے کینٹین میں کھانے پر ٹائپسٹ سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ کھانے کے بعد خط کو پورا کر دو، تاکہ آج ہی کی ڈاک سے روانہ کیا جا سکے، وہ ہنس کر کہنے لگی "سوموار کی صبح کو ملیں گے" اس جواب سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ وہاں کے کام کرنے کا ڈھنگ ہی یہی ہے۔ لوگ آٹھ گھنٹے روزانہ سکنڈ سکنڈ کی پابندی کے ساتھ بڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں اور فرصت کے اوقات کو جان سے زیادہ عزیز رکھ کر اپنا پروگرام بناتے ہیں۔ یورپ کے مزدوروں نے جینے کے قابل اجرت (LIVING WAGE) آٹھ گھنٹے روزانہ کا کام ہفتہ میں دو یا ڈیڑھ دن کی چھٹی کے علاوہ سال میں پندرہ دن سے لے کر ایک مہینہ کی تنخواہ کے ساتھ چھٹی کے حق کو سالہا سال کی شدید جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے اور وہ اس کا استعمال خوب جانتا ہے۔ آسودگی کے ساتھ ہی انسان کو فرصت کے مشاغل کی سوجھتی ہے بقول سودا، ہمارا تو یہاں یہ حال ہے ؎

یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

فرصت اور فراغت سے محرومی نے کام اور کام کی وجہ سے زمانے نے ہمیں جن عادتوں پر مجبور کر دیا ہے ان سے یورپ

میں چھٹکارا نصیب ہوتا ہے مگر دھیرے دھیرے۔

میرے دماغ میں ایک غلط خیال یہ جما ہوا تھا کہ یورپین کارکن وقت کی پابندی کے نام پر مشرقی مسائل کو تیزی سے حل نہیں کرتے ہیں۔ کام اتنا تھا کہ اتوار کے دن کام نہ کرنا، تضیع اوقات معلوم ہوتا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ اتوار کو بھی کام کروں اس خیال پر ہماری ایک انگریز ساتھی پہلے تو مسکرائی، پھر سنجیدگی سے کہا آؤ، مگر یہاں کوئی نہیں ہوگا۔ ایک اتوار کو جب میں کام کے شوق میں دفتر آیا تو سوائے تنظیمی اسٹاف کے جو باری باری سے دن رات کام کرتا ہے، دوسرے شعبوں میں سناٹا ہے میں اپنے کمرے میں بمشکل دس منٹ بھی نہ بیٹھا ہوں گا کہ مارے سردی کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے۔ کمرہ کو گرم کرنے والا، کوئلہ ڈالنے والا مزدور بھی تو اتوار کو چھٹی مناتا ہے، میں دفتر سے نکل کر چلا گیا اور پھر کبھی اس "شوق فضول" کی جرات نہ ہوئی

اندرا سین گپتا، ہندستانی ساتھی نے اپنے دوستوں سے ملا دیا، جن میں سے اکثر و بیشتر انگریزی جانتے تھے، اٹھارہ زبانیں بولنے والے کوئی ڈیڑھ سو تو خود ہمارے دفتر کے ساتھی تھے۔ ان کے علاوہ ویانا کے احباب کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، اجنبیت اور اکیلے پن کا جان لیوا احساس جاتا رہا رنگ (RING) دو رویہ درختوں سے ڈھنکی ہوئی ایک حسین شاہراہ پرانے شہر کو گھیرے ہوئے ہے جو اپنی دلکشی اور زیبائش کی وجہ سے دنیا کی مشہور اور خوبصورت شاہراہوں میں سے ایک ہے، زمانہ قدیم سے یہ شہر فنکاروں، عالموں، سنگیت کاروں کی آماجگاہ رہ چکا ہے۔ بادشاہوں اور خصوصاً ملکہ ماریا تھریشیا کے عہد میں دنیا کی ایک بڑی شہنشاہیت کی راجدھانی کی حیثیت سے اس قدیم شہر نے بڑی ترقی کی، مشہور شاہی محل، گرجا گھر، شاہراہیں، گلی کوچے، تھیٹر، آپیرا، دکانیں، باغ احاطے، مورتیاں، قہوہ خانے، میوزیم، مدرسے زیادہ تر اسی رنگ پر ہیں، یا رنگ کے اندر قدیم شہر میں۔

اب جہاں یہ شاہراہ ہے کسی زمانہ میں یہیں قدیم شہر کی فصیل تھی۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں ترک ویانا کی اس فصیل تک پہنچ چکے تھے مگر ۱۶۸۳ء میں یہاں ترکوں کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے تحت جب فصیل ٹوٹی اور شاہراہ بنی تو اس پر سوائے سرمایہ دار کے مزدوروں کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ویانا کے مزدوروں نے اس سڑک پر چلنے کے حق کو مسلسل جدوجہد کے بعد حاصل کیا، اب تو یہ عالم ہے لاکھوں مزدور اپنے مظاہرے اسی سڑک پر کرتے ہیں اور جب کبھی سرمایہ دار سے ٹکر لینے کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہتے ہیں "چلو رنگ پر"۔ جارج سے بہتر مجھے کوئی اور نہیں ملا، جو اس قدیم شہر کی شکل و صورت اور مزاج سے روشناس کرا سکے، جارج مصور بھی تھا اور شاعر بھی، اس کی ماں ایک سنگیت کار تھی جو اساتذہ کی قدیم دھنوں سے اپنے مہمانوں کی ضیافت کیا کرتی تھی۔ جارج شہر کے چپہ چپہ سے واقف تھا اسے اپنے شہر سے بلا کا پیار تھا۔ اور پیار میں گہرائی تھی۔

ایک دن ہم دونوں نے موزارٹ، کافی ہوز میں سیاہ تلخ کافی پی اور شہر کی سیر کو نکلے۔ پختہ دو منزلہ، سہ منزلہ مکانات شاہی محلات، اسٹفانی کا شہرہ آفاق کلیسا اور دوسرے گرجا گھروں کی اندرونی سجاوٹ کلس، تنگ گلیاں اور ان کے پُراسرار موڑ خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ اب آپ یکایک ایک دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی گھر میں جا رہے ہیں۔ پردہ چھت دار گلی ہے، پتھر صحن، حوض، فوارے بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ پرانی دہلی، بنارس یا امین جیسے اپنے ہی شہر میں گھوم رہا ہوں۔ شہر کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی، طرز تعمیر میں، قدیم سے لے کر جدید تک ہر طرز تعمیر کی عمارتیں ملتی ہیں۔ رومنسک (ROHANISQU) طرز کی سادگی، گاتھک طرز کا دبدبہ اور سنجیدگی باروق (BARUQU) طرز کا جذبۂ آزادی دل پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ انسان کی طرح شہروں کا بھی ایک کردار ہوتا

ہے۔ نئی دہلی باوجود اپنی جدید عمارتوں کے بالکل سپاٹ ہے، بہ مقابل پرانی دلی کے، ویانا کا یہ قدیم حصہ تو یوں بھی دل چھین لیتا ہے کہ یہاں قدیم بو باس کے ساتھ ساتھ نئی چمک دمک کی آمیزش ہے، جارج نے پرانے شہر کی گلیوں میں ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ (MOZART) نے یہاں فلاں آپیرا لکھا تھا، فلاں مکان میں (BEETHOVEN) ..... نے فلاں سنفنی لکھی تھی، فلاں مکان سے اس کا فلاں عشق وابستہ ہے، تو مجھے ہندوستانیوں کی اپنی تہذیبی یادگاروں سے بے رخی پر رونا آگیا، وہاں ایسی عمارتیں قومی ورثہ کی حیثیت سے محفوظ ہیں، مگر پرانی دلی کے کوچہ بلی ماراں میں غالب کا گھر، کسی ہندوستانی دواخانہ کا گودام بنا ہوا ہے، سروجنی نائیڈو کا گولڈن تھرش ہولڈ جس سے ہماری زندگی کی گرانقدر یادیں وابستہ ہیں اب ایک معمولی ہوٹل بن کے رہ گیا ہے۔ کسی کے دل کو دھکا نہیں لگتا۔ افسوس تو اس بات کا ہے۔

دو گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد تھک کر ہم نے ایک رسٹوراں میں پناہ لی یہ وہ احاطہ ہے جہاں ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں طلبا نے حصہ لیا تھا، انھیں گلیوں میں وہ قدیم رسٹوراں بھی ہے جہاں دنیا کے مشاہیر موزارٹ، بیتھوون سے لے کر بڑے بڑے سیاسی اور عالم بیٹھا کرتے تھے۔ ایک کمرہ میں ان مشاہیر کے دستخط دیواروں پر اب تک موجود ہیں اور سیاحوں کی دلچسپی کا اب بھی یہ مرکز ہے۔ یہیں وہ زمین دوز شراب خانے ملتے ہیں جہاں داخل ہو کر انسان صدیوں پرانے طلسماتی ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ اندھیرا اندھیرا دبی دبی سی روشنی، قدیم دل آویز دھنیں، قدیم دیواریں پرانے ساز و سامان، ہتیاروں، صراحیوں، جام اور صلیبوں سے سجی ہوئی تھی کہ ماحول میں سچائی پیدا کرنے کے لیے ایک جگہ چھت کے لٹکتے ہوئے جالے تک محفوظ رکھے گئے ہیں۔ یہاں سوائے مرد عورت اور شراب اور سنگیت اور رقص کے ہر شعبے پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا ہے جیسے جدید انسان کے خلاق ہاتھ نے اور بھی نکھار دیا ہے۔

جارج کی ماں نے ایک شام کھانے پر بلایا تھا وہاں حسن اتفاق سے ہنری سے ملاقات ہوئی جس نے ہندوستان پر جرمن زبان میں ضخیم کتاب لکھی ہے، مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اس کتاب میں میری نظم "تلنگانہ" کا ترجمہ بھی موجود ہے میں ہنری اور جارج کی ماں کھاتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ جارج نے اتنے میں میری تصویر بنا ڈالی آئیل میں، مجھے نہ بھائی، ہو بہو کرپلانی کی شبیہ، میں انکار کر رہا تھا کہ میں ایسا نہیں ہوں مگر وہ اصرار کرتا رہا کہ نہیں تم ایسے ہی ہو میں آج تک قائل نہیں ہو سکا کہ وہ شبیہ میری ہے۔

اپنا کھانا اپنا گانا

کامریڈ ڈانگے کی بیوی نے جنھیں ہم سب تائی کہہ کر پکارتے ہیں یورپ جاتے ہوئے مرچ مسالے کی شیشی میرے ساتھ کر دی تھی۔ دفتر کا کیا مٹن ہو یا کوئی رسٹوراں وہ شیشی برابر ساتھ رہتی۔ بیرے، کھانا پروسنے والی لڑکیاں، پوچھتیں کیا یہ پپرکا (PAPRICA) مرچ ہے تو میں (YA) ہاں کہہ کر ولایتی کھانا زہر مار کرتا۔ مگر ایک مہینے کے اندر وہ سارا مرچ مسالہ ختم ہو گیا۔

"اپنا کھانا اپنا گانا" بزرگوں کے قول میں کتنی سچائی ہے اس کا تھوڑا بہت — اندازہ ہمیں خود ہندوستان میں ہو جاتا ہے۔ جہاں زبانوں اور تہذیبوں کی طرح ذائقہ اور پکوان میں باوجود بہ ظاہر یکسانیت کے بلا کا تنوع موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اور فنون کی طرح قبائل اور قوموں نے کھانے پینے کے فن کو بھی ترقی دے کر اپنا اپنا ذائقہ پیدا کر لیا جس کے بنانے میں عضویاتی عمل، آب و ہوا، معاشی مسائل کے علاوہ تہذیب و تمدن، مذاہب کے حلال و حرام کی

تفریق اور بے بنیاد تعصبات نے بھی گہرا اثر ڈالا ہے جو تسلسل اور تواتر کی وجہ سے عادت بن گئے ہیں۔ ترغیب و تکرہیہ کے اکسانے میں ان عوامل کا بڑا عمل دخل ہے۔ جو غیر شعوری طور پر اپنا کام کرتے ہیں۔

ویانا میں میرا ایک ہندوستانی دوست جین تھا، جو مذہبی نہیں تھا۔ مگر دسمبر کی سردیوں میں بھی وہ دہی چاول اور سبزی پر گزارہ کرتا تھا۔ اس سے پوچھو کہ "بھئی یہ کیا"، تو کہتا "عادت"۔ اور پھر اس کی فلسفیانہ اور جمالیاتی توجیہہ بھی کر دیتا۔

کئی ہندوستانی اور پاکستانی احباب برسوں سے ماسکو میں ہیں۔ مگر جب کبھی کوئی ہندوستانی ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو تڑپے ترسے ہوئے انداز میں کہتے ہیں "یار مرچ مسالہ بھیجو ہندوستان سے، مرتے ہیں اچھے مزے کے لیے"۔

تاشقند میں مفتی اعظم، بادشاہ خاں اور ان کے صاحبزادے حاجی ضیاالدین کے ہاں جب ہم ہندوستانی نمائندے مدعو تھے تو بار بار بارک اللہ کی رکعت کان میں پڑتی اور رنگ برنگی قسم کے نان، کباب، قورمہ، شوربہ، پلاؤ دیکھا ان کے نام، ان کا رنگ، ان کی خوشبو اور ان کے ذائقہ نے ذہن سے یہ محو کر دیا کہ ہم کسی غیر ملک میں ہیں۔ بنگالی ساتھی چٹرجی نے کہا تھا "یہ تو اپنا ہی کھانا ہے دوسرے حکم تک کھاتے رہو"۔ کئی مسلمان مختلف ملکوں کے ایسے ملے جو شراب تو شوق سے پیتے ہیں مگر سور کے گوشت سے نفرت کرتے ہیں۔ بہت سے ہندو ایسے ملے جو مرغ، مچھلی، جھینگا تو چٹ کر جاتے ہیں مگر گائے کے گوشت کے نام سے چڑتے ہیں۔

خود یورپ میں گھوڑے کا گوشت لوگ کھاتے ہیں مگر غریب لوگ ابلا ہوا سوکھا، پسا ہوا گوشت ہوتا ہے جسے سلامی کہتے ہیں جو روزانہ لوگ ہر کھانے پر شوق سے کھاتے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ یہ گدھے کا گوشت ہے تو ہمارے دوست بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ اس کے اظہار کی کیا ضرورت تھی یہ ہم اس لیے نہیں کھاتے ہیں کہ گدھے کا گوشت ہے بلکہ اس لیے کہ لذیذ ہے۔

چین میں ایسے بھی سبزی خور موجود ہیں، جنھوں نے دودھ کو چکھا تک نہیں وہ اسے بھی گائے کا ایک حصہ سمجھ کر حرام قرار دیتے ہیں کیکڑے کا مغز تو ناشتہ میں مرغوب غذا ہے۔ روس کے کیویار، تازہ مچھلی کے انڈے دنیا کی نفیس غذاؤں میں سے ایک ہے مگر بہت سے لوگوں کو بھاتے نہیں۔ چین میں سانپ کھا لیا جاتا ہے۔ میں نے کینٹن میں چینی احباب سے فرمائش کی کہ سانپ کھلائیے تو وہ ہنس کر ٹال گئے کہ خزاں کے موسم میں آؤ تو کھلائیں گے حالانکہ میں نے دیکھا کہ بازار میں سانپ بک رہے تھے شاید اس خیال سے کہ کہیں میں قے وے نہ کر دوں ان دوستوں نے اچھا کیا کہ میری فرمائش پوری نہیں کی مگر میں نے دیکھا کہ خود ہندوستان میں قبائلی لوگ اور وہ لوگ جنھیں "جرائم پیشہ" کا نام دیا جاتا تھا زندگی کے تقاضوں سے کیا کیا نہیں کھاتے ہیں۔ بہار کے کول کے کان کن چپکے سے آپ کو دعوت دیں گے، "سانپ کھاؤ گے بھیا"۔

پینے کا بھی یہی حال ہے۔ پینے والے اور نہیں پینے والے دونوں قسم کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ آب و ہوا کے اثر سے کچھ مذہبی اور سیاسی احکامات اور روایات کے تحت زہد و تقویٰ اور ریاکاری عام ہے۔ مگر لوگ اچھی بری جیسی بھی ملے پی لیتے ہیں۔ پینے والے تو وہاں بھی پیتے ہیں جہاں کہا جاتا ہے کہ ممانعت ہے۔ مگر خانہ کشید مضر صحت شراب پی کر اپنی صحت و عافیت کو خراب کر لیتے ہیں۔

یورپ میں شراب، غذا اور تہذیب کا جزو ہے۔ مگر کہیں قانونی طور پر منع نہیں ہاں اسکنڈی نیوین ممالک

جیسے ڈنمارک، ناروے، سویڈن اور فن لینڈ میں سوشل ڈیموکریٹس کی حکومتوں نے پینے پر پابندی ضرور لگادی ہیں. فن لینڈ میں تو کمیونسٹ پارٹی نے اپنے ممبروں پر قطعی حرام کردی ہے. پینے والوں کو پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔ کمیونسٹ ممالک میں قانونی طور پر منع نہیں البتہ بچپن ہی سے نئی نسل کو الکحل کے مضر اثرات سے واقف کرا دیا جاتا ہے چنانچہ سوویت یونین میں نوجوانوں میں شراب سے زیادہ دودھ، پھلوں کا رس بہت مقبول ہیں۔ ویانا میں مدرسین کی بین الاقوامی کانگریس میں ایک روسی نوجوان بیٹھا بیئر پی رہا تھا. میں نے کہا (VODKA) وڈکا اپنی قومی شراب کیوں نہیں پی رہے ہو، تو اس نے کہا "وڈکا سے مجھے نفرت ہے" چین کے لوگوں نے ہمیں فخر سے بتایا کہ شراب کا استعمال چین میں بڑھ رہا ہے کیونکہ لوگوں کی خوشحالی بڑھ رہی ہے. مگر وہ روز نہیں بلکہ ہفتہ میں ایک آدھ بار پی لیتے ہیں. پہلے تو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی تھی اب بڑے پیمانے پر سب پیتے ہیں.

یورپ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو گوشت شراب اور سگریٹ سے پرہیز کرتے ہیں. مگر ایسے خاصانِ خدا خال خال ہیں. بہت سے ملکوں کی سیاحی نے یہ حقیقت تو روشن کردی کہ حضرت انسان ایک ایسے جانور ہیں جو زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کھاتے ہیں۔ نہ صرف کھاتے ہیں بلکہ ذائقہ دار بنا کر، لطف لے کر کھاتے ہیں ــ اور پیتے بھی ہیں۔

راحتِ جاں

میری ولفورڈ، انگریز.. لڑکی نہ صرف اچھی جرنلسٹ تھی بلکہ اچھی ماں، اچھی بیوی اور اچھی دوست ہونے کے علاوہ پکانے میں بھی استاد تھی. اس کا امریکی نژاد شوہر جاّن، اقتصادیات کا عالم عجیب خصوصیات کا نوجوان تھا. اسے عورتوں کے بناؤ سنگھار سے چڑ تھی، کہتا کہ مردوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے عورتیں ایسا کرتی ہیں. ناچ بھی اسے پسند نہیں تھا. کہتا کہ ناچ میں جو تھکن ہوتی ہے وہ ایک دو میل پیدل چلنے سے بھی پوری ہوسکتی ہے. میرّی نے اب تک خیاّم کا صرف نام سنا تھا پڑھا نہیں تھا. میں نے ویانا کے ایک دوست سے مانگ کر خیاّم کا انگریزی ترجمہ (فزجیرلڈ کا) اسے دیا. کچھ دیر بعد میں نے پوچھا کیا رائے ہے تمھاری خیاّم کے بارے میں. تو میرّی نے کسی قدر معذرت خواہی کے انداز میں کہا کہ جاّن نے خیاّم پڑھنے کے بعد کہا کہ کیا تم خیاّم پر ایک گھنٹہ ضائع کروگی؟ خیاّم کے اقتصادی نظریہ کو میں تمھیں دو منٹ میں سمجھا دوں گا بغیر پڑھے اس نے کتاب مجھے لوٹا دی، حقائق کی توجیہہ میں جاّن کا نقطہ نظر بڑی حد تک میکانکی تھا.

میں نے یہ قصہ ایرانی دوست ایرج اسکندری کو سنا دیا جو ان پر شاق گذرا. ایرج اسکندری ایران کی تودہ پارٹی کے سربرآوردہ قائد اور اس کی حکومت کے وزیر تھے. رجعت پرستوں کے ہاتھوں تودہ حکومت کی معزولی کے بعد وہ ویانا میں مقیم تھے ــ نوآبادیاتی ــ ممالک کی سیاست اور معیشت کے متعلق وسیع معلومات اور ان پر گہری نظر رکھتے تھے. سیاسی ہم خیالی کے ساتھ ہند ایرانی کلچر کے صدیوں پرانے رشتے بھی باہمی خلوص اور محبت کی بنیاد تھے

ایرج اسکندری کو حافظ و خیام کے علاوہ بہت سے جدید شعرائے فارسی (ہند اور ایرانی) کے بھی ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ ہم جب کبھی ملتے تو فارسی اشعار ہی میں گفتگو ہوتی۔ میں نے ان سے خاص طور پر ملک الشعراء بہار کی ایسی نظمیں سنیں جو اس سے پہلے نہ کہیں پڑھی تھیں نہ سنی تھیں۔ ایسے بھی موقعے ملے کہ کاظمی ان اشعار کو خوش الحانی کے ساتھ خاص ایرانی لہجہ اور طرز میں سناتا۔ مہین، اس کی بیوی گوشت بھونتی اور علی لہسن تراشتا اور کلام کے نکات سمجھا جاتا۔ ان تمام نعمتوں کا دنیا میں اکٹھا ہو جانا قدرت کی بے بہا دین تھی۔ میں ایرج اسکندری اور جان کے مزاج اور طبائع کے اختلاف کا لطف لیتا رہا۔ جان کو قائل کرنے کی کوشش فضول تھی۔ جان دوسری جنگ عظیم میں فاشسٹوں کے خلاف امریکی فوج میں بڑے عہدے پر فائز تھا مگر اب وہ اپنے وطن سے دور ویانا میں بے وطنی کے دن گذار رہا تھا کیونکہ امریکہ کے جنگ باز حکمران اس کے امن عالم اور بین قومی دوستی اور جنگ کے خلاف خیالات کو خطرہ سمجھ کر امریکہ میں داخل ہونے نہیں دیتے ہیں۔ الزام یہ تھا کہ وہ کمیونسٹ ہے مگر جان کھانوں کا شوقین تھا اور وہ بھی تیز کھانوں کا۔ کھانے کے وقت میز پر وہ پیاز، مرچ اور لہسن کاٹ کاٹ کر مہمانوں کی طرف بڑھاتا اور خود بھی مزہ لے کر کھاتا تھا۔

ذائقہ کی تلاش میں میں نے ویانا کے معروف اور غیر معروف سب ہی مقامات آزما ڈالے۔ فرنچ، اطالوی، روسی، چینی، ہنگیرین، یوگوسلاوی سب کھانوں کا مزہ چکھا۔ ایک دو رسٹوراں ایسے ملے جہاں شام کا کھانا اپنے ڈھب کا مل جایا کرتا تھا۔ فٹ پاتھ کے کنارے شیشہ کی الماریوں میں لال لال مرچ کے گچھے، راہروؤں کو کام و دہن کی آزمائش کی دعوت دیتے ہیں اس کے نظارہ ہی سے منہ میں پانی آجاتا تھا اور احباب تو تفریحاً تبدیلی ذائقہ کے لیے تیز کھانے گوارا کر لیتے مگر جان ایک ایسا تھا جو مزہ لے کر کھاتا۔ کھانوں کا ذائقہ تو خیر عام یورپین گھرانوں سے ہٹ کر کسی قدر تیز ہوتا تھا مگر ان کے نام بھی میرے لیے کچھ کم ترغیب کا باعث نہیں تھے۔ کوفتہ، قورمہ، کباب سیخ، شامی کباب، ایک اور کھانا تھا جس کا نام تھا "شمشیر سلطان عبدالحمید" جو شاید محض مرچ کی تیزی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور آخر میں ترکی مٹھائی "راحت جاں" جسے ایران میں "راحت حلقوم" کہتے ہیں ذائقہ کی تکمیل کر دیتا۔ یہاں نہ صرف سیاح سفارت خانوں کے آفسر اور عملے والے بلکہ خود ویانا کے چٹورے ہر شام جمع ہوتے ہیں۔ رسٹوراں کی خاموش فضا میں سنگیت کے استادوں کی دھنیں ہلکے ہلکے سروں میں دل و دماغ پر خوشگوار اثر ڈالتی رہتی تھیں اور کانچ کی خوشنما انگیٹھیوں پر تازہ اور گرم گرم غذا میزوں پر پروسی جاتی۔ سردیوں میں قاب سے نکلتی ہوئی بھاپ، منظر میں اشتہا انگیز فضا پیدا کر دیتی تھی۔ یہ مزیدار کھانے سربیہ اور مقدونیہ کے ہوتے جن پر ترکوں کی تہذیب کا گہرا اثر ہے۔ کام ختم کر کے فٹ پاتھ پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر گرم گرم (SA SEES) سا سیج، چٹنی کے ساتھ بطور ناشتہ کھا لیا کرتا، اور شام میں اگر جیب میں پیسے ہوتے تو مرچوں والے رسٹوراں میں چلا جاتا۔ ایسا کھانا مہنگا تھا۔ اور گاہے گاہے نصیب ہوتا تھا۔

ہندوستان کے مقابلہ میں یورپ میں عام طور سے لوگوں کی صحت بہتر ہے جس میں آب و ہوا اور معاشی ترقی کے

ساتھ ساتھ غذا کو بڑا دخل ہے، غذا متوازن ہے، قومی ذائقہ کے پیش نظر جدید طب کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے دل و دماغ اور جسمانی صحت کے لیے ضروری اجزا غذا میں شامل ہیں۔ گوشت، روٹی، سبزی، چکناہٹ، پھل، الکحل، کافی وغیرہ میں غذا کے بہت عناصر شامل رہتے ہیں۔ مگر اچھی یا بری غذا کا انحصار اس پر بھی ہے کہ ہماری آمدنی کیا ہے؟ جس کی زبان پر جگر، بگھارے بینگن، اباڑے کی بھاجی، کھٹی دال، قیمہ میتھی کی بھاجی چڑھے ہوئے ہوں اس کے سامنے یورپ کا خوانِ نعمت بھی ہیچ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ولایتی غذا گوارا ہونے لگی تھی۔ ایک دن میری نے کھانے پر بلایا کہا کہ ہندوستانی کھانا کھاؤ گے تم آج، میں کسی قدر وقت سے پہلے ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ میری نے گیاس کے چولہے پر چاول، ترکاری گوشت آدھ پون گھنٹے میں بنا دیئے۔ جان نے برتن دھوئے اور میز چن دی۔ اس دوران میں میں ان کی بچی سارا سے کھیلتا رہا جو مجھے میری ماں بن کر تھپک تھپک کر سلاتی اور کہتی کہ آنکھیں بند کرو۔ اس کی ماں سلانے کے لیے جو جو ترکیبیں کرتی ہوگی سارا نے وہ سب مجھ پر صرف کر دیں۔

میرے علاوہ ایک انگریز شاعر اور اس کی بیوی، ایک آسٹریائی مزدور اور اس کی انگریز بیوی بھی مدعو تھے۔ میں نے تو صرف مشروم ٹماٹو گوشت کا سالن چاول کے ساتھ کھایا۔ واقعی ہندوستانی سالن تھا میں حیران کہ میری نے آخر یہ بنایا کیسے؟ وہی مرچ مسالہ وہی خوشبو، وہی رنگ وہی ذائقہ۔ مہینوں بعد اس دن موچھوں پر ناک پسینہ آگیا دوسرے اور کسی کو تو کچھ نہیں ہوا مگر میں پیچش میں مبتلا ہو کر تین دن تک فریش رہا۔

کچھ دن بعد ویانا میں عالمی امن کونسل کے اجلاس میں روسی شاعر تیخونوف سے ملاقات ہوئی جن سے میں بڈاپسٹ میں مل چکا تھا، پوچھا کہ یہاں کی غذا کیسے چل رہی ہے؟ میں نے کہا کہ اب معدہ، اس قدر "مہذب" ہوگیا ہے کہ وہ ہندوستانی غذا کے خلاف بغاوت کر رہا ہے۔

خواجہ غلام السیّدین

زبان کا مسئلہ

مجھے بہت خوشی ہے کہ میں آج ایک دو سال پرانا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ ہندی پرچار سبھا نے عرصہ ہوا مجھے اپنے سالانہ کنونشن میں شریک ہونے کے لیے بلایا تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے دفتری دھندوں کا کہ ان کی وجہ سے اب تک نہ آسکا۔ اس دیر کی معذرت کے ساتھ ساتھ مجھے آپ کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ نے اس موقع پر مجھے یاد کر کے میری عزت بڑھائی۔ یہ احساس اس حالت میں اور زیادہ ہو جاتا ہے جب کوئی شخص یہ جانتا ہو کہ اسے اس عزت کو پانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میری زندگی پڑھنے پڑھانے میں اور دفتر کی چکی چلانے میں گذری ہے۔ زبان اور ادب کی خدمت کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنا ضرور سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان کی میرے دل میں عزت ہے اور ان کے کام کے لیے پریم۔ ایسے ہی خاموش تعمیری کاموں کے ذریعہ قومیں بنتی ہیں۔ ہندی پرچار سبھا کے کام اور اس کی خاموش خدمت سے میں واقف ہوں لیکن نہ اس قدر جتنا ہونا چاہیے۔ البتہ اس موقع پر آپ کے کام کو دیکھ کر یہ واقفیت بڑھ گئی ہے۔ مجھے کل ہی آپ کے کاموں کی ایک رپورٹ پڑھنے کا موقع ملا جس سے اندازہ ہوا کہ آپ نے دھیرے دھیرے پچیس برس میں اس کو کس طرح بڑھایا اور پھیلایا ہے۔ لیکن کسی کام کی قدر و قیمت کا اندازہ محض اس کے پھیلاؤ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقصد کی معقولیت اور دیانت سے ہوتا ہے۔ اگر مقصد کو سمجھداری کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے تو تھوڑا کام بھی دور تک پہنچتا ہے اگر مقصد ہی درست نہیں تو جتنا بھی آپ آگے بڑھیں گے یا تیز چلیں گے اصل منزل دور ہوتی چلی جائے گی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے زبان کے بارے میں جو پالیسی رکھی ہے اس میں گاندھی جی کی نظر اور ہدایات کا فیض جاری ہے اور (اگر میں انکسار کے ساتھ عرض کر سکوں) اس میں مجھے ان خیالوں کا عکس بھی نظر آتا ہے جو زبان کے پرچار اور اس کے بنانے کے سلسلے میں برسوں سے میرے دل اور دماغ پر حاوی رہے ہیں۔ آپ نے اپنی رپورٹ میں اس پالیسی کو جس طرح بیان کیا ہے اس کو دہرانا بے موقع نہ ہوگا: "ہم چاہتے ہیں کہ دیوناگری لپی میں ہندی زبان ملک کی عام زبان بنے۔ لیکن اس میں جو لفظ باہر سے آکر داخل ہو گئے ہیں ان کو قائم رکھا جائے اس زبان کو ایک ایسی سادہ اور میٹھی زبان بنانے کی ضرورت ہے کہ وہ کسی خاص طبقے یا جماعت کی زبان نہ سمجھی جائے بلکہ عام

جنتا کے دل کی پکار بن سکے۔ یعنی ہم ہندی کے اس اسٹائل اور روپ کے حامی ہیں جس کا ذکر ملک کے ودھان میں میں کیا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سبھا سیاست اور زبان اور جماعتی جھگڑوں سے بالکل الگ رہے اور مقامی زبانوں کی ترقی میں حصہ لے۔ اس طرح وہ بھی۔۔۔ پھلے پھولیں گی اور ہندی ان کے اور ملک کے سارے حصوں کے درمیان ایک پل کا کام دے گی"۔ کارکنوں کی یہ پالیسی ہر طرح قدر کے قابل ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ زبان کے اس طوفان میں جس نے پچھلے دس برس میں اپنا سر اٹھایا ہے آپ کے قدم نہیں ڈگمگائے۔

اس موقع پر آپ کے کاموں کے بارے میں کسی مفصل تنقید کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں زیادہ تر دوست ایسے ہیں جو اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ایک لاکھ آدمیوں کو ہندی پڑھانا۔ قیدیوں اور ہریجنوں کی تعلیم کا انتظام کرنا، استادوں کو ٹریننگ دینا۔ دو اسکول اور ایک کالج چلانا، پستکالیوں کا قائم کرنا اور علمی اور عام دلچسپی کی کتابوں کا شائع کرنا۔ جن میں بچوں، بالغوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے مذاق کی چیزیں شامل ہیں۔ ایک اچھے پریس کا قیام، یہ سارا پروگرام آپ کے مقصد کی خوبی اور وسعت کا ثبوت ہے۔ مجھے خاص طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کی اس سنستھا نے صرف حکومت ہی سے نہیں بلکہ دوسری زبانوں کی انجمنوں سے بھی مل جل کر کام کیا ہے اور ان کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے زبان کی سیوا میں تنگ خیالی اور سرپرستی بڑی خطرناک چیزیں ہیں شکر ہے کہ آپ نے اپنے دامن کو ان سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے، میں اس بات پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

دوستو! دیس کے آزاد ہونے کی وجہ سے ہم پر بہت سی نئی ذمہ داریاں اور نئے بوجھ پڑے ہیں۔ لیکن تمام کٹھنائیوں کے باوجود ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمت اور خوش دلی کے ساتھ انہیں اٹھائیں اور کتنے بہت سے اور مختلف کام ہیں یہ۔ دیس کی مالی حالت کو سدھارنا اور جنتا کی زندگی کے معیار کو بڑھانا ہے صنعت و حرفت اور کھیتی باڑی کو پھیلانا اور نئے ترقی یافتہ راستوں پر ڈالنا ہے دیس سے بیماری اور جہالت کو نکالنا ہے۔ دلوں سے تنگی اور دماغوں سے اندھیرے کو نکالنا ہے۔ ریت رسم اور ذات پات کے جو بندھن ہماری زندگی کو لوہے کی سی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ان کو توڑنا ہے۔ دو صدیوں کی غلامی نے ہماری رچنا تمک شکتیوں کو جو زنگ لگا دیا ہے اس کو صاف کرنا ہے۔ ملک میں جو دل توڑنے والے بھید بھاؤ پیدا ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے خود آزادی کی سندر کشتی بھنور میں آتی معلوم ہوتی ہے ان کو ختم کرنا ہے، اور صرف دیس کے اندر ہی نہیں بلکہ دیس کے باہر دنیا میں بھی جو آج گویا ہمارے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ امن و شانتی کے خیال کو پھیلانا ہے، ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ ہماری ساری تہذیب اور تمدن، ہمارے کلا کے امر شاہکار ہماری قدریں ہماری زندگی کے سنہری اصول جنہوں نے صدیوں کی جانچ کرنے والی آنکھوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے، ہمارے بھگتوں کے گیت ہمارے صوفیوں کا تصوف، ہمارے ادیبوں کا ساہتیہ، یہ سب چیزیں جنگ کی آگ میں بھسم ہو جائیں گی۔ اسی وجہ سے تو

شاعر نے آج سے پچاس برس پہلے یہ سندیسہ دیا تھا ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

میں اس موقع پر یہ ذکر کیوں کر رہا ہوں۔ ایک تو یہ یاد دلانے کے لیے کہ ہماری قومی زندگی کی نیو محض دھن دولت اور قوت کی تلاش پر نہیں رکھی گئی . . . . بلکہ بعض اخلاقی سدھانتوں پر رکھی گئی ہے جن کا پالن ہمارا فرض ہونا چاہیئے، اس بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔ آج کی دنیا میں اور خود ہمارے دیس میں ایسے لوگ اور گروہ موجود ہیں جو چاہے زبان سے ان اصولوں کا دم بھریں لیکن اصل میں ان کے من میں زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے لیے دولت، قوت اور اختیار حاصل کریں۔ موجودہ دور کی تباہ کاریوں کے رعب میں آ کر ان کا خیال یہ ہو گیا ہے کہ شانتی کا پیغام خواہ وہ پرانے رشیوں، منیوں اور نبیوں اور صوفیوں نے دیا ہو یا گاندھی اور نہرو کی زبان اور دل سے نکلا ہو اس زمانہ کی ضرورتوں سے اس کی آب وہوا سے اس کی راج نیتی سے میل نہیں کھاتا۔ یہ زمانہ تو قوت اور اہنسا کی رسہ کشی کا ہے۔ مدت ہوئی ایک مشہور انگریز اخبار نویس نے اس بھٹکی ہوئی ذہنیت کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی تھی۔

"اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے یا زبان کے میدان میں معنی پیدا کرے، لمعے کی ساخت کے بارے میں دماغ لڑائے۔ یہ تو ایسا معلوم ہوگا جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے ۔ کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے اور کاغذ پر روشنائی یا فضا میں فکر انگیز جملے بکھیرے۔ وہ تو جنگ کے نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جائیں گے یا ان . . . . آشاؤں اور سپنوں کا نوحہ پڑھے جواب باسی ہو گئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل۔ پیادہ فوجوں (اور ہوائی جہازوں اور ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے مقابلے میں ایک نقاد کی یا زبان جاننے اور سکھانے والوں کی کیا حیثیت ہے۔"

مگر میں صاف طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ یاس اور ناامیدی کا پیغام ہے۔ اگر ہمیں زندگی کو ایک سندر روپ میں ڈھالنا ہے تو ہمیں مادی قدروں کے ساتھ ساتھ لیکن اس سے کہیں زیادہ ادبی اور اخلاقی قدروں سے رشتہ جوڑنا ہوگا اور دیس میں اس زندگی کی عمارت بنانے کے لیے نئی بنیادیں ڈالنی ہوں گی۔ ان بنیادوں میں ایک بہت اہم بنیاد زبان ہے جو فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں اس طرح رسی بسی ہوئی ہے جس طرح شریر میں آتما یا شمع میں روشنی۔ زبان ہی کے ذریعہ ہمارے وچاروں میں صفائی پیدا ہوتی ہے اور دل کی بات سانچے میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ اسی کی مدد سے ہم اپنے پاس اور دور کے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کرتے اور میل جول رکھتے ہیں۔ ورنہ ہماری حالت ایسی ہوتی ہے جیسے ایک بہت بڑے ساگر میں پھیلے ہوئے جزیرے جن کا ایک

دوسرے کے ساتھ کوئی سمبندھ نہ ہو، یہی زبان ہے جو کہیں بچوں کی توتلی بولی کی شکل میں ہمارا دل لبھاتی ہے یا کہیں ٹیگور کے گیتوں کے سانچے میں ڈھل کر دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے، کہیں ابوالکلام آزاد کی تقریر اور سروجنی دیوی کی شاعری بن کر ان میں آگ لگاتی تھی ہمت اور جوش اور حوصلے کی آگ اور کہیں گاندھی کی سیدھی سادی دل سے نکل کر دل میں اتر جانے والی بولی میں دنیا کو پریم اور شانتی کا پیغام پہنچاتی ہے۔ کتنی بڑی نعمت ہے یہ خدا کی! جس نے انسان کو دوسرے تمام حیوانوں سے الگ اور اونچا کر دیا ہے۔ اس شان سے کہ انسان کی تعریف ہی "حیوان ناطق" یعنے بولنے والا جانور قرار پائی۔ لیکن کیسے اچنبھے کی بات ہے یہ دوستو اور عزیزو کہ یہی زبان بجائے دلوں کو جوڑنے کے دلوں کو توڑنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اپنی زبان سے محبت جو ایک قدرتی اور شریفانہ جذبہ ہے۔ دوسری زبانوں سے نفرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ زبان تو ایک امر اور امٹ دھن ہے اور جو شخص اس کو بولتا اور برتتا ہے وہ اس دھن میں شریک ہو جاتا ہے جو شخص ایک زبان جانتا ہے وہ مقابلتہً غریب ہے دھنوان نہیں۔ جو شخص کئی زبانیں جانتا ہے وہ زبان بھی جو اس نے اپنے ماں کے دودھ کے ساتھ پائی ہے اور وہ زبانیں بھی جو دوسروں نے اپنی ماؤں کے دودھ کے ساتھ پی ہیں وہ بہت زیادہ دولت کا مالک ہے۔ ان کی بدولت اس کے لیے دوسرے لوگوں اور ملکوں کی تہذیب اور تمدن ذکر و فکر، ساہتیہ اور کلا، سائنس اور فلسفے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن نہ معلوم یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ بجائے اس سیدھی سادی اور صاف بات کو سمجھنے کے، نہ صرف ہمارے دیس میں بلکہ دنیا بھر کی تاریخ میں زبان کے جھگڑے قضیوں نے نفرت اور تعصب کی آگ کو بھڑکایا ہے۔ اس وقت دنیا بھر کا ذکر تو کیا کروں۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں ہی میں نئی تقسیم کے وقت جو فتنہ بپا ہوا اس کی یاد ابھی تک کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے ہمارے دل میں۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جو آپ کی دعوت نے مجھے دیا ہے نہ صرف آپ کے کام کو سراہوں کہ آپ دیس کی مختلف زبانوں کے بیچ میں مفاہمت کے پل بنا رہے ہیں بلکہ ان سب لوگوں کے دلوں کو کھٹکھٹاؤں جنھوں نے اس گر کو نہیں پہچانا بلکہ اپنی ناسمجھی اور ضد سے زبان کی تلوار کے ذریعہ بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاملہ صرف ہندی اردو کا نہیں ہندی انگریزی کا نہیں ہندی اور غیر ہندی زبانوں کا نہیں، بلکہ ساری زبانوں کے باہمی رشتے کا ہے۔ ہمارے اس دیس میں جہاں کثرت بھی ہے اور وحدت بھی۔ دوئی بھی ہے اور ایکتا بھی جو بہت سی دور دراز کی تہذیبوں اور وچار دھاراؤں کا سنگم ہے ہمارے لیے عقل کا راستہ ایک ہی ہے کہ ہم سب زبانوں کا سواگت کریں کہ وہ ہمارے پیارے دیس کی زبانیں ہیں۔ ہم اپنی مادری زبان اس لیے سیکھیں کہ اس زبان میں ہم وچاروں اور بھاؤناؤں کو زیادہ سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ ہندی زبان سیکھیں کہ وہ ملک کے ایکتا کو ظاہر کرنے اور مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ دیس کی دوسری زبانیں سیکھیں کہ وہ ہمارے دوستوں اور پڑوسیوں اور دیس باسیوں کی

زبانیں ہیں۔ دوسرے ملکوں کی بھاشاؤں کو سیکھیں خاص کر انگریزی کو جس کے ذریعہ ہم نہ صرف مغرب کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ سکتے ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے دیسوں کے ساتھ بھی بات چیت میل جول لین دین کر سکتے ہیں۔ اس میں جھگڑے اور فساد کا تلخی اور تشدد کا موقع کونسا ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شخص کو سب زبانیں سیکھنی چاہئیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ جتنی زبانیں چاہے سیکھے۔ اپنی زبان اچھی طرح سے سیکھے اور اس میں تعلیم پائے اور ہندی کو اس حد تک پڑھے کہ ملک کے کسی حصہ میں بھی خود کو اجنبی سا محسوس نہ کرے۔ ہندی اور راہندی زبانوں کا جھگڑا اس وجہ سے بھی بے معنی ہے کہ ان کے میدان الگ الگ ہیں۔ دکھن اور پورب کے پرانتوں میں اگر ایسی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کا رشتہ ہندی سے دور کا ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اپنے دور کے رشتہ داروں کے ساتھ ایک گھر میں امن اور آشتی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اور یہ گھر کوئی تنگ یا چھوٹا سا گھر بھی تو نہیں ہے۔ دنیا کی آبادی کا کوئی پانچواں حصہ اس گھر میں رہتا ہے۔ ہندی کو ان سب زبانوں کی دین سے اپنی جھولی کو بھرنا ہے تاکہ وہ ملک کے دل کی دھڑکن اور پکار کی ترجمانی کر سکے اور ساتھ ہی ان سب زبانوں کو ہندی کا کھلے دل سے سواگت کرنا ہے تاکہ وہ اس کو بھی اپنی ہی دولت میں شمار کریں۔

اس سلسلے میں ہندی، ہندوستانی اور اردو کا قصہ بھی اٹھتا ہے اس کا کارن سمجھنے سے تو میں بالکل ہی معذور ہوں بلکہ شاید یہ کہنا چاہیے کہ سمجھ تو سکتا ہوں ایک حد تک لیکن اس قصے کو بڑھانے والوں کی سمجھداری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کارن تو یہی ہے کہ انگریزوں نے دلوں میں فرق ڈالنے کے لیے جہاں اور بہت سی تدبیریں اختیار کیں وہاں ہندی اور اردو کے فرق کو چمکایا اور بڑھایا اور تف ہے ہماری بھول اور نادانی پر کہ ان دونوں زبانوں (بلکہ ایک ہی زبان کے دو سنگاروں) کو بنانے میں ہم سب نے جو حصہ لیا تھا اس کو بھلا کر ہم ان کی چال میں آ گئے اور اپنا مشترک ورثہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ؎

وائے بر سادگیٔ ما کہ فسونش خوردیم
رہزنے بود کمیں کردہ رہ مردم زد

افسوس ہے ہماری سادگی پر کہ ہم اس کے جھانسے میں آ گئے۔ ایک ڈاکو تھا جو گھات میں آ بیٹھا اور اس نے راستہ چلنے والوں کا راستہ کاٹ ڈالا۔ اور ایسا کاٹ ڈالا کہ ابھی تک ہم صحرا میں بھٹک رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد جب ہماری بدقسمتی ہندوؤں اور مسلمانوں کے جھگڑوں کی شکل میں ظاہر ہوئی تو ہندی کو ہندوؤں کے ساتھ اور اردو کو مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور جو زہر اور کڑواہٹ سیاسی رشتوں میں پیدا ہوئی تھی وہ منہ اور زبان میں بھی سرایت کر گئی ملک کی تمام زبانوں میں کوئی زبان بھی ہندی کے اس درجہ قریب نہیں جتنی اردو۔ دونوں زبانوں میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ لفظ ایک ہیں۔ زبان کا عام کینڈا اور گریمر ایک ہے سارے فعل اور بیشتر اسم

ـہیں۔ فرق جو ہے وہ زیادہ تر اسمائے صفت کا ہے جو زبان کی آرائش اور تراش وخراش کے لیے استعمال ہوتے
ں، اور اس کے سنگھار کا ذریعہ ہیں۔ اردو نے یہ سنگھار کا سامان زیادہ تر فارسی عربی سے لیا اور ہندی نے سنسکرت
ے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ابتدا میں اس قدر گھلی ملی اور شیر و شکر تھیں کہ مدت تک اردو نے ہندی کے نام کو
یا اور اس کے ساتھ کبھی غیریت کا خیال دل میں نہ آیا۔ دونوں زبانوں کے لیکھکوں اور ودوانوں نے بھی تنگ دلی
یں دکھائی بلکہ ہندی کے شبد ساگر میں ہزاروں عربی، فارسی اور خالص اردو کے لفظ اور اردو کی مستند لغات
ں ہزاروں ہندی اور سنسکرت سے نکلے ہوئے لفظوں نے مہمانوں کی حیثیت سے پناہ لی۔ اور بولنے والوں نے
نا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور میزبانوں کی طرح ان کی آؤ بھگت کی۔ اردو زبان کے بہت سے شاہکار اس تحریک
ں گواہی دیتے ہیں۔ دور کیوں جایئے اقبال کا نیا شوالہ۔ حالی کی مناجات بیوہ — راجہ رادھیکا پرشاد سنہا کی
ثر (جس کو ہندی والے ہندی، اردو والے اردو اور ہندوستانی والے ہندوستانی کہہ سکتے ہیں) اس بات کا ثبوت
یں کہ اردو میں ہندی لفظوں کی کھپت بشرطیکہ سلیقے کے ساتھ کی جائے اس کی سندرتا کو بگاڑتی نہیں سنوارتی
ہے۔ اس طرح اردو فارسی لفظ صرف شبد ساگر کی پونجی میں جمع نہیں بلکہ انھوں نے شاعری اور ادب کے علاوہ ہندوؤں
لی مقدس کتابوں رامائن اور مہابھارت کے ترجموں میں بھی بار پایا ہے۔ اس لیے اردو ہندی کا بیر عقل کی دشمنی ہے
دوسرے کے شگون کے لیے اپنی ناک کٹانا۔ اگر اردو کی چیزیں ہندی لپی اور ہندی کی اردو رسم الخط میں شائع
لی جائیں اور لکھنے والے دور بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کریں اور قبول عام کو
اپنی کسوٹی بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی دولت سے مالا مال نہ ہوں۔ کہاں سے
زبان لاکر کہوں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لفظوں کا جغرافیہ نہیں ہوتا۔ ان کے باپ دادا کی تلاش ان کے
ابتدائی وطن کی کھوج لگانے کی کوشش علمی ریسرچ کے لحاظ سے تو اچھی چیز ہے لیکن اگر اس کا مقصد ان کی ذات پات کی
چھان بین کر کے ان کا حقہ پانی بند کرنا ہے تو اس سے زیادہ حماقت کیا ہو سکتی ہے۔ جو لفظ ہماری زبان میں آکر کھپ
گیا وہ ہمارا ہے چاہے سنسکرت سے آیا ہو یا فارسی سے یا انگریزی سے یا ولندیزی سے اس کو ہاتھ سے دینا اپنے
دھن کو برباد کرنا ہے۔ اردو میں ہندی کے جو سندر لفظ ہیں ان کو آدر اور پریم کے ساتھ اپنائیے۔ اس کو زبردستی شامل
کرنے کی کوشش سنسکرت کے اپرچت شبدوں کی ٹھونس ٹھانس اردو فارسی لفظوں کو شہر سے نکالنے کا جذبہ یہ
چیزیں تو ہماری قومی تہذیب اور پرمپرا کے خلاف ہیں۔ ایک زمانہ اردو پر بھی ایسا ہی گذرا ہے جب اس میں ایک
تنگ دلی اور عربی اور فارسی لفظوں کی اندھی بھرمار سے ایک سختی اور اجنبیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ
ذرا جلد ہی سنبھل گئی۔ اب اس کی قوت اور زندگی اسی میں ہے کہ وہ جنتا کی بول چال سے اپنا رشتہ نہ توڑے اور مجھے یقین
ہے کہ ہندی کے سچے سیوکوں اور پریمیوں کی آشا اور کوشش بھی یہی ہے کہ وہ بھی اس ڈگر پر چلے اور اس منزل کی

طرف قدم اٹھائے۔ جوں جوں دلوں میں صفائی ہوگی زبان بھی صاف ہوتی چلی جائے گی کیونکہ اس کو کسی مصنوعی تحریک کے ذریعہ یا سرکاری حکم سے نہ بدلا جا سکتا ہے نہ بگاڑا جا سکتا ہے نہ بنایا جا سکتا ہے۔ وہ تو لوگوں کی بول چال اور میل جول سے پیدا ہوتی ہے اور ان کے دلوں اور دماغوں کی ترجمانی کرتی ہے اور پھر ادیبوں اور شاعروں اور دوسرے لیکھکوں کی محنت اور خلاقی اور کلاکاروں کی تپسیا سے اس میں تراش خراش آتی ہے اور اس کے طفیل وہ نئی اور سندرتی اور رنگ روپ لاتی ہے۔ دنیا کے اتہاس میں زبانوں کی ترقی ہمیشہ اسی ڈھنگ سے ہوئی ہے۔ ہم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔ ہمارے لیے یہ مسئلہ صرف زبان کا نہیں بلکہ ملک کی ایکتا اور قوم کی زندگی کا ہے دلوں کو ملانے کے لیے ایک ملی جلی صاف اور رشتہ زبان کی ضرورت ہے اور زبان کو بنانے کے لیے دلوں کے میل اور محبت کی۔ یہ مسئلہ ہمارے دیس کے سارے دوسرے سوالوں سے زیادہ اہم ہے۔ اگر ہم نے اپنے خیالات اور جذبات میں ایکتا اور ہم آہنگی پیدا نہیں کی۔ اگر ہم دیس کے لوگوں میں وہ (EMOTIONAL INTEGRATION) نہیں لا سکے جس پر آئے دن پنڈت نہرو زور دیتے رہتے ہیں تو ملک کے بھوشن کا وہ سندر نقشہ جس کا خواب ہمارے نیتا اور کوی اور مفکر دیکھتے آئے ہیں خطرے میں پڑ جائے گا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ ہمیں یہ وحدت کثرت کی گوناگونی میں پیدا کرنی ہے۔ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ ۴۰ کروڑ لوگوں کے وچاروں اور الگ الگ طور طریقوں پر ایک اسٹیم رولر چلا کر انھیں زبردستی ایک ہی سانچے میں ڈھال دیں وہ راستہ ڈکٹیٹرشپ کا راستہ ہے جس کو ہم نے کبھی سویکار نہیں کیا اور ہم کبھی سویکار نہیں کریں گے۔ ہمیں اپنے دل اور دماغ کے دریچے کھلے رکھنے ہیں تاکہ ان میں سارے سنسار کی حیات بخش کرنیں اور ہوائیں داخل ہو سکیں جب کبھی ہم نے اپنے دیس کی اور پردیس کی اچھی چیزوں کا سواگت کیا ہے اور انھیں کھلے دل سے اپنایا ہے دیس آگے کی طرف بڑھا ہے جب کبھی ہم نے ان دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کر لیا ہے اور پانی کے بہاؤ میں زور نہیں رہا قومی زندگی سست اور افسردہ اور پچھڑی ہوئی رہ گئی ہے۔ زبان کے معاملے میں بھی ہمیں اسی اصول کو اپنانا ہے۔ جو لوگ اور سنستھائیں ہندی پرانتوں میں . . . .

کام کر رہی ہیں انھیں خاص طور پر اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دلوں کی گرہ محبت سے کھلتی ہے اس کو قینچی سے نہیں کاٹا جا سکتا۔ اگر انھیں یہ یقین ہوگا کہ ہندی ایکتا اور پریم کی راج دوت بن کر آ رہی ہے وہ خوشی کے ساتھ اس کا سواگت کریں گے۔ اگر انھیں یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ ایک حاکم زبان بن کر دوسری زبانوں کا حق چھیننا یا ان کی اُنتی میں روڑے اٹکانا چاہتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس لیے اس معاملے میں صرف یہی کافی نہیں کہ آپ کی نیت صاف ہو بلکہ ان لوگوں کو اطمینان دلانا ضروری ہے جن کے لیے آپ کام کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ دلوں کے میل کو اور بھید بھاؤ کے جذبے کو دور کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کی رگیں سرطان کی طرح قوم کے جسم کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے انصاف کی پالیسی، سب زبانوں کے ادھیکاروں کے ساتھ انصاف اور ان کو ہنسی خوشی کے ساتھ ان کا حق دینے کے لیے آمادگی۔ دنیا کے جتنے کٹھن جھگڑے ہیں خواہ وہ کسی میدان

میں ہوں ان سب کی بنیاد انیائے پر ہے۔ شاعر نے سچ کہا تھا کہ ؎

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے
...انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

دلوں کو صاف کیجئے کھوٹ کپٹ کو نکال کے انصاف کا دامن تھامیے اور پھر دیکھیے کہ کس طرح مشکلوں کے پہاڑ رائی بن جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہندی پرچار سبھا نے اتنے برسوں میں کبھی اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ یہاں دوسری زبانوں کی جو سنستھائیں ہیں ان کے ساتھ مل جل کر کام کیا ہے اور ایسی اسکیموں کو ہاتھ میں لیا ہے۔ جن کے ذریعہ یہ سب زبانیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو سکتی ہیں اور ایک دوسرے کی دوا سے لابھ اٹھا سکتی ہیں۔ یہی راستہ شرافت، رواداری و سمجھداری کا راستہ ہے ورنہ زبان کی بنیاد پر اگر ملک میں بہت سے پاکستان بن گئے تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ اس کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ ملک کے نام ہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ اس اندیشہ کی روک تھام کریں اور ان میں شامل ہیں نہ صرف ہمارے سیاسی لیڈر بلکہ ہمارے ادیب اور شاعر اور اسکولوں اور کالجوں کے ودیارتھی اور استاد اور سماج سیوک اور وہ سب لوگ جو اپنی تعلیم یا پوزیشن کی بدولت دوسروں کے خیال پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ جسے ہم سب کو مل جل کر جیتنا ہے

غلام ربانی

کتبات اور شاعری

کتبے پڑھنا بڑی دیدہ ریزی اور پتہ ماری کا کام ہے مگر یہ کام دلچسپ بہت ہے اور جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی اہم بھی ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے کتبے پڑھنا بہت ضروری ہے کیونکہ قدیم ہندوستان کے بڑے تاریخی مواخذ یہی کتبات ہیں۔ بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں یہاں تاریخ لکھنے کا رواج نہیں تھا اس میں شبہ نہیں کہ قدیم ڈراموں، قصص روایات، تاریخی افسانوں اور رزمیہ نظموں میں ملک کے بعض فرمانرواؤں اور ان کے کارناموں کا ذکر موجود ہے بلکہ بعض قصوں کے ہیرو یہاں کے راجا مہاراجا ہیں اور پوری کہانیاں ان کے گرد گھومتی ہیں مگر یہ کتابیں تاریخ کی تعریف میں نہیں آتیں۔ کوئی سوا سو (۱۲۵) برس سے ہندوستان کے کتبوں کا مطالعہ جاری ہے اور محض ان ہی کتبات کا طفیل ہے کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ بہت کچھ مدوّن ہو گئی ہے۔

ہمارے ملک کا ہر حصہ کتبوں سے مالا مال ہے۔ یہ قدیم تحریریں، مختلف قسم کے پتھروں اور چٹانوں پر موجود ہیں۔ پرانی لاٹھوں، میناروں، اور قلعوں کے دروازوں پر ہیں۔ مذہبی عمارتوں کے ستون اور دیواریں ان سے خالی نہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے پایوں پر بھی ہیں، لوہے، تانبے، پیتل، کانسی کی تختیوں اور سونے چاندی کے برتنوں، مہروں پر بھی ہیں، بعض جگہ لکڑی میں بھی منبت کیے گئے ہیں۔ قدیم مٹی کے برتنوں اور مہروں پر بھی ہیں۔ یہ کتبے کھروشٹی، سنسکرت، پالی، پراکرت، مرہٹی، تلگو، کنڑی، تامل، ملیالم، عربی اور فارسی وغیرہ مختلف زبانوں میں ہیں مگر آج کی اس مختصر صحبت میں صرف فارسی کتبات سے بحث کی جائے گی۔ ان میں ایسے کتبوں کا ذکر نہیں ہوگا جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں یا خطاطی کے نایاب نمونے ہیں۔ صرف وہ کتبے لیے جائیں گے جو نظم میں ہیں اور شاعری کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

پٹھانوں کے ابتدائی دور کے کتبے عربی اور فارسی میں ہیں، یہ عموماً سیدھی سادی نثر میں ہیں جن میں سلاطین وقت کے نام ان کے لمبے چوڑے القاب کے ساتھ کندہ ہیں۔ ہندوستان میں فارسی کا سب سے پرانا کتبہ ہانسی (ضلع حصار) میں ہے یہ کتبہ علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں اس قصبہ کے پارسی دروازہ کی تعمیر کے وقت نصب کروایا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پٹھانوں کی حکومت میں آئے دن انقلاب کی آندھیاں آتی رہتی تھیں جس سے اس عہد میں ادب کچھ ترقی نہ

کو سکا، البتہ لودھیوں کے زمانہ میں ملک میں تعلیم عام ہوگئی اور ادبی مذاق بھی اچھا ہوگیا تھا۔ اس عہد کے کتبے نظم میں بھی ہیں۔ جس طرح مختلف زبانوں میں ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح ہر عہد کی تحریر کو دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ بھی بدل جاتا ہے اور ماہرین کتبات پرانی تحریر کو دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ پٹھانوں کے عہد کے کتبے عموماً خط نسخ میں ہیں یا ثلث میں، ان میں اگر تاریخ کنندہ نہ ہو تو بھی ماہرین ان کے خط کی وضع سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

مغلوں کا زمانہ علم و فن کی ترقی کا زمانہ تھا چنانچہ اس عہد میں کتبات کا معیار بھی بلند ہوگیا تھا بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ کتبہ نویسی ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ تاریخ گوئی کا رواج بہت پرانا تھا، چنانچہ یادگار کی نوعیت کے لحاظ سے اس کا مادہ تاریخ نکالا جاتا اور اس کو دل نشین پیرایہ میں نظم کر دیا جاتا تھا اگر کتبہ نثر میں ہوتا تو پوری عبارت مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں کتبوں کے لیے شعر کہنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں تھا اس کے لیے بڑے بڑے اساتذہ پر نظر پڑتی تھی اور جو کتبے شاہی فرمان سے نصب ہوتے تھے وہ عموماً ملک الشعراء سے لکھوائے جاتے تھے۔ محمد معصوم بکھری اکبری دور کا شاعر تھا۔ نامی تخلص کرتا تھا۔ اکبر کے عہد کے بہت سے کتبے نامی کے کہے ہوئے ہیں جو قندھار، آگرہ، فتح پور سیکری، ناگور، مانڈو، دھار، امین وغیرہ دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔ نامی کے کلام میں درد بہت ہے اس کے بعض اشعار اودگیر (ضلع بیدر) کی عمارتوں پر بھی موجود تھے۔

آگرہ کے قلعہ میں جہانگیری محل اور دیوان خاص بڑی پاکیزہ عمارتیں ہیں۔ دیوان خاص شاہجہاں کا بنوایا ہوا ہے اس پر کلیم کا ایک طویل کتبہ موجود ہے۔ مرزا طالب کلیم ہمدانی شاہجہاں کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ مولانا شبلی نے شعر العجم میں اس کی معنی آفرینی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کتبہ میں بھی اس نے بلند پروازی دکھائی ہے۔ کتبہ کا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔۔

"اس قصر دلکشا کی کرسی اتنی بلند ہے کہ اکبر آباد کا سر عرش سے جا لگا ہے۔ اس کے کنگرے آسمان کی۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ پیشانی سے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے سپہر کے "س" کے دندانے۔ اس ایوان میں سجدہ کرنے سے پیشانی کی بڑی تحریر مٹ جاتی ہے۔ رعایا کا احوال بادشاہ پر روشن ہے وہ یہاں تک جانتا ہے کہ لوگ رات کو خواب میں کیا دیکھتے ہیں۔ اس رونق اور آرائش کا مکان آسمان نے زمین کے پردے پر کہیں نہیں دیکھا۔ اس کی چھت آفتاب کے مانند درخشاں ہے اور آسمان اس کے نیچے سایہ کی طرح پھیلا ہوا ہے۔"

اصل کتبہ یہ ہے:۔

ازیں دل کشا قصر عالی بنا | سر اکبر آباد شد عرش سا
بود کنگرش از جبین سپہر | نمایاں چوں دندانِ سین سپہر

سجود درایں سرائے سرور کند سر نوشت بد از جبہ دور
شرافت یکے آید در شان او سعادت در آغوش ایوان او
رہ جور از بیش و کم بستہ است بہ زنجیر عدلش ستم بستہ است
بہ نازم بہ زنجیر کر عدل شاہ ہمہ چشم شد در رہ دادخواہ
بر احوال مردم چناں در حساب کہ داند چہ بیند شبہا بخواب
در ایوان شاہی بصد احتشام چو خورشید بر چرخ بادا مدام
چو ایوان او عالم آرائی شد سر خاک از او آسماں سائی شد
شہنشاہ آفاق شاہ جہاں کہ نازد بہ او روح صاحب قران
بایں رونق و زیب و زینت مکاں ندیدہ بروی زمیں آسماں
بود صحن بامش چو سیمائے مہر بزیرش فتادہ چو سایہ سپہر
بتاریخش اندیشہ آورد رو در فیض شد باز از چار سو
چنیں گفت طبع حقائق شناس سعادت سرائے و ہمایوں اساس
۱۰۴۶ھ ۱۰۴۶ھ

اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں نے زنجیر عدل لٹکوائی تھی، اس کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ہے۔
قلعہ بیدر (دکن) میں رنگین محل کے کتبوں کی شان ہی نرالی ہے، یہاں ندرت خیال کے ساتھ کتبوں کی تیاری میں بھی جدت دکھائی ہے۔ سیپ کے خوبصورت پرچیں تیار کر کے ان کو اعلیٰ قسم کے سنگ موسیٰ میں پچی کیا گیا ہے پچی کاری بڑی نفاست سے کی گئی ہے اور سیپ کی چمک دمک سے کتبہ میں جان پڑ گئی ہے۔ محل کی اندرونی محراب پر یہ کتبہ ہے:

ہر در ثمیں کہ در صدف دارد عشق از بہر نثار در رگہت دارد عشق
عاشق شود آنکس کہ در آید ز درت گویا در و بام تو می بارد عشق

پویلین کی کھڑکی پر یہ اشعار ہیں:-

اے منظر دیدہ از جمالت روشن دی کردہ چو در در صدف سینہ وطن
بخرام بہ شہ نشیں خلوت گہ دل کز بہر تو آراستہ شد ایں گلشن

یہاں کی مسجد سولہ کھم میں ایک کتبہ تھا جو اس مسجد کا نہیں تھا کسی دوسری جگہ سے لاکر رکھ دیا گیا تھا۔ اب یہ کتبہ قلعہ کے اثری عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں

قلندر خاں حاکم بیدر نے کوئی ایوان بنوایا تھا۔ عمارت تو زمانے کی نذر ہوگئی اس کا یہ کتبہ باقی رہ گیا ہے۔ عمارت اور تل میں کوئی وجہ شبہ نہیں ہے مگر شاعر نے جو مادہ تاریخ نکالا ہے اس میں بڑی دلآویز تشبیہ دی گئی ہے، ملاحظہ ہو۔

بہ دور شاہ عالمگیر غازی — کہ از عدلش شدہ گیتی منور
قلندر خاں بہار باغ دولت — کہ از بویش جہاں گشتہ معطر
بہ پیش آفتاب دست جودش — بود دریا و کاں از ذرہ کمتر
رواقے ساخت بہر یادگارے — کہ باشد زیر ایں فیروز منظر
پئے تاریخ او از طارم چرخ — ندا آمد کہ "خال روی بیدر"
۱۰۸۸ھ

خوبصورت ایوانوں اور عالیشان محلوں کے نام ایسے رکھے جاتے ہیں جن سے شکوہ اور عظمت ظاہر ہو۔ ان کتبوں میں بھی سطوت اور جبروت کا اظہار ہوتا ہے مگر بعض اوقات انسان کو اپنی مجبوری اور بے بسی دکھائی دے جاتی ہے۔ لال قلعہ دلی کے مثمن برج میں جو کتبہ ہے، اس میں یہی بے مائیگی ظاہر کی گئی ہے؛

اشعار یہ ہیں :-

ای بند بپای قفل بر دل ہشیار — وی دوختہ چشم پای در گل ہشیار
عزم سفر مغرب و رو با مشرق — ای راہ رو پشت بہ منزل ہشیار

لال قلعہ کا دیوان خاص اپنے وقت کا سب سے خوبصورت ایوان تھا جس کی قسمت میں تخت طاؤس لکھا تھا۔ یہ عمارت سر سے پاؤں تک مرصع تھی مغلوں کے زوال کے زمانے میں اس پر تباہی آئی اور اس کے تمام قیمتی پتھر نکال لیے گئے، مگر اس کا حسن اب بھی باقی ہے، یہ وہ زلف ہے جو بگڑنے میں بھی بنا کی۔ اس کے شمال اور جنوب کی محرابوں پر سونے سے لکھا ہوا ہے :- اگر فردوس بر روی زمین است

زمین است و ہمین است و ہمین است

عمارت جس قدر خوبصورت ہے اس کا یہ کتبہ بھی انتہائی حسین ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا دیوان خاص کے لیے یہ شعر کہا گیا ہے یا اس شعر کے لیے دیوان خاص بنوایا گیا ہے۔ یہ عمارت ۱۶۳۹ء میں تعمیر ہوئی اور سو سال بعد یعنی ۱۷۳۹ء میں اسی جگہ نادر شاہ تخت طاؤس پر بیٹھا اور اس کے سامنے محمد شاہ مفتوح کی حیثیت سے پیش ہوا لیکن تیموری خاندان کو اس سے بھی برا دن دیکھنا تھا، ۱۸۵۷ء میں اسی دیوان میں بہادر شاہ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ جب یہ بدنصیب بادشاہ پیشی کے لیے اس جنت میں لایا جاتا ہوگا تو اس شعر پر ضرور نظر پڑتی ہوگی اور نہ معلوم اس پر کیا گذرتی ہوگی۔

پہلے زمانے کے فرمانروا تخت کو شاندار بنانے کا بہت خیال رکھتے تھے اس کی زینت کے لیے وہ آسمان کے تارے

توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہمنی سلاطین کا تخت فیروزہ اپنے وقت کا سب سے مشہور تخت تھا۔ یہ تاریخی تخت بیدر کے تخت محل میں تھا۔ لیکن مغلوں کے "تخت طاؤس" کی شان اور ہی تھی۔ ایسا جوہر نگار تخت دنیا کے کسی فرمانروا کو شاید ہی نصیب ہوا ہو۔ شاہجہاں نے اس کے لیے قدسی سے کتبہ لکھوایا تھا یہ کتبہ تخت طاؤس کے اندر کی طرف زمرد سے لکھوایا گیا تھا۔ کتبہ طویل ہے، چند اشعار پیش ہیں:۔

زہے فرخندہ، تخت پادشاہی — کہ شد ساماں بتائید الٰہی
فلک روزے کہ می کردش مکمل — زر خورشید را بگداخت اول
بحکم کار فرما صرف شد پاک — بمینا کارِش مینای افلاک
جز ایں تخت از زرد گوہر چہ مقصود — وجود بحر وکاں را حکمت ایں بود
رساند گر فلک خود را بپایش — و بد خورشید و مہ را رونمایش
خراج بحر وکاں پیرایۂ او — پناہ عرش وکرسی سایۂ او
در اطرافش بود گلہائے مینا — فروزاں چوں چراغ طور سینا
شب تار از فروزِ لعل و گوہر — تواند صد فلک را داد اختر
چو تاریخش زباں پرسید از دل — بگفت اورنگ شاہنشاہ عادل

مسلمانوں سے پہلے ہندوستان میں باغوں پر توجہ نہیں دی جاتی تھی، مغلوں کو باغوں سے عشق تھا انھوں نے جگہ جگہ خوبصورت باغ لگوائے اوران کو حوضوں، نہروں، فواروں اور جھرنوں سے آراستہ کیا ان باغوں کے دروازوں بارہ دری اور دوسری عمارتوں پر کتبے بھی تھے، لاہور کے شالامار باغ پر یہ کتبہ نصب کیا گیا تھا۔

چوں شاہجہاں پادشاہ حامی دیں — آراستہ شالامار با طرز متیں
تاریخ بنا ایں از رضواں جستم — گفتا کہ بگو "نمونہ خلد بریں"

شالامار کے پاس شاہجہاں کی بیٹی سلطان جہاں کا باغ تھا۔ اس کا نام گلابی باغ تھا باغ تو اب نہیں رہا مگر اس کا دروازہ قائم ہے جس پر یہ کتبہ چینی کے بیل بوٹوں میں موجود ہے۔

خوشا باغے کہ دارد لالہ داغش — گل و خورشید و مہ زیبد چراغش
ز تقویم خرد پرسید غازی — "گلابی باغ" شد تاریخ باغش

اورنگ زیب کے زمانے میں قلعہ قندھار (دکن) میں کوئی باغ لگوایا تھا اس کا کتبہ ایک برج کی گھونگٹ کی دیوار میں نصب ہے۔ کتبہ کے آخری اشعار یہ ہیں:۔

بدور شاہ عالمگیر غازی — بنا فرمود باغ از اوج تقدیر

زہے باغے کہ از نظارہ او | بگرد سر مگردد نور تحریر
پئی تاریخ او از پیر دانش | بہ پرسیدم بگفت از حسن تقریر
بیفزای ہیچ چوں اندر حسابش | شود تاریخ سالش "رشک کشمیر"

باغ حسام اودگیر (دکن) میں دو کتبے محمد معصوم نامی کے کہے ہوئے ہیں ان میں سے ایک اندھیری محل کی مغربی دیوار میں نصب ہے، دوسرا تعلقداری بیدر میں ہے اور اودگیر کا کتبہ یہ ہے:۔

تواں کردن تمام عمر را مصروف آب و گل
کہ شاید یک دمے صاحب دلے در وے کند منزل

یہ کتبہ "مانڈو" (مالوہ) میں بھی ہے۔ بیدر کا کتبہ:۔

ساختم این خانہ را تا دوستی منزل کند
ورنہ عاقل عمر خود کے صرف آب و گل کند

سرائیں، تالاب، پل، کنوئیں اور باولیاں بھی کتبوں سے خالی نہیں۔ مشہور مورخ خافی خاں کو نظام الملک اول نے اپنے ہاں دیوان کا عہدہ دیا تھا وہ کچھ عرصہ دکن میں رہا، نرساپور کی باولی اسی کی یادگار ہے، کتبہ یہ ہے:۔

چشمۂ شیریں دریں قصبہ نبود | کز زلالش تشنہ را لب تر بود
ساخت خافی خاں چنیں چاہ لطیف | موج آبش جسم را جوہر بود
ہاتفی گفت از پئی تاریخ سال | چشمۂ پاکیزہ از کوثر بود

یلگندل (ضلع کریم نگر) کی باولی میں رای بندرابن کا کتبہ موجود ہے۔ اس کے باپ بھاڑامل کو شاہجہاں کے زمانہ میں 'رای' کا خطاب ملا تھا اور اس کو داراشکوہ کا دیوان مقرر کیا گیا تھا۔ بندرابن اورنگ زیب کے زمانے کا مورخ ہے۔ "لب التواریخ" اس کی مشہور تاریخ ہے، باولی کا کتبہ یہ ہے:۔

در زمان خدیو دریا دل | شاہ اورنگ زیب شاہ زمن
چشمۂ ساخت فی سبیل اللہ | از پئی خلق رای بندرابن
سال تاریخ او ز ہاتف غیب | فیض جاری ندا رسید بمن

حیدرآباد (دکن) میں علیاباد دروازہ کے قریب ایک بہت بڑی باولی ہے، اس پر یہ کتبہ ہے:۔

داد توفیق خالق اکبر | کند سلطاں قلی چہ خوش تر
ساخت مسجد برای عند اللہ | دارد امید شافع محشر
لعنت اللہ بر آں کہ بفروشد | ہر کہ ایں را خود شود کافر

گفت تاریخ چاہ بیت اللہ | نقش 'جوئی چشمۂ کوثر'

دکن میں اور جگہ بھی ایسے کتبے ہیں جن میں اس قسم کی لعنت بھیجی گئی ہے یا بددعا دی گئی ہے۔
نلدرگ (ضلع عثمان آباد) میں پانی محل کے لیے ندی کا جو بند باندھا گیا ہے، اس پر ابراہیم عادل شاہ کے زمانے کا یہ کتبہ موجود ہے:-

از حضرت شاہ دیں پناہ منصور | شہ پیر محمد عادین نامور
در بستن ایں سد بتوفیق الہ | سدی شد چو سد سکندر مشہور
از دیدن ایں چشم محباں روشن | می گردد و چشم دشمناں گرد دکور
از دل کردم سوال و تاریخش گفت | کایں سد بلطف شاہ ماند معمور

بمبئی سے ۵۰ میل جنوب مشرق میں دابل ایک گمنام جگہ ہے، کسی زمانہ میں یہ مقام بہت اہم تھا، اس نے کئی حکومتوں کے انقلاب دیکھے ہیں۔ یہاں ایک شکستہ جامع مسجد کے پاس زمین پر ایک کتبہ نصب ہے۔ یہ ایک شاہی فرمان ہے، جو دونوں زبانوں میں ہے۔ پتھر کے ایک رخ پر فارسی کتبہ ہے اور دوسری طرف اس کا مطلب مرٹھی زبان میں کندہ ہے۔ اس زمانہ میں یہاں یہ رواج تھا کہ کوئی صاحب جائیداد لاولد مرجاتا تو اس کی جائیداد پر حکومت کا قبضہ ہو جاتا تھا اس سے زیادہ تر ہندو روسا، اور جاگیردار متاثر ہوتے تھے۔ سلطان نے اس رسم کو ختم کر دیا۔ اس زمانہ میں شاعری کا زور تھا چنانچہ فرمان بھی ذیل کی نظم میں کندہ کر دیا گیا ہے۔

امیر کبیران ملک شیخ علی | کہ بد نائب دابل از حکم شاہ
چو دیدند مردم کہ دیں پرور است | بعرضش رسانند کز دیر گاہ
ہر آں کس کہ اولاد صلبی ندارد | اگر ہست ہندو و گر دیں پناہ
پس از فوت او ہر چہ ماند متاعش | چہ مال و منال و قبا و کلاہ
ہمہ می گرفتند حکام دابل | ازیں رسم بد عالمی شد تباہ
پذیرا شدہ التماس خلائق | بسی داشتہ پاس خاطر نگاہ
بسر نوبت خویش عبد الرسول | چناں امر کردہ کہ از حکم شاہ
بہ ہندو مسلماں معاف ست لاشک | تصدق بود وارثہ جم سپاہ
کہ ہر کس کہ باشد ز ہر دو فریق | کند گر تخلف بود رو سیاہ
بدیں عہد میثاق و پیماں درست | نوشتند و کردند حق را گواہ

شاہجہاں کی زندگی کے آخری سات سال نظر بندی میں گذرے۔ جب وہ آگرہ کے قلعہ میں بند تھا تو اس کی بیٹی

جہاں آرا اس کے ساتھ رہی اور باپ کے مرتے دم تک اس کی خدمت کرتی رہی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ بیٹی کس کی سونی ہوتی ہے۔ جہاں آرا کی قبر حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں ہے۔ مزار کے سرہانے مرحومہ کا یہ شعر کندہ ہے:-

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

دریا گنج دلی میں ایک مسجد زینت النسا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد اورنگ زیب کی بیٹی زینت النسا بیگم کی ہے اس کے بلند مینار بہت دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں زینت النسا بیگم کی قبر پر یہ کتبہ ہے:-

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است
سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

بابر آگرہ میں مرا اس کی قبر کابل میں ہے۔ جہانگیر نے اس پر کتبہ نصب کرایا جس میں اپنے جد امجد کی اولوالعزمی اور شجاعت کو اس طرح بیان کیا کہ ہے کہ جب وہ اس دنیا میں ملک و دولت واقبال غرض تمام عالم اجسام پر قبضہ کر چکا تو عالم ارواح کو فتح کرنے چلا گیا۔ کتبہ کا کچھ حصہ یہ ہے:-

بادشاہے کز جبینش تافتے نور الہ
آں ظہیر الدین محمدؐ بود بابر بادشاہ
با شکوہ و دولت و اقبال عدل و داد دیں
داشت از توفیق و فیض و فتح و فیروزی سپاہ
عالم اجسام را بگرفت و شد روشن رواں
بہر فتح عالم ارواح چوں نور نگاہ
شد چو فردوسش مکاں رضواں زمن تاریخ جست
گفتمش فردوس دائم جائی بابر بادشاہ

جہانگیر نے انارکلی کے مدفن پر مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ اس میں بہت اعلیٰ قسم کا سنگ مرمر استعمال ہوا تھا۔ جو زمانے کی دست برد کے نذر ہو گیا۔ قدرت بعض وقت بڑی ستم ظریف ہو جاتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے زمانے میں بہت دنوں تک یہ عمارت پروٹسٹنٹ چرچ کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور اس کا نام "سینٹ جیمس چرچ انارکلی" مشہور ہوا۔ مقبرہ پر خود جہانگیر کا شعر کندہ ہے جس کا ایک ایک لفظ محبت اور یاس میں ڈوبا ہوا ہے، کتبہ یہ ہے:-

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را
آہ گر من باز بینم روی یار خویش را

شعر کے نیچے مجنون سلیم اکبر کندہ ہے۔

انسان چاہے اپنے منہ سے نہ کہے مرنا نہیں چاہتا، مگر مرنا ضروری ہے تو پھر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد کچھ دن اور زندہ رہے اس کے لیے وہ بہت کچھ کرتا ہے ایک یہ کہ قبر پر مقبرہ بنواتا ہے چنانچہ بہت سے عالی شان مقبرے مرنے والوں نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرا لیے تھے۔ ان مقبروں پر بے شمار کتبے ہیں۔ ابراہیم کے روضۂ بیجاپور میں کتبوں کو سنگ خارا میں جالی کی طرح تراشا گیا ہے۔ ان مشبک کتبوں کے چند اشعار سنیئے۔

در عجب ماند آسمان از ارتفاع ایں بنا
سر برآوردہ از زمیں گوید مگر چرخے جدا
روضۂ فردوس از ایں روضۂ طراوت بردہ وام
ہر ستونش در لطافت سروے از باغ صفا
ہر تار بخشش صلا دادہ ملک از اوج فلک
یادگار تاج سلطاں ایں بنائے دلفزا

احمد نگر کے قریب ایک مقبرہ نظام شاہوں کے عہد کا ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ما عاشقم کشتہ شدن اعتبار ماست — شمشیر عشق تیز زسنگ مزار ماست
بے زخم تیغ عشق زعالم نمی رویم — بیروں شدن زمعرکہ بے زخم عار ماست
مایا وجود سنگ ملامت سلامتیم — گویا کہ سنگ ہای ملامت حصار ماست
مارا گرفتہ یار سوی دار می کشد — ساقی بیار می کہ دمی گیرودار ماست
چوں کاتبی خوش شیم کہ در روز و خطا بار — عالم معطر از قلم مشکبار ماست

اس کے نیچے کی پٹی پر جو اشعار ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالب خاں کا مقبرہ ہے جو کسی لڑائی میں مارا گیا۔ "خان شہید" سے تاریخ نکلتی ہے۔

بیدر میں احمد شاہ ولی بہمنی کے مقبرہ پر بہت سے اشعار سنہری حروف میں نقش ہیں۔ یہ کلام حضرت نعمت اللہ کرمانی کا ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے مایگی بیان کی گئی ہے لیکن اس موضوع پر جیسے موثر اشعار مقبرہ علی برید میں ہیں ایسے ہندوستان کے کسی مقبرہ پر نہیں یہ رباعیاں شیخ فریدالدین عطار کی ہیں جن کو چینی کے حروف میں لکھا گیا ہے۔ علی برید برید شاہیوں میں سب سے طاقتور سلطان تھا، اس کی آواز اس کی قبر سے سنیئے :-

ای ہم نفساں چوں اجل آمد بسرم — از پائی در افتادم و خوں شد جگرم
دی تازہ گلے بودم اندر چمن باغ — امروز فرو ریخت ہمہ بال و پرم
یاران و عزیزاں بسر خاک من آیند — وز خاک بپرسند نشان و خبرم

گر خاک جہاں جملہ بغربال بہ بیزند ــــ حقا کہ نیابند نشانِ دو اثر من
رفتم بہ جہاں جائی کہ باز آمدنم نیست ــــ ہم نیست امیدم کہ کس آید بسر من
عطار دلے دارم از درد بخون غرق ــــ حقا کہ نیاید دو جہاں در نظر من
دریغا کہ بے ما بسے روزگار ــــ بروید گل و بشگفد نو بہار
کسانے کہ از ما بغیب اندر اند ــــ بیایند و بر خاک ما بگزرند
دامن کشاں کہ می رود امروز بر زمیں ــــ فردا غبار کالبدش بر ہوا رود
خاکت دار استخواں رود ای نفس خیرہ چشم ــــ مانند سرمہ داں کہ در دو توتیا رود
تفرج کناں در ہوا و ہوس ــــ گزشتیم بر خاک بسیار کس
کراماز داں ماندن امید ماند ــــ چو کس را نہ بینی کہ جاوید ماند

اولیائے کرام بادشاہ تو نہیں ہوتے مگر حکومت ان کی بھی ہوتی ہے۔ سلاطین اپنی سطوت اور شوکت سے لوگوں کے دلوں پر سکہ بٹھاتے ہیں اور اولیا اللہ محبت کی میٹھی مار سے دلوں پر قبضہ کرتے ہیں۔ جب کوئی تاجدار ظلم پر اتر آتا تو یہ بے تاج کے بادشاہ اسے ٹوک دیتے تھے اور اس میں وہ اپنی جان پر بھی کھیل جاتے تھے۔ ان کی درگاہوں مقبروں اور خانقاہوں میں بے شمار کتبے ہیں، ان کے نمونے ملاحظہ ہوں۔ بیدر میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی خانقاہ کے دروازے پر یہ اشعار کندہ ہیں:۔

با ما دو سہ دل مباش یک دلہ کن ــــ وز ہر چہ کہ غیر باشد آں را یلہ کن
یک صبح با خلاص بیا بر در من ــــ گر کار تو بر نیاید آنگہ گلہ کن

ناگور (راجپوتانہ) میں خانقاہ تارکین کے دو کتبے ملاحظہ ہوں:۔

نامی بکشا چشم بصیرت در باب ــــ بنیاد زمانہ ہمچو نقشے است بر آب
با تو گویم کہ حاصل دنیا چیست ــــ بیداری یک زماں و باقی ہمہ خواب

ایک دوسرے مزار پر:۔

ای ہر کہ دریں گنبد آباد رسد ــــ گر با دل غمناک و گر شاد رسد
از بہر خداوند تعالیٰ و تقدس ــــ مارا بہ یکے فاتحہ فریاد رسد

حضرت سلطان نظام الدین اولیا نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا بعض ان سے خوش نہیں تھے یہاں تک کہ سلطان غیاث الدین تغلق نے آپ کو دلی چھوڑنے کا حکم دیا۔ ان سلاطین کے مقبرے بے چراغ پڑے ہیں اور حضرت کی درگاہ میں زائرین کا میلہ سالگا رہتا ہے اور بڑی دھوم سے عرس ہوتا ہے۔ اس میں کئی کتبے ہیں مگر داخلہ دروازہ

پر ایک مصرع کندہ ہے جو ایک قطعے کے معنی دیتا ہے اور زائر کے دل پر خاص اثر پیدا کرتا ہے، مصرع یہ ہے :۔
"شاہاں چہ عجب گر بہ نوازند گدا را"

پالتو جانوروں کو دفن کرنے کا رواج بہت پرانا ہے یہاں تک کہ اہرام مصری میں انسانی ممی کے ساتھ کتے بلیوں کی ممیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مختلف مقامات پر کتوں کی قبریں ہیں۔ احمد نگر میں ہاتھی کی قبر ہے۔ یہ وہ ہاتھی تھا جو تالی کوٹ کی جنگ میں لڑا تھا۔ اس نے رام راج کو سونڈ سے اٹھا کر مہاوت کے حوالے کیا تھا۔ چنانچہ ہاتھی اور مہاوت کی قبر پر کتبہ بھی ہے۔ پٹن (ضلع اورنگ آباد) میں گھوڑے کی قبر پر طویل کتبہ ہے، یہ گھوڑا مرزا ایرج کا تھا جو عبدالرحیم خانخاناں کا بیٹا تھا۔ کتبہ نثر میں ہے مگر آج کل کی نظم معرا سے کم نہیں ملاحظہ ہو۔

"در دریای سلطنت و بختیاری، مغز خاندان ابہت و کامگاری کہ ہنوز از گل صد برگ عمر شریفش شانزدہ برگ شگفتہ در ایں مصاف شیر نصرتش خرطوم فیلاں مست شگافتہ و رخش دولتش افسر سروراں بہ نعل شکستہ بتاریخ ۲۰ ر ذی قعدہ ۱۰۱۰ ھ عناں فتح و نصرت در حین مراجعت از جنگ طاغیان جش و دکن کہ از ہفدہ ہزار کم نبودند با چہار ہزار سوار در موضع کھیر کہ بفتح آباد مشہور گردانیدہ بمنزل پٹن نزول اجلال فرمود۔ رخش دلیرش کہ نہنگ خون آشام دریائے مصاف بود و در ایں معرکہ بدستیاری او داد رستمی دادہ بودند بہوائے سبزہ عدن بفردوس خرامید و بجزائے حسن عمل :۔

بایں تشریف کہ در زمانہا کا نقش فی الحجر مذکور است
در زمانہا تیز باقی ماند تحریر فی غرہ شہر ربیع الاول ۱۰۱۰ ھ

جہانگیر بھی عجب طبیعت لایا تھا، ایک دن اجمیر میں بھاٹیا مندر کے پاس سے گذر رہا تھا وہاں ایک چٹان زمین سے ابھری ہوئی دکھائی دی، حکم دیا اس چٹان کو بیٹھے ہوئے ہاتھی کی شکل میں تراش دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور چٹان کا ہاتھی بن گیا۔ اس کے دائیں پہلو پر یہ شعر کندہ ہے :۔

تاریخ فیل سنگ شد از حکمت الہ ایں کوہ پارہ فیل جہانگیر بادشاہ

مہروں اور تلواروں پر عموماً ان کے مالکوں کے نام کندہ ہوتے ہیں لیکن مغلوں نے اس میں بھی جدت دکھائی ہے ابوالفضل نے اکبر کی مہروں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ عدالتی کارروائیوں میں جو مہریں استعمال ہوتی تھیں ان پر یہ شعر کندہ ہے :۔

راستی موجب رضائے خداست کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

شاہجہاں کی تلوار کے قبضے پر شہنشاہ کا نام کندہ تھا مگر وہ بھی شعر کے سانچے میں ڈھل گیا ہے :۔

ہست ایں شمشیر خاص ثانی صاحب قرآن شاہ غازی بادشاہ بحر و بر شاہجہاں

توپیں شکل صورت میں اس قدر بے ڈول سی ہوتی ہیں کہ ان پر اعلیٰ شاعرانہ خیالات کا اظہار ذرا مشکل ہے لیکن شاعر بھونڈی سے بھونڈی چیز میں بھی حسن تلاش کر لیتا ہے۔ چنانچہ توپوں کے کتبے دلچسپی میں دوسروں سے کم نہیں ان کے نام بھی شاعرانہ ہیں جوان پر کندہ ہیں، فتح رہبر، اژدھا پیکر، ملک میداں، دل کھنڈل، فتح لشکر، صف شکن، ظفر پیکر، قلعہ کشا، فتح جنگ، آتش بار وغیرہ ناموں نے ان توپوں کی شکل صورت اور رنگ روپ پر پردہ ڈال دیا ہے قلعہ گولکنڈہ کے پیٹلہ برج پر اورنگ زیب کی مشہور توپ "فتح رہبر" رکھی ہوئی ہے۔ یہ قلعہ کے محاصرہ کے وقت استعمال ہوئی تھی اس پر خط نستعلیق میں یہ رباعی کندہ ہے:۔

تا صراحی خندہ تعلیم از لب دلبر گرفت
آتش جست از دہان او و مجلس در گرفت
می طپد دل بہر وصل امانمی داند کہ سوخت
شعلۂ جانسوز او تا خصم را در بر گرفت

اسی قلعہ میں ایک توپ قلعہ کشا ہے، اس پر یہ شعر ہے:۔

ہر کہ آمد بجہان اہل فنا خواہد بود
آنکہ پاینده و باقی است خدا خواہد بود

بیدر کی ایک توپ کا کتبہ سنیئے:۔

حبذا توپے پر آشوبے کہ از رعد بلند
لرکند گوش فلک را بر کند کوہ از وطن
از پئی خصمان شاہنشہ دین بکشودہ است
تا کند یکبارگی خصمان سر اندر دہن

انگریزوں اور سکھوں کی پہلی لڑائی جو عہد نامہ پر ختم ہوئی اس میں انگریزوں نے ۲۰۰ توپوں پر قبضہ کیا تھا جو کلکتہ بھیج دی گئیں۔ ان میں سے ۲۰ توپوں پر کتبے تھے، ان کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

توپی طالع شاہ رنجیت سنگھ — ہمہ ملک را زیر کردہ چو خنگ
کھڑک سنگھ شہزادہ عالی مکاں — کہ دانای کوراں بود ماد راں
فتح جنگ شد در زمانے تیار — کہ ہفدہ صد و بود ہشتاد و چار
جمعدار ایں توپ شد رای سنگھ — کہ درجاں فشانی است او بے درنگ

سمت ۱۸۸۴

ایک توپ پر یہ شعر ہے :-

چو اژدرھا بجان و دل بسے داغ کہن دارم
حذر کن اے رقیب از من کہ آتش در دہن دارم

قطعہ: ہست ایں توپ مصر بیلی رام — با نقش گفت فتح و نصرت نام
خرب آتش فشاں و برق شرار — صبح اعدا ز دود او چوں شام

ایک اور توپ کا کتبہ :-

ہست ایں توپ اژدھائے دہاں — از دم خود شرار برق فشاں
بیک آواز خود کند ناگاہ — بخت دشمن چو دود خویش سیاہ
در عہد بادشاہ رنجیت سنگھ — عل رائے سنگھ توپ ساز
سمت ۱۸۰۰

ہندوستان میں ہزاروں حکمراں گذرے ہیں، ان کے مختلف سکوں کی تعداد کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان سکوں پر انسان، چرند، پرند، درخت، پھل، پھول، سانپ، بچھو، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، دیوی، دیوتا، غرض دنیا بھر کی چیزیں نقش ہیں۔ مغل فرمانرواؤں نے اس میں بھی اپج سے کام لیا اور اپنی اشرفیوں پر اشعار نقش کرائے۔ سکوں پر اشعار دنیائے مسکوکات میں ایک جدت تھی، جس کو مغل بادشاہ اخیر دم تک نبھاتے رہے۔ شعر کے دونوں حصے ایک رخ پر نقش ہوتے تھے اور دوسری طرف بادشاہ کا نام اور سنہ وغیرہ ثبت ہوتا تھا۔ سکہ کے ایک رخ پر پورا شعر جلی خط میں نقش ہوتا تھا۔ فارسی رسم الخط کی کرامت تھی، یہ صلاحیت اسی میں ہے کہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ مضمون آسکتا ہے۔ جہانگیر کی چند اشرفیوں کے اشعار سنیئے :-

روی زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

قضا بر سکۂ زر کرد تصویر — شبیہ حضرت شاہ جہانگیر
جہاں فرد ز باجیر گشت سکہ زر — ہنورم نام جہانگیر شاہ اکبر
حروف جہانگیر و اللہ اکبر — ز روز ازل در عدد شد برابر ۲۸۹

اس شہنشاہ نے ایک اشرفی پر اپنے نام کے ساتھ نورجہاں کا نام بھی نقش کرایا تھا۔ شعر میں یہ مضمون باندھا گیا ہے کہ نورجہاں کے نام سے سونے کی قیمت سو گنا ہو گئی ہے، شعر یہ ہے:-

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور — بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

اکبر نے الہ آباد کا قلعہ بنوایا اور اسی دار الضرب سے اشرفی جاری کی اس پر یہ شعر تھا:۔

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد　　بشرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

اس پر کسی بادشاہ کا نام موجود نہیں ہے۔ بعض ماہرین مسکوکات کا خیال ہے کہ جہانگیر نے اپنی بغاوت کے زمانے میں یہ اشرفی جاری کی تھی۔

مغل فرمانروا جب کسی مہم پر جاتے تھے تو ان کے لشکر کے ساتھ دار الضرب بھی ہوتا تھا، جب وہ کسی مقام کو فتح کرتے تو وہیں سے اپنے نام کا سکہ جاری کرتے تھے اس دار الضرب کا نام "اردو" تھا۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کا سکہ بھی چل چکا ہے اور اب تک اس کا نام سکوں پر موجود ہے۔ اردو کا ایک شعر سنیئے:۔

باد رواں تا کہ بود مہر و ماہ
سکۂ "اردوئے" جہانگیر شاہ

گجرات اور دکن کے سلاطین کے سکوں پر بھی کہیں کہیں اشعار نظر آتے ہیں۔ قطب شاہیوں کے ابتدائی دور میں سلاطین بہمنی کے سکے جاری تھے اور بیجانگر کے ہن بھی چلتے تھے۔ چنانچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے سکہ پر ایک شعر موجود ہے جس میں جعلی سکہ بنانے والے پر لعنت بھیجی گئی ہے۔ شعر یہ ہے:۔

تغیر دہ فلوس شاہی　　پیوستہ بہ لعنت الٰہی

سلطان محمد عادل شاہ کے ایک سکہ پر یہ شعر نقش ہے:۔

جہاں ازیں دو محمد گرفت زینت و جاہ
یکے محمد مرشد دوم محمد شاہ

ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اس مضمون کی تیاری میں یوں تو اور کتابوں سے بھی کتبات لیے گئے ہیں مگر زیادہ تر مواد "اپی گرافیا انڈو مسلمکا" سے لیا گیا ہے۔ یہ جرنل حکومت ہند کی جانب سے شائع ہوتا تھا اس میں اسلامی کتبات چھپتے تھے۔ کوئی ۲۰ سال تک یہ رسالہ ڈاکٹر غلام یزدانی او، بی، ای کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ آپ کی .. سبکدوشی کے بعد تیرہ سال کے عرصہ میں "اپی گرافیا انڈو مسلمکا" کا صرف ایک نمبر پچھلے سال نکلا ہے اس میں حکومت کی جانب سے یہ اعلان ہے کہ آئندہ سے یہ رسالہ علاحدہ شائع نہیں ہوگا بلکہ اپی گرافیا انڈکا" کے ضمیمہ کے طور پر چھپا کرے گا۔ (اردو مجلس میں پڑھا گیا)

شاہد صدیقی

حیات مشکل آساں نہیں تو کچھ بھی نہیں
اگر یہ درد ہی درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

فضائے یاس میں ناکامیوں کی ظلمت میں
چراغِ شوق فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مری نگاہ کہ ہے اُس نظر سے وابستہ
حریفِ گردشِ دوراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

چلی ہے لے کے دوانوں کو جستجوئے بہار
قدم قدم پہ گلستاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ زندگی جو محبت میں لازوال ہوئی!
اجل سے دست و گریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کوئی فسانہ ہو یا مثنوی و نظم و غزل
حدیثِ عظمتِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سلیمان ادیب

مئے کی جتنی عظمت ہے اس سے کم سمجھتے ہیں
جامِ مئے کو دیوانے جامِ جم سمجھتے ہیں

زندگی کی راہوں میں گو بھٹک گئے لیکن
تیری زلف کے مارے پیچ و خم سمجھتے ہیں

اپنے غم کا افسانہ میں سُنا کے پچھتایا!
میرے غم کو اہلِ دل اپنا غم سمجھتے ہیں

دوستی کے پردے میں دشمنی بھی دیکھی ہے
کون کتنا مخلص ہے یہ بھی ہم سمجھتے ہیں

بات اپنے مطلب کی جب کوئی نہیں کرتا
تم بھی کم سمجھتے ہو ہم بھی کم سمجھتے ہیں

ایک بار کی شہرت ساری عمر چلتی ہے
میں پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں

سلام مچھلی شہری

سلسلۂ آفتاب

(حضرت امیر خسروؔ کی بارگاہ میں عقیدت کے کچھ پھول)

زمیں پر اگر دیوتا کچھ نہ ہوتے تو انسان شاید پریشاں ہی رہتا
نظارے تو ہوتے بہاریں تو ہوتیں مگر گلشنِ فکر ویراں ہی رہتا
حقیقت کا مفہوم واضح نہ ہوتا اگر دل نشیں کلپنائیں نہ ہوتیں
کوئی خاص منظر نکھر ہی نہ پاتا جو اس کے لیے کچھ فضائیں نہ ہوتیں
حقیقت کی ان ضو فشاں منزلوں میں حسیں خواب مسکرانے لگے ہیں
بزرگوں نے جو دیپ روشن کیے تھے وہی دیپ پھر جگمگانے لگے ہیں
کلا اور سنگیت کے دیپ پھر سے مقدّس فضاؤں میں جلنے لگے ہیں
زہے عہدِ حاضر کہ حافظؔ کے بربط پہ میراؔ کے نغمے مچلنے لگے ہیں
مبارک کہ وادیٔ گنگ و جمن میں کلا کو نئی زندگی مل رہی ہے
مبارک کہ پھر "طوطیٔ ہند خسروؔ" کے افکار کی روشنی مل رہی ہے
نئی روشنی میں نئے تاج محلوں میں، اجنتاؤں کا جنم ہونے لگا ہے
ہمارے "کلامندروں" سے قریب آج روٹھا ہوا دھرم ہونے لگا ہے
ملی ہے ضیا بارِ تعبیر جس کی وہی خواب پہلے بھی دیکھا گیا تھا
مبارک وطن کی سحر کہہ رہی ہے کہ یہ آفتابوں کا اک سلسلہ تھا!!

(ادارۂ نظامیہ" دہلی میں ۱۹ رمئی، ۷۵ کو یوم خسروؔ کے موقع پر پڑھی گئی)

خورشید احمد جامی

ہزیمت

مرے غم کا مداوا ہے یہی سمجھا تھا
تجھ کو پاکر مری تقدیر سنور جائے گی
تیرے عارض کی سحر خواب تمنا بن کر
مری دنیائے محبت میں نکھر جائے گی
زلف نکہت کی فضاؤں میں جواں بانہوں میں
زندگی دور سے آئی ہے ٹھہر جائے گی

تجھ کو پاکر بھی ہوں بیگانۂ آرام و سکوں
درد دل بجھ نہ سکا چاکِ جگر سل نہ سکا
تیرے آغوش کی مہکی ہوئی تنہائی میں
شوقِ افسردہ مسرت سے گلے مل نہ سکا
مسکراہٹ کے کنول ہیں ترے لب پر لیکن
غنچۂ خاطرِ ناشاد مرا کھل نہ سکا

جب بھی چاہا کہ ترے پیار میں اے جانِ وفا
اپنی امید کو فردوس بداماں کرلوں
تیرے رخسار شفق رنگ کی شامیں لے کر
اپنے ارمانوں کی تسکین کا ساماں کرلوں
ترے الطاف مسلسل کی ضیا پاشی میں
اپنی خوشیوں کے خد و خال فروزاں کرلوں

جب بھی چاہا تو ہوا یہ کہ نہ جانے کیونکر
یک بہ یک ہاتھ سے دامانِ طرب چھوٹ گیا
میری ہر ایک تمنا مری ہر اک خواہش
پاس آکر مرے چپکے سے کوئی لوٹ گیا
جاگ اٹھے مرے انفاس میں کتنے ہی شرار
اور اس عشرتِ حاصل کا فسوں ٹوٹ گیا

دیکھتا یہ ہوں کہ احساس کے آئینے میں
عکس ماحول کے چہرے کا ابھر آیا ہے
زخمیٔ گردشِ دوراں ہے امنگوں کا شباب
گردِ آلام نے ہر نقش کو دھندلایا ہے
جیسے تاریک و شکستہ سی عمارت کے قریب
ملگجی صبح نے آنچل کوئی لہرایا ہے

فراق گورکھپوری

خط اور دو غزلہ

مئی کا "صبا" ملا۔ اس میں اثرؔ لکھنوی نے میری غزل کا جواب لکھا ہے اور میری غزل پر تنقید بھی فرمائی ہے۔
جس شخص کی ایک غزل ایک شعر ایک مصرعہ ایک رباعی ایک نظم ایک نثر کا فقرہ کسی کو متاثر نہیں کر سکا ایسا کس ۹۰ برس ادیب کرے تو کیا کرے۔ بقول شخصے جب یہ حضرت اثرؔ اپنا کلام سنانا شروع کرتے ہیں تو کنوئیں میں سچا ندنے کو جی چاہتا ہے۔ جعفر علی خاں آثرؔ لکھنوی کے کلام میں نہ تو کہیں جوشِ بیان ہے، نہ زورِ کلام ہے، نہ کہیں نرمی اور نہ گھلاوٹ ہے، نہ آنسوؤں کی تھرتھراہٹ ہے، نہ نشاط کی مسکراہٹ، نہ رنگینی، نہ شگفتگی نہ غنائی عناصر، نہ احساسِ لامحدود نہ رمزیت، نہ فضا آفرینی، نہ خیر و برکت کے عناصر، نہ آفاقی ادب کی آوازِ بازگشت، لہجے میں تہہ داری، نہ سپردگی، اس کلام بے روح میں نہ نفسیاتی نکات، نہ حیرت و استعجاب، نہ انفرادیت، نہ طہارت، نہ بلندی، نہ گہرائی، نہ ہمہ گیری، نہ سوز و گداز و تاثیر، نہ نادر و نازک تشبیہیں و استعارے، نہ جادو بیانی، نہ تالیفِ قلب کا کوئی سامان، نہ اظہارِ شخصیت، نہ وجد آفرینی نہ نمک نہ حلاوت نہ دل گرفتگی، نہ جاذبیت، نہ حسنِ تعبیر، نہ لہجے کی بے اختیاری نہ وہ ملکوتی صفات جن سے انسان کے کلام پر الہام کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نہ چوٹ کھایا ہوا دل، نہ معصومی، نہ سادگی نہ پُرکاری، نہ کچھ۔ البتہ اشعار تقطیع سے نہیں گرتے بقول ڈاکٹر تاثیرؔ مرحوم۔ اتنی مدقوق شاعری کسی قابلِ ذکر شاعر نے کی ہی نہیں۔ کمزوری، نقاہت، بے رنگی، بے کیفی، سونا پن..... بنارٹ، ایک بے جان گھٹن، سڑاین اس شاعری کے طرہ ہائے امتیاز ہیں۔
امام غزل میرؔ کی غزل پر ایک دو غزلہ حاضر کر رہا ہوں جسے پڑھ کر میاں اثرؔ لکھنوی پھڑک تو کیا اٹھیں گے بھڑک ضرور اٹھیں گے۔ یہ بے چارے اپنی جنم سے مردہ STILL BORN شاعری کو اسی طرح کلیجے لگائے پھر رہے ہیں جیسے بندریا اپنے مردہ بچے کو سینے سے اس وقت تک لگائے پھرتی ہے جب تک بدبو سے تنگ آ کر اسے پھینک دینے پر نہ مجبور ہو جائے۔
میں نے ایک واقعہ مجازؔ و جوشؔ ملیح آبادی کے منہ سے اثرؔ کے متعلق سن کر بغیر ان کا (اثرؔ کا) نام بتائے ہوئے شائع کر دیا تھا۔ اسی وقت سے اور پھر اپنی فطری کم بینی سے مجبور ہو کر اثرؔ لکھنوی بغیر کوئی ٹکٹ لگائے FREE FOR ALL وہ کرتب دکھا رہے ہیں کہ ادب کے سرکس کے وہ PRIZE CLOWN یعنی انتہائی مضحکہ خیز اکٹر بن گئے ہیں۔ خواجہ آتشؔ کا یہ شعر جھلا رکھا ہے ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

ایک شعر اثر لکھنوی کی غزل کے متعلق عرض کیا ہے — سنیے:-

پھیکی غزلوں پہ جو چھیڑا تو کہا جھنجھلا کر
تم بڑے وہ ہو تمھیں مار کے ٹکڑے کر دیں

اطمینان رکھیے ابھی وہ مہینوں تک اپنے کرتب دکھاتے جائیں گے اور میری طرف سے داد و اداکاری بھی پاتے جائیں گے۔ "مارے گجن کے مری جائیں حسن تنکوا ہیں" آپ سے ملیے آپ ہیں جناب اثر لکھنوی۔

میر کی غزل پر دو غزلہ آپ کا فراق — فراق

میر

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں[1]

تیغ دریغ نہیں ہے اس کی بسمل گہ میں کسو سے بھی
ہیں تو شکار لاغر ہم پر ایک امید پر آئے ہیں

خم سے لگی میخانے کے دیوار بھی اپنے گھر کی ہے
لطف پیر مغاں سے عجب کیا ہم آخر ہمسائے ہیں

شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہیے
اچھے اپنے جی کو ہم نے آپ ہی روگ لگائے ہیں

محو سخن ہم فکر سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں
آپ کو جب کھویا ہے ہم نے تب یہ گوہر پائے ہیں

دیکھیں طرف ہے کون سی جس سے تیغ ناز بلند کرے
ہم نے بھی تو اس ہی جہت سے فرق نیاز جھکائے ہیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

کس کو ایسی بے خبری تھی جس کے بولے تو چونکا
سو ٹھوکر نے ان پلکوں کی کتنے فتنے جگائے ہیں

کون وہ ایسا ظالم تھا استاد فن عیاری کا
اتنے سن میں جس نے تجکو ایسے فریب سکھائے ہیں

میر مقدس آدمی ہیں تھے سجہ بکف سے خانے میں
صبح جو ہم بھی جانکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

فراق

۱

ہم ہیں کہاں کے رہنے والے اور کہاں سے آئے ہیں
کس رخ سے قربت ہے ہمیں کن زلفوں کے ہمسائے ہیں

ایک عظیم "اب" ہے کہ اسی کی پرچھائیں وقت گزراں
ماضی و حال و مستقبل سب چلتے پھرتے سائے ہیں[2]

---

[1] میر نے بعد کے اشعار میں ہائے مخلوط کی قید قوافی میں نہیں رکھی۔ فراق

[2] نہ کوئی ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل، صرف ایک عظیم اب (ONE GREAT NOW) ہے۔ افلاطون

رنج و غم یاس و حرماں کیف و مستی امید و نشاط
رنگا رنگ ترے جلوے میرے لیے کیا کیا لائے ہیں

دل کی تمنا بر آنا بھی اک نازک طنز پنہاں
چشم کرم ہوتے ہی کسی کی ہم کیا کیا شرمائے ہیں

یہ طفلی و شباب و پیری یاد رہے گی عالم کو
اتنی چھوٹی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ رچائے ہیں

منزل و مقصد دو تو نہیں ہیں حسن و عشق کی دنیا میں
تم بھی سوئے دل آؤ ہم بھی آئے آئے ہیں

کار عظیم اہل فن کا ہے تہذیب وجداں و شعور
اہل عمل زور بازو سے یہ تو نہیں کر پائے ہیں

سلہ بادل گرجا بجلی چمکی کوئل بولی پھول کھلے
ہم سر گلشن اس موسم میں ساماں سامان لائے ہیں

بھینی بھینی بو آتی ہے آگئی فصل بہاری کیا
ڈالی ڈالی نور میں غنچے کچھ کچھ رنگ بھی لائے ہیں

ان کی پنکھڑیوں پر قرباں آٹھ جنتوں کے گلزار
آج تو اس کے لب رنگیں نے وہ گل تر برسائے ہیں

نور سحر نے چوم کے وہ رخ اپنی قسمت چمکائی
موج صبا نے چھو کے وہ گیسو اف کیا کیا بل کھائے ہیں

سلہ میاں اثر نے رنگ میر میں کہہ کر کیا کیا جھک مارا
ہم بھی رنگ میر میں دیکھو کیسی غزل کہہ لائے ہیں

پارۂ ابر سیہ تھے اک دن دیکھیں نہ دیکھیں جس کو فراق
ملک سخن پر اک مدت سے اب تو ہمیں ہم چھائے ہیں

(۲)

میری غزل میں جوش بیاں کے وہ دریا لہرائے ہیں
جعفر علی اثر نے جن میں کیا کیا غوطے کھائے ہیں

روز و شب دونو تھے جلو میں جب وہ ادھر کو آئے ہیں
پرچم مہر و ماہ کہکشاں ساتھ ساتھ لہرائے ہیں

رات تو اس کی آمد آمد ڈھا گئی ہلچل پیر ہل چل
مثل شعلۂ شمع انجمن اہل بزم تھرائے ہیں

انتظار تقدیر بشر ہے سعی قرب تدبیر بشر
آؤ نہ آؤ آپ میں ہم تو اک مدت سے آئے ہیں

ہم پہ ان آنکھوں کی بجلی گرتی رہی ہے۔ گردش چرخ
ہم کو کیا تڑپائے گی ہم تڑپے تڑپائے ہیں

ماتم خانۂ عشق میں سن لے اپنے جور و ستم کا ذکر
رندھی رندھی آوازیں ہیں سب کے لہجے بھرآئے ہیں

ایک پیام آزادی ہے پیچ و تاب اسیری بھی
زلف سیاہ کی قید میں ناحق ہم کیا کیا گھبرائے ہیں

دیکھ ہماری شعلہ نوائی ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے جن میں
ان راتوں کو دل ظلمت میں ہم نے چراغ جلائے ہیں

دیکھ کے جن کو غیب کی آنکھیں جھپک جھپک سی جاتی تھیں
ساقی ہم نے تیری بدولت وہ ساغر چھلکائے ہیں

کس سے ملیے کس سے نہ ملیے اجنبیوں کی دنیا میں
آہ پرائے بھی تو ہیں اپنے۔ اپنے بھی تو پرائے ہیں

سلہ صفی لکھنوی کا مصرعہ ہے ۔ فراق
سلہ جعفر علی خاں اثر لکھنوی جن کا ایک مصرعہ بھی کسی کی زبان پر نہیں چڑھ سکا۔ اس مقبولیت کے کیا کہنے ۔ فراق

کیوں باہم بیگانہ رہیں کچھ ہم وطنی کا پاس کریں — تم جس دیس سے آئے ہو ہم بھی تو وہیں سے آئے ہیں[۱]
میرے لب و لہجہ کو بھی دیکھیں یوں تو حریفوں نے بھی اکثر — جورِ ستم بیداد و تغافل کس کس کے گُن گائے ہیں
سن سن کر سر دھنتی رہیں گی آنے والی نسلیں بھی — آج میرے اشعارِ غزل فردا کو وجد میں لائے ہیں
ہیں ارمانِ عشق باشندے آنکھ اوجھل دنیاؤں کے — اے دلِ زار یہ تیرے یہاں دور دور سے آئے ہیں
گزروگے جو ہماری خاک سے طرفہ چراغاں دیکھوگے — زیرِ زمیں بھی لپک جاتے ہیں زخم وہ دل پر کھائے ہیں

ایسی بھی کیا غم کی بے خبری آنکھیں تو کھولو فراق ذرا
بڑی منتوں سے ہم اس کو گھیرے گھیرے لائے ہیں

---

۱ وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں (میر)

برق موسوی

دامن کو ذرا دیکھ....

حضرت جعفر علی خاں اثر لکھنوی کہنہ مشق شاعر بھی ہیں، سخن فہم بھی اور نقاد بھی، آپ کی شاعری کی عمر ہمارے اکثر شعرا کی عمروں سے زیادہ ہے۔ آپ نے بڑے معرکہ کی غزلیں کہی ہیں اور کٹر سے کٹر نقادوں سے دادِ تحسین حاصل کی ہے۔

ہر شاعر اور فنکار میں ہزاروں خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض شعرا میں "حفظِ ذات" سے ہٹ کر ایک غلط قسم کی انفرادیت، جس کو انفرادیت سے زیادہ انانیت یا بالفاظِ دیگر "ہمچو دیگری نیست" کا جذبہ یا خبط کہنا چاہیئے — پیدا ہو جاتا ہے۔

" خطائے بزرگاں گرفتن، خطا ست " سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن اعتراض کی نیت سے نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ آدابِ بزرگاں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، دبی زبان اور شکوہ کے انداز میں اگر میں یہ کہوں تو شاید "خطا" نہ سمجھی جائے گی کہ حضرت فراق گورکھپوری کے تعلق سے حضرتِ اثر نے غلط قسم کے " ہمچو ما دیگری نیست " کے جذبہ کا مظاہرہ کیا ہے — مجھے حضرت اثر کی وسیع القلبی اور عالی ظرفی سے توقع ہے کہ وہ خود بھی میری اس صاف گوئی پر برا نہ مانیں گے تاکہ مجھے دبی زبان سے یہ کہنے کا موقع نہ ملے ؎ عارف کہ بر بحد، تنک آب ست ہنوز

اس مضمون سے میرا مقصد نہ تو حضرت فراق کی صفائی ہے اور نہ حضرت اثر کی تردید۔ بلکہ کامل غیر جانبداری اور احتسابِ نفس کے ساتھ " ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں " کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ؎

ایں گناہ ایست کہ در شہر شما نیز کنند

جہاں حضرت فراق سے سہو ہوا ہے، وہیں حضرتِ اثر بھی سہو اور خطا سے نہیں بچ سکے ہیں۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ شاعر بھی انسان ہے۔ اس سے غلطی کا سرزد ہونا یقینی ہے غالب، انیس، حافظ اور سعدی بھی سہو سے نہیں بچ سکے۔ چونکہ سہو و نسیاں تقاضائے بشری ہے۔ اس لیے ایسی لغزشیں معاف کر دی جانے کے قابل ہیں — لیکن جہاں سہو کی تکرار اور غلطی پر اصرار ہو، اور ساتھ ہی چیلنج اور یہ دعوی بھی کہ میرا کلام " اغلاط و ہفوات کا پشتارہ نہیں — تو ایسا دعوی کرنے والا کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت اثر نے " صبا " کے تازہ شمارے میں " چھیڑ خوباں سے " کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے:

"رسالہ 'صبا' حیدرآباد دکن کے شمارہ (۴)، جلد (۴)، ۵۹ء میں حضرت فراقؔ گورکھپوری کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

قلم کا زور تنقیدوں میں ناحق صرف کرتے ہیں   غزل اک ایسی کہہ لائیں حریفوں میں اگر دم ہو

ان کا مخاطب صحیح میں ہی ہوں کیونکہ تنقیدی مضامین میں ان کی شاعری کا پول کھولتا رہتا ہوں ان کے چیلنج کے جواب میں میں نے غزل کہہ دی، مگر یہ اعتراف ہے کہ ان کی ایسی نہیں، کیونکہ اغلاط و ہفوات کا پشتارہ نہ بنا سکا۔ اس طرف توجہ دلانے کو الگ ایک مضمون لکھ دیا ہے۔ اب اگر فراقؔ صاحب میں دم ہو تو میری غزل کا جائزہ لے کر اس کی خامیاں اور کمزوریاں دکھائیں اور ان کی غزل پر میں نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کو رد کریں۔ ہیں گو دہیں میداں ـــ"

اس موقع پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت آثرؔ کا یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کانچ کے مکان میں رہنے والا دوسرے کانچ کے مکان والے پر پتھر پھینک مارے ـــ حضرت آثرؔ نے اپنی جو غزل جائزہ کے لیے پیش فرمائی ہے اس کو پڑھنے کے بعد اس کہاوت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ "دوسروں کی آنکھ کا شہتیر دیکھنے والوں کو اکثر اپنی آنکھ کے تنکے سجھائی نہیں دیتے" کہنے کو تو حضرت آثرؔ نے اس غزل میں "بہت زور مارا" ہے۔ لیکن "نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب" والی بات ہے۔ اٹھارہ شعر کی اس غزل کے اشعار ؎

سب کے سب ہیں نظری ایک پہ بھی صاد نہیں

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس غزل میں نہ صرف خامیاں اور کمزوریاں ہیں بلکہ فاش لفظی و معنوی غلطیاں بھی۔ مثلاً زیر بحث غزل کا یہ شعر ؎

کہیں تقلید میں بھی خوبیٔ تخلیق ہوتی ہے
حریفِ زلفِ محبوباں بھلا کیا "زلف پرچم" ہو

"زلف پرچم" پر حضرت آثرؔ نے فٹ نوٹ تحریر فرمایا ہے :۔

"زلف پرچم۔ علم کا پھریرا۔ صرف فراقؔ صاحب کی آگاہی کے لیے لکھتا ہوں کہ شاید ان کے مبلغ علم سے باہر ہو"

یہ فراقؔ صاحب کو آگاہ کرنے کی بھی ایک رہی جب کہ آپ خود اس لفظ کی حقیقت سے آگاہ نہیں ـــ "پرچم" کے اصل معنے خود "پھریرے" کے اور مجازاً زلف کے ہیں۔ اس لیے "زلف پرچم" کہنا ایسا ہی ہے جیسے "شب برات کی رات" اس وقت میرے سامنے بڑی بڑی لغتیں نہیں ہیں اور یوں بھی پرچم جیسے لفظ کی تحقیق کے لیے لغت دیکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ بقول خاقانی ؎   نیست مدّاح تو محتاج صراح و قاموس

تاہم حضرت آثرؔ کو مطمئن کرنے کے لیے اردو، فارسی کے جو لغات اس وقت میرے سامنے ہیں ان کا حوالہ دینا ضروری

سمجھتا ہوں۔

۱۔ غیاث اللغات ۔ فارسی ۔ نولکشور ۔ صفحہ (۱۰۳) "پرچم" بالفتح و جیم فارسی نیز مفتوح ۔ چیزی ست کہ از ابریشم سیاہ طیار ساختہ بر سر علم بندند و بمجاز موئی گاؤ کوہی را نیز می گفتہ باشند۔
سراج اللغات و در برہان و لطایف نوشتہ کہ بمعنی دُم گاؤ کوہی ست و بمجاز بمعنی زلف و کاکل نیز می آید۔
۲۔ فیروز اللغات ۔ اردو چھٹا ایڈیشن ۔ مطبوعہ امرتسر ۔ صفحہ (۳۰۷)، پرچم ۔ فارسی ۔ مذکر ۔ پھریرا ۔ کپڑا جو جھنڈے پر باندھا جاتا ہے ۔ (۲) زلف کاکل ۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت اثر نے "زلف علم" کے قیاس پر "زلف پرچم" بنالیا جس پر "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" کی مثال صادق آتی ہے۔ "زلف علم" صحیح ترکیب ہے۔ جیسا کہ عرفی نے کہا ہے ؎

نریں باد پریشاں بکنم زلف علم را

لیکن اس قیاس پر "زلف پرچم" مہمل محض ۔ اس کے قطع نظر غالب کے اس شعر سے بھی واضح ہوگا کہ "پرچم" الگ چیز ہے اور "علم" الگ ؎

بادا علمت کہ بخرامندۂ و گردوں
چوں بیضہ ز پرچم تہ پر باد علم را

پرچم پھریرا ہے اور علم وہ نیزہ ہے جس پر پھریرا لگایا جاتا ہے۔
یہ تو لفظی بحث تھی ۔ آئیے اب حضرت اثر کے اس شعر کو معنوی اعتبار سے جانچیں! ؎

کہیں تقلید میں بھی خوبیٔ تخلیق ہوتی ہے

تقلید میں تخلیق کی خوبی نہیں ہوتی ـــ لیکن یہ نظریہ غلط ہے ـــ بقول افلاطون ـــ انسان خصوصاً شاعر فطرت کا نقال ہے وہ فطرت کی نقل اتارتا ہے ۔ لیکن نقل کو اصل فطرت (تخلیق) سے کہیں زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ حیات کے کسی شعبہ میں دیکھیے ۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ تقلید بیشتر تخلیق سے زیادہ مکمل اور بے عیب ہوا کرتی ہے ۔ مثال کے طور پر غبارہ کو لیجئے ۔ فضا میں پرواز کرنے کے سلسلے میں اولین تخلیق تھی ۔ اب موجودہ زمانہ کے طیارہ کو دیکھئے جو غبارہ کو دیکھ کر اس کی تقلید میں بنایا گیا ہے ۔ غور کیجئے خوبی غبارہ میں تھی یا موجودہ طیارے میں ہے! غبارہ اگر "خوب" تھا تو طیارہ "خوب تر" ہے ۔ نقش ثانی ہمیشہ نقش اول سے بہتر ہی ہوا کرتا ہے ـــ ارتقا کے سوتے خشک نہیں ہوئے ۔ دنیا برابر آگے بڑھ رہی ہے ۔ ہر تخلیق ایک نامکمل اور دھندلا خاکہ ہوتا ہے جس کو بعد کے آنے والے مکمل کرتے ہیں اس میں رنگ بھرتے ہیں ۔ ہر تخلیق اور ساری کائنات ابھی نامکمل ہے بقول اقبال ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یہ جداگانہ بحث ہے کہ تخلیق کی یہ ناتمامی ہی، ذاتِ تمام کا پتہ دیتی ہے۔ تخلیق کو "اولیت" حاصل ہے۔ لیکن "اکملیت" نہیں۔ تقلید کو اولیت حاصل نہیں لیکن اکملیت ضرور حاصل ہے۔ دنیا میں کوئی تخلیق مکمل نہیں بہت کم خیالات ایسے ہیں جن کو تخلیقی یا ORIGINAL کہا جا سکے۔ عموماً خیال سے خیال پیدا ہوتا ہے دیئے سے دیا جلتا ہے۔ انسان تقلید پر مجبور ہے وہ دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرتا ہے پھر اپنے تجربات اس پر مستزاد کرتا ہے۔

تقلید میں تخلیق کی خوبی ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کو شعر و ادب میں جانچ لیجئے! رودکی نے شاہنامہ کے ابتدائی چند سو شعر کہے تھے۔ یا بالفاظ دیگر شاہنامہ کی تخلیق کی تھی۔ فردوسی نے رودکی کی تقلید میں شاہنامہ کی تکمیل کی۔ اب بتائیے رودکی کی تخلیق میں خوبی ہے یا فردوسی کی تقلید و تکمیل میں! اردو زبان میں بقول بعضے قطب شاہ نے مرثیہ کی تخلیق کی۔ انیس نے اس ابتدائی تخلیق کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔ اب بتائیے قطب شاہ کی تخلیق میں خوبی ہے یا انیس کی تقلید و تکمیل میں۔ امیر خسرو نے اس خیال کی تخلیق کی تھی ؎

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند
آں روئے ہا کہ در تہ گرد فنا شدند

دیکھئے غالب نے تخلیق کے اس ابتدائی خاکہ میں رنگ بھر کر اس کی خوبی کو کس طرح دوبالا کر دیا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سعدی کے اس ابتدائی خیال کو ؎

اند ورطۂ ما خبر ندارد
آسودہ کہ بر کنار دریاست

حافظ نے کس طرح مکمل کر کے تقلید کو تخلیق سے بڑھا دیا ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابی چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

تخلیق اک حسنِ طبع ہے۔ اور تقلید جو جدت اور تکمیل کے مقاصد لیے ہوئے ہوتی ہے، اس حسنِ طبع پر اضافہ کر کے اس کو نکھارتی ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ بر حسنِ طبع دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

مندرجۂ بالا مثالوں سے یہ ظاہر ہوا کہ ایک شاعر ایک آرٹسٹ جو فطرت کا نقال ہوتا ہے وہ نقل کو اصل فطرت اور تخلیق سے کہیں زیادہ حسین بنا دیتا ہے۔ تخلیق کی خامیوں کو دور کرتا ہے۔ بشرطیکہ وہ نرا نقال نہ ہو بلکہ اس میں جدت اور تکمیل کا جوہر ہو۔ ان مسلمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر حضرت اثر کے اس مصرعہ کو ؎

کہیں تقلید میں بھی خوبیٔ تخلیق ہوتی ہے

یوں پڑھا جائے ؎

کہیں تقلید میں بھی "خامیٔ" تخلیق ہوتی ہے

تو میں سمجھتا ہوں کہ بدیہات کے عین مطابق ہوگا۔
حضرت اثر کا دوسرا شعر ؎

یہی منشا ہے پاکی کا، یہی جوہر ہے پاکی کا
مثال آہوئے رم دیدہ اپنے سایہ سے رم ہو

"آہوئے رم دیدہ" جی ہاں! "خشکہ پاگندہ بہرو زہ"۔ آہوئے رمیدہ۔ آہوئے صیاد دیدہ۔ آہوئے رم خوردہ۔ آہوئے رم زدہ۔ یہ تمام ترکیبیں اساتذہ کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ جیسے غالب ؎

میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
مجھ سے مانوس ہوئے میرے پریدہ طوطی
رام ہو جا کبھی اے میرے رمیدہ آہو

مرزا وحید ؎

رشتۂ جذب محبت بکمند کوتاہی
چہ شد ای رم زدہ، آہوئے بیاباں شدۂ

لیکن "آہوئے رم دیدہ" کی نہ کہیں دید ہے نہ شنید۔ میں شکرگذار رہوں گا حضرت اثر کا اگر وہ عرفی، بیدل، خسرو یا غالب کے کلام سے "آہوئے رم دیدہ" کی سند پیش فرمائیں۔
لغت میں "رم" کے معنے "ڈر۔ وحشت اور گریز کے ہیں۔ فیروز اللغات صفحہ (۶۶۴)۔ بنا بریں یہاں آہوئے رم دیدہ کی بجائے رم خوردہ درست ہو سکتا ہے ؎

مثال آہوئے رم خوردہ اپنے سایہ سے رم ہو

اس لفظی اصلاح کے بعد معنوی غلطی ابھی اپنی جگہ برقرار ہے ؎

یہی منشا ہے پاکی کا یہی ہے جوہر پاکی
مثال آہوئے رم دیدہ اپنے سایہ سے رم ہو

پاکی کا یہ منشا ہے کہ ہرن کی طرح اپنے سایہ کو دیکھ کر چوکڑی بھری جائے۔ یعنی ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ یا ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

"پاکی" کے عام معنے جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ طہارت کے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ طہارت کا یہ منشا کیسے ہو سکتا ہے کہ اچھا خاصا آدمی "کوری بیٹھ بچھیرے" کی طرح اپنے سایہ سے بدکتا رہے۔ یوں بھی سایہ سے بدکنا، اپنے آپ سے گریز کرنا صحت مندانہ علامت نہیں۔
حضرت اثر کا تیسرا شعر ؎

عجب وہ راز ہے، جس کا کیا ہے پاسباں مجھ کو
نفس تلوار بن جائے، زباں دل کی جو محرم ہو

"راز" کا "پاسباں" نہیں ہوتا۔ "در" کا پاسباں ہوتا ہے۔ راز کے لیے "امین" یا "راز داں" کہنا چاہیئے۔ اس کے قطع نظر غالب کے اس مکمل شعر کے ہوتے ہوئے لفظ بدلنے کی کیا ضرورت تھی ؎

این رازکہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

قریب قریب اسی مضمون کو صائب (غالباً) نے بھی ادا کیا ہے ؎

عجب سوز است اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم، ترسم کہ مغز استخواں سوزد

حضرت اثر کا چوتھا شعر ؎

بھلا گفتار کا کیا دخل اس بزم تماشا میں
جہاں بے تابیٔ دل کا حیا سے خیر مقدم ہو

"بے تابیٔ دل" کا اظہار "بزم تماشا" میں نہیں خلوت میں کیا جاتا ہے۔ بلکہ احتیاط وفا، اور رضا کوشی کا تقاضا یہ ہے کہ خلوت میں بھی بے تابیٔ دل کا اظہار نہ ہو، حرف مطلب زبان پر نہ آئے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

خلوت میں ان کے کیسے یہ کثرت ہو بار باب
کیوں جائیں ان کے سامنے ارماں لیے ہوئے

اس کے قطع نظر "گفتار" کی پھر بھی پذیرائی ہو سکتی ہے۔ لیکن بے تابیٔ دل کا اظہار جو کم حوصلگی اور بوالہوسی کی طرح سنگین جرم ہے۔ کس طرح روا رکھا جا سکتا ہے۔ وہ تو خیر گذری کہ "حیا" سے خیر مقدم کیا گیا۔ کسی اور طریقے سے کیا جاتا تو۔۔۔!۔ حیا سے خیر مقدم کرنے کا یہ مضمون غالب کے پاس موجود ہے ؎

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

حضرت اثر کا پانچواں شعر ؎

"خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید"
اگر وہ کم سخن گرم سخن ہو کیا ہی عالم ہو

آپ نے فارسی کا ایک مصرع مستعار لے لیا۔ خیر اچھا کیا۔ لیکن اردو گرہ ایسی لگائی کہ فارسی مصرع "خموشی" کے باوصف زبان حال سے کہہ رہا ہے: "طنبورہ من چہ می سرآید"۔ یہ گرہ ایسی ہی ہے جیسے کوئی صبا رفتار گھوڑے کے ساتھ "اڑیل بیل" کو جوت دے۔ یہاں "اجتماع نقیضین" واقع ہوا ہے۔ "خموشی"۔ "کم سخنی" نہیں۔ اور کم سخنی، خموشی نہیں دونوں میں کھلا اور نمایاں فرق ہے۔ یہ بحث جداگانہ ہے کہ خموشی "عین تکلم" ہے اور "تغافل"۔ "عین اعتنا"۔ جیسے ملا ظہوری کہتا ہے ؎

تو نظر باز نہ ای، ورنہ تغافل نگر است
تو زباں فہم نہ ای، ورنہ خموشی سخن است

جب آپ خموشی کو تسلیم کر رہے ہیں تو پھر "کم سخن" کہنا غلط۔ کم سخنی، خموشی اور "بسیار گوئی" کی درمیانی حالت کو کہا جاتا ہے اس لیے دوسرا مصرع یوں درست ہو سکتا ہے

"خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید"
زباں سے وہ جو "ہاں" کہدیں نہ جانے کیا ہی عالم ہو

چھٹا شعر ؎

نہیں اب ہوش اتنا بھی ہجوم نامرادی میں
نہ ہو کس حسرت برباد کا اور کس کا ماتم ہو

جب آپ حسرتوں کی تقسیم کر رہے ہیں، ایک حسرت اور دوسری حسرت میں فرق و امتیاز کر رہے ہیں، تو معلوم ہوا کہ آپ ہوش میں ہیں۔ اس لیے "نہیں اب ہوش" کہنا وہی "طنبورۂ من" والی بات ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں حضرت اثر وہ بات کہنا چاہتے تھے جو غالب نے اپنے اس شعر میں کہی ہے ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ساتواں شعر ؎

مذاق عشق و خودداری جزاک اللہ جزاک اللہ
وہی گریہ ہے جس کا ضبط زخم دل کا مرہم ہو

اے جزاک اللہ! "ضبط گریہ" زخم دل کے لیے مرہم ہوتا ہے یا SEPSIS اور SEPTIC! رونا تو دل کی بھڑاس نکال دیتا ہے۔ آنسو کا ہر قطرہ زخم دل کے لیے پھاہا ہو جاتا ہے ــــ برخلاف اس کے ضبط گریہ سے نہ صرف یہ کہ زخم دل ناسور بن جاتا ہے بلکہ دم اکھڑ جاتا ہے ؎

دم اکھڑ جائے گا اس ضبط سے اکر نوحہ گری
چھٹتا کیوں نہیں منہ ڈھانپ کے رونے والے!

آٹھواں شعر ؎

جو ذوق خود ستائی اک سراپا ناز کا کم ہو
پلک جھپکانے میں شیرازۂ کونین برہم ہو

کیا غالب کا یہ مضمون اس آسانی کے ساتھ اپنایا جا سکتا ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ذوق خود ستائی کے "صرف" "کم ہونے" سے شیرازۂ کونین برہم نہیں ہو سکتا۔ ہاں ذوق خود ستائی کا عدم، شیرازۂ کونین درہم برہم کر سکتا ہے۔ مصرعہ اول میں الفاظ کم زائد محض ہے۔ اسی طرح لفظ "اک" بھی۔ اک کی بجائے "اس" ہونا چاہیے۔ دوسرے مصرعے میں جھول ہے۔ تیر نشانہ پر نہیں۔ دوسرا مصرع یوں درست ہو سکتا ہے ؎

جھپکتے ہی پلک، شیرازۂ کونین برہم ہو

نواں شعر ؎

سُنا کر مجھ کو کہتا ہے ستمگر اور ہنس ہنس کر
مدادا کیوں وہ ڈھونڈے جو رہین لذت غم ہو

"سُنا کر مجھ کو کہتا ہے" روزمرّہ اور بول چال کے خلاف ہے۔ پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے ؎

سنا نے مجھ کو کہتا ہے ستمگر غصے سے ہنس کر

دوسرے مصرعے میں "ڈھونڈے" کی بجائے "چاہے" ہونا چاہیے۔ کیونکہ انسان خیال سے عمل کی جانب بڑھتا ہے خواہش جستجو کا پیش خیمہ ہوتی ہے ؎ مدادا کیوں وہ چاہے جو رہین لذت غم ہو

پندرھواں شعر ؎ جہاں یہ حال ہو دل کا عبث فکرِ مداوا ہے
جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے اک ذرا بھی درد اگر کم ہو

درد کے کم ہونے سے جگر کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ــــ بلبل کی انتڑیوں میں رگِ گل کی پھانس ہے۔ موازنہ کیجئے۔ حضرتِ اثر کے شعر میں اور اس فلمی شعر میں کیا فرق ہے ؎

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

سولھواں شعر ؎ بہارِ آرائیِ جلوہ بقدرِ ہمتِ دل ہے
نہ کیوں پیشِ نظر ہر لحظہ تازہ ایک عالم ہو

غالباً حضرتِ اثر یہ مضمون ادا کرنا چاہتے تھے ؎

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

لیکن بُرا ہو "آورد" کا۔ "جلوہ آرائی" کو "آرائیِ جلوہ" کہہ بیٹھے۔

مطلع ثانی ؎ مزا بربادیوں کا جب ہے اے دل وہ شریکِ غم ہو
محبت کی ہے یہ توہین اپنا آپ ماتم ہو

حضرتِ اثر کا یہ مطلع پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آواز کہیں سنی ہوئی ہے ؎

یارب صدائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں۔ آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

ہاں اچھا یاد آیا ؎ الفت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

دیکھئے حضرتِ اثر کے مذکورہ بالا مطلع کے مضمون کا ایک "معارضی پہلو" یوں بھی ہو سکتا ہے۔ بدعت طراز طبیعت مضمون کو اس طرح الٹ دیتی ہے ؎

مزا بربادیوں کا جب ہے ان کو ہو خوشی حاصل
یہ توہینِ وفا ہوگی اگر ان کو مرا غم ہو

مقطع ثانی ؎

جو کج اندیش اہلِ دل کا واقف اسرارِ ہستی ہوں
اثر گمراہیوں کا ان کی تم کو کس لیے غم ہو

"جا چھوڑ دیا، مردِ مسلمان سمجھ کر"۔ میں مقطع پر تنقید نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے راست اندیشہ ہے کہ مقطع میں کوئی "سخن گسترانہ بات" آ پڑے گی اور حضرتِ اثر مجھ کو "کج اندیش" سمجھ کر میری "کج اندیشی" کا غم نہیں کریں گے اور ممدوح کا غم نہ کرنا میری "گمراہی" پر دلالت کرے گا۔

مضمون کافی طویل ہو گیا۔ اب میں اپنے اس مضمون کے "آہوئے رم دیدہ" کو "شاخ بستہ" کرنے سے پہلے، یعنی مضمون ختم کرنے سے پہلے دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک ہنسی کی بات، دوسرے سنجیدہ۔ ہنسی کی بات یہ ہے کہ میں نے بھی حضرتِ اثر کی زمین میں ایک شعر کہنے کی جرأت کی ہے ؎

دسواں شعر ہے
یہی شوریدگیٔ عشق کا پیہم تقاضا ہے
کہ وہ زلفِ مسلسل اور برہم اور برہم ہو

پہلے مصرعہ میں "شوریدگی" کا نہیں بلکہ "آشفتگی" کا محل ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "زلفِ مسلسل" کی بجائے "زلف مشوش" کہنا درست ہے۔ دیکھیے انشا کے اس شعر میں ؎

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے بوجھ سے
کھاتی ہیں تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

زلف مسلسل کا صحیح استعمال ہے۔ لیکن حضرت اثر کے شعر میں لفظ "برہم" کی مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے زلف مشوش ہونا چاہیے۔ جو لوگ الفاظ کا مزاج پہچانتے ہیں وہ اس نازک فرق کو سمجھ سکتے ہیں۔

گیارھواں شعر ہے
شرابِ عشق کے اک جرعہ کے بدلے نہ لے ہرگز
اگر سرمایۂ عیش دو عالم بھی فراہم ہو

پہلے مصرعہ میں "دُو" کے "آجانے کی وجہ سے تنفر صوتی" پیدا ہو گیا ہے۔ یہ شعر یوں درست ہو سکتا تھا ؎
شرابِ عشق کی اک بوند بھی دے کر نہ لے ہرگز
اگر خمخانۂ عیشِ دو عالم بھی فراہم ہو

بارھواں شعر ہے

کرشمہ سازیٔ حسنِ جہاں افروز ارے توبہ
جہاں تک شرح کرتے جاؤ رازِ عشق مبہم ہو

پہلے مصرعہ میں حسن کی صفت "جہاں افروز" بتائی گئی ہے۔ جب حسن کی صفت جہاں افروزی ہے تو پھر رازِ عشق کو "مبہم" کی بجائے آشکار بلکہ اظہر من الشمس ہونا چاہیے۔ کیونکہ جہاں افروزی کا تقاضا یہی ہے۔ اگر میں یہاں "تاروں گھٹنا اور سورج نے آنکھ" کہوں تو کیا برمحل نہ ہوگا؟!! اس کے قطع نظر" عروضیوں" کے نقطہ نظر سے اگر یہ مصرعہ کی تقطیع کی جائے تو "افروز" کا "ز" تقطیع سے گر جاتا ہے:۔

کرشمہ سا ۔ زیٔ حسن ۔ جہاں افرو ۔ ارے توبہ
مفاعیلن ۔ مفاعیلن ۔ مفاعیلن ۔ مفاعیلن

تیرھواں شعر ہے

گداز دل بھی شامل ہو جو میری طرح اشکوں میں
ٹپکتے شعلہ کا ہر قطرۂ شبنم پہ عالم ہو

پہلے مصرعہ میں گداز کا محل نہیں بلکہ "سوز" کا محل ہے۔

چودھواں شعر ہے
غرورِ عشق، نازِ حسن سے کچھ کم نہیں یعنی
جو سر جھک جائے سجدہ میں تو غیرت سے جبیں نم ہو

یعنی "دبرائے وزن" کے قطع نظر۔ دوسرے مصرعہ کی جھول اور "نم" کے مکرر قافیہ کے عیب کو اس طرح دور کیا جا سکتا تھا ؎
جبیں غرقِ عرق ہو جائے، سر سجدہ میں گر خم ہو

میرے دل کو جلا کر کردیا ہے سرد شیشہ تم نے
کہو سچ سچ کہ تم معشوق ہو یا جوہری بم ہو

چونکہ سائنس کی تحقیق ابھی ایٹم تک پہنچی ہے۔ اس لیے میں ایک ہی شعر پر اکتفا کرتا ہوں آئندہ جیسے جیسے تحقیق آگے بڑھتی جائے گی میں بھی اپنے اس شعر کی بنیاد پر قافیے کی اینٹیں جما جا کر "دو منزلہ" "سہ منزلہ" چار منزلہ پنج منزلہ غزل کہتا جاؤں گا۔

دوسری سنجیدہ بات یہ کہ شاعر منتہی ہو یا مبتدی اس سے کسی نہ کسی غلطی کے سرزد ہونے کا نہ صرف امکانِ عقلی بلکہ بقول مُلا جامی "امکان بے عقلی" بھی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے "صبا" کے اسی زیر بحث شمارہ میں حضرت جوش کا ایک شعر چھپا ہے ؎

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفہ میں حسینؑ
سب شہادت کے ہیں آثار جفا جور گرم

اس شعر میں ایک تاریخی غلطی اور ایک لفظی غلطی ہے۔ تاریخی غلطی یہ کہ امام حسین علیہ السلام کوفہ نہیں گئے بلکہ کربلا گئے۔ آپ کوفہ کے ارادے سے نکلے ضرور تھے۔ لیکن راستہ میں مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ کوفہ کے حالات دریافت کرنے پر فرزدق نے کہا۔ کوفیوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں یزید کے ساتھ۔ ان کے ہاتھ یزید کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ یہ سن کر آپ کوفہ گئے بغیر ہی کربلا چلے گئے۔ لفظی غلطی یہ کہ "طرح" "کے بعد" "سے" زائد محض ہے۔ جوش اس مضمون کو ستھرے رنگ سے باندھ سکتے تھے۔ ممکن ہے ان سے کچھ سہو ہو گیا ہو۔ اس مثال سے واضح ہو گیا کہ غلطی بڑے سے بڑے شاعر سے ہو سکتی ہے۔ لیکن جو شاعر انصاف پسند اور وسیع النظر ہوتا ہے وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے اور آئندہ ایسی غلطی سے بچتا ہے۔ لیکن جس میں انصاف کا جوہر نہیں ہوتا وہ اعتراف کرنے کی بجائے کج بحثی پر اتر آتا ہے۔ ایسے ہی شاعر کی نسبت زمانہ کا فیصلہ ہے ؎

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں برگیر
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

جیلانی بانو

انتقام

دادی کو سب کی پیدائش کا وقت یاد تھا۔
جس وقت چاہو ذرا سی کوک بھر دو اور سن لو۔
"میں جیبہ کے چھلّے میں جا رہی تھی جس وقت باقر پیدا ہوا ہے۔ اس دن میں نے گلابی جالی کا دوپٹہ اوڑھا تھا اودے غلطاں کا پائجامہ اور رہری گرنٹ کا کرتا پہنا تھا۔ اندر والے دالان میں بیٹھی عطر لگا رہی تھی۔ دروازے پر کہار کھڑے تھے ادھر باقر دہی کے لیے پیسے مانگ رہی تھی کہ دلہن نے مجھے پکارا — اے اماں جی — اماں جی — میں نے بدحواسی کے مارے عطر کی شیشی کھلی چھوڑ دی خس کا عطر تھا۔ پچاس برس پرانا — آج کل تو سو روپے تولے بھی نہ ملے —"

دادی کوئی بات سنانے بیٹھتی تو اتنی تفصیل بیان کرتی تھیں کہ جی ڈوب جاتا۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے کی آنکھوں میں اپنی پیدائش کا منظر یوں جم گیا تھا جیسے وہ خود موقع واردات پر موجود تھا۔

سب اصرار کر کے دادی سے تفصیل سنتے۔

مگر سارہ کو اپنی پیدائش کا ذکر کبھی پسند نہ آتا تھا۔ وہ چاہتی تھی دادی اس قصے کو بالکل بھول جائیں۔ مگر دادی کو تو سنک تھی۔ جس بات کے پیچھے پڑ گئیں تو لتّے لیے بنا نہ چھوڑتیں۔ خصوصاً جب سرو کی ضد اور بے ہودگیوں کا ذکر ہو رہا ہو تو وہ ادبدا کے لاکھوں بار کی گھسی پٹی کہانی شروع کر دیتیں۔

مجھے تو کل کی سی بات یاد ہے ابھی آٹھ برس ہی تو ہوئے ہیں سرو کی پیدائش کو — دلہن نے کوئی جتن نہ چھوڑا تھا۔ رسیاں تک پھاندیں۔ سارے شہر کی دائیوں اور ڈاکٹروں نے اپنی سی کر ڈالی۔ مگر یہ لونڈیا تو دلہن کی کوکھ کو چپک کر رہ گئی تھی — ادھر سے اختر میاں کا چوبیس گھنٹے تقیہ تھا کہ چار بیٹیاں ہو چکی ہیں اور اب پھر —

سارہ کٹ کے رہ جاتی۔ اماں ابا کے خلاف نفرت کا ابال سا اٹھتا۔ کاش ایک بار پھر وہ وقت واپس آ سکتا تو وہ سب کی اوقات پر سات بار تھوک کر چلی جاتی۔

"اختر میاں کی بے قراری تھی کہ پاؤں زمین پہ نہ ٹکتے تھے —" دادی نوّے میل فی گھنٹے کی رفتار

سے کہی چلی جا رہی تھیں۔

"کمر پر ہاتھ باندھے دالان میں ٹہلے جا رہے تھے ــــ لڑکا ــ لڑکا ــــ لڑکا ــــ

میں اپنی مرجان والی تسبیح لیے دعا مانگ رہی تھی کہ اللہ بہو کی مشکل آسان کرے۔ مگر بچاسوں بار اختر میاں نے میرا وظیفہ تڑوایا ــــ اماں اس بار تو لڑکے کی دعا کیجئے۔ اماں لڑکی کو پالنے کے لیے تو ڈھیروں روپیہ چاہیے۔ بھئی ہمارے پاس تو کچھ ہے نہیں چھٹی تو اب آپ کو کرنی پڑے گی ــــ مارے انتراہٹ کے ڈاکٹرنی کو بلالائے ــ

اوہنہ بس کرو اماں جی ــ" سارہ تلملا کے رہ گئی۔

اور دولہا بھائی کے بھائی اسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ کاغذ کا برادہ تھی جسے اس کے باپ نے چمکتے ہوئے سونے کے دھوکے میں لاٹری سے نکالا تھا۔

مسہری پر پاؤں لٹکائے وہ کھسیانی سی بیٹھی رہی۔ خشک گلے سے کچھ گنگنانے میں اس نے پنکھے کے پنگھے نکال نکال کر پھینک دیے۔ مگر دولہا بھائی کے بھائی، جو رقیہ باجی کو گھورے جا رہے تھے اب اپنی عینک کا رخ سارہ کی طرف گھما چکے تھے۔ لیکن رقیہ باجی کی طرح شرما شرما کے اترانے کی بجائے وہ غصہ میں پھنکی جا رہی تھی۔

"اور دادی ایک بار ابا میاں نے انھیں مسہری کے نیچے جو پھینک دیا تھا ــ" باقر دادی کو مزید تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجبوراً سر راشد کے دوسرے کمرے میں بھاگی۔

آج تو دن بھر اسے انگاروں پر لوٹنا پڑا۔ دولہا بھائی کے وہ طوطے کی ناک والے بھائی کیا آئے تھے کہ سارا گھر تہ و بالا ہو گیا۔ سب ان کی خاطر تواضع میں بچھے جا رہے تھے۔ اماں چولہے کے پاس جُتی ہوئی تھیں۔ رقیہ باجی ان کے آس پاس سے بچوں کو مار مار کے بھگا رہی تھیں ان کے سفید کپڑوں پر کسی بچے کا ہاتھ بھی پڑ جاتا تو رقیہ باجی کو دھکا سا لگتا تھا۔ ساری دنیا کے سڑے بسے لطیفے اور پڑوسیوں کی برائیاں ان کے خرگوش کی طرح لمبے لمبے کانوں میں انڈیلی جا رہی تھیں اور وہ بطخوں کی آوازیں ہنسے جا رہے تھے۔ خود بات کرتے یوں ناک میں بولتے تھے جیسے ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہے ہوں۔ کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر اس نے ذرا سا پٹ کھولا اور گردن نکال کے زور سے چیخی۔ ٹیاؤں ٹیاؤں ــــ

باقر کا بھی ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ اگر وہ ذرا دیر پہلے اس کا منہ نہ چڑا چکی ہوتی تو باقر ضرور ہنستا۔

حد ہو گئی اماں نے انھیں نادرہ باجی کے بھاگنے کا قصہ بھی سنا ڈالا

"ابھی لوگ عشا کی نماز پڑھ کے لوٹے بھی نہ تھے جو وکیل صاحب کے ہاں میں پڑی ہے"

لینی کے دن دھاڑے ــ ؟ طوطے کی ناک نے پلٹ کر رقیہ باجی کو دیکھا جو دالان کا تھم پکڑے جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

"مادھا کیا ــــ سب کے منہ پر کالک لگا گئی۔ ہمارے وکیل صاحب رونڈو ب مرنے کو دوڑتے ہیں۔

"کم بخت خود ڈوب مرتی ہے" دادی بھی قریب آبیٹھیں۔

مگر اس بار نہ تو طوطے بولے اور نہ بطخیں ہنسیں۔ اماں اور دادی اس گرم خبر کے ایسے سرد استقبال پر کھسیانی گئیں اور سارہ بہت خوش ہوئی۔

آج صبح ہی سلیٹ پر اس کی باقر اور ٹبو سے زبردست لڑائی کے بعد "کٹی" ہو چکی تھی۔

ویسے تو باقر ایک آدھ گھنٹے کے بعد ہی لڑائی بھول جایا کرتا تھا۔ مگر آج پے در پے شکستیں کھانے کی وجہ سے سارہ کو جب جب موقع ملا اس نے باقر کا منہ چڑا دیا۔ اور باقر نے اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے آج ٹبو کو جامن کے جھاڑ پر چڑھایا تھا۔ اس نے بڑے خوفناک انداز میں یہ خبر دادی کو سنائی مگر ٹبو پھر بھی پٹنے سے بچ گئی تھی۔

اب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے ــ؟

بڑی دیر تک وہ رقیہ باجی کے گلابی دوپٹے کا لچکا ناخنوں سے نوچتی رہی پھر قینچی مل گئی تو دولہا بھائی کی کتابوں میں سے بڑی نفاست کے ساتھ بیل بوٹے کاٹنے بیٹھ گئی۔ مگر ایک بھی ڈھنگ کا نہ کٹا۔

آج سارے گھر سے وہ بیزار ہوئی جا رہی تھی۔

گھر کیا اچھا خاصہ مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ ذرا دیر کو سب اکٹھے ہوئے اور تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ مرکھنے بیلوں کی طرح وہ اور ٹبو آمنے سامنے آتے ہی مارکٹائی شروع کر دیتی تھیں۔ ادھر باقر کو ضد تھی کہ جب بیٹھے گا اسی کرسی پر یوں تو باقر کو گولیوں اور پتنگوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ سبق یاد کرتا۔ مگر سارہ کو یوں ناک سٹرک سٹرک کر، پسینے میں شرابور بال کھلے، سلیٹ پر تھوک ہتھیلیوں سے ملتے دیکھتا تھا تو بس حرص سوار ہو جاتی۔ بہ ضد کہ بیٹھوں گا تو اپنی کرسی پر۔ پہلے تو وہ باقاعدہ وکیلوں کی طرح بحث جاتی، کوسے دیتی اور پھر مارتی۔ مگر باقر کا بدن پتھر تھا الٹے اسی کے ہاتھ دکھنے لگتے۔

سنسناتی دوپہر میں سب تھک ہار کر سو رہے تھے۔

صرف رقیہ باجی، دولہا بھائی اور وہ طوطے کی ناک والے بیٹھے کارڈز کھیل رہے تھے اور ٹیاؤں ٹیاؤں کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ اگر دادی کو خشکی کا مرض نہ ہوتا تو وہ بھی سو جاتیں ــــ ہائے کیا خود مختاری کا زمانہ ہوتا وہ ــ!

مگر اب تو سوتے وقت اماں سب کی لاڈلی میں دادی کو تھما دیتی تھیں دادی کو ان نخروں کو روکنے کے لیے ہزاروں گر یاد تھے۔ کبھی آپاؤں کی پیدائش کا حال سنا رہی ہیں، کبھی پریوں کی کہانیاں، پٹاری کھول کر خربوزے کی میگیں کھلاتیں۔ میٹھی میٹھی بھونیں سب کی انگلیوں کو چھوا دیتیں۔ ذرا بھی آنکھ بچی تو سارہ ان کی بقچہ میں سے کپڑوں کی کترنیں گڑیوں کے لیے چرا لاتی تھی۔

مگر آج اس کا جی دادی سے بھی کھٹا ہو گیا تھا۔

بیچ کمرے میں کھڑی وہ بڑی دیر تک سر کھجاتی رہی۔ آہستہ سے رقیہ باجی کی صندوقچیہ کھول کر دو چار الائچیاں منہ میں ڈال لیں۔ ڈبیہ میں سے سلمے کے تار نکال کر انھیں خوب کھینچ کھینچ کر لمبا کیا۔ پھر چاروں طرف کوئی شجر ممنوعہ تلاش کرنے لگی۔ جانے کیوں لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ جو چیز بھی چھولے یا تو ٹوٹ جائے گی یا گندی ہو جائے گی۔

اچانک وہ اچھل پڑی۔ الماری کے اوپر پٹیاؤں ٹیاؤں کا کیمرہ رکھا ہوا تھا۔ کیمرہ چھونے کے لیے اس کے ہاتھوں میں کُھل ہونے لگی۔ آج صبح رقیہ باجی اس طوطے کی ناک کے ساتھ بغیچہ میں گئی تھیں اس نے زبردستی رقیہ باجی کو پکڑ پکڑ کے ان کے بے شمار فوٹو لیے تھے۔ باقر یا ٹھو جا کے کھڑے ہو جاتے تو انھیں مار کر بھگا دیا جاتا۔

اسے ٹھو کی طرح تصویریں اتروانے کا اتنا شوق نہ تھا جتنا کیمروں کو چھو کر دیکھنے کا تھا۔

اس کے اندر رقیہ باجی بند ہیں۔ اماں کے پلنگ پر کھڑے ہو کر اس نے کیمرہ اتارا اور اس کے سوراخ میں آنکھ گڑو دی۔ اندر ٹپاٹپ اندھیرا بھرا پڑا تھا رقیہ باجی کہیں دکھائی نہ دیں۔ تھرتھراتے ہاتھوں سے اس نے جلدی جلدی سارے پیچ گھما ڈالے۔ پر جانے کیسے اس کا ہاتھ ایک بٹن پر گیا اور ڈبہ پٹ سے کھل گیا۔ مگر اندر سے کچھ نہ نکلا۔ ایک کافور کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ سخت مایوسی ہوئی خیر اس نے جلدی جلدی توڑ مروڑ کے پٹی اس میں ٹھونسنا چاہی کہ اماں نے کروٹ بدلی اور وہ دھکا کھا کر نیچے گر پڑی۔

شور سن کر سب سے پہلے رقیہ باجی آئیں اور پھر قیامت آگئی۔

جانے کیا کیا ہوا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ سوجا ہوا گال لیے کھڑکی میں بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ لاتوں اور گھونسوں کے اس اندھیائی میں اسے صاف ایک بات یاد رہی کہ چلاتے وقت طوطے کی ناک سے یوں آواز آرہی تھی جیسے کتے کا پلا رو رہا ہو۔

خوب خوب برسنے کے باوجود لوگوں کو اس پر اتنا غصہ آرہا تھا کہ اب کسی کو نیند نہ آرہی تھی۔

"بچاری کو دن بھر اماں جی مارتی رہیں ۔" جانے کیوں دولہا بھائی کو اس پر رحم آرہا تھا۔

"اس سے تو اچھا ہے کہ پھر بھنگن کو دیدو۔" اب معلوم ہوا کہ یہ کیسی گھن بھری ہمدردی تھی۔

"اے واہ کیوں دے دوں۔ آٹھ برس تک پالا ہے تو اب پل ہی جائے گی۔"

یہ ماں کا انتہائی لاڈ تھا۔

مگر وہ تو اب اس طرح ہرگز نہ پلے گی۔ آج اس نے طے کر لیا۔

اماں تو اس کی پکی دشمن تھیں ــــ ایک اماں ہی کیا۔ سب ہی اس کی بات کو یوں ٹال جاتے جیسے بہرے ہوں۔ ہر روز وہی کہتے کہ کمن جیسی منحوس ڈوبٹیا اڑھ کے ماشٹر سے پڑھنے چلے جا رہے ہیں کبھی عید بقرعید کو رنگ برنگے

کپڑوں کے ڈھیر آتے تو وہ بھی رقیہ باجی کی حرص میں اماں کے پاس جا بیٹھتی۔

"میں تو اس سرخ کپڑے کا کرتا سلواؤں گی۔" وہ کپڑا سینے پر پھیلا کے دیکھنے لگتی۔

"اونہہ میلا کیے دے رہی ہے" رقیہ باجی اس کے پسینے اور میل میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے کپڑا چھین لیتیں۔

"میں تو ابھی کپڑے کا سلواؤں گی۔" وہ ترستے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے کو اب بھی سہلاتے جاتی۔

"لو اس میں سے دو گز دو کرتے سی دو۔" اماں کوئی ذلیل سی چھینٹ نکال کر رقیہ باجی کو تھما دیتیں۔

وہ لاکھ سر پٹکتی، اس کپڑے کو عمر بھر نہ چھونے کی قسمیں کھاتی مگر آخر کو وہی گھگرا پہننا پڑتی جو رقیہ باجی سے کبھی ٹھیک نہ سلی۔ کبھی آستین تنگ، کبھی گریبان سر میں اٹک جاتا اور پہناتے وقت وہ خوب جھنجوڑیاں دیتیں۔

دالان میں دادی آموں کا مربہ بنا رہی تھیں۔ بھڑ اور بالر آس پاس مکھیوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ چاہتی تو وہ بھی دو ایک بار شیرے میں انگلیاں ڈبو ڈبا کر چاٹ ہی لیتی۔ مگر اس وقت تو وہ دنیا کی ساری رنگینیوں سے بیزار ہو چکی تھی۔ بغاوت کی آگ میں اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔

ٹیکا ٹیک دوپہریا میں گلی دم سادھے پڑی تھی۔ گرم گرم لو کے تھپیڑے اس کا منہ جھلسے دے رہے تھے اور آنکھوں میں مٹی کے ذرے کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ کہیں دور سے ملائی کے برف والے کی ٹھنڈی ٹھنڈی آواز آ رہی تھی۔ نکڑ پر دھنا موچی سر جھکائے کھٹ پٹ کر رہا تھا۔ اس کے کالے بدن پر پسینے کی چکاچوند سے نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ کبھی کبھی سر پہ تر رومال ڈالے لوگ ظہر کی نماز کو مسجد جا رہے تھے۔

دو چیلیں لڑتی جھگڑتی ایک دوسرے کو دھکے دیتی ہوئی آئیں اور موری میں ایک جھپٹا مار کے پھر اڑ گئیں۔ دوسری چیل چلاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بھاگی۔

اچانک اس کی نگاہ ایک کاغذ کی پڑیا پر گئی جو سڑک کے بیچ میں پڑی ہوئی تھی۔

یہ باقر کی کارستانی تھی۔ گرم دوپہریوں میں جب کوئی کام نہ رہتا تو وہ خالی کاغذ کی پڑیاں باندھ کے سڑک پر ڈال دیتے تھے۔ پھر کھڑکی میں بیٹھے انھیں اٹھا کے کھولنے والوں کا تماشہ دیکھا کرتے —— یہ بڑا مزے دار کھیل تھا۔

اس وقت بھی وہ سب بھول بھال کے تماشہ دیکھنے لگی۔

کئی لوگ اسے روندتے ہوئے گذر گئے۔ البتہ چوک کی طرف سے جب پرانے کنستر خریدنے والے نے اسے دیکھا تو اپنی رفتار تیز کر دی۔ سرو نے ایک زوردار قہقہہ کی تیاری کر لی تھی مگر جب ایک بہشتی نے لپک کر پڑیا اٹھائی تو اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ جیسے آپا میاں دالان میں ٹہل رہے ہوں —— لڑکا —— لڑکا —— لڑکا ——

اور پھر بہشتی نے پڑیا پھینک دی جیسے اندر سے سارہ نکلی ہو۔

اس نئی ذلت پر انتقام کا جذبہ بری طرح بھڑکنے لگا۔

کھڑکی کے پٹ کو زور زور سے بجاتے میں اس نے انتقام کے بہت پلان بنائے۔ اس کے گالوں پر تو صرف

ٹیاؤں ٹیاؤں کی انگلیاں ابھری ہوئی تھیں مگر دل میں بہت ہی اگلی پچھلی نفرتیں ابھرنے لگیں۔ اسے سب سے زیادہ غصہ تو دادی پر آرہا تھا اور ان سے زیادہ ابا میاں پر ـــ اور اماں کو تو ـــ

اندھی کنوئیں میں گر جاؤں ـــ ؟ ایک بڑا رومینٹک سا خیال روشن ہوا۔

بڑا مزہ آئے گا۔ رقیہ باجی کے کھیل میں بیٹھے بٹھائے کھنڈت پڑے گی۔ لوگ زبردستی اسے زعفران کا شربت پلائیں گے۔ انار کھلائے جائیں گے۔ جیسے اماں بے ہوش ہوئی تھیں تو کھلائے گئے تھے۔ سب کی روتے روتے آنکھیں سرخ ہوجائیں گی۔ ممکن ہے اماں بھونچ کپڑے کا کرتا بنانے پر راضی ہوجائیں ـــ ؟

مگر جوں جوں اس نے اپنی موت کی فلم دیکھی سخت مایوس ہوگئی۔

یہاں تو اٹھتے بیٹھتے لوگ اس کی موت کو یاد کرتے ہیں۔ اور دادی کے لیے تو مرنا کوئی بات ہی نہ تھی۔ جب سے نادرہ بھاگی تھی وہ دن رات یہی کہتیں کہ اس سے تو مرجاتی تو وکیل صاحب کو صبر آجاتا۔

بھاگ جاؤں ! اس نے مسرت سے بے حال ہوکر سوچا۔

پھر تو ابا میاں کی آواز وکیل چچا کی طرح بیمار بلی کی سی ہوجائے گی۔ مونچھیں لٹک کر ہونٹوں پر گرجائیں گی۔ اماں کو بھی نادرہ کی طرح غشی کے دورے پڑیں گے، اور دادی ہاتھ مل کے کہیں گی اس سے تو مرجاتی تو اچھا تھا۔ خاندان کی ناک کٹ گئی۔ نادرہ کے گھر والوں کی ہونق صورتیں اسے یاد آئیں تو خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پٹکنے لگی ہائے وہ گھر والوں کو کتنی بڑی سزا دے سکتی ہے۔

بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے اپنے دکھتے ہوئے وجود کو سمیٹا اور دالان سے گذرتے وقت پلٹ کر گھر پر اس نے ایک جھلتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

... ابھی لوگ ظہر کی نماز پڑھ کے بھی نہ لوٹے تھے جو ہمارے گھر میں پلس پڑ گئی۔ میں میٹھی آموں کا مربہ بنا رہی تھی۔ باقر ایک کیری کی پھانک چرا کے دالان میں بھاگا جا رہا تھا۔ ادھر امتیاز میاں کے بھائی کارڈز کھیلتے میں بطخوں کی طرح قیں قیں ہنس رہے تھے کہ ـــ

دادی سب کو یہ قصہ سنایا کریں گی۔

چوک میں سے سرپٹ دوڑتے میں وہ چاہتی تھی سب اسے دیکھ لیں کہ وہ گھر سے بھاگی ہے۔

آمنہ ابوالحسن

عیدی

جب سے کمال آیا تھا گھر کی حالت ہی کچھ عجیب ہو گئی تھی ایک عجیب سی چہل پہل اور رونق گھر کے کونے کونے سے سمٹ کر ہر طرف بکھر گئی تھی اور بچے بڑوں کا تو سوال ہی کیا ایسا معلوم ہوتا تھا گھر کی دیواریں تک زبان حال سے پکار پکار کر کہنے لگی ہیں "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" زندہ دلی کی یہ پرچھائیاں وسیع و عریض ہالوں اور صاف ستھرے سجے سجائے کمروں سے اتر کر باورچی خانے کی اس چوکی تک بھی جا پہنچی تھیں جہاں مہرو اپنی میلی اوڑھنی کو بڑی احتیاط سے سر پر جمائے آنکھیں نیچی جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں مگن ہوا کرتی اور رابعہ بیگم جو کبھی رابعہ دلہن بھی تھیں . . . . کام کے دوران میں کبھی ایک تھکی تھکائی نظر اپنی لخت جگر مہرو پر ڈال کر ان آنسوؤں کو ساڑھی کے آنچل سے آنکھوں ہی میں رگڑ دیا کرتیں جو مہرو کی حالت پر ہر وقت باہر آنے کے لیے بے قرار ہوا کرتے۔

نانی اماں نے اپنا مستقل مشغلہ سرے سے ترک کر دیا تھا اور قرآن شریف کو اچھی طرح جزدان میں لپیٹ کر سرہانے والی الماری کے تابدان میں احتیاط سے رکھوا دیا تھا۔ خالہ کا تو کچھ پوچھنا ہی نہ تھا وہ نظر بھر کر اپنی پروین کو دیکھتی بھی نہ تھیں کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے اور اماں —— اماں کے ہاتھ گو اب بھی تیزی سے سروتے کے ساتھ مصروف کار ہوتے مگر جہاں بھی انھیں یہ شبہ گذرا کہ کمال ان کی طرف آنے لگا ہے وہ جھٹ کشتی پاندان میں جما سروتے کو صافی میں رکھ پاندان دور سرکا دیتیں اور اپنا کھڑا ہوا گھٹنا اس طرح بٹھا دیتیں جیسے کہہ رہی ہوں آؤ بیٹا کمال یہاں سر رکھ کر لیٹ جاؤ تاکہ میں تمھیں خاندان کی اونچ نیچ سمجھا سکوں ——

کمال کی اس عادت سے سب ہی واقف تھے وہ جتنا سیماب صفت اور شریر تھا اتنا ہی "ایدی" بھی —— جہاں بھی اس نے کسی کو بیٹھے دیکھا جھٹ اپنا سر اس کی "ٹانڈی" پر رکھ دیتا اور پھر بڑے دلربا انداز میں پوچھتا —— ہاں تو نانی اماں پھر کیا ہوا —؟ نانی اماں کے قصے ختم ہونے ہی نہ پاتے یہاں تک کہ سارا گھر تھک جاتا مگر کمال اماں کی ٹانڈی پر سر جمائے بڑی دلچسپی سے سب کچھ سنا کرتا اور جہاں کسی نے نانی اماں کو ٹوکا وہ فوراً بول اٹھتا —— ہاں تو نانی اماں پھر کیا ہوا —— آگے کہو ——

بھابی کمال کی اس عادت سے بہت بیزار تھی جہاں اس نے کمال کو دیکھا جھٹ اطراف کی چیزیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی

ہوتی جیسے بڑی مصروف ہو۔ مگر کمال بھی ایک ہی گھاگ وہ باتوں میں مگن اس طرح لیٹا رہتا جیسے اطراف کی کچھ خبر ہی نہ ہو اور جب سجابی اس کی مصروفیت سے مطمئن ہو کر چپ کے سے پیچھے آ بیٹھتی تو وہ ایک ہی جست میں اس کے پاس پہنچ جاتا اور بغیر کسی انتظار کے اس کے زانو پر سر رکھے ٹوٹی باتوں کا سلسلہ جوڑنا شروع کر دیتا۔ کمال کی فرمائش پر نانی اماں کی ناتوان بوڑھی آواز فضا میں کپکپاتی اور اماں اور خالہ کے دلچسپ چٹکلوں کے ساتھ ساتھ سارے خاندان کا شجرہ اس کے سامنے کھل جاتا۔ اسے آئے ہوئے ابھی پندرہ دن بھی نہیں گذرے تھے پھر بھی یہ پتہ تو چل ہی گیا تھا کہ پورے خاندان میں کس کس کے گھر کتنی لڑکیاں ہیں اور کونسا گھر اپنی امارت اور سلیقہ مندی میں مشہور ہے اور کونسا بے پناہ دولت کے باوجود بدسلیقگی میں اور کونسا اپنے افلاس میں۔

"مگر نانی اماں یہ تو بتائیے سجابی میں آپ کو ایسی کونسی خوبی نظر آئی جو آپ انھیں یوں اٹھا لائیں" وہ کن انکھیوں سے سجابی کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور ساتھ ہی ساتھ تعریفوں کو بھی سنتا جاتا جو اس سوال کے جواب میں دہرائی جاتیں۔ سب ہی جانتے تھے، بوٹے قد والی نرم و نازک سجابی نانی اماں کی بڑی چہیتی نواسی بہو تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ سکتا مگر اس سوال کے ساتھ ہی سجابی اپنی جگہ اور سمٹ جاتی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی کانٹوں دار جھاڑی ان سے لپٹ پڑی ہے اور اب چھڑائے نہیں چھوٹتی یوں تو وہ بڑی ہنس مکھ تھی اور اپنے سب ہی دیوروں سے بہت بے تکلف مگر جانے کیوں کمال سے وہ بہت گھبراتی اس کے چمکیلے بالوں اور صاف شفاف آنکھوں میں نجانے وہ کونسی چیز مچلا کرتی جو سجابی کو بوکھلا دیا کرتی اور اپنی ساری خود اعتمادی کے باوجود بھی اسے یہ وہم ہونے لگتا کہ یہ چھلے دار بال اس کے اطراف لپٹتے جا رہے ہیں اور یہ روشن خوبصورت آنکھیں چمکدار قندیلوں کی طرح اس کے سارے وجود پر چھائی چلی جا رہی ہیں ۔۔ سجابی جتنا اس سے کتراتی وہ اتنا ہی اس کے پیچھے پھرا کرتا اور کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا جب سجابی اسے بیٹھے ہوئے مل جاتی۔

رمضان کے دن تھے سحری ختم ہو چکی تھی سب لوگ روزے کی نیت باندھ چکے تھے اور اب صحن میں پڑے ہوئے تختوں پر اطمینان سے بیٹھے ادھر ادھر کی گپ شپ میں مصروف تھے تاکہ فجر کا وقت ٹل نہ جائے اور نماز سے فارغ ہو کر سب آرام کی نیند سو سکیں ۔۔۔ رمضان کے دنوں میں گھر میں گانا بجانا بالکل بند ہوتا، اور نانی اماں جو اب سارے کاموں سے ریٹائر ہو چکی تھیں اس بات پر کڑی نظر رکھا کرتیں کہ کہیں کوئی نماز سے تو غافل نہیں ہو گیا ہے اور کسی نے دھیمے سے ریڈیو تو نہیں کھول دیا اس معاملے میں وہ اپنی چہیتی بہو اور لاڈلی نورس تک کو نہ چھوڑتیں ۔۔۔ "اے دلہن میں نے کہا اب بس کام چھوڑ دو کہیں نماز قضا نہ ہو جائے اور بٹی پردین تم بھی اٹھو کیوں آنکھوں کی دشمن ہو رہی ہو بھلا یہ بھی کوئی سینے کا وقت ہے؟ اندھیر اجالا ہو رہا ہے کیا سینے کے لیے دن نہ نکلے گا بٹی ۔۔۔" وہ نند بھاوج کو ٹوکتیں اور پھر ایک مسرانی نظر اماں اور خالہ پر ڈالتیں جو تخت کے ایک گوشے پر جائے نماز بچھائے سر پر رنگین اوڑھنی کا گلدانا

مارے ہاتھ میں تسبیح لیے قبلہ رو بیٹھی ہوتیں اور نانی اماں کا سر فخر و محبت سے اونچا ہو جاتا اور ان کی بوڑھی آواز فرطِ محبت سے کپکپا جاتی "خدا سب کو ایسی نیک توفیق دے" ۔۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر با آواز بلند کہتیں اور تھوڑی دیر کے لیے ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ سجابی کی دلچسپ باتیں اور پروین کے دبے دبے قہقہے رک جاتے، باورچی خانے کی گھما گھمی بند ہو جاتی اور ایک عجیب سا تقدس سارے گھر پر چھا جاتا سب لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو ایسے وقت بقول نانی اماں کے ساری بدروحیں گھبرا کر آسمان کی طرف پرواز کر جاتیں اور پاک فرشتے اپنا سایہ سارے گھر پر پھیلا دیتے۔

وقت یوں بھی نہیں ٹھیرا کرتا اور رمضان کا مہینہ تو خصوصیت سے مصروفیت کا ہوتا ہے روزہ، نماز، افطاری اور پھر سحری ۔۔۔ روزے کی تھکن، نماز کی پابندی قرآن شریف کی تلاوت اور شام کی تیاریاں ۔۔ درمیان میں تھوڑا بہت وقت جو مل جاتا وہ بھی سونے یا باتیں کرنے میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا اور پھر جب سے کمال آیا تھا مہمانوں کی بھی خاصی آمد و رفت تھی۔ سجابی کو تو فرصت برائے نام ہی ملتی مگر پروین بھی زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتی اسے باتوں ہی باتوں میں نانی اماں نے یہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کمال اس کا ہونے والا دولہا ہے اور وہ شرم و لحاظ جو کنواری لڑکیوں کا خاصہ ہوتا ہے اس کا خیال اسے ہمیشہ رکھنا چاہیئے۔

پروین نے گو اچھی تعلیم و تربیت پائی تھی مگر گھر کے سخت ماحول نے اس کی طبیعت میں کچھ ایسی شرم و حیا بھر دی تھی جو اب اس کی طبیعت کا ایک لازمی جزو بن گئی اسی لیے نانی اماں کی حکم عدولی یا نافرمانی اس کے بس کی بات بالکل نہ تھی یہی وجہ تھی کہ صرف تنہائی میں ہی وہ سجابی کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنتی اور جب سجابی مصروف ہوتی تو وہ سارا وقت اپنے کمرے میں پڑھنے یا سینے میں گزار دیا کرتی۔ بننا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اس لیے بڑی بڑی سلائیوں پر ہمیشہ اس کی انگلیاں اتنی تیزی اور مہارت سے چلتیں جیسے کوئی مشین اپنے تمام کل پرزوں کے ساتھ۔ سردیوں کے لیے کسی کو کوئی اونی کپڑا باہر سے خریدنے کی ضرورت نہ ہوتی سب ہی کچھ گھر میں تیار ہو جاتا ۔۔۔

عید کو صرف دو روز باقی تھے نئے نئے کپڑے سیے اور بنے جا رہے تھے نانی اماں عینک لگائے احکام صادر کر رہی تھیں اماں اور خالہ ماں کو سامنے بٹھائے باورچی خانے کے بکھیڑے سلجھا رہی تھیں اور سجابی اور پروین مشین سامنے رکھے کپڑوں کے رنگین ڈھیر میں الجھے بالکل کسی درزی کی دکان کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ کمال باہر سے ٹہلتا ہوا آیا اور آتے ہی نانی اماں کی گود میں دراز ہو گیا ۔۔۔ "بہت تھک گیا ہوں نانی اماں ٹھنڈا پانی پلوایئے" وہ بڑے فرمائشی انداز میں بولا اور نانی اماں ایک دم چونک کر اپنی تھرتھراتی انگلیوں کو اس کے بالوں میں الجھا کر بڑے نرم مگر فہمائشی انداز میں بولیں ۔۔ "لے ہے بیٹا اس طرح کا مذاق نہ کیا کرو ۔۔ روزہ مکروہ ہو جائے گا"

"روزہ ۔۔ تو کیا میں روزہ ہوں" ۔۔ کمال نے سنجیدگی بھری معصومیت سے پوچھا۔

"اے اب تم یہ بھی بھول گئے۔ سحری میں میرے ہی ہاتھ سے تو کھلایا تھا ۔۔ کیوں دلہن"۔۔ ؟ وہ مشین پر

بیٹھی ہوئی دلہن سے مخاطب ہوئیں اور پروین یکایک چونک کر بولیں — جی — جی ہاں . . . .

کمال نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پھر خلافِ توقع نانی اماں کی گود سے ایک دم اٹھ بیٹھا — نظر جا کر اس نے مشین کی طرف دیکھا، رنگوں کا ایک طوفان سا بکھرا ہوا تھا اور بھابی بیر بہوٹی بنی اس طوفان میں مل ہوئی جا رہی تھی اور پھر اس کی نگاہ ٹھٹکی پروین چپ چاپ لمبی لمبی پلکوں میں آنکھیں چھپائے قینچی ہاتھ لیے پھیلتے کپڑے کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں سنبھال رہی تھی۔ کمال کو اس وقت وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آئی — حسین اور معصوم — مگر جلد ہی اس کی نگاہ اچٹ گئی اور دور صحن کے اس پار اس چھوٹے سے کمرے پر جا جمی جہاں دہلیز پر بیٹھی مہرو پھٹے پرانے کپڑوں میں پیوند لگا رہی تھی — کمال نے یکایک نانی اماں سے پوچھا: "ہاں تو نانی اماں آپ نے خاندان کے سب ہی لوگوں کے بارے میں مجھے بتا دیا مگر یہ نہ بتایا کہ رابو ممانی اس حالت کو آخر کیوں کر پہنچیں — ؟"

سوال چونکا دینے والا تھا۔ نانی اماں نے تھوڑا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر ان کی مدد کرنے والا اس وقت وہاں کوئی نہ تھا، خالہ اور اماں چولہے کے پاس مصروف تھیں اور بھابی مشین پر — سنبھل سنبھل کر بولیں — "بیٹا حالت کونسی بری ہے وہی تو کھاتی ہیں جو ہم سب کھاتے ہیں اور اسی گھر میں رہتی ہیں جہاں ہم تم سب رہتے ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ تھوڑا بہت کام زیادہ کر لیتی ہیں سو یہ کوئی بری بات تھوڑی ہی ہے۔ تم ہی بتاؤ گھر کا کام کون نہیں کرتا میں تو خیر چلنے پھرنے سے معذور ہوں مگر تمہاری اماں، خالہ، بھابی اور پروین تک تو سب ہی کرتے ہیں —"

نانی اماں نے فرق کی جو حدِ فاصل تمام گھر والوں اور رابو ممانی کے درمیان کھینچی تھی وہ کمال کی نظر میں کچھ جچی نہیں اس لیے بولا — "مگر ممانی ہمارے ساتھ رہتی کیوں نہیں سب سے الگ تھلگ صحن کے اس پار ایک اکیلی چھوٹی سی کوٹھری میں کیوں پڑی ہیں اور پھر مہرو — آخر وہ بھی تو پروین کی ہم عمر ہے پھر وہ کیوں دن رات چولہے میں گھسی آگ اور دھوئیں کا شکار ہوا کرتی ہے کیوں نہیں بھابی سے گھل مل کر باتیں کرتی کیوں نہیں اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹتی کیوں نہیں آپ کے ہاتھ سے کھانا کھاتی — آخر کیوں — میں نے تو اسے آج تک اس طرف آنے نہیں دیکھا کیا وہ ان ساری آسائشوں کی مستحق نہیں — ؟" کمال جانتا تھا کہ یہ موضوع نانی اماں کے لیے ناگوار ترین ہے اور وہ اس پر کبھی کسی سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار جب وہ بھولے سے جا کر چوکی پر مہرو کے قریب بیٹھ گیا تھا تو نانی اماں کا مزاج کتنا بگڑ گیا تھا پھر بھی — اس نے کن انکھیوں سے دیکھ کر نانی اماں کی بے انتہا محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس بات کو چھیڑ ہی دیا —

" اے لو — انھیں کسی نے منع تھوڑا ہی کیا ہے کہ وہ اس طرف نہ آئیں تم دیکھو تو خیر سے دلہن نے مہرو کے لیے عید کے کپڑے بھی سی دیئے ہیں —" نانی اماں کی انگلی کی سیدھ میں کمال نے دیکھا ساٹن اور اطلس کے درمیان چھینٹ کا ایک جوڑا بھی بڑی بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا — "اور بیٹا جن عورتوں کے شوہر مر جاتے ہیں ان کے لیے دنیا میں

رہ ہی کیا جاتا ہے کام کاج ہی میں تو وہ اپنی باقی زندگی گذار دیتی ہیں ـــــ" نانی اماں کی آواز اپنے اکلوتے جواں سال بیٹے کی موت یاد کرکے بالکل تھرا گئی اور چند ملگجے آنسو ان کی آنکھوں سے ڈھلک کر ان جھریوں دار رخساروں پر بہتے چلے گئے۔ رابعہ کی شادی کو ابھی ایک سال ہی ہوا تھا اور ننھی مہرو عالم وجود میں آنے ہی والی تھی کہ ان کے جواں سال بیٹے کا دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک انتقال ہو گیا۔ اسی دن سے وہ اس بچی کو منحوس اور بہو کو بدفال سمجھتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ گھر کی بڑی بہو ہوتے ہوئے بھی شوہر سے محروم ہو جانے کے بعد رابعہ دلہن ساس اور نندوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ماماؤں کی سی زندگی گذار رہی تھیں اسی گھر میں جہاں کبھی وہ بڑے ٹھاٹ سے راج پاٹ کیا کرتی تھیں اور ان کی اکلوتی بچی مہرو ـــــ سب کی نگاہوں کا کانٹا باپ کے چھوڑے ہوئے ورثے اور رتبے سے محروم سب کے آرام و اطمینان کی خاطر محنت کی سخت چکی کے درمیان اپنی نوخیز جوانی کو سمیٹے شب و روز پستی چلی جا رہی تھی۔

"تو آپ سمجھتی ہیں ماموں ابّا کی موت کی قصوروار رابعہ ممانی ہیں ـــ" کمال نے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا۔ قدم کی برکت بڑی چیز ہوتی ہے بیٹا جب سے رابعہ بیاہ کے آئی میرا بیٹا ایک دن بھی اچھا نہ رہا اور خدا کی مار اس بچی پر اس کی پیدائش کیا ہوئی میرے بیٹے کی موت کا پیغام ہو گئی۔" نانی اماں اپنی جلی کو کہہ پر بلک بلک کر رونے لگیں اور روتے روتے ہی کچھ دیر کے لیے رک کر بولیں۔

"ایک تمھاری خالہ بھی ہے جب بیاہ کر گئی تو بیٹا اللہ رکھے تمھارے خالو کی نوکری میں ترقی ہوئی اور جب پروین پیدا ہوئی تو ـــ تو گھر میں دھن کی بارش ہو گئی خدا رکھے وہ نائب تحصیلدار سے تحصیلدار بن گئے ـــ"

نانی اماں کہتی رہیں اور کمال خلاؤں میں تکتی جائے زندگی کے اس اتار چڑھاؤ پر سوچتا رہا وہ کمال جو ہنسنے اور شرارت کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا آج پہلی بار زندگی کے سیاہ رخ سے نقاب اٹھا کر اس کے چھپے ہوئے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا ـــ اس دن جب سحری کے بعد سب سو گئے تو وہ چپکے سے نظر بچا کر رابعہ ممانی کی کوٹھری میں داخل ہو گیا ـــ مہرو زمین پر میلی سی سوزنی بچھائے غفلت کی نیند سوئی پڑی تھی اور رابعہ ممانی ایک ٹک نظر جما کر آسمان کے ستاروں کو دیکھے جا رہی تھیں کمال جب بالکل قریب پہنچا تو وہ چونک کر ایک دم اٹھ بیٹھی اور کمال کو اپنے اس قدر پاس دیکھ کر پہلے تو بوکھلا سی گئیں پھر دونوں ہاتھ اس طرح کھول دیے جیسے اسے اپنے سینے میں بھر لینا چاہتی ہوں۔

"ممانی ـــ" وہ اس پراسرار ماحول سے گھبرا کر آہستہ سے بولا اور ممانی کی آنکھوں سے پندرہ سال کی رکی تھمی گنگا جمنا بہہ نکلی بغیر کچھ کہے اس نے اپنا سر دھیرے سے ممانی کی گود میں رکھ دیا اور بڑے اطمینان سے لیٹتے ہوئے بولا۔

"ـــ ابھی تک جاگ رہی ہو ممانی ـــ سوئیں نہیں ـــ؟" اور ممانی نے جواب دینے سے پہلے ایک بار نیچے بچھی ہوئی میلی چادر کو اور پھر کمال کے صاف ستھرے کپڑوں کو دیکھا اور ان کی خاموش آنکھوں سے یہ ڈر علانیہ طور پر

جھڑکنے لگا کہ اگر اس طرح لیٹنے سے تمھارے کپڑے میلے ہو گئے تو...... تو...... مگر کمال نے کوئی پروا کیے بغیر اپنے دونوں پیر پھیلا دیئے اور بولا " آپ...... آپ مہرو کو کسی اسکول میں کیوں نہیں داخل کروا دیتیں ـــــ"
ممانی زندگی میں پہلی بار یہ انوکھا سوال سن کر گھبرا سی گئیں پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں " کون اسے اسکول بھیجے گا اور جو وہ چلی بھی جائے تو ـــ تو گھر کا کام کون سنبھالے گا بیٹا ـــ پکانا، برتن مانجھنا سب ہی کچھ تو ہے میری تو آنکھیں اب اس قابل بھی نہیں رہیں ـــ" اور پھر ممانی کا گلا اپنی پچھلی پندرہ سالہ مصیبت کی ماری زندگی پر بھر آیا اور ان کی آواز ان کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ کمال نے ان مٹیالی آنکھوں کو غور سے دیکھا جو روتے روتے شاید اب بالکل ماند سی ہو چلی تھیں اور اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا " میں عید کے بعد ملازمت پر چلا جاؤں گا آپ میرے ساتھ چلی چلیں ہم وہاں مہرو کو کسی اچھے اسکول میں داخل کروا دیں گے اور...... اور...... مگر اس سے پہلے کہ کمال کچھ اور بھی کہتا ممانی نے فرط مسرت اور شدت جوش سے لرزتی آواز میں کہا ـ کمال ـــ اور ان کی آواز مارے درد کے پھنس کر رہ گئی اور آنسوؤں کا بہتا ہوا تیز رفتار دھارا رخساروں پر یوں جم کر رہ گیا جیسے کسی نے تیز رو دریا کے سامنے بند باندھ دیا ہو۔ دو منٹ کے لیے کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا جیسے صرف مہرو کی سانسوں کے زیر و بم کی خفیف سی آواز توڑ رہی تھی اور بس ـــ
" مگر بیٹا تم ایسا نہ کر سکو گے ـــ" ممانی نے ذرا سنبھل کر کسی انجانے خوف سے لرز کر کہا ـ کمال ان کی گود سے اٹھ بیٹھا اور بڑے استوار لہجے میں بولا ـــ " آپ اس کی فکر نہ کریں "
رات نے اپنے پھیلے گیسو سمیٹ کر اکٹھا کر لیے تھے اور اب صبح بڑے دلکش انداز میں قدم قدم اترتی آسمان کی بلندیوں سے زمین کی طرف چلی آ رہی تھی کمال اٹھ کھڑا ہوا ممانی نے جھک کر اس کے ماتھے کو چوما اور کمال نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سوتی ہوئی مہرو پر ڈالی جس سے نیلے دوشالے میں اسے ایسا لگا جیسے چاند صبح کی آمد پر آسمان کے دبیز نیلے پردوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا ہو اور وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔
اگلا دن اس طرح گذر گیا کہ نہ ہی کمال کو اس کی خبر ہوئی اور نہ ہی ممانی کو ـــ ممانی کے لیے پندرہ سال بعد ایسی صبح طلوع ہو رہی تھی جو واقعی عید سے کسی طرح کم نہ تھی اور کمال کے لیے نئی صبح ایک ایسی انوکھی اور میٹھی کھٹک لیے طلوع ہوئی تھی جس سے وہ آج تک ناواقف تھا جو اس کے دل میں نہ پردوں کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی بھابی کو چھیڑ کر۔
عید کا دن اچھا خاصا قیامت کا دن تھا گھر میں کان پڑے آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ نانی اماں کے احکام، اماں اور خالہ کی چیخیں، بھابی اور پروین کی تیاری اس پر ابا، خالو ابا اور بڑے بھیا کی دھوم نہانا، ناشتہ کرنا، عیدگاہ جانا اور پھر سب سے عید ملنا ـــ
ابا، خالو ابا اور بڑے بھیا سے عید مل کر وہ سب سے پہلے نانی اماں کے پاس آیا۔

"نانی اماں ــ تسلیمات ــــ" وہ قدمبوس ہونے کے لیے جھکا اور نانی اماں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے چٹ چٹ بلائیں لے کر کہا ــ " نظر بددور آج تو بالکل شہزادہ لگ رہا ہے ــ" قریب ہی سے خالہ نے کہا ــ کیوں نہ ہو لباس سے آدمی کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے بھلا دیکھو تو آج کی اور روز کی شکل میں کتنا فرق ہے موا وہ بھی کوئی لباس ہوا بالکل فرنگیوں جیسا ــ ڈھیلا ڈھالا بے ڈھنگا قمیص اور پتلون ــــ میں تو باز آئی ــــ"
اور پھر انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ممتا بھر کے اسے اس طرح تولا جیسے کہتی ہوں ــ " ماشاءاللہ کیا کہنے ہیں نظر نہیں لگتی اور ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا جب ایک دن ایسے ہی مشجر کی شیروانی اور تاش کی سنہری دستار لگائے میری پروین کو بیاہنے آئے گا تو لوگوں کی آنکھیں واقعی چکا چوند ہو جائیں گی ــــ مانو چاند آسمان سے زمین پر اتر آیا ہو۔"
نانی سے مل کر وہ خالہ کی محبت بھری نگاہوں کے سائے میں اماں کی طرف بڑھا اور پھر ایک لمحے کے لیے اسے ایک بالکل نیا سا احساس ہوا جیسے سکون اور اطمینان کا لازوال خزانہ اس کے سر پر اپنا ٹھنڈا سا سایہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ماں کا سینہ تھا کتنا پرسکون اور امیدوں سے بھرپور، یہاں سے بڑھ کر وہ بھابی کے پاس چلا ــ خطرہ محسوس کر کے بھابی پہلے ہی سنبھل گئی۔
"آج تو بھیا کی موت ہے ــ" وہ جھک کر بھابی کے کان میں بولا بھابی نے ہنس کر تھپڑ اٹھایا آج بھی دیور جس کے آگے ہمیشہ ان کی خود اعتمادی نے چوٹ کھائی اور جس سے بچنے اور دور رہنے ہی میں انھیں ہمیشہ اپنا بھلا نظر آیا بالکل بچے کی طرح لگا نہ جانے کیوں ماں نہ ہوتے ہوئے بھی ممتا کی محبت اور جوش بھابی کے سینے میں ابل پڑا اور انھوں نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ــ " چلیے کدھر ــــ پہلے اپنی موت کا سامان تو دیکھتے جاؤ ــــ"
کمال نے مڑ کر دیکھا بازو والے دروازے سے پروین اس طرح نمودار ہو رہی تھی جیسے رات کے دھندلے آسمان پر چودھویں کا پورا چاند ــــ۔
"اوہ ــ" وہ مسکرایا اور قریب جا کر بولا ــ " آداب عرض کرتا ہوں ــــ سنا ہے آج آپ بھی عیدی دینے والی ہیں ــــ لائیے ــــ" اس نے اپنا ہاتھ پروین کے آگے پھیلا دیا۔ پروین اس ناگہانی اور غیر متوقع حرکت پر سٹپٹائی اور لاچار نظروں سے بھابی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ــــــ " اس مصیبت کو لائی ہو تو خود ہی دور کرو۔" بھابی نے پروین کی بے چارگی کو محسوس کیا اور جھٹ سے بولی ــ " بے شرم کہیں کے۔ لاج نہیں آتی ــ اگر نانی اماں نے دیکھ لیا تو ــــ؟"
"تو میں کیا کروں ــ میں نے کونسا قصور کیا ہے۔ کہہ دوں گا بھابی مجھے مقتل میں لیے جا رہی ہیں ــ"
"ہائے اللہ" ــ بھابی اپنی جگہ ڈول کر رہ گئی اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ یہ ہمیشہ شرارت کرنے والا لڑکا اتنا ذہین بھی ہو سکتا ہے ــ بولی ــ " بس اب آگے بڑھو۔ بہت ہو چکا ــ"

"جو حکم —" وہ تعمیل حکم میں ذرا سا جھکا اور بولا — "چلیے آپ کو بھی پہنچا دوں، بھیا کب سے کمرے میں اکیلے انتظار کر رہے ہیں —"

"ہٹ" بھابی پھر اسے مارنے دوڑیں اور وہ ہاتھ پکڑ کر بولا "بھابی۔ تم ہو کتنی۔ اتنی ذرا سی تو ہو میں تو تمھیں ایک ہاتھ سے اٹھا لوں پر بھیا —" وہ پلٹ کر مسکرانے لگا۔

"بھیا ذرا کمزور ہیں —" اس نے جلدی سے کہا اور اس سے پہلے کہ بھابی اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہوتی ان کی زد سے بچتا بچاتا نکلا چلا گیا۔

بھابی نے اس کے جاتے ہی اطمینان کا لمبا سانس لیا اور ماتھے سے پسینہ پوچھنے لگیں — "خدایا کتنا شریر ہے" وہ دھیرے سے بڑبڑائیں اور پھر دین — وہ اپنی جگہ بت کی طرح کھڑی یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور جب کمال چلا گیا تو اس کی نظریں آہستہ آہستہ پلٹ آئیں۔

کاش کمال مڑ کر دیکھتا پھر اسے نظر آجاتا کہ ان نظروں میں اس کے لیے کیا کچھ نہیں — آرزو، ارمان، التجا اور سکون و اطمینان کا ایک لمبا سہانا سپنا مگر وہ تو چھلاوے کی طرح آیا اور گذرا چلا گیا جیسے کوئی پھول اپنی خوشبو فضا میں چھوڑ کر کسی ان دیکھے انجانے گلچین کی جھولی میں جا پڑا ہو۔

اس گہما گہمی سے ہٹ کر جب وہ صحن کے اس پار پہنچا تو دیکھا مہرو کمرے کے ایک کونے میں کھڑی اپنے ایک ہاتھ سے رات کی مہندی جھڑا رہی ہے اس نے اب تک نہ کپڑے ہی بدلے تھے اور نہ ہی بال بنائے تھے بھابی کا سیا ہوا چھینٹ کا جوڑا فرش پر ایک طرف دھرا ہوا تھا اور وہ روزمرہ کے میلے کپڑوں ہی میں اب تک ملبوس تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا ممانی کی غیر موجودگی میں کمرے میں جانا ٹھیک نہیں پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ دبے قدموں آگے بڑھا اور پیچھے سے اپنے دونوں ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے —

"کون —" مہرو کا سارا جسم خوف اور ڈر سے لرز کر رہ گیا۔

"بوجھو —" کمال نے آہستہ سے کہا۔

مہرو نے زور لگا کر ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا دیئے اور پھر کمال کو اپنے آگے پا کر حیرت و استعجاب کی ایک چیخ اس کے ہونٹوں پر آئی مگر کمال نے جھٹ اپنے ہاتھ سے اس چیخ کو وہیں روک دیا

"چلاؤ نہیں — ذرا دھیرے بولو۔ کیا مجھے شہر بدر کرانے کا ارادہ ہے —؟" وہ بولا

"آپ —" مہرو مارے ڈر کے تھرتھرائی۔

"ہاں میں — تمھیں تعجب ہے —" کمال کی آنکھوں میں کچھ ایسی نرم چمک اتر آئی کہ مہرو کا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا اس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ چاند اس طرح آسمان سے اتر کر بے کھٹکے اس کے کمرے میں

چلا آئے گا، سہانے سپنے جو صرف اس کی بند آنکھوں میں تھرتھرایا کرتے تھے یوں زندہ و متحرک ہو کر اس کی کھلی آنکھوں کے آگے مجسم ہوں گے۔

خدا کے لیے جائیے ۔ کوئی دیکھ نہ لے ـــــ" وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی ۔" میں منت کرتی ہوں یہاں نہ ٹھہریئے ـــ" اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمال کے آگے جوڑ دیے۔

"نہ گھبراؤ مہرو میں جا رہا ہوں واقعی مجھے یہاں نہ آنا چاہیے تھا مگر ـــ مگر وہ ایک منٹ کے لیے ہکلایا اور پھر الفاظ جما جما کر بولا مگر تم جانتی ہو آج عید ہے سب تحفے لے رہے ہیں، دے رہے ہیں میں بھی تمھارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں تم اسے قبول کر لو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اس نے ملتجی آنکھوں سے مہرو کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ نہ سمجھ سکی زندگی میں آج پہلی بار کسی نے اس سے ایسے التجا آمیز انداز میں بات کی تھی اور پھر وہ بھی کون ـــ کمال ـــ جو سارے لوگوں کی آنکھوں کا تارا تھا سارے گھر کا راج دلارا ـــــ اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں جیسے کہنا چاہتی ہو ـــ" تو جلدی سے دے دو اور چلے جاؤ ـــ"

اس کی آنکھوں کو اس طرح اوپر اٹھتے دیکھ کر کمال آہستگی سے آگے بڑھا اس نے دھیرے سے مہرو کے دونوں ہاتھ پکڑے ـــ تازہ مہندی کی بھینی بھینی مہک اور سرخ خون سی ہتھیلیاں کمال کا سر ایک منٹ کو چکرا سا گیا بے خودی کی سی حالت میں اس نے آگے بڑھ کر مہرو کو اپنی دونوں باہوں میں سمیٹ لیا اور پھر دھیرے دھیرے کسی مقناطیسی اثر سے کھنچتا ہوا وہ جھکا اور پھر تڑپ کر اس نے اپنے جلتے ہوئے گرم ہونٹ مہرو کے نرم کومل ہونٹوں پر رکھ دیے ـــ

ایک ثانیہ اس حالت میں گذرا پھر وہ فوراً اس سے الگ ہو کر بولا ـــ" تمھاری عیدی ـــ اور اب لاؤ میرا تحفہ ـــ" اس نے اپنا ہاتھ کسی مجبور سائل کی طرح مہرو کے سامنے پھیلایا مگر اس میں اتنا دم ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ کچھ دے سکتی ۔

"نہیں دوگی ـــ خیر نہ سہی میں آج ممانی اماں سے اپنا حق مانگوں گا ـــــ ہاں آج ـــ اس خوشی و مسرت کے دن ـــ عید کا تحفہ ـــــ جانتی ہو کون سا ـــــ ؟" اس نے پھر دھیرے سے مہرو کی بے جان تھوڑی کو اونچا اٹھایا اور پھر جھپٹ کر باہر نکل آیا ـــــ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور آنکھیں ایسی متوالی جیسے ابھی ابھی جام منہ سے ہٹایا ہو۔

دروازے کی دراز سے رابعہ بیگم نے یہ سب کچھ دیکھا ان کی آنکھیں تیزی سے بھیگتی چلی گئیں ـــــ یہ آنسو بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں یہ صرف غم ہی پر نہیں برستے بلکہ خوشی کے موقع پر بھی آپ ہی آپ بہنے لگتے ہیں. انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا کی بارگاہ میں شکریہ ادا کیا کہ بالآخران کا حق جو پندرہ برس سے دن دھاڑے لوگوں کی آنکھ

میں دھول ڈال کر چھینا جا رہا تھا آج پھر انھیں واپس مل گیا۔ آنسو پونچھ کے وہ جلدی سے کمرے میں داخل ہوئیں اور مہرو کی طرف دیکھے بغیر کانپتے ہاتھوں سے اس گٹھری کو کھولنے لگیں جس میں ایک ایک چیز کر کے نہ جانے انھوں نے کیا کچھ جمع کر رکھا تھا اب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ یہ ساری چیزیں تن تنہا نہ دیکھیں بلکہ دنیا کو بھی بتا دیں کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے وہ بھی کچھ بڑی محنت سے جوڑ کر جمع کر سکی ہیں۔

ادھر خالہ اماں مہمانوں سے کہہ رہی تھیں —— ارے ایسی ایسی تو ابھی بہت سی عیدیں آئیں گی خدا رکھے پروین اور کمال کو ان کے صدقے میں ہم بھی اپنی آرزوئیں پوری کر لیا کریں گے۔ ذرا دیکھو تو میں نے اس شادی کے لیے کیا کچھ نہیں جمع کیا ہے —— بڑے بڑے صندوق کھلنے لگے اور مہمانوں کے ساتھ ساتھ خالہ اماں اور نانی اماں کی ناتواں آنکھوں میں بھی روشنی کی ایک تند لکیر تیرتی چلی گئی۔

کمال نے برآمدے میں رک کر یہ سب کچھ دیکھا ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ اسی طرح مسکراتا ہوا تیزی کے ساتھ باہر نکل کر چلا گیا جیسے اسے اتنی لمبی فرصت نہ رہی ہو کہ ایک منٹ رک کر ہی اس بیش بہا سامان پر ایک نظر ڈال لیتا۔

واجدہ تبسّم

جی کا جنجال

بڑے میاں دستر خوان پر سے اٹھے — ہاتھ دھوئے — کلّی کی اور رومال سے منہ پونچھتے، آنگن میں آ تخت پر چڑھ، پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے —

"ارے بنّے — خلال کی ڈبیہ تو لائیو —" حسب معمول انہوں نے ہانک لگائی۔

بنّے ڈبیہ لے کر آیا تو چپکے سے پوچھا — "کیوں بے بنّے یہ قبلہ کدھر ہے —؟"

بنّے ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا اور ساروں میں سنا گیا "ارے بڑے ابا قبلے کو پوچھتے ہیں —"

اب بات تو اتنی قابل تعجب بھی نہ تھی — کون سے سجدوں میں سر دیئے بیٹھے تھے کہ قبلے کعبے کی خبر رہتی مگر پھر بھی حیرت کی تو بات ہی تھی —

"چپ بے ہنسے جاتا ہے نامعقول —" بڑے ابا نے گھُرکی دی اور بنّے بگڑے تیور دیکھ کر کھسک گیا —

بڑے ابا نے ڈبیہ کھولی۔ نیم کی تیلی نکالی اور خلال کرنا شروع کر دی۔

کھٹکے سے دادی بی کی آنکھ کھل گئی۔ کنکھنی آنکھوں سے انہوں نے دیکھا — بڑے ابا لوٹا اٹھا کر باہر نکل رہے تھے — دادی بی کو کیا پڑی تھی کہ پیچھا اٹھاتیں — کروٹ لے کر سو رہیں — مگر پانچ دس منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ بڑے زوروں پر نماز پڑھنے کی آواز آنے لگی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا — دادی بی نے وہیں تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑے ابا نماز پڑھ رہے تھے —!!

نیند دادی بی کی آنکھوں سے اڑ کر دور بھاگ گئی — اک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں — آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ یہ بڑے ابا ہی ہیں! وہی تو تھے — ہری چوخانی کی تہبند اور ڈھیلا چارکلی کا ململ کا کرتا پہنے سر پر آڑی ٹوپی رکھے بڑے جلال میں آئے پڑھے چلے جا رہے تھے، اللہ اکبر — اللہ اکبر —

صبح دادی بی نے اٹھ کر سب سے کہا "لے سنتے ہو جی — صبح مظہر میاں نماز پڑھ رہے تھے:

— "کیا بات کرتی ہو اماں —؟ بھلا بڑے بھائی اور نماز پڑھیں —؟؟"

بات اتنی بعید از قیاس تھی کہ دادی بی کے لاکھ یقین دلانے پر بھی کسی کو یقین نہ آیا۔

بڑے ابا بھی بس اپنی طرح کے ایک ہی تھے ــــ ہر حرکت انوکھی اور ہر عادت نرالی ۔ دادی بی کو بیسا کیسا غصہ آتا ان کے خلال کرنے پر ــــ مگر یہ سنتے کہاں تھے ــــ بڑے ابا کا معمول تھا کہ ہر کھانے کے بعد خلال کرتے ۔ گھر بھر کے بچے پچھواڑے کے نیم نیچے سے تیلیاں جمع کر کے لاتے اور گڑیاں سی بنا بنا کر رکھ لیتے ۔ بڑے ابا پیسے پیسے کو ایک ایک گڈی خریدتے تھے اور مزے سے خلال کرتے ۔ روز کا معمول تھا ادھر کھانے پر سے اٹھے ــ کلی کی، ہاتھ دھوئے، کاندھے پر پڑے رومال سے منہ پونچھتے آنگن میں آ، تخت پر چڑھ، پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے اور آواز لگائی ــ

"ارے بچے ذرا خلال کی ڈبیہ تو لائیو"

ادھر ڈبیہ آئی اور خلال چلنی شروع ہو گئی ــ دادی بی جل کر بولتیں ــ

"اے ہاڑ پٹے نے لکڑیاں چلا چلا کر اچھے خاصے دانت موئے کھل کھلے کر لیے ـ"

اب یہ تو دادی بی بھی جانتی تھیں کہ دانت کھل کھلے عمر بھر ہوئے تھے یا واقعی خلال نے اپنا رنگ بتایا تھا ــ بڑے ابا دادی بی کے بچوں میں سب سے بڑے تھے ــ چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادی ہو گئی ہوا گئی ــ بچے چھوڑ پوتے نواسوں والے ہو گئے مگر بڑے ابا دہی کے دہی رہے۔

بڑے میاں اور چھوٹے میاں کی نسبت ساتھ ہی ساتھ بھیجی گئی تھی۔ اب یہ تو اللہ ہے جسے چاہے نواز دے ــــ مگر بات دراصل یہ تھی کہ چھوٹے میاں دیکھنے دکھانے میں بھی اچھے تھے اور ذرا چار حرف پڑھ گئے تھے ــــ بیٹی والوں نے چھوٹے میاں کو تو ہاں کا جواب دے دیا اور بڑے میاں کے لیے صاف کہہ دیا ــــ

"ہماری بیٹی بھیّا میں بہہ کر تھوڑی آئی ہے کہ اٹھا ماریں ــــ"

اب صاف سیدھی طرح جواب ملتا تو کیا برائی تھی ــ؟ مگر انھوں نے تو بس منہ پھوڑ طعنہ بھیّا کا دیا ۔ بڑے میاں کو وہ تن تنا کر غصہ آیا کہ سارے میں پیٹ دیا ــ

"شادی وہ کرے جس نے سؤر کا گوشت کھایا ہو ــــ"

اب بھائی بند بچار ہے ہیں ــ دوست احباب سو سو باتیں ملا رہے ہیں ــ بجائے اس کے کہ قسم توڑتے الٹے برس پڑے ان ہی پر، اور بولے ــ" شادی کروں گا تو ند باپوں کی اولاد سمجھ لینا ـ"

یہ گالی تو صاف دادی بی پر پڑتی تھی ــــ بھلا دادی بی نے ایسا کیا قصور کیا تھا کہ ایسی باتیں سننے کو ملیں ــــ؟

"جائے موا چولھے بھاڑ میں ـــــ ہماری عزت لوٹے لیتا ہے "

اور دادی بی نے تو سنہ بھر کے قسم کھائی کہ "شادی کرنے کا بولوں تو دو مردوں کی جورو سمجھ لینا" لو بھلا اب ماں ہی دخل نہ دیں تو کس کی چیندیا کھجلائی تھی کہ منہ سے چوں بھی کرتا ـــــ ؟ ؟

سیلاب کا پانی اور جوانی کا زور روکے نہیں رکتا ـــــ بڑی پارسائی کا دعویٰ کیے بیٹھے تھے بڑے میاں ـــــ آگے پیچھے سے، اندھیرے اجالے میں، کونے کھدرے میں جہاں کسی کا منہ دیکھا اور باچھوں سے رال ٹپکی ـــــ یہ ضرور تھا کہ شادی نہ کرنے کا جو عہد کیا تھا سو پورا کر دکھایا ـــــ مگر یہ تو سارے خانوادے کو معلوم تھا کہ حضرت بری باتوں میں پڑ گئے ہیں ـــــ ایسے اوچھے دادی بی نے کاہے کو دیکھے ہوں گے ـــــ اپنے بیٹے سے تو ابولا بندھا تھا مگر پھوپھی خالہ سے کہلوایا بھی کہ ـــــ "ارے حرامزادے ـ چھوڑ یہ چال ـــــ سیدھی طرح رہ ـــــ" مگر وہ تو اس کانوں سنتے اس کانوں اڑا دیتے ـــــ !

جھوٹ سچ کون اڑائے ـــــ اللہ کو منہ دکھانا ہے ـــــ سامنے عاقبت ہے ـــــ سننے میں تو یہی آتا تھا کہ بڑے میاں نے لال منہ کی بندریا بھی نہ چھوڑی ـــــ شہر بھر میں ہر کنکالہ کا پتہ ان ہی سے پوچھ لو ـــــ فلانی کی آواز میں رس ہے ـــــ فلانی کی آنکھ میں زہر ہے ـــــ اس کا جوبن پھٹا پڑ رہا ہے ـــــ اس کے بدن میں مستی ہے ـــــ ارے ایک بات تھی! یہاں تو جب بڑے میاں بیٹھ گئے دفتروں کے دفتر کھل گئے ـــــ بس بڑے میاں ہیں اور رنگارنگی باتیں ـــــ

پیپل کی ٹیک والی مسجد سے لگ کے میواتیوں کا محلہ تھا ـــــ ان میں روہیلے بھی تھے ـــــ جو سرحد پار کر کے ہندوستان باہر سے آئے تھے ـــــ ان کی عورتیں کیا تنومند کیا چوڑی چکلی ہوتیں کہ بڑے میاں ایسوں کی رال تو ٹپکتی ہی تھی ـــــ بڑے مسجدوں کے ملّا بھی دم چھوڑ دیتے ـــــ ان ہی میں ایک خان پٹھان بھی تھا ـــــ نام و نام تو کس کو معلوم تھا سب خان سا ب خاں ساب بولتے تھے ـــــ اس کی ایک چھوکری تھی ـــــ نام تھا گلابو تھی بھی کم بخت گلابی گلابی ـــــ سفید چکنی مٹی میں جیسے گلاب کی پتیاں گوندھ کر اللہ میاں نے اسے انسان کے روپ میں ڈھالا تھا ـــــ کرتا سدا کھلے گلے کا پہنتی ـــــ بہ جھونجل کی جھونجل چاندی کی زنجیر ـــــ موٹے موٹے بٹنوں میں اٹکی ہوئی آدھے بٹن کھلے ـــــ آدھے بٹن بند ـــــ اور چلتی تو ایسی تھرک تھرک کر کہ بوٹی بوٹی جگہ چھوڑ دیتی ـــــ بال بال اچھل اچھل کر چلتے ہوؤں کو مخاطب کرتا ـــــ کھلی رکھنے کی جگہ کو بند رکھتی اور بند رکھنے کی جگہ کو ہوا کھلاتی پھرتی ـــــ بیٹی تو ایسی ہی تھی پر باپ بڑا ناک والا تھا ـــــ اپنے بھائے تو بیٹی کو سات پردوں میں بٹھا کر رکھتا مگر وہ حرافہ سارے باڑے میں کدکڑے لگاتی پھرتی ـ دیکھنے والوں کی آنکھیں کون بند کرے ـــــ سامنے آتی چیز تو سب ہی دیکھتے ہیں ـــــ اور یوں بھی چڑھتا چاند کس سے چھپا رہ سکا ہے ؟

بڑے میاں نے بھی دیکھا۔ دیکھا کیا بس ریجھ گئے اور ایسے ریجھے کہ دادی بی کی تجوری سے ان کے چڑھاوے کے چھ تولے کے کنگن لے جا کے بدمعاشوں کے ہاتھ سونپ آئے کہ کیسا بھی کر کے وہ لونڈیا اڑا لاؤ۔ ان کا کیا جاتا تھا۔ اک میں رہے اور موقع ملتے ہی اسے اٹھا لائے۔ انھوں نے جی بھر کے کھیل کھیلے۔ خوب خوب باغ مانی کی۔ باپ کو پتہ چلا اس نے تیرے میرے کو ملا کر گواہیاں ثابت کیں اور بڑے میاں دھر لیے گئے۔

وہ تو جیسی بھی پڑی بھگت گئے مگر دادی بی کا اور سب ہی کا یہ خیال تھا کہ اب کبھی وہ تیری میری لڑکی پر دانت نہیں جھکائیں گے مگر بڑے میاں کی جوانی کا زور بھی وہ زور تھا کہ بارہ گھوڑے بھی ہیچ تھے۔ جانے ادھر کی مستی بھری پڑی تھی کہ کھری باتوں کی چارپائیاں لوٹ لوٹ کر چورا کر ڈالتے۔ نواڑ کے پلنگوں کا تو ذکر ہی کیا تھا۔ دادی بی نے آنگن سے سارے پلنگ چارپائیاں اٹھوا کر ان کے لیے تخت ڈلوا دیا تھا۔

انھوں نے توجب سے دو باپوں کا طعنہ دیا تھا ماں نے منہ پھیر لیا تھا مگر یہ بڑی سعادت مندی سے اب بھی روزانہ صبح ماں کو سلام کرنے جاتے۔ اب یہ ماں کے دل پر تھا کہ دعا دے دے یا بددعا دے دے۔ منہ سے بھلے ہی کچھ کہہ لیں مگر دل ہی دل میں اب بھی بھڑکتی تھیں۔ سارے میں بدنامی ہو گئی تھی اس پر کڑھتی بھی تھیں۔

"اب جو کر لیا سو کر لیا۔ ابھی بھی موئی مونڈی کا ادھاندل گھائی مچاتا پھرتا ہے۔ چین سے گھر کیوں نہیں جوڑ لیتا۔" ان کے کانوں تک مگر پہنچاتا کون؟ اور پہنچ بھی جاتی تو مانتا کون؟

بیٹے خلال کی ڈبیہ لاتا اور یہ دانتوں کی خبر لینی شروع کر دیتے۔ دانت دکھو نویوں بھاگنے کو آمادہ جیسے بچے "چھپا چھپائی" میں ایک دوسرے کو لوٹنے پر تلے ہوں۔ اگوشت میں ڈھیلاپن بھی آ رہا تھا۔ دو چٹکیوں میں پکڑنے سے مٹھی سی ہاتھ میں آ جاتی تھی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ بدن کو ہاتھ لگاؤ تو ایسا کسا بندھا تھا کہ ستار جیسی دھن دھن آواز نکلتی۔ مگر اتنے گئے گذرے ہو کر بھی ہر گنوں پورے تھے۔ نماز تو شبیر میاں کے جنم کے وقت ہی پڑھی ہو تو پڑھی ہو۔ اور اب شبیر میاں اللہ کے فضل سے دو بچوں کے باپ تھے۔ عید بقر عید کی نمازوں سے تو خدا واسطے کا بیر تھا۔ عید بقر عید جیسے دنوں میں بھی، کہ برس کا ایک دن ہوتا ہے۔ مزے سے دس گیارہ بجے اٹھتے۔ منہ ہاتھ دھو باہر نکل جاتے۔ اور پھر وہی رات کے بارہ بجے۔ دو بجے اور تین بجے کی خبر لاتے۔ کبھی تو سورج نکلے اپنی صورت دکھاتے۔ بچے بولتے۔ "بڑے ابا۔ نماز پڑھنا۔"

تو تن تنا کر بولتے۔ "تمھارے جنازے کی نماز پڑھیں گے۔ ابھی سے کیا پڑھنا۔"؟

نیاز۔ نذر گیارھویں سے یوں دور بھاگتے جیسے پکا دین دار نمازی شراب کباب سے بھاگے۔ اب تو عمر پچاس سے بھی ڈھلک رہی تھی۔ اس عمر میں تو سب ہی سنبھل جاتے ہیں۔ ان کا ڈھنگ سب سے

نرالا تھا بلکہ دو ہاتھ اونچے ہی تھے ـــ

کمال میاں کی شادی کا وہ دھوم دھڑکا تھا کہ لوگ راتوں کو سونا تک بھول گئے ـــ بڑے گھر کی بیٹی اٹھائی ـــ کسی بات کی کمی نہ تھی ـــ یہاں بھی ہر چیز سیر کو سوا سیر ـــ رت جگے ہوتے ـــ تلن ہوتے ـــ گلگلے ـــ پوریاں ـــ چونگے تلے جاتے اور ڈھولک پر وہ تھاپیں پڑتیں کہ بڑے بڑے منتشر بھی نیند سے چونک چونک پڑتے ـــ چڑچڑ جاتے ـــ

گرمیوں کے دن تھے ـ بڑے میاں اپنے معمول کے مطابق تین بجے رات کے لگ بھگ بازار سے لوٹے ـــ ساتھ میں دوستوں کی ایک منڈلی بھی تھی ـــ اچھے خاصے گھر باریوں کو بیویوں سے تڑوا دیتے ـــ بولتے ـ "ارے میاں بازار کی ہانڈی میں جو مزہ ہے وہ گھر کی ہانڈی میں کہاں ـ" ؟ ایسے چکلے دیتے کہ جانے والے پالتو کتا بن ساتھ ہو لیتے ـــ

لوٹے تو رت جگے کی دھوم تھی ـــ آنگن بیچ منڈوا پڑا تھا ـــ پھولوں پتوں سے لہکتا مہکتا ـــ وہ گڑبڑ ـــ وہ شور شر کہ توبہ ـــ منڈوے تلے گیت ہو رہے تھے ـــ اور ڈھولک پر تھاپ پر تھاپ پڑ رہی تھی ـ

جی کا جنجال ہوا باجرہ لائے ـــ
میں نکٹو بولی باجرہ ـــ
تم کاہے کو لائے باجرہ ـــ

وہ بیچ میں جو موٹی موٹی آنکھوں والی الھڑ سی چھوکری تھی وہ تان اٹھاتی اور سب ساتھ دیتیں ـــ وہ اپنی پتلی سی ناک چڑھا کر "نکٹو" اس مزے سے بولتی کہ جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ـ

جب میں وہ باجرہ چھڑانے کو بیٹھی
بھونسہ اڑا اڑا جائے موا باجرہ !

اور پھر بھونسے سے بچنے کے لیے اس نے آنکھوں پر، اس زاویے سے منہ بنا کر ہاتھ رکھا کہ بڑے میاں وہیں ڈھیر ہو گئے ـــ

میں نکٹو بولی باجرہ
تم کاہے کو لائے باجرہ
پتلی سی ناک "نکٹو" پر بار بار چڑھتی اترتی ـ
جب میں وہ باجرہ چھننے کو بیٹھی

آنکھیں پھوٹی جائیں موا باجرہ

رات کے تین بھی تو بج رہے تھے — اس نے اپنی نیند بھری موٹی موٹی آنکھیں سب کے سامنے کھول کر زور سے بیچ لیں۔

آنکھیں پھوٹی جائیں موا باجرہ!

اور پھر زور کی تھاپ دی —

میں نگوبولی باجرہ!

بڑے میاں کا دل چاہا سارا باجرہ خود ہی چن چنا کر صاف کر دیں۔

جی کا جنجال موا باجرہ لائے۔

باجرے کی تکرار چلتی رہی اور بڑے میاں وہیں کھڑے رہے — صبح صبح جب اندھیرا چھٹ رہا تھا اور صبح کی ہلکی ہلکی روشنی بھرپور اجالے سے بدل رہی تھی۔ بڑے میاں وہیں دو سروں پر کھڑے اس کو گھورے جا رہے تھے — اس کو، جو وہیں، ڈھول کے پاس بے فکری سے ٹانگیں پھیلا کر سو گئی تھی اور ان کی نیند اڑا گئی تھی —

جانے کیا نیکی دل میں آئی — اس کی طرف سے کوئی برا خیال دل میں نہ آیا — جھٹ سوچ لیا بس اسی سے شادی کر لیں گے — اتنے گئے گذرے ہو کر بھی لاکھوں پر بھاری تھے بڑے میاں — کون تھا جو بیٹی نہ دیتا بھلا لوگ مرد کی عمر نہیں دیکھتے اس کا دھن دیکھتے ہیں اور دھن کی یہاں کیا کمی تھی — ؟

بڑے میاں نے ہاتھ پاؤں جلائے تو پتہ چلا کہ بڑے گھر والوں کی پوتی ہے۔ انھوں نے ماں کے آگے جا کے ہاتھ پاؤں جوڑے — خوشامدیں کیں — ماں دو مردوں کی جورو ٹھہریں نہ الگ — خود دو باپوں کے اولاد ٹھہرے۔ مگر دل کی چوٹ تھی سہار کیسے تھی — توبہ تلا کر کے قسم لوٹائی اور ماں کے قدموں میں گر کر گذرے دنوں کی معافی مانگ لی —

دادی بی بڑے ٹھسّے سے گئیں — پوپلے منہ سے پوپلے منہ والے بیٹے کا پیام لیکر — اور بڑے آبا گویا مشرف بہ اسلام ہو گئے — ایسی نیکیاں بھری بی بی تھی کہ اس کی زندگی میں آتے ہی بڑے میاں ساری بدی بھول بیٹھے اور اس دن کئی نہ مانے بعد دادی بی نے دیکھا کہ بڑے میاں لوٹا اٹھا کر باہر نکل گئے — اور پھر کنمنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا کہ بڑے میاں پٹاپٹ سجدے کر رہے ہیں — بار بار ماں کو لڑکی والوں کے پاس بھیجتے کہ اماں کیسا بھی کر اتا کام کروا دو — اور خود سجدوں پہ سجدے کیے جاتے — اللہ میاں سے دعائیں بھی یوں مانگتے جیسے برابر کے دوست احباب سے باتیں کر رہے ہوں —

" ارے اللہ میاں آپ کیا سمجھے ہیں اس کو بھگا نہیں سکتا —؟ مگر مولی اب میرا دل خود نہیں چاہتا — پھول ہے

اللہ میاں بھول ــــ بس اب تو دل چاہتا ہے کہ شریف مردوں کی طرح گھر بیٹھ کر زندگی کروں ــ"!

اللہ میاں کو رشوت کا لالچ بھی دیتے " ارے پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا ــ رمضان کے روزے رکھوں گا ــ ہاں قرآن شریف بھی پڑھوں گا ــ"

مزید شعیلاتے بنانے " اگر اتنے پر بھی آپ راضی نہیں تو روزانہ یٰسین شریف کی بھی تلاوت کروں گا ــ ورنہ میں زہر کھا لوں گا اور خودکشی کا عذاب آپ پر ہی پڑے گا ــــ اللہ میاں مجھے سچ مچ ہاجرہ سے عشق ہوگیا ہے ــ"!

اللہ میاں کے کان کھلے تھے شاید ــ یا سیر بڑے میاں کی دعاؤں ہی میں اثر ہوگا ــ لے دے ہوئی بھی مگر پیسہ یہاں بھی شامیانہ بن کر سب عیبوں کو ڈھانک گیا ــ بڑی دوڑا دوڑی کے بعد ہاں ہوگئی. بڑے میاں کے پاؤں زمین پر پاؤں نہ پڑتے تھے ــــ ہاں ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وضو بنا قرآن شریف لے کر بیٹھ گئے اور دو پارے پڑھ کر آنحضرت کے نام بخش دیئے ــــ اماں بھی خوش یہ خوش تھیں ــ اور پرانی باتیں بھول بھال کر شادی کے کام کاج میں گم تھیں.

اور قاضی صاحب نے جب پوچھا ہے " ہاجرہ بیگم اتنے اتنے مہر کے عوض قبول ہے " تو بڑے میاں آسمانوں پر اڑے چلے جا رہے تھے ــ کہیں دور سے بولے ــ

" جی ہاں ــ جی ہاں ــ جی ہاں "

ڈھم ڈھم ڈھم ڈھول پٹ گیا ــــ گویا اعلان ہوگیا کہ لو جی ہابل بیٹی پرائی ہوگئی ــ

دسترخوان بچھے ہوئے تھے ــــ صفیں کی صفیں بیٹھتیں ــ کھانا کھا کر جگہ خالی کر دیتیں ــــ پھر دوسری صف بیٹھتی ــ بڑے میاں پھولوں، گجروں اور سہرے سے لدے پھندے، سر پر زری کا صافہ باندھے ہاتھ دھونے کے لیے رکھی سلاپچی لوٹے کی طرف بڑھے ــــ مینڈھیاں اترتے ہیں تو پاس ہی سے سسکی سی سنائی دی ــ آگے بڑھے تو کونے میں سایہ سا کانپ رہا تھا ــــ بولے ــ

" ادھر کون ہے ــــ ؟ کھانا کھا چکے ــ" ؟

ہوں نا ہاں ــــ

" ارے بھئی جواب نہیں دیتے ــ چوروں کی طرح کیا کھڑے ہو ــــ" ؟ اور بڑے میاں نے ہاتھ پکڑ کر سامنے کھینچ لیا ــــ

" ارے چتو بھائی کے بیٹے ہو ــــ کیا نام ہے میاں تمہارا ــ ؟ بھول ہی گیا میں تو ــــ ہاں ہاں یاد آیا ــــ ظفر میاں اچھے تو ہو ــ" ؟

بڑے میاں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا ــــ ہائیں ــــ رو رہے ہو تم " وہ آنکھیں پھاڑ کر بولے

—" ہوا کیا — ؟ گھر میں تو سب اچھے ہیں "؟

"جی ہاں سب ہی اچھے ہیں بس میں ہی نصیبوں کا پورا ہوں" وہ ڈوبتی آواز سے بولے۔

"بات کیا ہے میاں" بڑے میاں نے پیار سے پوچھا —

اک دم ظفر میاں عورتوں کی طرح پھپھک پڑے "اپنی قسمت کی سیاہیوں کا شمار کر دوں تو میں پورے طور سے برسات کی رات بن چکا ہوں — کہیں اجالا نہیں — روشنی کی ہلکی سی رمق نہیں"!

"عورتوں کی طرح روئے جاتے ہو بات بتاتے نہیں — ہوا کیا ؟ کہیں گھر تو نیلام پر نہیں اٹھ گیا"؟

چنو میاں بے چارے بڑے اچھے دن دیکھے بیٹھے تھے — بڑے نانا کے زمانے میں دروازے میں ہاتھی جھولتا تھا — اصطبل میں اصیل گھوڑے ایک نہ دو پورے آٹھ تھے — ان پر جھکا جھول چاندی کے گہنے — ارمان بھرے دم تھے بے چارے — بگھی سواری کے لیے تھی — ایسی چھکا چھک چھن چھن کرتی آتی کہ لوگ ایک میل پرے سے ہی بولنا شروع کر دیتے —

"ارے ہٹنا میاں — حویلی والوں کے گھر کی سواری آ رہی ہے"

دل کے بھی ایسے ویسے نہ تھے — پورے گاؤں میں اپنے اونچے ہاتھ کے لیے مشہور تھے — چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے — برے دن آئے اور ایسے آئے کہ گھر کی اچھی بری چیز بک بکا کر کوڑی بن گئی — کہاں تو وہ ہاتھی گھوڑے اور بگھیاں — اور کہاں یہ حال کہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے مگر کوئی پاس بٹھا کر سلام لینے کا بھی روادار نہ تھا — بڑے میاں کے گھر والوں میں بس اتنی ہی بات بڑی اچھی تھی کہ اپنے پرائے، امیر، غریب، چھوٹے بڑے سب کی خیر خبر لیتے رہتے — اب نصیبوں سے ایک مکان بچ رہا تھا، مکان کا ہے کو تھا اچھا خاصا ڈھنڈار تھا — کچھ بھی تھا مگر سر چھپانے کو آسرا تو تھا۔ اس کی بھی سن گن مل ہی رہی تھی — بڑے میاں یہی سمجھے شاید نیلام اٹھ رہا ہوگا —

بڑے شاعرانہ انداز میں ظفر میاں بولے —

"مکان کا تو نہیں — میرے ارمانوں کا نیلام اٹھ گیا — چاندی کی طاقت واقعی بہت بڑی ہوتی ہے"!

بڑے میاں بچّہ تو تھے نہیں — سناٹے میں آ گئے — تھوڑی دیر چپ رہے پھر بڑی صلاحیت سے پوچھا —

"ہاجرہ سے محبت کرتے ہو"!؟

"جی ہاں — اور وہ بھی مجھ سے کرتی ہے" ظفر میاں جیسے عدالت کے سامنے حلفیہ بیان دینے پر تل گئے —

"آپ کو یاد ہوگا آپ کے پیام جانے کے کئی دنوں بعد تک جواب نہ ملا تھا — ہاجرہ کہتی تھی میں زہر کھا لوں گی — یا نہیں تو بس ظفر سے شادی کروں گی — اور اس کے غریب ماں باپ کہتے تھے آپ ایسا داماد بار بار نہیں ملا کرتا — مگر جیت آپ ہی کی ہوئی تھی اور ہوئی" وہ چھوٹے بچّوں کی طرح آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رو پڑے —

"اب یہاں کھڑا سوچتا تھا کہ ہاجرہ ڈولی چڑھے گی تو اس پر سے یہ گوندنیاں نچھاور کردوں گا — ہماری محبت تو اسی کے تلے پروان چڑھی — پانچ سال سے ہم ساتھ رہنے کا سوچتے آئے تھے مگر . . . . "

"چھی — مرد ہوکر روتے ہو — آؤ میرے ساتھ — آنسو پونچھ ڈالو — پونچھ لو — بس پونچھ بھی ڈالو —"

دیوان خانے میں ابھی قاضی صاحب اور باراتی بیٹھے ہوئے تھے، بڑے میاں پھولوں سے لدے پھندے، ظفر میاں کا ہاتھ پکڑے داخل ہوئے — دو ایک منٹ تو ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر بیچوں بیچ جاکر کھڑے ہو گئے اور سپاٹ لہجے میں بولے — " میں مظہر میاں، ہاجرہ بیگم کو تین بار طلاق دیتا ہوں — " !

"طلاق — " ؟ ؟ سب سناٹے میں آ گئے —

دو چار منٹ خاموشی رہی ہوگی کہ — اک دم بھن بھناہٹ سی ہونے لگی — بڑے میاں نے قدرے سختی سے ہاجرہ کے باپ کو مخاطب کیا —

" میاں جی آپ کو معلوم تھا نا کہ آپ کی بیٹی ظفر میاں سے محبت کرتی ہے — ؟ پھر بھی لے کر میرے پلے باندھ دی — میں ایسی اوباش لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا " ان کی آواز ڈوب رہی تھی مگر وہ سنبھل گئے —

" مہر میں ابھی دیئے دیتا ہوں — "

دولہن والے گھر سے بڑے میاں کا گھر دور ہی کتنا تھا — لپکتے ہوئے گئے اور جھولی بھر روپے لیے آ گئے — کھن کھن بھری محفل کے سامنے گن دیئے اور گرج کر بولے —

" قاضی صاحب پڑھا دیجئے اس بدچلن کا نکاح — ابھی ظفر میاں کے ساتھ — " یہ کہہ کر انھوں نے اپنا سہرا اتار کر ظفر میاں کے سر باندھ دیا — اپنی جامدانی کی اچکن اتار کے ظفر میاں کو پہنا دی —

ان کی آنکھوں میں نمی گھل رہی تھی — مدھم اور نرم آواز سے بولے " جاؤ میاں — خوش رہو — کھاؤ پیو عیش کرو — میں تم دونوں معصوم فرشتوں کے لیے اپنی نیک تمنائیں اور دعائیں بھیجتا ہوں " !

دستر خوان بچھے ہوئے ہی تھے — بڑے میاں نے دو چار الٹے سیدھے نوالے زہر مار کیے — کھانے پر سے اٹھے — ہاتھ دھوئے — کلی کی اور رومال سے منہ پونچھتے باہر آ، پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ پاؤں سمیٹ کر آواز دی —

ارے بھئی خلال دینا ذرا — !

کسی نے ہاتھ میں نیم کی تیلی تھما دی اور خلال چلنی شروع ہوگئی — ! !

بازگشت

۱۲ر مئی ۶۵ء — حیدرآباد

"صبا" دن بدن معیاری ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً چند ماہ سے تو رسالہ کافی اچھا نکل رہا ہے۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ دوسرے رسالوں کے مقابلے میں کافی جاندار رہتا ہے۔

اثر لکھنوی کی غزل فراق کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں انھوں نے فراق کی غزل میں جو غلطیاں بتائی ہیں وہ کچھ کچھ ٹھیک ہیں۔ مگر ان کے اظہار کا طریقہ بہت ہی غلط اور تہذیب سے گرا ہوا ہے۔ اساتذہ کی نوک جھونک دلچسپ ضرور ہوتی ہے مگر اس میں بھی سنجیدگی ہونی چاہیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو دشمن ہیں جو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں عبارت میں جب جھنجھلاہٹ اور گالی گلوج آجاتی ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ دوسرے کی شخصیت سے متاثر اور مرعوب ہیں اور اگر آپ کسی کو اپنے سے کم سمجھتے ہیں تو اس کی غلطیوں کو بڑے ہی دوستانہ انداز اور سنجیدگی سے ظاہر کردیتے ہیں۔ جب اثر صاحب فراق کی شاعری کا پول کھولنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ مہذب طریقوں سے دلیلیں دے کر یہ ثابت کریں۔

افسانوں کی طرف توجہ کرو۔ مخدوم کے "تحفے" پسند آئے۔ شاہد صدیقی نے "سخن گسترانہ بات" میں کوئی خاص بات نہیں کہی۔

شاخ نبات

۲۲ر مئی ۶۵ء — حیدرآباد

مخدوم کے "تحفے" پاکر بس مزہ آگیا۔ یہ فراق و اثر تو بہ ہے۔ انھوں نے بچوں کو بھی مات دے دی۔ اچھا جی اگر میں کہوں کہ آپ "صبا" میں ایک سرے سے افسانے چھاپنا ختم ہی کردیجئے تو کیسا رہے؟ واجدہ تبسم

۲۳ر مئی ۶۵ء — حیدرآباد

زمانہ کس قدر ناقدر شناس ہے اس کا اندازہ صبا کے نئے پرچہ کو دیکھنے کے بعد ہوا۔ عزیز محترم اثر لکھنوی نے فراق کی غزل پر جو تنقید کی ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اس بات کی غماز ہے کہ اب ادبی پرچے بھی آج کی بے ہودہ اور سطحی صحافت کے گھٹیا اصولوں کو اپنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کی "نوک جھونک" سے نوشق لوگ فائدہ ضرور اٹھا سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی تعمیری مقصد اس میں پنہاں ہو — یہ کیا بات ہوئی کہ دو پہلوان جو

کسی اکھاڑے کی تلاش میں تھے۔ ان کے لیے اکھاڑہ فراہم کر دیا جائے ـــــ صبا کی اشاعت دوسرے طریقوں سے بھی تو بڑھائی جا سکتی ہے۔

"صبا" سے مجھے دلچسپی ہے ـــ اس لیے کہ حیدرآباد کی روایات اور شمالی ہندوالوں کے تعصب سے میں خوب واقف ہوں۔ بعض خوش فہم یہاں تک کہتے ہیں کہ دکن میں کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ـــ آپ اپنے نظریہ کے بل بوتے پر شاید وحدت کائنات کے قائل ہوں ـــ اور میری یہ بات بلا دلیل آپ کے دل میں جگہ نہ پا سکے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب میں اجارہ داری، انانیت اور تعصب کا ذمہ دار صرف شمال والوں کا پندار اور دکن والوں کا تجاہل عارفانہ ہے ـــ یہ کوئی اتہام نہیں ہے میرے پاس دلائل ہیں۔ آئندہ کبھی بیان کروں گا۔

ڈاکٹر ابو العلائی

۲۵ مئی، ۶۵ء ــــــــــــــــــــــ نئی دہلی

ابھی صبا کے پچھلے نمبر کے بارے میں کچھ لکھنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ آج نیا نمبر بھی مل گیا۔ پچھلے نمبر میں عالم کا مضمون پڑھ کر بڑی حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی۔ مغنی کا مضمون بھی پڑھا۔ عالم کا مضمون پڑھ کر تو احساس ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ ادب برائے ادب والوں کی صف میں پہنچ رہے ہیں۔ یہ بھی جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ ترقی پسند ادب کی تحریک مر چکی ہے "، اس کا کوئی رول نہیں رہا۔ یہ بات داستان بھی نہیں کرسکتے جو (تم نے ان کا مضمون ساہتیہ اکادمی کے مجموعے میں پڑھا ہوگا) ترقی پسند ادب کے مخالفین میں سے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی تنظیم ویسی باقی نہیں رہی جیسی کہ پہلے تھی، اور شاید آج کے نئے حالات میں ممکن بھی نہیں لیکن ترقی پسند تحریک کسی انجمن کا تو نام نہیں ہے۔ یہ تو نام ہے ادب کے اس نظریہ کا جو ادب اور ادیب کو سماج اور زندگی سے الگ نہیں کرتا۔ جو ادب برائے زندگی کا ادب کی افادیت کا قائل ہے۔ اور آج کتنے ادیب ہیں جو اس نظریہ کے خلاف ہیں؟ جتنے بڑے شاعر، ادیب نقاد اردو زبان کے ہیں۔ ان میں ادب برائے ادب والوں کی کتنی تعداد ہے؟ اگر آج کچھ لوگ ان منفی پہلوؤں پر تنقید کر رہے ہیں جو ترقی پسند تحریک میں داخل ہوگئے تھے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کی بنیادی باتوں کے خلاف ہیں۔ تم تو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ وہاں بھی کچھ لوگوں نے ادب برائے زندگی اور ادب کی بحث چھیڑی تھی اور تم کو یاد ہوگا کہ اس صف آرائی میں ادب برائے ادب والے کتنی چھوٹی اقلیت میں تھے۔

جب آپ ادب برائے زندگی کو مانتے ہیں تو پھر اپنے لیے IVORY TOWER نہیں بنا سکتے۔ آپ کو سماج کی عائد کردہ کچھ پابندیوں کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ پابندیاں کتنی ہوں گی۔ اس پر بحث ہو سکتی ہے۔

سوویٹ یونین اور بعض دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ سماج کے بعض منفی پہلوؤں پر سخت تنقیدیں کی گئیں

بعض لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ مارکسی اصول ہی سرے سے غلط ہیں۔ بالکل یہی بات ترقی پسند تحریک کے بارے میں ہو رہی ہے۔ میرا ارادہ ایک تفصیلی مضمون لکھنے کا ہے بشرط فرصت میں جون کی چوتھی تاریخ کو مدراس جا رہا ہوں وہاں سے کولمبو جاؤں گا۔ جون کے آخر میں حیدرآباد پہنچوں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ میں یہ مضمون لکھوں مضمون کیلئے کچھ کتابوں کی ضرورت ہے جو شاید وہاں مل جائیں گی۔

کلیم اللہ

۲۶ مئی ۶۵ء ——— نئی دہلی

کل کی ڈاک میں صبا ملا۔ اس بار نظموں میں شمیم کرہانی کی نظم "تمہارا"، راشد آذر کی "آج کی شام" خصوصیت سے پسند آئیں۔

ادھر مقطع میں "آپ اپنے منہ میاں مٹھو" بننے کی وبا سرعت سے پھیلتی جا رہی ہے۔ جسے لگام دینے کی ضرورت ہے اس شمارہ میں منظر شہاب اور پرویز شاہدی کی غزلیں میری اس بات کا ثبوت ہیں۔

چھیڑ چھاڑ اور شخصی عناد سے پیدا ہونے والی تنقید کے ڈانڈے ہمیشہ تنقیص سے جا ملتے ہیں۔ اثر صاحب کی تنقید بھی اسی کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ سلسلہ کچھ اچھے نتائج کو سامنے لا سکے گا۔ تاہم فراق صاحب کی جن کمزوریوں کی طرف انھوں نے سخت انداز میں توجہ دلائی ہے۔ اس سے انکار ناممکن ہے۔

شاہد صدیقی کی "سخن گسترانہ بات" اپنے اختصار کے باوجود خیال آفریں ہے۔ مخدوم کے "سفر ما ہے" کو تحفتاً قبول کیا جا سکتا ہے۔

آخر صبا میں کہانیوں کا حصہ کب بلند ہوگا؟ اس طرف دو چار ماہ سے تو آپ نے ایک بھی ایسی کہانی شائع نہیں کی جس کی تعریف کی جا سکے۔ اور اس بار تو صبا میں صرف ایک ہی کہانی شائع ہوئی ہے طرفہ یہ کہ وہ کہانی بھی اتنی عجیب و غریب ہے کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ اگر یہ کہانی کرتار سنگھ دگل کی بجائے کسی اور غیر معروف سردار جی نے لکھی ہوتی تو معاف کیجئے آپ اسے زندگی بھر نہ چھاپتے۔

واجدہ کے تعلق سے آمنہ ابوالحسن کا خط ان کی شکست خوردہ ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ عوض سعید

۳۰ مئی ۶۵ء ——— حیدرآباد

صبا کا تازہ پرچہ ملا۔ اثر لکھنوی نے تنقید سے زیادہ تنقیص کی طرف توجہ دی ہے۔ یہ سلسلہ دلچسپ باتوں کے باعث دلچسپی رہے گا۔ مخدوم کے "تحفے" پُراثر ہیں۔ ابوظفر عبدالواحد کی نظم "کالی گھٹا" دل پر جبر کر کے پڑھنا پڑتی ہے۔

جوش کے ایک شعر کو آپ نے جلی حروف میں چھاپا ہے۔ مجھے کسی پہلو سے اس میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی کہیں اچھا ہوتا اگر آپ وہ جگہ خالی رکھتے۔ علی آفتاب

۴ جون ۶۵ء ——— حیدرآباد

نئی صبا" ملا۔ حضرت اثر لکھنوی کی غزل اور تنقیدی مضمون پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کیونکہ غزل شوماٹ" اور مضمون

تھا گر"۔ حضرت فراق گورکھپوری کے چیلنج کے جواب میں حضرت اثر لکھنوی نے جو غزل پیش کی ہے اس کو پڑھنے کے بعد نہ صرف اثر صاحب کی تنقید کا معیار معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کا "مذاقِ شعر گوئی" اور "مقصدِ شاعری" بھی۔

شیخ ناسخ کو فن و قواعد سے اس قدر عشق تھا کہ وہ ہر اس شعر کو جس میں کوئی فنی غلطی نہ ہو (اور جو موزوں ہو) "جانِ ایمانِ شاعری" سمجھتے تھے۔ ناسخ کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ فرمائیے ؎

جو اُس پری سے شبِ وصل میں رکاوٹ ہو
مجھے بھی ایک جنازہ ہو یا چھپر کھٹ ہو

بھلا فراق صاحب اس چھپر کھٹ والی شاعری کو کیا جانیں اور اس کی کیا قدر کریں۔ "اثر لکھنوی چھپر کھٹ" میں تو نزاکتِ چاشنیِ محاورہ، آدابِ تقدیم و تاخیر، بُعدِ زمانی و مکانی اور لطیف طنز و مزاح کے علاوہ بے شمار جان لیوا ادائیں بھی ہیں لیکن فراق صاحب ان سے بے خبر ہیں۔ بالآخر اثر صاحب نے تہیہ کر لیا کہ وہ تنقید کے پھول برسا کر (قلم سے بے اختیار "پتھراؤ کرکے" نکل رہا تھا) فراق صاحب کو اس فنِ لطیف کی جانب متوجہ فرمائیں گے چنانچہ اثر صاحب کے حسب ذیل جملے "فنِ تنقید" کی تاریخ میں تا ابد تاباں و درخشاں رہیں گے۔ اور کیا تعجب کہ مستقبل قریب میں انھیں "فنِ تنقید" میں بنیادی حیثیت حاصل ہو جائے۔ جملے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "ان کا مخاطب صحیح میں ہی ہوں کیونکہ تنقیدی مضامین میں ان کی شاعری کا پول کھولتا رہتا ہوں"۔

۲۔ "زلف پرچم، علم کا پھریرا۔ صرف فراق صاحب کی آگاہی کے لیے لکھتا ہوں کہ شاید ان کے مبلغ علم سے باہر ہو"۔

۳۔ "میرے درست کردہ مطلع کے مقابل فراق صاحب کا اصلی مطلع پڑھیے مجھے امید ہے کہ ان کی لنڈوری شاعری کا اندازہ ہو جائے گا"۔

۴۔ "علاوہ بریں ماتم، دلِ خوں شدہ، ستم زدہ یا الم گشتہ کا ہوتا ہے نہ کہ دلِ گم گشتہ کا جس کی بازیافت یا پتہ چل جانے کا امکان ہے۔ محض تصنع اور ٹھنڈے نخرے"۔

۵۔ "اثر نے کم سے کم تیس برس ادھر فراق صاحب کی تازہ مزخرافات سے کہیں بہتر کہا تھا"۔

۶۔ "واہ ری بیہودہ لفاظی اور دریدہ دہنی"۔

۷۔ "یہ حضرت اگر بھوں بھوں اور پھکوں پھکوں بھی روئیں تو ستاروں کا پگھلنا کیسا آنکھ بھی نم نہ ہو"۔

۸۔ "مجھے ہمیشہ یہ الجھن رہی کہ فراق صاحب شاعر کس رخ سے ہیں۔ ان کے متعدد اشعار ناموزوں ہوتے ہیں۔ زبان بڑی چیز ہے معمولی الفاظ کے محل استعمال کا وقوف نہیں"۔

۹۔ "خال روئے زیبا کر" کی دہقانیت شوشہ و مرکز میں واوِ عطف بالفتح و باعلان۔ تاہم فراق صاحب میر و غالب حسرت و اقبال الغرض تمام شعرائے ماضی و حال سے اشرف و افضل۔ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو"۔

حضرت فراق گورکھپوری (جیسے بڑے شاعر) کے متعلق حضرت اثر لکھنوی (جیسے استاد) نے (اپنی پاکیزہ زبان میں) جو

ارشاد فرمایا ہے وہ نوجوان شاعروں اور نقادوں کے لیے مشعل راہ" ہے۔

خصوصاً سنجیدگی فکر، اصول تنقید کی پابندی، شعر سمجھنے اور سمجھانے کا انداز، اصلاح دینے کی خواہش میں خلوص نیت علم کا اظہار (معاصرانہ چشمک، تنگ نظری، حسد اور طعن تشنیع سے اجتناب) آثر صاحب کی نمایاں خصوصیات معلوم ہوتی ہیں سہ

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ادیب صاحب! ایک بات اور عرض کردوں "صبا" میں ایک عرصہ سے سنجیدہ اور متوازن ادب شائع ہو رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ "صبا" کو انشا اور مصحفی کا اکھاڑہ نہ بنائیے۔ ہم ابھی وہ تمام غیر ادبی زیادتیاں نہیں بھلا سکے جو چند پڑھے لکھے ادیبوں نے میر، غالب، اقبال، فراق اور فیض کے ساتھ کی تھیں۔ بعد میں تلافی کے طور پر قصیدے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ بہرحال آپ کے لیے احتیاط ضروری ہے۔ "صبا" کی مقبولیت اور ترقی کا سہرا آپ کے سر ہے۔ غیاث صدیقی

۵ رجون ۵۵ء ــــــــــــــــ پدا پلی

صبا اب کی بار بہت دیر سے یعنی ۳۰ مئی ۵۵ء کو ملا۔ مخدوم کے تحفے اگر صبا میں شامل نہ ہوتے تو پرچہ بالکل بے جان معلوم ہوتا سنا ہے صدیقی کا مضمون موجودہ ماحول میں واقعی قابل غور ہے۔

یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے اردو شعراء کا جو انتخاب شائع ہو رہا ہے اس میں اختر الایمان کی نظم کو اس لیے شائع نہیں کیا جا رہا ہے کہ ان کے نام کی ترکیب غلط ہے۔ مولانا آزاد کی اس ذہنیت کے خلاف یقیناً زبردست آواز اٹھانی چاہیے یہاں تک کہ اگر وہ انتخاب شائع ہو تو اس میں اختر الایمان کی نظم شامل رہے ورنہ تمام شاعر اس مجموعے سے بائیکاٹ کریں۔ سلیمہ صدیقی

۵ رجون ۵۵ء ــــــــــــــــ حیدرآباد

مئی کا صبا ملا۔ بہ حیثیت مجموعی پرچہ جاذب نظر ہے، پہلے کی بہ نسبت کتابت، طباعت اور ترتیب کو آپ نے ترقی دی ہے حصہ نظم و نثر برابر کے نظر آتے ہیں لیکن پرچے کے معیار کو اور بلند کرنے کی ضرورت ہے!

پہلی بات میں پہلی مرتبہ اداریہ کی شان پیدا ہوئی ہے۔ آپ نے خود تنقیدی کو احتساب کا درجہ جانے کیوں دیا۔ خود تنقیدی خود شکستگی نہیں، بلکہ عرفانِ ذات کا ذریعہ ہے۔ یہ زمانہ شعوری آرٹ کا ہے اس لیے یقین ہے کہ اکثر ادیب شاعر جو یقیناً بے شعور نہیں ہیں، بغیر کسی عالمانہ غور کے اپنے فن کو تنقید کی کسوٹی پر کسنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ اس لیے ناقدین کو بھی ان کے فکر و نظر کو پرکھنے اور جانچنے اور ان کا معیار مقرر کرنے میں آسانی ہوگی۔ آپ کو یاد نہیں رہا کہ کچھ دن پیشتر خود میں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ بہت دن ہوئے جامعہ دہلی مرحوم نے فراق وغیرہ سے ان کے اپنے فن کے بارے میں لکھوایا تھا

باقر مہدی کے خط میں اختر الایمان کے متعلق مولانا آزاد کی رائے پڑھ کر سخت حیرت ہوئی۔ نہ جانے انھوں نے یہ رائے

ذوق کے کس معیار پر قائم کی۔ اگر ابوالکلام کی ترکیب درست ہے تو اختر الایماں کی ترکیب بھی درست ہے۔

آپ کی یہ رائے ٹھیک ہے کہ "سخن گسترانہ بات" کے مصنف بدلتے رہیں اس سے تازگی اور تنوع برقرار رہے گا۔ لیکن شاہد صدیقی صاحب نے جو بات اس موضوع کے تحت کہی ہے وہ نا تمام ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ خود "سخن گسترانہ بات" لکھنے والوں پر QUALIFICATION کی شرط لگا دی جائے۔ اصل ضرورت QUALIFICATION یا بڑی بڑی جامعاتی اسناد کی نہیں بلکہ علم و مطالعہ کے صحیح زاویہ سے استعمال، اپنی زبان کی روح، عصری ضرورتوں، تقاضوں اور میلانات کو سامنے رکھ کر گہری نظر، ایمانداری، فراخدلی اور وسیع المشربی سے تنقید کرنے اور جس کسی کے پاس "ادبی جال" ہو اسے اجاگر کرنے کی اور کج رویوں اور کوتاہیوں پر ٹوکنے کی ضرورت ہے ــــ کئی نقاد اعلیٰ علمی سند اور وسیع مطالعہ رکھنے کے باوجود تنگ نظری، جانب داری اور بے ذوقی کا اظہار کرتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۵۶ء کی شاعری پر مضمون لکھا تھا تو انھیں "ادب لطیف" اور "نقاد" کے ماہر کوئی شاعر نظر نہیں آیا۔ اسی طرح خلیل الرحمان اعظمی نے سردار جعفری اور سجاد ظہیر اور بعض دوسرے ناقدین کی جانبداری اور رنگ نظری پر مقالہ لکھا ــــ اور صحیح لکھا، مگر خود بھی جانبداری اور احباب نوازی کے شکار ہو گئے ــــ شکیل الرحمان اور خلیل الرحمان اعظمی نے غزل پر مضامین لکھے تو اس میں خالص نظم گو شعراء کو بھی شریک کر لیا، مثلاً کیفی اعظمی وغیرہ کو۔ یہی حال احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن کا بھی ہے۔

اسی طرح اصول تنقید بھی شاعر شاعر کی نسبت سے بدلتا رہتا ہے اس کی مثال سردار جعفری کی فیض اور فراق پر تنقیدیں ہیں۔ بعض ناقدین چند معروف شاعروں اور ادیبوں کے نام لکھنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ فہرست اور بڑی بھی ہو سکتی ہے، گویا انھوں نے تنقید لکھ کر پڑھنے والوں اور شاعروں اور ادیبوں پر بڑا احسان کیا ہے ــــ اگر پڑھنے والے خود فہرست کو مرتب کر سکتے ہیں تو ان کی تنقیدی نگارشات کا کیا مطلب ہے ــــ کیا ضرورت، اس کے بغیر بھی پڑھنے والا کچھ نہ کچھ رائے رکھتا ہی ہوگا؟

بہرحال شاہد صدیقی نے جو سوال اٹھایا ہے وہ لائق توجہ ہے، نیا نہیں ہے اس سے پیشتر وامق جونپوری اور خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ اس موضوع پر لکھ چکے ہیں۔ پھر بھی ضرورت اس ذہنیت کے خلاف جنگ کرنے کی ہے۔ ہمارے ناقدین کو چاہیئے کہ انگریزی ادب کے حوالوں کے ساتھ انگریزی کی تعمیری، تخلیقی اور ایماندارانہ تنقید کا معیار بھی سامنے رکھیں۔

اساتذہ کی نوک جھونک زبان و ادب کے طالب علموں کے لیے دلچسپ بھی ہوتی ہے اور فائدہ مند بھی، مگر فراق صاحب اور اثر صاحب کی نوک جھونک، انشا اور مصحفی کے بتبذل معرکوں کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ ہم ان دونوں بزرگوں سے علمی بحث اور لطیف طنز و خوش مذاقی کی توقع رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ذاتیات کا عنصر اتنا غالب اور ہلکی سطح پر اتر آتا ہے کہ بسا اوقات رنج ہوتا ہے۔ اثر لکھنوی صاحب فراق گورکھپوری صاحب کو شاعر مانیں یا نہ مانیں وہ تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اسی طرح بے مثال شاعر ہیں، جیسے حضرت اثر لکھنوی اپنے اشعار کی بے کیفی اور بے اثری کے باوجود ایک مسلم الثبوت استاد فن اور

نکتہ دانِ زبان وسخن ہیں، رہی عروض کی غلطیوں کی بات تو بڑے بڑے اساتذہ اس سے نہ بچ سکے، خود خلیل نے کہا تھا۔ انا اکبر من العروض۔ اور مولانا روم بھی کہہ گئے ہیں۔ من : دائم فاعلان فاعلات ــ اب کہیئے!

اثر صاحب نے جو ابجزل پیش فرمائی ہے ــ وہ واقعی اکثر وبیشتر صحیح اشعار پر مشتمل ہے مگر ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو محل نظر ہیں۔ اسی طرح انھوں نے فراق صاحب کی غزل پر جو تنقید واصلاح فرمائی ہے۔ کئی جگہ درست ہے مگر کئی جگہ خود انھوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بعض جگہ ان کا اعتراض محض مکتبۂ فکر کے اختلاف کے باعث ہے ــ میں اس پر بھی کچھ لکھتا۔ مگر بیاری خط کی طوالت سے مانع ہے۔

ہاں حمید الدین شاہد کا مضمون پڑھ کر ایک سوال پیدا ہوا ہے۔ انجمن ترقی اردو اور ادارۂ ادبیات اردو، مکش، صفی اورنگ آبادی، ساجد، باقی، علی منظور اور ان کے علاوہ حیدرآباد کے زندہ شاعروں کے کلام کو شائع کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

متین سروش

کراچی ۱۰ رجون ۵۷ء

اس بار "صبا" کا دورنگی "ٹائیٹل واقعی خوبصورت ہے۔ "سخن گسترانہ بات" وسیع اور جاندار ہونی چاہیئے ــ اس وقت تو اس کی حیثیت ٹیبل ٹاک سے زیادہ نہیں ــ جناب اثر اور فراق کی چشمک ــ بس عبرت ہی عبرت ہے اس میں ــ ایسا احساس برتری نفسیاتی طور پر شکست خوردگی کا غماز ہوتا ہے۔ اب دو جناب اثر ہوں کہ جناب فراق! اگر یہ تنقیدی انداز نیاز فتحپوری اور پروفیسر رشید لکھنوی کا سا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی مگر اس سے تو بچگانہ مرحوم کے "ادب خبیث" کی یاد تازہ ہوتی ہے، غرض کہ یہ بحث ادبی کم اور شخصی زیادہ ہے جس سے بدمزگی اور بے لطفی پیدا ہوتی ہے

"سفید پوش" کے کردار کی ORIBINALITY پر مجھے شبہ ہے ادھر شوکت صدیقی بھی کچھ اس سے ملتا جلتا کیرکٹر پیش کر چکے اور ویسے یہ "پیروئ مغرب" والی بات ہے۔ حصۂ نظم نسبتاً زیادہ جاندار ہے آپ نے لکھنے والوں سے بجا طور پر اپیل کی ہے۔ کاش یہ صدا بہ صحرا نہ ثابت ہو ــ منظور رضائی

تبصرے

کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست

مرتبہ:۔ نصیر الدین ہاشمی
سائز:۔ بڑی تقطیع
صفحات:۔ ۶۴۸
کاغذ۔ اچھا، کتابت وطباعت اوسط
قیمت:۔ (مجلد معہ گرد پوش) بارہ روپے
ملنے کا پتہ۔ دفتر معتمد کمیٹی نواب سالار جنگ مرحوم دیوان ڈیوڑھی۔ حیدرآباد دکن۔

نواب سالار جنگ ان جاگیرداروں میں تھے جو آرٹ اور ادب کا اچھا ذوق اور اس سے زیادہ آرٹ اور ادب کے شہ کاروں اور نایاب نمونوں کے جمع کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے قدیم آثار، تاریخی نوادر، مشرقی اور مغربی آرٹ کے انمول اور نایاب نمونوں کا جو ذخیرہ چھوڑا تھا، اس کو ایک میوزیم کی صورت میں ترتیب دیا جا چکا ہے۔ جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ایک فرد واحد اتنا متنوع اور بیش بہا ذخیرہ جمع کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

میوزیم کی طرح سالار جنگ کا کتب خانہ بھی نایاب مخطوطات، اور کمیاب مطبوعات سے بھرا پڑا ہے۔ مرتب فہرست کا بیان ہے کہ انگریزی کتابوں کے علاوہ کتب خانے میں عربی، فارسی، ہندی اور ترکی کی تیس ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ جن میں دس ہزار مخطوطات ہیں۔ اردو کے (۱۰۴۵) مخطوطات بھی ان میں شامل ہیں جن کی وضاحت زیر نظر ہے۔

تعجب ہے کہ اسٹیٹ کمیٹی نے کتب خانے کی ترتیب، فہرستوں کی تیاری، مخطوطات کی اشاعت کے کام میں اتنی دلچسپی نہیں لی جتنی کہ میوزیم کی ترتیب میں لی۔ حالانکہ اس کام کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ قابل مبارکباد ہے انجمن ترقی اردو حیدرآباد جس نے مخطوطات کی فہرست کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بعجلت ممکنہ سرانجام دیا۔

نصیر الدین ہاشمی مرتب فہرست ہذا دکن کے محقق کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے یورپ میں اپنے قیام کے زمانے میں انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور پیرس کے کتب خانوں کا تفصیلی معائنہ کیا اور اپنی تحقیق کا حاصل یورپ میں دکھنی مخطوطات کے نام سے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ موصوف کے اپنے تحقیقی کام کے دوران انڈیا آفس، رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، بوڈلین

لائبریری آکسفورڈ، یونیورسٹی لائبریری کیمبرج، قومی کتب خانہ پیرس وغیرہ کی فہرستوں کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا اور تصحیح کا کام انجام دیا تھا جس کو بہت سراہا گیا۔ زیر تبصرہ فہرست کی ترتیب کے وقت موصوف کو اپنے اس تجربے سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع ملا۔ انھوں نے بڑی حد تک ڈیوی کے اصول کے مطابق جو فہرستوں کی ترتیب کے وقت پیش نظر رکھا جاتا ہے یہ فہرست مرتب کی ہے لیکن بعض مقامات پر اس سے انحراف بھی کیا ہے۔

ہاشمی صاحب نے کتابوں کو ۸ ابواب اور ۲۴ فنون کے تحت تقسیم کیا ہے۔ اصول ابواب یہ ہیں۔ اسلامیات، مذہب فلسفہ و منطق، سائنس، کارآمد فنون، فنون لطیفہ، لسانیات، ادبیات اور تاریخ۔ ان میں سے ہر باب کی پھر ذیلی تقسیم الگ کی گئی ہے۔

فہرست کا آغاز نواب مہدی نواز جنگ بہادر صدر نشین کمیٹی کے پیش لفظ سے ہوتا ہے جس کے بعد حبیب الرحمٰن صاحب نے عرض حال کے عنوان کے تحت فہرست کی ترتیب کے بارے میں اظہار خیال کیا جس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے چار پانچ سال ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ حیدرآباد کے مشہور کتب خانوں میں جو اردو مخطوطات ہیں ان کی وضاحتی فہرستیں تیار کروائی جائیں۔ اس سلسلہ میں کتب خانۂ آصفیہ عجائب خانہ حیدرآباد، سنٹرل ریکارڈ آفس اور کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی اور کتابوں کی فہرستیں مکمل ہو چکی ہیں۔ ہم انجمن کو اس اہم کام کی تکمیل پر مبارک باد دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ دوسری فہرستیں بھی جلد از جلد شائع ہو جائیں گی۔ یہ کام عام آدمی کی دلچسپی کا نہ سہی انجمن کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جائے گا۔

پیش لفظ اور عرض حال کے بعد ہاشمی صاحب نے حرف آغاز اور کچھ فہرست ہذا کے بارے میں کے عنوانات کے تحت نواب سالار جنگ کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔

فہرست کے محاسن اور معائب کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وہ استعمال میں آئے گی اور اس کے مندرجات اصل مخطوطات کے مطابق پائے جائیں گے لیکن جہاں تک صرف فہرست کے مطالعہ سے اس کے متعلق عام رائے قائم کرنے کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے اس کی ترتیب میں ہاشمی صاحب کو بڑی محنت اور دماغ سوزی کرنی پڑی ہے اور انھوں نے اس کو زیادہ سے زیادہ مفید، کارآمد اور معلوماتی بنانے کی ممکنہ کوشش کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ محققین کے لیے یہ فہرست بہت کارآمد ثابت ہوگی اور اس سے وہ نہ صرف ایک بڑے کتب خانے کے مخطوطات سے واقف ہو سکیں گے بلکہ تحقیق کے لیے نئے نئے میدان ہاتھ آئیں گے۔

فہرست میں ایک چیز بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ ہے زبان۔ نظر ثانی کے موقع پر کم از کم صحت زبان پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ بحالت موجودہ پڑھنے والے کو زبان کی غلطیوں کی وجہ سے الجھن سی ہوتی ہے۔

کتاب کی قیمت بھی کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک فہرست پر ہی کیا موقوف "سلسلۂ یوسفیہ" کے تحت جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کو شائع ہوئے برسوں ہوئے لیکن ابھی

تک ان کی بڑی تعداد فروخت نہ ہو سکی۔ یہ کتابیں جب چھپی تھیں اس وقت لاگت بھی بہت کم آتی تھی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ قیمتوں پر نظر ثانی کی جائے تاکہ یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں، اور نواب سالار جنگ نے جس مقصد کے تحت ان کی اشاعت کی اسکیم بنائی تھی وہ پورا ہو۔

حسینی شاہد

اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ

۱۔ اختر شیرانی (۲) فیض (۳) مجاز (۴) اختر انصاری
۵۔ شاد عارفی (۶) احمد ندیم قاسمی (۷) مجروح (۸) عرش ملسیانی

انجمن ترقی اردو ہند (علیگڈھ) نے اردو کے جدید شاعروں کا انتخابی سلسلہ شائع کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت بارہ آنے ہے اب تک اس سلسلے کی مندرجہ بالا آٹھ کتابیں شائع ہوئی ہیں ابھی پہلے سیٹ میں جذبی، مخدوم، وجد، کیفی، جاں نثار اور راشد کی کتابیں زیر طبع ہیں۔ انجمن نے یہ سلسلہ اس لیے شروع کیا ہے کہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی بنا پر کسی شاعر کا سارا کلام نہیں پڑھ سکتے اس شاعر کے رنگ سے متعارف ہو جائیں اور انھیں اس کے تفصیلی مطالعے کی خواہش پیدا ہو۔ جدید شاعروں کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچانے کے لیے یہ ایک اچھا اور لائق ستائش اقدام ہے۔ جسے عوام میں یقینی طور پر مقبول ہونا چاہیے۔

تمام شاعروں کا انتخاب کلام بڑی حد تک نمائندہ ہے لیکن کہیں یہ کمی ہے کہ بعض شاعروں کے انتخاب میں ان کی کچھ نمائندہ چیزیں نہیں آسکی ہیں۔ مثلاً اختر شیرانی کے انتخاب میں "اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا" کی کمی کھٹکتی ہے مجاز کے انتخاب میں "اعتراف" "نورا" "رات اور ریل" کی عدم شمولیت حیرت ناک ہے، اس طرح زندہ شاعروں کے انتخاب میں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید انتخاب کے وقت ان کی اپنی رائے نہیں لی گئی اس طرح سے یہ انتخاب زیادہ نمائندہ ہو سکتا تھا۔

نئے شاعروں کے اس انتخابی سلسلے کی زیر طبع کتابوں میں اثر لکھنوی کا نام دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، اگر اس سلسلے میں اثر کو شریک کیا جا سکتا ہے تو پھر جگر، فراق، جوش اور دوسرے پرانے شاعروں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، اسی طرح پروفیسر شور، نشور واحدی، اختر الایمان، ن م راشد، ساحر لدھیانوی اور چند دوسرے شعراء کا انتخاب بھی ضروری ہے کیونکہ سرور صاحب نے تعارف میں یہ لکھا ہے کہ کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں موجودہ دور کے سارے اہم اور قابل ذکر شعراء آ جائیں۔ میرا خیال ہے کہ ان شاعروں کے نہ ہونے سے ہماری جدید شاعری کے بہت سے پہلو تشنہ اور کئی گوشے تاریکی میں رہ جائیں گے۔

اس انتخابی سلسلے میں شاد عارفی کا نام دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کیونکہ ہمارے ادب میں پچھلے چند سال پہلے جو تنگ نظری آگئی تھی اس کی وجہ سے کئی اہم شاعر اور ادیب نظر انداز کر دیے گئے تھے۔ بعض کو اب تک ان کا مناسب مقام نہیں مل سکا ہے۔ مگر یہ امر بجائے خود کافی امید افزا ہے کہ اب ہمارے نقادوں اور انتخاب کرنے والوں کی نظریں شاد عارفی پر بھی پڑنے لگی ہیں۔ شاد عارفی کا لب و لہجہ، اسلوب، مزاج بالکل منفرد ہے، اسی طرح ان کی شاعری کے موضوعات میں بھی غضب کا نیا پن اور انفرادیت ہے یکساں آوازوں کے ہجوم میں اگر کوئی آواز سب سے الگ سنائی دے تو وہ فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور شاد عارفی کی

بھی خوبی ہے، یہی نہیں بلکہ ان کی نظمیں اور غزلیں ہماری شاعری میں لب ولہجہ، انداز و اسلوب اور موضوعات کے تنوع کی بھی ضامن ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند ایسے اور دوسرے شعراء کو بھی نظر انداز نہ کرے گی جن کے پاس انفرادیت اور اپنی آواز ہے۔

انجمن ترقی اردو کا یہ انتخاب ایک مستحسن اقدام ہے اور یہ انتخابی سلسلہ اس قابل ہے کہ ہر ادب دوست اور باذوق کے گھر کی زینت بن سکے قیمت بھی زیادہ نہیں ہے اس لیے آسانی سے طلباء عوام اور خواص سب ہی ان کتابوں کو خرید کر انجمن کے اشاعتی پروگرام کی توسیع میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنی ہے وہ یہ کہ اگر اس طرح کلاسکی شعراء کا انتخاب بھی شائع کیا جائے تو اردو زبان وادب کی بڑی خدمت ہوگی کیونکہ بہت سے قدیم شعراء کے دواوین اس قدر کم یاب ہیں کہ بازار میں تو کیا بڑے بڑے کتب خانوں میں نہیں ملتے۔ اگر انجمن اس طرف توجہ کرے تو قدیم شعراء کے انتخابی سلسلے کو بھی ایسی ہی مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ وحید اختر

آگ میں پھول

حمایت علی شاعر کا پہلا مجموعہ کلام اور ان کی نو دس سال کی فکر سخن کا نچوڑ ہے۔ حمایت علی شاعر کا نام ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں آئے دن مختلف معیاری ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حمایت علی شاعر ان شاعروں میں سے ہے جن کے لیے شاعری نہ تو ذریعہ معاش ہوتی ہے اور نہ محض دل بہلائی اور وقت گزاری کا ذریعہ۔ ان کی شاعری میں کسک اور خلش ہے جو زندگی کے درد سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مجموعے میں مختلف رومانی اور مسائلی نظموں اور غزلوں، رباعیوں اور قطعات کے علاوہ ایک طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" بھی شامل ہے جو غالباً اس مجموعے کی سب سے اچھی نظم ہے۔ اس کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے صرف چند ہی پڑھی جانے کے قابل ہیں اور ان میں سے ایک "بنگال سے کوریا تک" بھی ہے۔ یہ نظم ایک کہانی ہے جو آپ بیتی کے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ بنگال اور کوریا اس میں تمثیلی علامتیں ہیں۔ اس نظم کے کئی حصے ہیں۔ ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمل نظم ہے ہر نظم دوسری نظم سے ایسی پیوست ہے کہ تسلسل اور روانی میں کہیں فرق نہیں آتا ہے یہ نظم بہت زیادہ طویل بھی ہو سکتی تھی لیکن شاعر نے اختصار اور ایجاز سے کام لے کر اسے طوالت ہونے سے بچا لیا۔ اس کی وجہ سے نظم کا مجموعی تاثر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس نظم کا ہیرو جنگ میں شریک رہ کر اس کی تباہ کاریاں دیکھنے کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ جنگ کے اثرات اس کے وطن تک پہنچ چکے ہیں: "دوسری زندگی" کے دو بند ملاحظہ کیجئے۔

زندگی کے ہر ایک گوشے میں — ایک اک چیز کارزار سی تھی
کھیت کے کھیت تھے گڑھوں میں دفن — اور بہو کی خدائی ساری تھی
ہر تجوری میں قبر کی مانند — موت کی جونے فیض جاری تھی
وسرتا کھیہ کوئی وہ کاں ہو — ہر طرف ترہ کی شب سیاری تھی

جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر ___ جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی
تنگ آ کر نہ جانے کتنی بار دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر مرے عزائم کو ایک بچّی نے ہنس کے توڑ دیا

جنگ کے معاشی اثرات کی تصویر مختصر لفظوں میں کس خوبی سے کھینچ دی گئی ہے آخری دو شعروں میں ایک طویل کہانی سموئی ہوئی ہے۔

شعلۂ بے دود، آخرِ شب، ادھوری کہانی، شکستِ خواب، اجنبی مہمان، اور غم فردا بھی اس مجموعے کی اچھّی نظمیں ہیں ان نظموں کی موسیقیت، خیالات کی ترتیب اور توازن، لب و لہجے کی گھلاوٹ اور تاثر کی شدت ایسی خصوصیات ہیں جو ہماری توجہ کو مرکوز کر لیتی ہیں۔

حمایت علی شاعر ترقی پسند شاعر ہیں ایک مخصوص فلسفۂ حیات پر ایقان رکھتے ہیں جو "اشتراکیت" ہے۔ غم ذات ہو، غم حیات ہو یا غم کائنات وہ ہر مسئلہ کو ایک خاص زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ جا بجا جمالیاتی اور معاشی قدروں کے ربط کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "میں نے زندگی کو ہمیشہ مادّی حدود میں دیکھا ہے اور انہیں مادّی حدود میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔ میرا محبوب وہی ہے جو زندگی میں میرا محبوب ہے ــ میری طرح گوشت و پوست کا انسان ــ ظاہر ہے کہ اس کے محسوسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ اگر مجھے اس سے عشق ہے تو اس نے بھی مجھے چاہا ہے۔ اگر میں اسے اپنا نہ سکا تو میں نے گریباں چاک کرنے کی بجائے سماجی حالات میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اگر میں نے اسے پا لیا ہے تو سماجی زندگی میں اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے"۔ اس اقتباس کو پیش کرنے سے میرا مقصد آپ کو اس مجموعے کی شاعری کے حدود اربع سے واقف کرانا تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو اس مجموعے میں کوئی خالص عشقیہ یا رومانی یا منظری نظم نہ ملے تو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ عشق اور حسن کے تعلق سے شاعر کا رویّہ وہی ہے جو ساحر لدھیانوی کا ہے۔ شاعر نے بھی "حسن ترر پرست" کو اپنی بعض نظموں کا موضوع بنایا ہے۔

زندگی کے بارے میں کسی فلسفے کو اپنانا بری بات نہیں ہے۔ لیکن جب کوئی فلسفۂ حیات اپنی روشنی سے حیات و کائنات کے مختلف مظاہر کو ان کی اصلی صورت میں بے نقاب کرنے کی بجائے فن کار کی آنکھ پر رنگین عینک چڑھا دیتا ہے تو فن کا انجام ظاہر ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر ہمارے ادب میں کیسے کیسے "انمول جواہر" بھرے پڑے ہیں وہ سمجھ دار اور متوازن دل و دماغ رکھنے والے قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں ـــ چنانچہ ساحر لدھیانوی کی طرح حمایت علی شاعر بھی کہیں کہیں کلبیت کا شکار ہو گئے ہیں۔۔۔ "اگر کوئی چاند کو دیکھ کر اس وجہ سے کڑھنے لگے کہ وہ روٹی کے مشابہ ہے مگر اس کی بھوک نہیں مٹا سکتا تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے ـــ آپ صرف اس سے ہمدردی کر سکتے ہیں۔ اس کا علاج تو کسی مطب ہی میں ممکن ہے۔ شاعر کی نظم "مژدۂ نو" میں اسی قسم کی جذباتیت جھلکتی ہے۔ کسی سیاسی یا معاشی نظام کو ہدف ملامت بنانے کے لیے اپنی بچّی کی موت کا سہارا لینے میں اور جاگیرداری نظام کو مطعون کرنے کی خاطر تاج محل کی تحقیر روا رکھنے

میں ایک سی ذہنیتیں کارفرما نظر آتی ہیں ۔ اس قسم کی جذباتیت نے شاعر کے لہجے میں کہیں کہیں حقارت آمیز تلخی پیدا کردی ہے بڑا شاعر بننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ اس تلخی کو رنگینی سے بدلیں اور فن کی نشاطی اور جمالیاتی قدروں کا احترام کرنا سیکھیں ۔

حمایت علی شاعر فطرتاً نظم گو شاعر ہیں ۔ غزل یا رباعی کی صنف سے ان کا مزاج نہیں ملتا ۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایسی اصناف کے پیچھے ضائع نہ کریں ۔ اردو میں اچھی طویل نظموں کی بہت کمی ہے وہ اس طرف توجہ کریں تو اپنے لیے بہت جلد جگہ پیدا کر لے سکتے ہیں ۔ اس موقع پر میں نظم نگاری کے تعلق سے چند باتیں عرض کروں گا ۔ آٹھ دس سال پہلے اردو شاعری میں موضوع اور ہیئت کے کچھ تجربے کیے گئے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعری میں اظہار خیال کے لیے نئی راہیں ٹٹولی جارہی ہیں ۔ لیکن ادھر عرصہ سے یہ جستجو قریب قریب مفقود ہوگئی ہے ۔ آج کے نظم نگار شاعر مقررہ اصناف سے انحراف کرتے جھجکتے ہیں ۔ کبھی جی چاہا تو بندوں میں اشعار کی ترتیب اور تعداد میں کچھ رد و بدل کرلیا اور بس ۔ اردو شاعری میں نظم آزاد اور نظم معریٰ کے پروان چڑھنے کے امکان بہت وسیع ہیں ۔ اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس سے قطع نظر نظم نگاری کے لوازم اور فنی اصولوں سے بالعموم شعرا بے نیازی برتتے ہیں ۔ غنیمت ہے کہ حمایت علی شاعر کی نظموں میں ایسی بے راہ روی زیادہ بار نہیں پاسکی ہے مگر بند بازی اور قافیہ پیمائی ان کی بعض نظموں میں بھی نظر آتی ہے ۔ کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ذرا سی عدم توجہی سے اچھی خاصی نظم مکمل فن پارہ بننے سے رہ گئی ہے ۔ "بنگال سے کوریا تک" کا خاتمہ موثر اور فطری نہیں ہے ۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ نظم کا اختتام قاری کی توقع کے مطابق ہی ہو ۔ لیکن نظم اس طرح ختم ہونی چاہیے کہ پڑھنے والا محسوس کرے کہ اس نظم کا خاتمہ اس سے ہٹ کر ہو ہی نہیں سکتا ۔

ان امور کے علاوہ زبان و بیان کی بعض ایسی خامیاں اس مجموعے میں نظر آتی ہیں جو ذرا سی توجہ سے دور ہوسکتی تھیں ۔

حمایت علی شاعر کا اپنا اسلوب یا اسٹائل ابھی پوری طرح متعین نہیں ہوا ہے ۔ ان کے لب و لہجے میں کیفی اور ساحر کے لہجہ کی آمیزش ہے ۔ کہیں کہیں فیض کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے ۔

میرا خیال ہے کہ شاعر نے اس مجموعے کو چھپوانے میں جلدی کی ۔ عام طور پر شاعر پہلا مجموعہ چھپوانے کے بعد مطمئن یا مایوس ہوکر بیٹھے رہتے ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ حمایت علی شاعر اس روایت کو نہیں اپنائیں گے ۔ ابھی اردو شاعری کو ان سے اچھی توقعات وابستہ ہیں ۔

"آگ میں پھول" صوری اور معنوی ہر لحاظ سے اردو شاعری کے قارئین کے لیے ایک حسین تحفہ ہے ۔ کتابت صاف ستھری ہے مگر غلطیوں سے بالکل پاک بھی نہیں ہے ۔ طباعت نفیس کاغذ اوسط درجے کا اور سرورق خوبصورت ہے اس کتاب کا حجم ۱۹۲ صفحے ہے اس لحاظ سے قیمت تین روپے نامناسب نہیں ہے ۔

مغنی تبسم

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جدید مطبوعات

گاندھی جی ادارے کی طرف سے بچوں اور بالغوں کے لیے مشاہیرِ ہند کے حالاتِ زندگی سادہ اور آسان زبان میں مرتب کرا کے شائع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر خورشید احمد صاحب جامی سے گاندھی جی کی حیات نظم میں مرتب کرائی اور یہ کتاب گاندھی جی کی ایک عمدہ تصویر کے ساتھ بچوں اور ان پڑھ بالغوں کی خاطر جلی حروف میں خاص اہتمام سے چھپوائی گئی ہے: صفحات ۳۲: قیمت بارہ آنے۔

سروجنی دیوی مولوی وزیر حسن صاحب نے اپنے مخصوص اندازِ بیان میں مرتب کی ہے جو اردو دنیا میں ایک خاصہ کی چیز ہے۔ یوں بھی اردو میں سروجنی نائیڈو پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ وزیر حسن صاحب چونکہ ان کے چھوٹے فرزند کے دوست ہیں اس لیے انھوں نے سروجنی نائیڈو کی نجی زندگی بڑی خوبی سے قلم بند کی ہے اور ان کی نظموں سے بھی بہت پر لطف اور اہم مواد حاصل کیا ہے۔ اس کتاب میں سروجنی نائیڈو کے بعض نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں: صفحات ۱۰۵: قیمت دو روپے۔

حیدرآباد کے بڑے لوگ ان میں نہایت اہم اور مفید تاریخی و سیاسی و سماجی معلومات نہایت بے باکی سے قلم بند کی گئی ہیں اور جدید حیدرآباد کے معماروں کا تذکرہ درج ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے حیدرآباد کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی سامنے آجاتی ہے، اور ان اصحاب کی خدمات اجاگر ہو جاتی ہیں جنھوں نے اس مرحوم ریاست کی بیداری اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ دکن کی تاریخ میں یہ کتاب ایک خاص اہمیت اور خصوصیت کی حامل رہے گی؛ صفحات: ۱۵۲: قیمت دو روپے۔

میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر اردو جوگیشوری کالج بمبئی۔ میاں داد خاں سیاح اردو کے ایک عجیب و غریب شاعر، ادیب اور سیاح تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ان کے نام بہت دلچسپ خطوط لکھے ہیں اور سیاح نے غالب کے مخالفوں کے دندان شکن تحریری جواب دیئے ہیں۔ اتفاق سے سیاح کا دیوان دستیاب ہو گیا ہے جس کو مدنی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کر لیا اور سیاح کے حالاتِ زندگی بھی معتبر ذرائع سے فراہم کر اور ایک تحقیقی کتاب کی صورت میں لکھ کر ادارہ کو اشاعت کے لیے روانہ کیے۔ یہ کتاب ادارے نے خاص اہتمام کے ساتھ باتصویر شائع کی جو تاریخِ ادبِ اردو اور غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ ہے: بڑی سائز، صفحات: ۹۶: قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیاتِ اردو
خیریت آباد
حیدرآباد دکن

انفیوزا

انفلوئنزا کے حملہ سے بچاتی ہے!

● انفیوزا ۔ جسم میں مدافعت کی طاقت پیدا کرتی ہے اور انفلوئنزا کو پیدا نہیں ہونے دیتی حفظ ماتقدم کے طور پر اس کی ایک خوراک رات کو سوتے وقت استعمال کریں۔

● مرض کی صورت میں انفیوزا کی تین خوراکیں دوپہر اور شام استعمال کریں۔ یہ مرض کو جڑ سے دور کرے گی۔ اور کمزوری پیدا نہیں ہونے دے گی۔

● انفیوزا ہمدرد لیبارٹریز کی ایک قابل فخر پیشکش ہے جس میں قدیم فراست اور تجربہ کو جدید فن دواسازی کی ٹکنیک سے کامیابی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

● انفیوزا ہمدرد کے ان تجربات کا حاصل ہے جو اسے ۱۹۱۸ کے انفلوئنزا کی خطرناک وبا سے کامیاب مقابلہ میں حاصل ہوئے تھے۔ ۱۹۱۸ میں بھی اس دور کامیاب علاج کا سہرا طبّ یونانی کے سر بندھا اور اب بھی تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔



قیمت فی شیشی
صرف -/۲ روپیہ

اپنے قریبی اسٹاکسٹ سے طلب فرمائیں۔

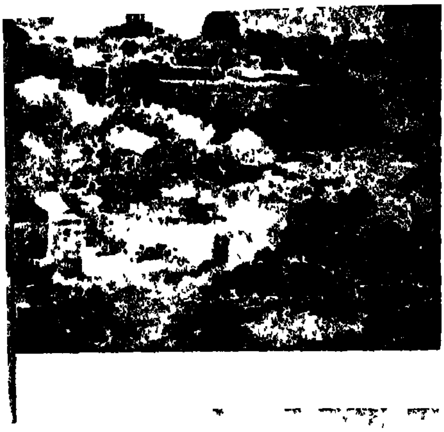
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

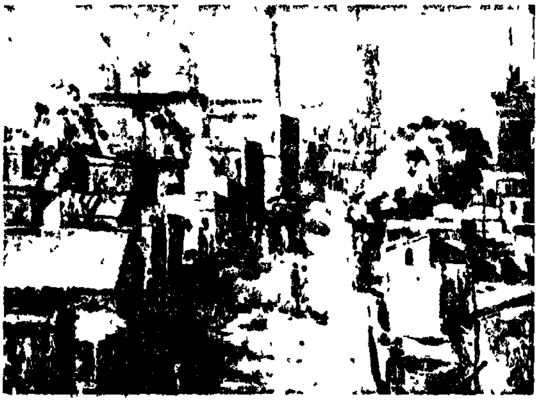
ڈسٹری بیوٹرز ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی فون نمبر ۲۶۳۱۵۷

Regd. No. H. [illegible]

"SABA" Monthly

[illegible] شمارہ جنگ آزادی نمبر ہوگا اس نمبر کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی سی ہوگی جس میں جنگ آزادی کے پس منظر، حیدرآباد کا جنگ آزادی میں حصہ اور اردو نظم و نثر پر اس تحریک کے اثرات کے موضوع پر مستند مواد فراہم کیا جائیگا اس نمبر کے لئے ہند و پاک کے تمام بلند پایہ ادیبوں کا تعاون حاصل کیا جا رہا ہے ۔









Rs. 1/-

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

صبا

ماہنامہ حیدرآباد دکن

ایڈیٹر۔ سلیمان اریب

فون :۔ (۵۴۰۲)

مجلس مشاورت :

حبیب الرحمن فضل الرحمن ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم

رائے جانکی پرشاد ڈاکٹر حفیظ قتیل عالم خوندمیری

دلاور علی خاں سید بن محمد (آرٹسٹ) رضیہ بیگم

کتابت :۔ محمد مظہر

• شمارہ (۷، ۸) • جلد (۱۷) • ماہ جولائی، اگست • قیمت :۔ ایک روپیہ

• زر سالانہ ہند و پاک سے (۱۰) روپے، ششماہی (۶) روپے، بیرون ہند سے (۲۰) شلنگ

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۷۰۲) کراچی ۲

پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ۷ اجزدگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان



حسین اور دلکش بننے کے لیے
AFGHAN SNOW
ESP
افغان اسنو
معاون حسن
استعمال کیجیے
افغان اسنو معاون افزائش حسن اشیاء
آپ کو اپنے حسن اور دلکشی میں اضافہ کرنے کے لیے
متنوع وسائل مہیا کرتی ہیں ...... افغان اسنو
معاون افزائش حسن اشیا آپ کے چہرے آپ کی
فیس کریمیں اور پاؤڈرس
ٹائلٹ اور ٹالکم پاؤڈرس
لپ اسٹک اور نیل پالش
لیونڈر اور خوشبویات

اس شمارے میں

سرورق :- بیدر کے مناظر
علی [illegible] گورنمنٹ کالج آف فائن آرٹس اینڈ آرکیٹکچر حیدرآباد

پہلی بات

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ؟

● اردو کی یہ یقیناً بدنصیبی ہے کہ وہ ہندوستان کی چودہ قومی زبانوں میں شمار ہونے اور اس برصغیر کے طول و عرض میں ہر جگہ کہیں کم اور کہیں زیادہ بولی جانے کے باوصف کوئی اسٹیٹ نہیں رکھتی اور ظاہر ہے کہ اردو کا کوئی اسٹیٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہر اسٹیٹ میں اس کی حیثیت بڑی قابلِ رحم ہو کر رہ گئی ہے۔ جس اسٹیٹ میں اردو بولنے والے بہت چھوٹی اقلیت ہیں وہاں وہ کوئی مطالبہ نہیں کر سکتے۔ اتر پردیش جو اردو کا گھر سمجھا جاتا ہے وہیں وہ بے گھر ہے۔ کم و بیش یہی حال بہار، دہلی اور پنجاب کا ہے۔ آندھرا پردیش جہاں اسے دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے وہاں بھی اس کا موقف کچھ بہت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ رہ گیا کشمیر تو وہاں بھی کشمیری زبان اردو کا پہلو دبائے ہوئے ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کل کشمیری زبان ترقی کر کے سرکار دربار سے اردو کو نکال باہر کرے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ؟ تاہم اردو کو ہندوستان میں جو دستوری حیثیت حاصل ہے اور اپنی جنم بھومی میں زندہ رہنے کا جو حق حاصل ہے اسے کوئی نہیں چھین سکتا چنانچہ ہمارے نزدیک اردو کی اصل بدنصیبی یہ ہے کہ خود اردو بولنے والے اپنی زبان کے تحفظ کے لیے

۱۔ متحد الخیال اور متحد العمل نہیں ہوتے
۲۔ بنیادی مسائل کو اولیت نہیں دیتے
۳۔ زبانی جمع خرچ زیادہ کرتے ہیں۔ اور
۴۔ کسی کی تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔

اردو کے اور مراکز کے بارے میں تو ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے لیکن حیدرآباد میں ـــــ جو اردو کا ایک اہم مرکز ہے جہاں اردو کو بلاشبہ کچھ سہولتیں بھی حاصل ہیں، جہاں اردو کے بہت سے ادارے اور لکھنے والے موجود ہیں جہاں سے اردو کے بہت سے اخبار اور رسائل نکلتے ہیں اور جہاں اردو کا بہت کام ہو سکتا ہے اور ٹھوس کام ہو سکتا ہے ـــــ آپس کے اختلافات نے بڑی ناخوشگوار صورت پیدا کر دی ہے۔

آج اردو کے تحفظ اور بقا کے لیے زیادہ سے زیادہ ادارے اور افراد سرگرم عمل ہوتے ہیں تو اس کو کوئی بری

نہیں ہے کیونکہ ہر ادارہ اپنے علاوہ دوسرے ادارے کو اردو کا سچا بہی خواہ نہ سمجھے اور ہر فرد اپنے ہی دل کو اردو کے درد کا قابل سمجھے اور دوسرے کی تڑپ کو نمائشی... تو پھر پھوٹ اور انتشار کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جس طرح تصوف کے مختلف سلسلے ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے اسی طرح اردو کے مختلف اداروں اور افراد کو ایک دوسرے کا حریف نہ ہونا چاہیے بلکہ ایک دوسرے کا حلیف بن کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہر ادارہ اور ہر فرد اپنا جھنڈا الگ بلند کرتا اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہے اور چاہتا ہے کہ قیادت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں رہے اس سے اردو کی خدمت تو کیا بدخدمتی ضرور ہو رہی ہے۔

ہماری خود پسندی اور علیحدگی پسندی کی ایک تازہ ترین مثال یہ ہے کہ حیدرآباد میں ابھی چند دن پہلے اردو کے ادیبوں کی ایک کوآپریٹیو سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا لیکن ہمارے بعض وہ بالغ نظر ساتھی جو خود ایک ایسے ادارے کی شدت سے ضرورت محسوس کر رہے تھے اور کوآپریٹیو سوسائٹی کے قیام کے لیے کوشاں تھے محض ایک "فروعی اختلاف" پر کوآپریٹیو سوسائٹی سے اپنا رشتہ توڑ چکے ہیں حالانکہ ایک ایسی منزل میں جہاں ایک خواب نے ابھی پوری طرح حقیقت کی صورت اختیار نہیں کی ہے ہم سب کو پورا پورا تعاون دینا چاہیے اور اپنی انفرادی رائے کو اکثریت سے منوانے کی بجائے اردو کے CAUSE کی خاطر اکثریت کی رائے کو مان لینا چاہیے اور سب کے ساتھ مل کر چلنا چاہیے۔ ہم حیدرآباد کے ان تمام اداروں، ادیبوں، شاعروں صحافیوں اور ادب دوستوں سے —— جو واقعی اردو کا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں جو بساط بھر اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور جو اردو کی "روٹی" کھا رہے ہیں —— یہ اپیل کریں گے کہ وہ ایک دوسرے کی نیتوں پر شک کیے بغیر ایک دوسرے کی آئیڈیالوجی کا سوال اٹھائے بغیر ایک اچھے مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے ...... کوآپریٹیو سوسائٹی سے بے تعلق رہنے کی بجائے اس کے اندر آ کر اس کی بنیادوں کو استوار کریں اور اس ذرا سی آبجو کو محیط بیکراں بنائیں ورنہ ہو گا یہی کہ یہ کوآپریٹیو سوسائٹی بھی کل ٹھپ ہو کر رہ جائے گی اور ہم .... کل پھر ایک ایسے ادارے کی ضرورت پر تبادلۂ خیال کرتے بیٹھیں گے۔

"صبا کا نومبر کا پرچہ شاہد صدیقی مرحوم کے لیے مختص ہو گا"

جان دی ہے تو حیات ابدی پائی ہے

. . . . جون سے اگست تک پانچ شخصیتیں ہم میں سے اٹھ گئیں جن کے لیے واقعی سیاسی و مذہبی اور علمی و ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ یہ پانچ شخصیتیں علی الترتیب میاں افتخار الدین، ڈاکٹر محمد اشرف، قاضی غیاث الدین شاہد صدیقی اور مولانا حفظ الرحمن کی تھیں۔

● میاں افتخار الدین لاہور کے بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے یورپ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ غیر منقسم ہندوستان میں پنجاب صوبائی کانگریس کے برسوں صدر رہے۔ میاں صاحب اپنی روشن خیالی، ترقی پسندی اور عوام دوستی کی وجہ سے مقبول بھی رہے اور معتوب بھی۔ وہ ہند پاک دوستی کے خواہاں اور پاکستان پر امریکی استبداد کے سخت مخالف تھے۔ چند سال پہلے انھوں نے لاہور سے پاکستان ٹائمز، امروز اور ہفتہ وار لیل و نہار جاری کیا تھا جو پاکستان کے بائیں بازو کا ہفتہ وار اور روزنامے سمجھے جاتے تھے لیکن ابھی ڈیڑھ دو سال پہلے پاکستان کی ملٹری حکومت نے ان اخباروں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میاں صاحب کے لیے آزادی تحریر و تقریر کا گلا اس طرح گھٹتا ہوا دیکھنا آسان نہ تھا اور شاید اسی صدمے نے ان کی جان لے لی۔

● ڈاکٹر کنور محمد اشرف علی گڑھ یونیورسٹی کی خاص "پیداوار" تھے۔ قومی آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد جیسے قومی رہنماؤں کے دست راست کی حیثیت سے حصہ لیا۔ ۱۹۴۲ء میں وہ کانگریس سے علیحدہ ہوگئے اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئے۔ ڈاکٹر اشرف کی ذہانت، وطن دوستی، زور خطابت، علم و فضل، ایمانداری، استقامت کردار اور حق گوئی و بے باکی ایسی صفات تھیں کہ ہندوستان کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ افسوس کہ ملک نے اس جوہر قابل کی قدر نہ کی۔ ڈاکٹر اشرف کی زندگی ایک المیہ تھی اور ان کا انجام بھی ایسے ایک ہیرو کی طرح ہوا۔ وہ وطن میں اجنبیوں کی طرح رہے اور مرے بھی تو برلن میں۔ غریب الوطن کی موت۔

● قاضی غیاث الدین کی عملی زندگی کا آغاز تو وکالت سے ہوا لیکن ۱۹۲۲ء میں وہ کانگریس سے وابستہ ہوگئے اور اپنے آپ کو قومی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ پھر ان کی صلاحیتوں اور خدمات کے اعتراف کے طور پر [illegible] کا [illegible] تنظیم جدید کے بعد حکومت مہاراشٹر نے پہلے انھیں قانون اور صنعت کا نائب وزیر مقرر کیا اور [illegible]

سپلائر بنایا۔ وہ مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ کے صدر تھے اور ایک تعلیمی اسکیم کو روبہ عمل لانے والے تھے۔ انہیں کی تحریک پر بمبئی سے ہفتہ وار "روحیات" جاری ہوا تھا۔ قاضی لیاقت نے ایک سیاسی رہنما، ایک بالغ نظر مدبر اور اردو زبان کے ایک مخلص کارکن کی حیثیت سے جو روایت چھوڑی ہے وہ قابل قدر بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

جہاں جہاں میں رکا وقت کے قدم بھی رکے
مرا وجود خود اپنی جگہ زمانہ تھا

● شاہد صدیقی نے یہ شعر کہتے ہوئے ہرگز یہ نہ سوچا ہوگا کہ ایک دن جب اس کے قدم رک جائیں گے تو وقت اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔ لہٰذا، ۱۴ رجولائی کی آدھی رات کو شاہد کا جسم خاکی تو یہیں رہ گیا لیکن اس کی روح وقت کے ساتھ پرواز کر گئی۔ ایک مجسم زندگی، ایک جوان ظریف، ایک ادا شناس غزل، ایک رند لاابالی اور ایک چلتی پھرتی انجمن کا اس طرح اچانک خاموش ہو جانا ایک ایسا سانحہ ہے جو نہ صرف ادب کا بلکہ بہت سے لوگوں کا ذاتی نقصان ہے۔ شاہد نے جس طرح اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے ہنستے ہنساتے زندگی گزار دی وہ بڑے ظرف کی بات ہے اور شاہد کے ظرف کا اندازہ وہ اہل کرم نہیں کر سکتے جو زندگی بھر اس کی ذہانت کا استحصال کرتے رہے اور جو محض اسے ایک شاعر، ایک نثر نگار۔۔۔ ایک لطیفہ گو اور ایک زندہ دل انسان سمجھتے تھے۔

● مولانا حفظ الرحمن کی ذات مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہو گئی تھی۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ ملک کو ان کی بڑی ضرورت تھی ان کی موت ایک بڑا قومی اور ملی نقصان ہے جس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے۔ مولانا نہ صرف ایک بلند پایہ عالم دین اور غیر متعصب مسلمان تھے بلکہ ایک زبردست مقرر، مصنف اور اردو زبان کے حامی بھی تھے۔ وہ فرقہ پرستوں کے سخت دشمن اور قومی یکجہتی کے ایک روشن مینار تھے۔ جمعیت علمائے ہند کے صدر، ندوۃ المصنفین، دارالعلوم دیوبند، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے مسلمانوں اور ہندوستان کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ خدا مولانا کو غریق رحمت کرے۔

مکتوب

جناب ایڈیٹر صاحب

براہ کرم میرا یہ خط "صبا" میں چھاپ کر مجھے ممنون فرمایا جائے۔

میری مرتب کردہ کتب خانہ، نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست پر جناب رئیس الدین صاحب فریدی کا جو مضمون رسالہ "صبا" کے پچھلے شمارے میں شائع ہوا ہے اس کے متعلق مجھے "شبہ" ہے کہ آیا "خارج" میں کوئی شخصیت رئیس الدین فریدی صاحب کی ہے بھی یا نہیں[1]۔ اور اگر کوئی شخصیت موجود ہے تو مجھے اس امر کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے کبھی کتب خانہ نواب سالار جنگ میں آکر استفادہ نہیں کیا۔ کیوں کہ جس وقت سے کتب خانہ سے استفادہ ہونے لگا ہے اس وقت سے استفادہ کرنے والوں کا پورا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ اس میں کوئی شخصیت رئیس الدین صاحب فریدی کی نہیں ہے، بلا کسی استفادہ کے فرضی طور پر مضمون قلمبند کرنا کہاں تک قرین قیاس ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ فہرست سے اصل مخطوطات کی مطابقت کر کے نہ دیکھا جائے اس وقت تک مضمون لکھا ہی نہیں جا سکتا۔

۲۔ نفس مضمون کے متعلق واضح ہو کہ جو مثالیں دی گئی ہیں ان میں سے بڑا حصہ غلط ہے اور ناواجبی، اگر فریدی صاحب تمام غلطیوں کو ثابت کر دیں تو میں اپنا اعتراف شائع کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ چند فروگذاشتیں اور کچھ سہو ہوا ہے، یا پھر کتابت اور طباعت کی غلطیاں ہیں۔

۳۔ اس قسم کی فروگذاشتیں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی مرتبہ فہرستوں میں بھی موجود ہیں جن کو پروفیسر ایتھے، پروفیسر ریو، اور ڈاکٹر بلوم ہاٹ جیسے قابل ترین اشخاص نے مرتب کیا ہے، اور ان کی اصلاح آج تک ہوتی رہی ہے۔ اور خود میں نے ڈاکٹر بلوم ہاٹ کی مرتبہ فہرست اور مخطوطات کی اصلاح کی ہے اور اس کی تصدیق مسٹر اسٹوری (اس وقت کے انڈیا آفس کے لائبریرین) کی تحریر میں میرے پاس موجود ہے۔

۴۔ رہا یہ امر کہ فہرست کی اشاعت میں کیوں عجلت تھی؟ یہ مجھ سے بالمشافہ دریافت کیا جا سکتا ہے میں اس کو بذریعہ تحریر ظاہر نہیں کر سکتا۔

نصیر الدین ہاشمی

---

[1] آپ کا [redacted] روزنامہ "انقلاب" بمبئی کا حیدرآباد ایڈیشن بہت دنوں تک ان کی نگرانی میں نکلتا رہا۔ آج کل وہ کلکتہ میں ہیں اور غالباً روزنامہ "ہند" کے ایڈیٹر ہیں۔ حیدرآباد سے ان کا اب بھی تعلق باقی ہے۔ (ایڈیٹر)

قاضی عیاذ انصاری

قومی یکجہتی اور بول چال کی زبان

ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں انسان کو بھی اظہار مطلب کے لیے دوسرے جانداروں کی طرح آواز کی ایک مختصر سی
شکتی ملی تھی، سونگھنے، چھونے اور دیکھنے کی طرح تاکہ وہ اپنی کہہ سکے اور دوسرے کی سن سکے، یہ وہ زمانہ تھا جب بقول ڈارون
وہ درختوں کی شاخوں پر اچھلتا، کودتا پھرتا تھا۔ اس دور کی صوتی صلاحیت چند مبہم آوازوں کے سوا کچھ بھی تو نہ ہوگی۔
آوازیں الفاظ کی طرح اس وقت پیدا ہوئی ہوں گی جب وہ درختوں سے اتر کر میدانوں میں آیا، اور دو پاؤں پر کھڑے ہو کر اس نے چلنا
سیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کے نچلے جبڑے کا وزن آہستہ آہستہ ہلکا ہو رہا تھا اور گلے کے اعصاب پر سے غیر ضروری عضلات
کا بوجھ کم ہو رہا تھا۔ اب وہ ان ہی آوازوں کو جو ابھی تک اظہار مقصد کے لیے اس کا بیش قیمت سرمایہ تھیں ہلکے تلفظ کے
الفاظوں میں ڈھالنے لگا ہوگا۔ ہلکے تلفظ کے الفاظ وہ ہیں جو صرف ہونٹوں کے کھولنے اور بند کرنے سے نکل آتے ہیں۔ ا
پا، اور ما یہ تھی بول چال کی ابتدا جس کی ترقی میں کئی قرن گزرے ہوں گے۔

کب اور کس زمانے میں سب سے پہلے بول چال کی طرح پری اور حیوانی آوازوں نے کسی خاص وقت تکلم کی
جگہ لے لی اور غیر ناطق انسان کب انسان بن کر چکنی چپڑی باتیں کرنے لگا اس کا واضح ریکارڈ اور قطعی شہادت ہمارے
پاس موجود نہیں ہے۔ ہاں اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ زمین کے جس حصے پر بھی حضرت انسان نے قدم جمائے وہ اپنے ساتھ
ایک بولی ضرور لایا۔ بہت سی ابتدائی بولیاں اب فنا ہو چکی ہیں جو باقی ہیں ان کی ابتدائی شکل و صورت بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے
بعض بالکل نئی ہیں۔ ایک دوسرے سے میل کھاتی ہوئی۔ فرانسیسی زبان اٹلی سے اور انگریزی جرمنی زبان سے کس قدر ملتی جلتی
ہے۔ ان میں سے بعض ایک دوسری سے بالکل الگ ہیں۔ ہندوستان کی پرانی زبانیں تامل، اور تلگو یورپ کی نئی زبانوں سے
کس قدر مختلف ہیں۔

زبانیں پرانی ہوں یا نئی کسی ایک گروپ سے متعلق ہوں یا الگ الگ ساری دنیا کی زبانوں میں انسان کی
بنیادی آوازیں مشترک ہیں اور یہی اشتراک ہے جنسی اعتبار سے غیر ناطق حیوانوں سے الگ کرتا ہے۔ انسان آخر کر
انسان ہے اس کے جذبات خصائل اور اس کی سماجی ضروریات میں ایک طرح کی یک رنگی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے
اس کے پاس بول چال کے لیے آواز نکالنے کا آلہ بھی یکساں ہے۔

حلق کے بیچوں بیچ چھوٹا سا ایک پردہ پیانو کے READ کی طرح گردن کے عضلات کی مدد سے کھلتا اور بقدر ضرورت بند ہوتا رہتا ہے، پھیپھڑوں کی دھونکنی کی ہوا ہردم اس پردے سے ٹکراتی رہتی ہے اور ہلکی، بھاری، اونچی، نیچی غرض سب طرح کی مدھم پنچم آوازیں اسی آلہ سے نکلتی ہیں۔ یہ آوازیں پھر منہ کے خلا میں پھیلتی، زبان پر پھسلتی اور دبتی دانتوں سے ٹکراتی، ہونٹوں اور ناک کے ذریعہ باہر آتی ہیں۔ آواز کے لیے پیانو کے READ کی مثال بہت جامع ہے لیکن بہت پرانی بھی ہے اس سے آلہ آواز ایک ساز کی طرح ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور آواز کے آہنگ کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے لیکن اس آلہ کو اگر ہم ایک سسٹم کی طرح بھی جانچیں اور پرکھیں تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ انسان کے جسم کا یہ آلہ کم و بیش براڈ کاسٹنگ سسٹم کی طرح کام کرتا ہے۔ اس سسٹم میں ایک طرف ٹرانسمیٹر ہے اور دوسری طرف اس ٹرانسمیٹر کی آوازوں کو سمیٹنے اور جذب کرنے والا ریسیونگ سٹ کان بھی ہے۔ انسانی جسم کا یہ ٹرانسمیٹر ایک مخصوص طاقت سے آوازیں نکالنے پر مامور ہے، منہ کے خلا میں ان آوازوں کی مدھم شکلیں بنتی رہتی ہیں جن میں رنگ ہے نہ بو، نہ مزہ، نہ ہم انھیں چھو سکتے ہیں اور نہ یہ دیکھی جا سکتی ہیں، کان کے سوا بدن کے کسی حصہ پر ان کا مطلق کوئی اثر نہیں۔ آہستہ آہستہ حرکت میں آنے والی اور تیزی سے فنا ہو جانے والی انسانی ٹرانسمیٹر کی یہ صوتی قوت کان کے ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہے اور دماغ پھر ان آوازوں کے اثرات کو بدن کے تمام حصوں تک پہنچا کر ان کا مقصد پورا کرتا ہے۔

انسان کا وہ پہلا گروہ جس نے نئی نئی بات کرنی سیکھی تھی جو نطق کی لذت سے پہلی بار سرفراز ہوا تھا۔ بول چال کی اس زبان سے اس نے کیسے کیسے بھاری کام لیے ہوں گے۔ مذہب اور سیاست کا گہوارہ یہی بول چال کی زبان بنی ہوگی۔ انسانی نسل کے پہلے حاکم کے حقوق کا اعلان اور رعایا کے فرائض اس زبان نے ادا کیے ہوں گے۔ منطق کی دلیلیں اور فلسفے کی الجھنیں اور آرٹ کی خوبیاں غرض چھوٹی سی دنیا کے چھوٹے سے سماج کی ساری ضرورتوں کی کفیل یہی زبان بنی ہوگی جو خالص بول چال کی زبان تھی، اور جس کے پاس ضرورت کے لائق تھوڑا سا ذخیرہ ایسے الفاظ کا ہوگا جو ابھی ابھی حیوانی آوازوں سے ترقی کر کے اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

زمانے کے ساتھ جوں جوں انسانی ضروریات کا پھیلاؤ بڑھتا گیا اپنی انفرادیت کے اظہار کی اسے زیادہ سے زیادہ ضرورت پیش آئی اب وہ اس مقام پر تھا اپنے جذبات و خیالات کو دوسروں سے منوانے کی جب اسے فکر لگی۔ مختصر سے کچھ عام نشانات مقرر کر کے وہ منہ سے نکلے الفاظ کی پہچان کرنے لگا اور پھر ان نشانات کے ایسے مرکب بھی تیار کرنے لگا [illegible] اور مسلسل ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مٹی کے تودوں، لوہے کی لاٹھوں اور پہاڑ کی چٹانوں پر حروف بنا بنا کر وہ اپنے خیالات و جذبات کی نشر و اشاعت کر رہا تھا۔

۔ ارتقا کی جو تڑپ حیوان کو انسان بنا رہی تھی اس کا تقاضا تھا کہ بنائے ہوئے یہ حروف اس کی مدنی ضروریات کا ساتھ دیں چنانچہ سماج کے پھیلاؤ کے ساتھ یہ حروف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگے۔ اب درختوں کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں کی باری آئی۔ ترقی کی سمت یہ انسان کا دوسرا قدم تھا اور یہی کتابی زبان کی ابتدا بھی تھی اس وجہ

بلکہ ایک تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ٹکر لینے لگی۔ جس سے آنکھ ملاتی اسے اپنا بنا لیتی، ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑی آسانی سے منتقل ہو جاتی، محلوں میں سجتی، بازاروں میں بکتی اور کتب خانوں کی زینت بنتی پھر یہی زبان ہم تک لوٹ آتی ہے۔

سماجی ترقی کے ساتھ کتاب کا درجہ بلند ہوتا گیا اور وہ اپنی بڑی بہن کلامی سے بہت آگے نکل گئی اور کلامی سے اتنی الگ بھی ہو گئی کہ الفاظ اور حروف کی ہم آہنگی کے باوجود ان دونوں میں کوئی چیز مشترک نہ رہی۔ کتاب کے صفحات پر بکھرے ہوئے اور بے شمار حروف آخر ہیں کیا؟ یہ ان ہی الفاظ کی نقل ہے جو انسان کی بنیادی آوازوں سے مدبر ہو کر اس کے حلق سے نکلے ہیں۔ الفاظ کی اس نقل میں انسان کے گلے کے سُر اور سروں میں لے کا کوئی تصور نہیں ملتا جو کلامی کی طرح جذبات کی ترجمانی کرے۔

انسان کو غصہ آتا ہے تو اس کا حلق خود بخود ایک خاص سُر متعین کر لیتا ہے۔ لے کے اتار چڑھاؤ سے اس کے لہجے میں ایک خاص ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ جیسے چاہے مدھم یا پنچم، بلمپت یا دُرت آوازوں کا الفاظ سے ایسا ربط قائم کر لیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ غصہ کے عالم میں ہے، اب حیرت زدہ ہے، اب اس پر محویت طاری ہے وہ چونکتا ہے اور اب خوف زدہ ہے اور اب اس کا جذبہ منتقمانہ ہے۔

غرض انسانی جذبے کی پوری پوری عکاسی ان آوازوں ہی میں مضمر ہے جو الفاظ کے ساتھ مربوط آلہ آواز سے نکل رہی ہیں اور کانوں سے سنی جا رہی ہیں۔ کتاب پڑھنے والے کو جذبات کی ان نیرنگیوں میں سے کسی ایک سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ جو پڑھنے والے کتاب کے صفحات پر جذبہ کو ابھار لاتے ہیں وہ گویا اچھا پڑھتے ہیں یہ ان کے پڑھنے کی خوبی ہے کتاب کی خوبی نہیں ہے۔ دراصل جذبات کی صوتی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فطرت نے صرف کان کو دیا ہے آنکھ اس لطف سے محروم ہے۔ کلامی اور کتابی زبان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کان اور آنکھ میں جس قدر آواز اور روشنی میں، کلامی زبان حلق تالو، دانت، اور ہونٹ سے نکلتی ہے اور کان سے سنی جاتی ہے، اور کتابی زبان یا چھپی ہوئی کتاب ہاتھوں سے بنتی اور آنکھ سے دیکھی جاتی ہے۔

ابتدائی عہد، جب سے لکڑی کے قلموں سے نقاشی شروع ہوئی تھی اور اس دور تک کہ بجلی کے پریسوں میں کتابیں چھپ کر تیار ہونے لگی ہیں، کتابی زبان نے ہر دور میں انسانی تمدن کی ترقی میں بڑی مدد دی ہے۔ یہی زبان ہے جو قرنوں سے تہذیب و شائستگی کی علمبردار ہے ایک برٹش میوزیم کی لائبریری کو لیجئے جس میں کم و بیش چالیس لاکھ کتابیں موجود ہیں، اگر ان کتابوں کو ایک پر ایک رکھ کر اونچائی قائم کی جائے تو اس ایک لائبریری کی کتابیں ہمالہ سے دس گنا اونچائی پر پہنچ جائیں گی۔ کتابی زبان کی اس عظیم کامیابی کے باوجود انسان کے دماغ پر یہ حقیقت غیر محسوس طور پر ہمیشہ حاوی رہی کہ لکھے کے پیچھے پڑ کر اس نے اپنے تکلم کے وہ بے بہا موتی جو الفاظ بن کر اس کی زبان سے نکلتے رہے ہیں، چٹانوں، کھالوں اور کتابوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جامد بنا دیے ہیں۔ ان میں الفاظ کی سی نہ وہ گرمی ہے، نہ کلام کی سی وہ زندگی اور نہ اظہار کی وہ بھرپور صلاحیت [illegible] صدی سے انسان کی ساری ایجادوں کا رخ کتاب سے ہٹ کر کلام کی طرف پھر گیا ہے، اس نے ٹیلیفون

ایجاد کیا۔ ہندوستان کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر کسی بھی غیر معروف گوشہ تک آپ اپنی آواز کو بے تکلف منتقل کر لیتے ہیں۔ گراموفون جیسی حیرت میں ڈالنے والی ایجاد بھی اسی بنیادی تمنا کا اظہار تھا، اور اب بولتے سینما اور ریڈیو کی ایجاد نے تو کتابی زبان کے مقابلے میں کلامی زبان کے پھیلاؤ کو حیرت انگیز حد تک ابھار دیا ہے۔ آج مائکروفون پر بولنے والے کی آواز بہ یک وقت جس قدر کان سن سکتے ہیں، دنیا کی مقبول سے مقبول ترین کتاب کو اتنے پڑھنے یا دیکھنے والے میسر نہیں ہو سکتے۔ انجیل مقدس کے ہزاروں نسخے اور ہر نسخے کے ہزاروں پڑھنے والوں کی تعداد اس تعداد سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو سنو کیلوواٹ کے ایک ٹرانسمیٹر کے ایک براڈکاسٹ کو حاصل ہو سکتی ہے۔ پچھلی جنگ عظیم کے آغاز پر جرمنی کے ڈکٹیٹر کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے مسٹر چرچل نے اپنی قوم کو خون، پسینہ اور آنسوؤں کا جو تحفہ پیش کیا تھا وہ نشری تاریخ میں اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے ایک حیرت ناک واقعہ ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ مسٹر چرچل کی آواز میں سُر اور لَے کا وہ امتزاج قائم ہو گیا تھا اور انھوں نے برطانوی قوم کے کان میں ہمت، مردانگی اور شجاعت کا وہ رس گھول دیا تھا جس نے برطانیہ کو من حیث القوم اتنے عظیم طوفان میں بھی مایوس نہیں ہونے دیا۔

آواز میں جذبہ اور اثر کے علاوہ کیف کا وہ تنوع بھی موجود ہے جو صورتوں کی طرح ہر آواز کے لیے الگ الگ مخصوص ہے۔ جنسی اعتبار سے مرد کی آواز عورت کی آواز سے الگ، پھر ہر مرد اور ہر عورت کی آواز اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ۔ مردانہ آوازوں میں کچھ بھاری گرج دار، کسی میں کھرّا پن، کوئی تلخ اور ڈراونی، بعض آوازیں بھاری اور رونق ہوتے ہوئے بھی سڈول چکنی اور لوچ دار ہیں۔ جس آواز کا لہجہ درست ہو، زیر و بم ٹھیک، سُر اور لَے کی بندش موزوں ہو الفاظ کی ادائیگی بے ساختہ اور پھر نفسی کیفیات کی حامل بھی ہو تو وہ مردانہ معیاری آواز سمجھی جائے گی۔

عورت کی آواز مرد کی آواز سے اصولاً پتلی اور تیز ہوتی ہے، عورت کا لہجہ نرم ہو یا گرم مسلسل بول رہی ہو یا رک رک کر وہ عادتاً اونچے سروں میں بولنا پسند کرتی ہے اور لَے کو تیز رکھتی ہے۔ مدھم سروں میں بولنے اور ہلکی لَے کی بھاری آواز عورت کے لیے جنسی اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جائے گی۔ مرد کے مدھم سروں کی بھاری اور صاف اور عورت کے اونچے سروں کی پتلی اور تیز آواز کے بین بین مدھم پنچم کی بنیاد پر تیسری آواز عام ہے جو مردوں اور عورتوں میں مشترک ہے۔

موسیقی کی طرح تکلم کی بنیاد بھی محض جذبہ پر ہے جو آواز کے قالب میں سُر اور لَے کی بندشوں سے مرتب ہو کر گوناگوں اثرات میں منقلب ہوتا رہتا ہے۔ انسان کا قلب خیالات اور جذبات کا اتھاہ ساگر ہے جس میں پے در پے موجیں اٹھتی رہتی ہیں، ان ہی لہروں میں فطری رجحانات تہ نشین موتیوں کی طرح مخفی و پوشیدہ رہتے ہیں۔ عملی زندگی میں جب ان رجحانات کو جنبش یا ٹھیس لگتی ہے تو قلب میں ایک لطیف ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور اعصاب میں ہیجان اور تناؤ بڑھ جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جب انسان کا بدن آواز کا مطالبہ کرتا ہے اور آلۂ آواز دماغ کی طرح ہدایت کے مطابق بہ قدر ضرورت ایک خاص حرکت کرتا اور ایک مخصوص آواز نکالتا ہے۔

کسی صورت، لباس، یا طرز ادا کو دیکھ کر یا آواز کو سن کر پیدا ہونے والے انبساط کو شگفتہ دلی اور کسی شدید یا

خفیف مخالفت کی وجہ سے مزاج کے ردِ عمل کو غصہ قرار دیجئے تو آپ کو اس ایک آواز کی نیرنگیوں کا احساس ہوگا۔ محبت اور اس کے مماثل جذبات میں آواز کے سُروں کی ترتیب اور اتار چڑھاؤ میں ایک پرکیف توازن قائم ہوجاتا ہے۔ عام طور پر محبت کے سُر مدھم ہیں۔ کیف شوق میں اس کی لَے بڑھی ہوتی ہے۔ رعنائی اور محبوبیت کا ترنم غرورِ حسن کے ترنم سے الگ ہے اسی طرح جھینپ، گھبراہٹ سے اور نزاکت لینت سے بالکل مختلف ہے۔ جذبہ اور آواز کے ربط میں سُر اور لَے کی بندش کی آسان مثال ہنسی کی ہے۔

آنکھوں کی خفیف سی بڑھی ہوئی چمک کے ساتھ ہونٹوں میں نازک تھرتھراہٹ بھی ہو تو تبسم ہے تبسم میں ہلکی سی آواز بھی شامل ہو تو ہنسی کہلائے گی۔ آواز کا تسلسل ایک طرح کی لَے بھی قائم کردے تو خندہ اور لَے میں زمزمے اور تانیں بھی شامل ہوجائیں، کندھے اور سر بھی چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ متاثر ہونے لگے تو قہقہہ اور آنکھوں سے پانی اور منہ سے کف بھی جاری ہو، اور سارا بدن متاثر ہو تو استغراب اور اس کی غیر اضطراری حالت کو زہرقہ کہتے ہیں جو ہذیان اور پاگل پن سے بہت قریب ہے۔ آپ نے دیکھا ہنسی میں جذبات کی یہ فراوانی خفیف مسکراہٹ اور ہلکے سے ایک تبسم سے ہذیان تک کتنے روپ بدلتی چلی گئی ہے۔ دراصل یہ فراوانی انسانی شعور کے ارتقا کی وہ منازل ہیں جن سے گزرتا ہوا وہ اپنے بنیادی اور مستقل جذبات کو اپنی ضرورتوں کے مطابق بے شمار عارضی جذبات میں منتقل کرتا چلا گیا ہے۔ جذبات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ہنسی کے مختلف منازل میں اسی حد تک آواز میں سُر اور لَے کی تبدیلی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ موسیقی کی طرح آخر تکلم کا خام مواد بھی آواز، سُر اور لَے ہے اور گلے میں آواز کا استعمال بھی وہی ہے جو موسیقی کے سُروں کا ہے اور اسی لیے آواز پر موسیقی کے قوانین کا پورا پورا اطلاق ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موسیقی کی آوازوں کی تحلیل سرگم میں کی جاسکتی ہے اور لَے کو بندھی ہوئی تالوں میں گنا جاسکتا ہے۔ برخلاف اس کے بول چال کی آواز کی پیمائش کسی خاص پیمانے سے ممکن نہیں ہے خود موسیقی کی پیمائش بھی صرف اس موسیقی کے لیے ممکن ہے جو ریاضی کی موسیقی کہلاتی ہے۔ انسان کے گلے کی وہ موسیقی جو بے ساختہ اور آزاد ہے ریاضی کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔ ہندوستانی موسیقی کے ماہر ریاضی مرحوم جان فولڈس[1] نے مہینوں اور برسوں خاں صاحب عبدالکریم خاں کی جھنجھوٹی کی ٹھمری پر کام کرکے بالآخر یہ کہہ کر قلم رکھ دیا تھا کہ نرم سروں میں HORMONICS کی جتنی بہتات خاں صاحب کے گلے میں ہے جس کا صحیح NOTATION ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ واضح رہے کہ ہندوستانی موسیقی میں جذبہ کے اظہار کے لیے خاں صاحب کی اس ٹھمری کو آج تک ایک طرح کا معیاری مقام حاصل ہے۔ غرض موسیقی ہو یا صوت انسان کے گلے سے نکلی ہوئی آوازیں بنیادی طور پر جذباتی ہیں۔ موسیقی میں جذبہ کی گنجائشوں سے فی الحال ہمیں سروکار نہیں۔ ہم آواز الفاظ اور حروف کے اس مسلسل ربط پر بحث کریں گے جس پر انسانی جذبات اور ان کے گوناگوں اثرات کا انحصار ہے۔ اس غرض کے لیے شیر خوار بچے کے صوتی ارتقا کا مطالعہ بھی بےحد ضروری ہے۔ انسانیت کی یہ منہ بندکلی، پھول بننے تک ان تمام صوتی مراحل سے گزر جاتی ہے جن کی تکمیل میں اس کے اجداد نے ہزاروں برس لگائے ہیں۔ بچہ کس طرح آوازوں سے نطق اور نطق سے اظہار پر قادر ہوتا ہے جبکہ بچہ کی پیدائش کے وقت اس کی متاع عزیز چند آوازوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہنسنے اور

رونے کے سوا وہ اور کچھ جانتا ہی نہیں۔ لیکن ضروریات کے پھیلاؤ کے ساتھ اس کی آواز کے ترنم میں واضح تبدیلیاں ہوتی ہے۔ ڈراون نے نظریۂ تجدید (RECAPITLATION) کی بنیاد پر جو دلیل نسل انسانی کے ارتقا پر قائم کی ہے میں سمجھتا ہوں بچہ ابتدائی زندگی میں وہی تجدید، کلامی زبان کے لیے پیش کرتا ہے۔ آج وہ خوراک کی تلاش میں روتا ہے لیکن تکلیف کے احساس پر رونے کی آواز سے مختلف انداز میں رونے اور ہنسنے کے درمیان جذبات کے اظہار کے لیے وہ عجیب عجیب آوازیں نکالتا ہے جو صرف آوازیں ہیں لیکن اپنی ساری ضروریات وہ انھیں آوازوں سے پوری کر لیتا ہے پھر دو پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوتے وہ اپنی آواز میں الفاظ کو شامل کرنے کی بنیاد ڈالتا نظر آتا ہے۔ ساری دنیا کے بچے سب سے پہلے آلہ تنفس سے نکلی ہوئی صداؤں کو ہونٹوں کی مدد سے مدبر کرتے ہیں اور بابا اور ماکے ابتدائی مخارج سے مانوس ہوتے ہیں۔ تا اور زجیسے الفاظ جو زبان سے چپل کر منہ کے خلا میں پھیل کر، دب کر نکلتے ہیں وہ بہت دیر کے بعد سیکھتے ہیں۔ بچہ کی زندگی کا یہ دور عبوری ہے جب وہ جذباتی آوازوں سے کلامی زبان کے خارجی اور تجرباتی دور میں شامل ہوتا ہے اب وہ آواز اور الفاظ کے ربط کے لیے اپنے ماحول میں اپنی انفرادیت کو محسوس کرتا چاہتا ہے اور اثبات میں اپنی بات منوانا ہے کھلونوں کے انتخاب میں کھانوں کے ذائقوں میں اور لباس کے تنوع میں ماں باپ اور بہن بھائی کی تمیز میں وہ ماحول کے ان تمام الفاظ سے واقف ہوتا رہتا ہے جو اس کی چھوٹی سی مدنی ضرورت کے لیے اسے ملتے رہتے ہیں چنانچہ چار یا پانچ برس کی عمر تک وہ زندگی کی ہر ضرورت اسی زبان سے پوری کرتا ہے جو محض کلامی ہے۔ ضرورت کی نوعیت البتہ بچوں میں مختلف ہوتی ہے جو ماحول کی تابع ہے۔ بڑے گھروں کے بچے اپنے کلام میں زبان کی ان پیچیدگیوں اور نزاکتوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں جو ماں باپ کی طرف سے انھیں ملتی رہتی ہیں۔ ایک غریب مزدور کا بچہ کیک پیسٹری، فالودہ اور فالودہ کا اس لطافت سے کہاں واقف ہو سکتا ہے جو بڑے گھر کے ایک بچے کو حاصل ہے۔ بنیادی آوازوں کے ساتھ الفاظ کے ربط کی پوری پوری تکمیل کے بعد اب اسکول جانے کی عمر شروع ہوتی ہے، اور زبان کا نیا تصور ب سے بندر اور ت سے تختی کے ساتھ وہ الفاظ کی نقل کو آنکھوں سے دیکھ کر پہچاننے لگتا ہے جو اب تک وہ صرف کانوں سے سنتا رہا ہے۔ کتاب کے حروف سے مانوس کر کے پہلی مرتبہ بچے کے ذہن کو کلامی سے ہٹا کر کتابی زبان کی طرف مائل کر دیا جاتا ہے۔ اچھے اسکول اور اچھے استاد کی قابلیت کا معیار بھی یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کم سے کم عرصہ میں بچے کو اس کے ماحول میں زیادہ سے زیادہ کتابی الفاظ سے مانوس کر دے اسکول کی زندگی میں جوں جوں وہ ترقی کرتا ہے اس کے ذہن کا جھکاؤ کلامی سے ہٹتا ہوا کتابی کی طرف اسی تیزی سے بڑھتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ احساس بھی مردہ ہو جاتا ہے کہ کتابی زبان کے سوا انفرادیت کے اظہار کا وہ کوئی دوسرا ذریعہ بھی رکھتا تھا۔

بچے کی زندگی جذبات کی زندگی ہے عمر کے ساتھ اب وہ جوں جوں عقل و شعور کی دنیا میں آگے قدم رکھتا ہے انفرادیت کے اظہار کے لیے اسے خارجی تجربات کے علم کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ ان خارجی تجربات کی جڑیں اسی سماج میں پیوست رہتی ہیں جس میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ جس تمدنی گروہ سے اس کا تعلق رہا ہے اس کی

روایتوں اور اخلاقی ذمہ داریوں کو وہ ہمیشہ محسوس کرتا رہتا ہے۔ اب تک باہمی دل سوزی اور خیالات و رجحانات کے روایتی اور اخلاقی اشتراک میں اس کی حیثیت انفرادی تھی، اب وہ ان وحدتوں میں شرکت چاہتا ہے جن سے اجتماعی زندگی مراد ہے۔ وہ مذہب کا دامن تھامتا ہے، آرٹ کا سہارا لیتا ہے، موسیقی، شعر اور ڈرامے سے لطف اندوز ہوتا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آرٹ کی دو متوازی حیثیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک کا تعلق آرٹسٹ سے ہے جو حسن کے خیالی پیکروں کو خارجی شکل دیتا ہے تاکہ شے مدرکہ کا اظہار ممکن ہو۔ دوسری طرف وہ لاتعداد عوام ہیں جو اب بچے سے بڑے ہو کر آرٹ کے اس تخلیقی عمل کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے والے ہیں جب ہم موسیقی کی کسی تان سے مسرور ہوتے ہیں شعر کی معنویت کو سمجھتے اور پھر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو در اصل ہم خود بھی ایک قسم کے تخلیقی عمل کا کام انجام دیتے ہیں۔ ہماری اس تخلیق کا معیار ہمارے جذبات کی شدت اور ہمارے ان تجربات کی باز آفرینی کے تناسب سے قائم ہوتا ہے جو آرٹسٹ کی طرح ہمارے بھی شعور میں پہلے سے موجود تھے۔ آرٹسٹ کی عظمت یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے وجدان میں شریک کر لیتا ہے اور ہمارے تخیل کو بیدار کر کے ہمیں اظہار کا موقع دیتا ہے آرٹسٹ، آرٹ اور عوام کے درمیان یہ انتہائی نازک مقام ہے جسے پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر کہ تخلیقی عمل کی طرف دھیان دینا ہوگا۔

جذبے سے آواز اور آوازیں پھر سُر اور لَے کی بنیاد پر الفاظ اور الفاظ سے پھر حروف تک ہم نے بچے کی زندگی میں کلامی اور کتابی زبان کے ارتقائی منازل کا مطالعہ کیا ہے۔ کلامی زبان جذباتی زبان، اور کتابی زبان اس کی اکتسابی زبان ہے۔ جو زندگی کے پھیلاؤ کو سمیٹنے اور پھر پھیلانے اور پھر سمیٹنے اور پھیلانے کی خاطر اسے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت موجود ہوتی کہ انسان کتاب کی مدد کے بغیر زندگی کے مسائل کو اور اس کے پھیلاؤ کو سمیٹنے اور پھر پھیلانے میں محض کلامی زبان سے پورا پورا کام نکال لیتا تو انسانی جذبات سے الفاظ کی نقل کے لیے ب سے بندر اور ت سے تختی کے تخیلی عمل کی طرف ہرگز مائل نہ کرتا۔ لیکن فطرت نے جس طرح کان کو آواز سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا ہے اسی طرح آنکھ کو خطوط اور رنگوں سے محظوظ ہونے کے لیے بنایا ہے تاکہ انسانی جذبہ تخیل کے سمعی اور بصری عمل سے یکساں انگیز رہے۔ علامہ نے تخیل کے اس دو رُخے عمل کو نور و صدا سے تعبیر کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست
کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

فطرت ہو یا عمران دونوں اسی نور و صدا کے امتزاج کی نمود ہیں جنھیں آرٹسٹ اپنے جذباتی سوتوں کی ابلتی ہوئی تخیلی قوت سے ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور ہم پھر بقدر وسعت اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ علامہ جذبے کے صوتی اثر و نفوذ اور اس کی بھرپور طاقت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے تخیلی پیکر، عشق، جنوں اور قلندر سب کے سب صوتی ہیں اور اسی لیے جان دار ہیں، ان میں گیرائی ہے، گہرائی ہے شدت اور قوت کے ساتھ ساتھ

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم تو از گرمیِ آوازِ من شناختِ مرا

ان کا جنوں حرکت و عمل کا صور پھونکتا ہے اور قلندر وہ بات کہتا ہے جس سے انسانیت پانی پانی ہو کر رہ جائے۔ حضرت عباس کے مرثیہ میں ان کے میدانِ جنگ میں اترتے وقت جو صدا بندی انیس نے کی ہے وہ بھی تخیل کے سمعی عمل کی ایک نادر مثال ہے ع

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے
کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

یا

غالب کا مشہور شعر ہے

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

صوتی تصویر کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس شعر کو سن کر قیامت کی طوفان خیزیوں کے تواتر اور تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ متاخرین میں فانی بدایونی کو صوتی پیکر بنانے کا اچھا سلیقہ تھا ع

وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر

میت کے آخری دیدار پر اٹھتے شور کی طرف کانوں کی لپک کا اندازہ کیجئے تو آپ کو اس ایک ہی مصرعہ سے تخیل کے سمعی عمل کی شدت کا پورا پورا احساس ہوگا، اور اس بات کا بھی احساس ہوگا کہ ہم کتنے غیر محسوس طور پر شاعر کے وجدان میں شریک ہو جاتے ہیں اور آرٹسٹ کے صوتی پیکر سے ہمارے تخیل کا سمعی عمل کتنا جلد ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور بالفاظ دیگر ہم خود تخلیقِ حسن میں کتنی آسانی سے آرٹسٹ کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔ آرٹ برائے زندگی کا مقصد بھی دراصل یہی ہے کہ آرٹ، آرٹسٹ اور زندگی ایک دوسرے سے گتھے رہیں اور زندگی کے تب و تاب میں اس کے رنگ و بو میں اس کے نور و صدا میں آرٹ کے واسطہ سے عوام اور آرٹسٹ ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہیں۔

شعر اور نغمہ کے علاوہ بھی کم و بیش آرٹ کی ہر صنف میں تخیل کا سمعی عمل جاری رہتا ہے۔ رقص، مصوری اور بت تراشی میں بھی آپ کہیں نہ کہیں آہنگ کی کارفرمائی تلاش کر لیں گے۔ لیکن ان فنوں کا تعلق چوں کہ بنیادی طور پر محض آنکھ سے دیکھنے اور ہاتھ سے بنانے سے ہے اس لیے فی الحال ان سے گزر کر ہمیں آہنگ کے تصرف کو ان اصناف میں تلاش کرنا چاہیے جو براہِ راست تکلم کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ ڈرامہ، ناول اور مختصر افسانہ، انشاء، سوانح اور تذکرے اور اسی قبیل کے اور دوسرے مروجہ اصناف میں آرٹسٹ حسن کے خیالی پیکروں کو خارجی شکلوں میں ہمارے سامنے رکھتا ہے اور ہم اس کی تخلیق میں اس کے شریک ان اصناف سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آرٹ اور آرٹسٹ کے ساتھ عوام کے تعلق کو سمجھنے کے لیے ہمیں آرٹسٹ کے ان لمحاتِ خوش کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ جب وہ تخلیقِ حسن کرتا ہے۔ یہ ایک سخت ہیجان اور بے چینی کی کیفیت ہے۔ تخیل کے سوا اس وقت اس کا اور کوئی محرم راز نہیں۔ اس کی نگاہوں کے آگے آگے بصری تخیل اور کانوں سے سرگوشیاں کرتا سمعی

سمعی تخیل زندگی کی بھولی بسری یادیں ایک ایک کر کے اس کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ آرٹسٹ نور و صدا کی اس کسوٹی پر ان یادوں کو کستا رہتا ہے۔ جب اور جہاں کہیں اسے موزونیت ملتی ہے وہ جذبہ کو قابو میں کرلیتا ہے۔ آرٹسٹ میں موزونیت کا شعور جس قدر بے ساختہ ہوگا اسی قدر وہ قوی ہوگا، اور جس قدر یہ شعور قوی ہوگا اسی قدر تخلیق نکھری ہوئی، پختہ اور پرخلوص ہوگی۔ جذبہ سے حسن آفرینی تک آرٹسٹ کے ذہنی رجحانات میں زندگی کی دل سوزی اور اجتماعی قدروں کی جتنی بہتات ہوگی تخیل کا سمعی عمل اسی قدر زیادہ ہوگا۔ تخیل کا یہ عمل اس وقت پھیکا پڑتا ہے جب آرٹسٹ کے تجربات میں کہیں تاثرات ہیں جو مستعار ہیں، کہیں ترجمے ہیں جو خلوص سے بیگانہ ہیں کہیں روایتیں ہیں حکایتیں ہیں جو اصلیت سے دور ہیں اور یہ سب تجربات کتابی ہیں اور اکتسابی ہیں۔ اس خام مواد سے آرٹسٹ فنی تخلیق تو کرلیتا ہے لیکن جسے کہتے ہیں خلوصِ فن وہ اس کی ان آوازوں میں مستور ہے جو جذبہ سے قریب ہیں، جو سُر اور لئے پاکر مترنم ہوتی ہیں۔ زندگی کے سوز و ساز سے وہ پروان چڑھتی اور صوتی تصویروں کی شکل میں موجود رہتی ہیں۔ ان آوازوں میں اس کا ماحول، اس کا تمدن اور اس کا سماج برابر کے شریک ہیں اجتماعی شعور کا وہ انفرادی ذہن جسے ہم آرٹسٹ کہتے ہیں فرد اور جماعت کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ ایک طرف سماج سے وہ کچھ لیتا ہے تو دوسری طرف سماج کو کچھ لوٹا بھی دیتا ہے۔ ادانِ پرداں (لین دین) کا یہ عمل آرٹ کا بنیادی مقصد بھی ہے اور اس مقصد کے لیے زبان ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ وہی زبان ہے جو صوت بھی ہے حرف بھی ہے۔ کلام بھی ہے اور کتاب بھی ہے۔

پچھلے سو سالہ کلامی تجربات نے صوت اور حرف کو جذبات اور مشاہدات کے دو مختلف زاویوں میں بانٹ دیا ہے اور قوموں کی زندگی اب کلام اور کتاب کے الگ الگ خانوں میں محدود ہوتی جا رہی ہے۔ کلام کا تعلق آرٹ سے اور کتاب کا رشتہ سائنس سے مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ کتاب کے صفحات پر بکھر کر یہ بے شمار حروف آخر ان الفاظ کی نقل ہی تو ہیں جنھیں بچہ بے بندر اور رت سے تختی کے تخیلی عمل سے پہچانتا رہا ہے اور سماجی پھیلاؤ کے تناسب سے کتاب ہی اس کے لیے مقصود بالذات بنتی چلی جاتی ہے۔ فرد کی طرح قوموں کی زندگی میں بھی ایسے دور آتے ہیں جب اس کی تخلیقی قوتیں کتابی اور اکتسابی ہو کر رہ جاتی ہیں، اور وہ کلامی زبان کے اس عمل سے محروم ہونے لگتی ہیں جس میں اس کی اپنی آوازوں کی بازگشت ہے۔ سُر ہے اور لئے ہے اور سُر اور لئے کا ترنم ہے۔

پچھلے سو سال کے ہندوستانی ادب میں ہماری اپنی زندگی سے زیادہ ہمیں مستعار زندگیوں کی تصویریں ملتی ہیں اس کا سبب دراصل یہی تھا کہ اس عرصہ ہم اپنی تخیل کی سمعی قوتوں سے بے خبر رہے، ہماری نظروں کے سامنے ایک ایسی زبان رہی جس کی بنیادیں ہمارے سماج میں پیوست نہیں تھیں۔ تخیل کا بصری عمل تو اپنا کام کرتا رہا لیکن ہماری زندگی سے ہمارے کان نا آشنا رہے۔ اس ایک صدی نے ہمیں بے شمار ڈاکٹر تو دیئے، انجینئروں کی کثیر تعداد بھی ملتی رہی وکیل اور صنعت کار تو بیدار ہوتے رہے لیکن انگریزی زبان نے ہمارے آرٹ اور ادب کے لیے کوئی ایک آسٹن نہ پیدا کیا کوئی ایک ایلیٹ اس دھرتی سے نہ اٹھا اور ایک ہارڈی بھی ہم میں نہ پیدا ہو سکا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد آرٹ اور

ادب کی اس بزمِ خموشاں میں حالی کی ایک آواز سنادی اور کچھ وقفہ کے بعد نثر میں پہلی بار منشی پریم چند ادب کے آسمان پر ایک ستارہ کی طرح نمودار ہوئے جنھوں نے پہلی بار اپنی زبان کے کلامی عنصر کو اپنے تخیل میں شامل کرکے ہمیں اپنی آوازوں کی بازگشت سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا۔

شمالی ہند کی بول چال کی تاریخ میں یہ دونوں بزرگ مشعلِ راہ بن کر ہمارے سامنے آئے تھے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ یہی زمانہ ہندوستان میں سیاسی اتھل پتھل کا زمانہ بھی ہے۔ انتشار اور بے چینی کا زمانہ سیاست نے اس علاقہ کی لسانی تمناؤں اور آرزوؤں کو کچل کر رکھ دیا۔ حالی نظم میں اور منشی پریم چند نثر میں اگر بول چال کی زبان کے معیار تسلیم کر لیے جاتے تو جو مسئلہ آج بھی ایک خار دار جھاڑی بن کر ہمارے دامن کو الجھائے ہوئے ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ اس لہلہاتے تناور درخت کی طرح ہوتا جس کے سائے میں ہماری تخلیقی قوتیں پروان چڑھتیں اور ہمارے آرٹسٹ مرغانِ خوش الحان کی طرح نغمہ سرائی کرتے سنائی دیتے۔

سہارن پور سے کلکتہ تک اور کلکتہ سے حیدر آباد تک جو زبان بولی جاتی ہے اسے ہندی، ہندوستانی یا اردو جو چاہے نام دے لیجئے اس پر ہماری سماجی زندگی کی پوری پوری چھاپ ہے۔ سہارن پور سے میرٹھ اور قرب وجوار میں دلی کی صاف ستھری بولی کا لہجہ۔ ہریانہ کے جاٹوں کے مخصوص رسم ورواج کا رنگ، متھرا، آگرہ اور علیگڈھ میں برج کی مٹھاس، علیگڈھ سے پھر الہ آباد تک اودھی کی گھلاوٹ لکھنو کی نزاکت اور نرماہٹ لیتی ہوئی اور گورکھپور سے بنارس تک بھوجپوری رنگ میں ڈوبی ہوئی عظیم آباد میں پھر ایک مرتبہ دلی اور لکھنو کے آہنگ کا زور پکڑتی ہوئی بہار سے نکل کر بنگال تک جا پہنچی ہے۔ زبان کے اس عظیم پھیلاؤ اور گوناگوں اثرات کے باوجود اس کے افعال میں کسی کو اختلاف نہیں۔ محاوروں اور ضرب المثال کی یکسانیت سے کوئی منکر نہیں۔ زبان کے اصول وقواعد پر سب کو اتفاق ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی کہے اور دوسرے کی سننے کی بے ساختہ صلاحیت پر سب متفق ہونے کے باوجود خود زبان والوں نے ہندوستان کی آزادی سے پہلے بول چال کی اس زبان میں انتشار وافتراق کے بیج بو دیئے تھے اور آج بھی وہ اسی بوجھ کے تلے دبی محسوس ہوتی ہے۔ بوجھ سے مراد وہی الفاظ کی غیر فطری نقل سے ہے ایسے حروف سے مراد ہے جو کلامی نہیں کتابی ہیں اور صرف کتابی نہیں اکتسابی ہیں۔ اس موقع پر سرکاری فائل کی نوٹنگ کی ایک مثال جو صرف بیس سال پرانی ہے آپ کے گوش گزار کردوں تو بے جا نہ ہوگا۔

" باہمی ایجاب وقبول کے بعد مابین سرکار میں یہ طے پایا کہ سر تحزجات رشتہ دور مع وصل نقول مراسلاجات ابلاغ خدمت گرامی کی جاویں۔"

بول چال کی بے چاری زبان اپنے بولنے والوں کا منہ تکتی ہی رہی لیکن بقول بعضے کوئی کالیداس ہماری سماجی زندگی کبھی کبھی اس برساتی ندی کی طرح بن جاتی ہے جو اپنے بہاؤ کے زور سے کنارے کاٹتی گئی مگر نہ صرف اپنا پانی گندہ کر لاؤ بلکہ آس پاس کے جھاڑ جھنکاڑ بھی اکھاڑ لائی۔ زبان کے ان جھاڑ اور جھنکاڑوں میں جو آج عام میں اگر آپ بول چال کی زبان کی حلاوت سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو حالی کے مدس کے بند کو ایک مرتبہ پھر گنگنا لیجئے۔

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے — بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے — گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

بول چال کے الفاظ میں آوازوں کے جن سُروں کا اور سُروں میں لَے کے جس ترنم کا میں تکرار کے ساتھ ذکر رہا ہوں حالی کے صرف ایک ہی بند میں اس کی شدت کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر مہذب زبان میں آج ہمیں یہ تاثر ملے گا کہ زبان کتابی ہوتے ہوئے بھی کلامی کے دامن سے وابستہ رہے انگریزی زبان کی وسعت، مقبولیت اور طاقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اس زبان کی اور خصوصیات کے علاوہ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان کی کتابی بنیاد اس کے کلام کے اسٹرپر ہے۔ چنانچہ زمانۂ جنگ میں بی بی سی کو اپنی نشری ضروریات کے لیے جب ایک بنیادی زبان کی ضرورت ہوئی تو زبان کے اسٹرمیں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ محض الفاظ کے عوامی تلفظ پر کچھ تھوڑا زور دینا پڑا اور ایک بنیادی زبان بن گئی جو سارے عالم کے لیے قابل قبول تھی۔

ہندوستان جیسے برصغیر کے لیے جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں طرح طرح کے ثقافتی منطقے موجود ہیں اور مذہبی طبقے آباد ہیں کسی ایک زبان کے بنیادی تصور کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک ہی آسان نسخہ تجویز ہوا کہ ہر علاقہ کی مقامی زبان اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ ترقی کرتی ہے اور وہ زبان جسے ملک کی اکثریت سمجھتی ہے سرکاری ضروریات کے لیے مخصوص کرلی جائے۔ زبان کے اس ہندوستان گیر تصور میں بول چال کا ذکر ہی نہیں تھا۔ یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ غیر ہندی علاقے اس سرکاری زبان کو بول چال کے لیے بھی استعمال کریں گے۔ زبان کی سرکاری حیثیت سے جس طرح تلگو اور تامل بولنے والوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں اردو بولنے والوں کو بھی زبان کی کتابی حیثیت سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ جو زبان انتراشٹریہ ضروریات کی غرض سے ترقی کر رہی ہے وہ محض کتابی ہے۔ کلام سے اس کا واسطہ بھی نہیں ہوگا۔ کلامی اور کتابی زبان کا یہ فرق بھی ملحوظ رہے کہ کلامی زبان سوسائٹی کے کسی طبقہ یا گروپ یا اقلیت یا اکثریت کی خاطر نہیں بنائی جاتی اس کی افادیت اس پورے سماج کے لیے ہے جس کے سماجی ثقافتی اور مذہبی شعور کے اظہار کا ذریعہ یہ زبان بنی ہے۔ برخلاف اس کے کتابی زبان یا پھر کتاب کی افادیت بندھے ٹکے اغراض اور ضروریات کے لیے ہے اور سوسائٹی کی خاص خاص اکائیوں کے لیے ہے۔ آپ کو کیا ضرورت ہے کہ ڈاکٹری کی فنی کتاب کا مطالعہ کریں یا انجینری کی اصطلاحوں کے جاننے میں اپنا سر کھپائیں۔

کلامی زبان کی ضرورت دراصل اس علاقہ کو ہے جس میں سماج کی باہمی دل سوزی سے مشترک تمناؤں اور آرزوؤں سے باہمی یک جہتی کا قومی تصور پیدا ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اب یہ احساس عام ہوتا جارہا ہے کہ اردو زبان کے اشتراک کو وہاں کی باہمی دل سوزی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس علاقہ میں اب یہ تصور جڑ پکڑتا جارہا ہے کہ اگر ہم نے زبان کو

اسی طرح آزاد چھوڑ دیا جس طرح کتابی شکل میں وہ آج ہمارے سامنے ہے تو ایک دن بول چال کی زبان کی بنیادی افادیت ہی نہیں ختم ہو جائے گی۔ کلامی زبان دراصل زندگی ہے جو جامد نہیں ہو سکتی۔ بول چال کی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کو زبان کے فطری رجحانات سے باخبر رہنا چاہیے اس کی ارتقائی صلاحیتوں کا ساتھ دینا چاہیے اور اس اشتراک کو جو پہلے سے شمالی ہند کی زبان میں مستحکم ہے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کی سعی اور جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ نئے رجحانات کو اپنانے، نئے تجربوں سے فائدہ اٹھانے اور نئے الفاظ سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو اب ان مصلحتوں کو بھی پس پشت ڈال دینے کی ضرورت ہے جن کی بنا پر ہم نے پچھلے پچاس برس تک خود اپنی کلامی زبان سے ایک طرح کا مخاصمانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ مثلاً ایسے متروکات پر پھر ایک مرتبہ غور کرنا چاہیے جنھیں ہم نے بلا کسی دلیل اور حجت کے نظر انداز کر کے خود اپنا نقصان کر لیا تھا۔ السانا اکسانا، اللنا، بچلنا اور رپٹنا جیسے افعال اور راوپری کسک، بیٹر، انکوا، بجالا اور ایسے ہی اور بے شمار اسما ہیں جنھیں آج ہم متروکات میں شمار کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ الفاظ اپنے پورے اثر و نفوذ کے ساتھ آج بھی بول چال کی زبان میں مستعمل ہیں۔ شمالی ہند میں کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو اردو داں طبقے کے لیے نئے نئے سے محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کا چلن اب زوروں پر ہے۔ پچھلے پندرہ برس میں ایک درجن سے زیادہ ایسے الفاظ نہیں بن سکے جو واقعی عوام میں جڑ پکڑتے جا رہے ہوں۔ آداب عرض نے اپنی لطافت کھو کر نمستے اور نمسکار جیسے تعظیمی الفاظ کی جگہ لے لی ہے۔ مہربانی اور کرم فرمائی کی جگہ کرپا عام ہوتا جا رہا ہے جلسے کی جگہ سمارہو، اور انتر، انتر، پرانت، سماچار، پرنام اور اپمان اور رشپمان جیسے الفاظ اب رواں دواں ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم موقعہ کی مناسبت سے ان کے استعمال سے پس و پیش کریں۔

نزاعی الفاظ وہ ہیں جو سنسکرت سے لیے گئے ہیں لیکن وہ اپنی شکل و صورت بدل کر ہماری زبان پر چڑھ چکے ہیں الفاظ کی اس ترکیب کو تدبھو کہتے ہیں۔ سنسکرت کے تدبھو الفاظ خالص عوامی الفاظ ہیں جن کو عوام نے اپنی مرضی سے اور اپنی سہولت کی خاطر قاعدہ اور قانون سے بے نیاز ہو کر اختیار کیا ہے اور ان کی حیثیت زبان میں اب اس قدر مضبوط ہے کہ انھیں اپنی جگہ سے کسی صورت بھی ہلایا نہیں جا سکتا۔ مشٹھان سے مٹھائی کو اب ہم سے کون چھین سکتا ہے۔ آشرے کے تلفظ میں نچلے جبڑے کو جھٹکا دے کر اوپر کو اٹھایا جاتا ہے تو صحیح تلفظ نکلتا ہے۔ عوام ایسے لسانی جھٹکوں کی پروا کیے بغیر الفاظ کو ہلکا اور سبک بنا لیتے چنانچہ آشرے کی بجائے آسرا ہو گیا جو انتہائی سبک اور سادہ لفظ ہے۔ تدبھو الفاظ کی فہرست میں وہ الفاظ ہی گنے جائیں گے جنھیں محض تلفظ کی تھوڑی سی تحریف سے آسان اور عام فہم کر لیا گیا ہے۔ اردک سے ادرک، انگری کو انگلی، بجری کو بجلی بنانے کا کام عوام کا تھا اور انھوں نے اس کام کو پوری مضبوطی سے کیا ہے۔ بجو بند سے بازو بند اور باجو بند بھی اسی قبیل کا لفظ ہے۔ بوکری سے بکری اور لطف تو یہ کہ نر کے لیے بوک کا تلفظ بجنسہٖ قائم رہا۔

نزاعی الفاظ میں فارسی عربی کے وہ الفاظ بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو پچھلے سات سو برس سے شمالی ہند کی زندگی میں رس بس گئے ہیں، اور اب ان کے متبادل سنسکرت الفاظ کی کھوج کر کے ان الفاظ کو زبان سے خارج کر دینے کی سعی کی جا رہی ہے لیکن ان الفاظ کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ ہلائے نہیں ہلتیں۔ حلوہ اور حلوائی کو بدلنے کی اب کسے جرأت

ہوگی اور کون برفی اور بالوشاہی کا بدل تلاش کرتا پھرے گا۔ راضی خوشی ایک ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں اور الگ الگ بھی عام فہم ہیں۔ راضی سے راضی نامہ بھی اسی قدر عام ہے۔ خوشی کا ساتھ ہنسی کا جوڑ فارسی میں سنسکرت کا حسین ترین پیوند ہے بول چال کی زبان میں اردو کے اس اشتراک کی حیثیت اس لیے بھی اب مضبوط ہو گئی ہے کہ ایسے بے شمار الفاظ شمالی ہند سے نکل کر ملک کی لمبائی چوڑائی میں پھیل چکے ہیں اور اس زبان کا جزو بن چکے ہیں جسے آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس موقع پر تت سم وادیوں کے اس اعتراض کا جواب بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جسے وہ ایک طرف تدبھو کے خلاف استعمال کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف بول چال کے فارسی، عربی الفاظ کے امتزاج کی سند بھی اسی سے لیتے ہیں۔ تت سم وادی وہ لوگ ہیں جو سنسکرت کے الفاظ کو ان کی اپنی اصلی شکل و صورت سے بول چال کی زبان میں شامل کرنے کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ بول چال میں جب فارسی کے الفاظ تت سم شامل کیے گئے ہیں تو سنسکرت کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اور تدبھو بنا کر شامل کرنا کہاں تک جائز ہے۔ بات خدا لگتی ہے، لیکن تت سم وادی یہ بات بھول جاتے ہیں کہ یہ فارسی الفاظ شمالی ہند کی زبان میں شامل ہونے سے پہلے وہاں کی بول چال کی زبان میں رائج تھے۔ ان الفاظ کو زبان میں شامل کرنے کے لیے یہاں کے عوام کو تدبھو عمل کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ یہاں کے عوام نے ان الفاظ کو ان کی بول چال کی شکل میں قبول کر لیا۔ عوام کی زبان پر وہی الفاظ چڑھتے ہیں جن کی ادائیگی میں گلے، جبڑے، منہ اور گلے کو کم سے کم زحمت ہو اور جب الفاظ کی ادائیگی میں انہیں زحمت ہوتی ہے تو وہ جس جگہ سے چاہتے ہیں لفظ کو توڑ مروڑ کر اپنی گون کا بنا لیتے ہیں۔ شہری جس لفظ کو راضی کہتا ہے دیہاتی اسے اپنی آسانی سے راجی بولتا ہے، غضب کو گجب، بندوق کو بندوک کہہ کر اپنا مطلب پورا کر لیتا ہے۔

"تلفظ کے صوتی جھٹکوں کو نکال کر صاف و سادہ بنا لینے کی ترکیب خالص عوامی ہے۔ آخر کیفیت کو عام طور پر کیف یت ہی بولا جاتا ہے۔

بول چال کی اس لمبی چوڑی داستان میں ہمیں عام زندگی کی اس لئے کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے جو اب تیز سے تر ہوتی جا رہی ہے۔ زندگی میں عافیت کم اور بھاگ دوڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ کتابی مطالعہ پر زندگی کا پورا پورا اثر ہے ہر کتاب نہ مطالعہ کے لیے ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے کہ بھاگ دوڑ میں انسان کتابیں بھی پڑھتا رہے ادھر کتاب خود اس قدر فنی اور اصطلاحی ہوتی جا رہی ہے کہ مخصوص مذاق اور خاص علم کے بغیر کتاب کا پڑھنا بھی ممکن نہیں ہے۔

ساری دنیا میں بول چال کی زبان کی ضرورت زندگی کی اس بڑھتی ہوئی لئے کے ردعمل کے طور پر اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ریڈیو اور بولتے سینما کے علاوہ ایسے ادارے اور آرٹ کی ایسی اصناف ظہور میں آرہی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے انسان کتاب پڑھنے سے اپنا وقت بچا سکے اور کم سے کم وقت میں پوری طرح آرٹ اور ادب سے لطف اندوز ہو سکے۔

کلامی زبان نے اس نازک وقت میں انسان کی بڑی راہبری کی ہے۔ آرٹ اور ادب کے وہ بے بہا موتی

جو کتاب کے صفحوں پر منجمد لائبریریوں کی زینت ہیں۔ اس زبان کی وساطت سے اب عوام تک پہنچ رہے ہیں اور کم سے کم وقت میں انسان ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس غرض کے لیے مشاعرے، مناظرے، مباحثے نقلیں اور تماشے ہوتے رہتے ہیں اور ڈراموں، جن گیتوں اور رقص و موسیقی کے بڑے بڑے سمارو ہ منعقد کیے جاتے ہیں، ان اداروں سے ایک طرف بول چال کی زبان کا تحفظ اور اس کی ترویج ہوتی ہے اور دوسری طرف آرٹ کا وہی دو رخہ مقصد پورا ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کو اظہار کا پورا پورا موقع ملتا رہا ہے اور عوام اس کی تخلیق میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

آندھرا پردیش کا چھٹا سال

آندھرا پردیش کے پہلے پانچ سال عملاً دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی مدت کے ساتھ ساتھ گزرے ہیں۔ دوسرے منصوبے کے تحت ریاست کے رقمی خرچ کا پروگرام ابتدائی تخمینے سے بقدر ۱۴ کروڑ روپے زائد رہا۔ ریاست کے چھٹے سال میں بھی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے یہ پوری پوری توقع کی جا سکتی ہے کہ تیسرے منصوبے کا نصب العین بھی، جس کے لیے (۳۰۵) کروڑ روپے کے خرچ کا پروگرام ہے، حاصل ہو کر رہے گا۔

- ناگارجن ساگر کے عظیم پروجکٹ پر پچھلے سال (۹) کروڑ روپے کی ابتدائی گنجائش کے مقابلے میں تقریباً (۱۰) کروڑ روپے خرچ ہوئے۔
- ریاست کی تیز تر صنعتی ترقی کے لیے (۳) کروڑ روپے کے منظورہ سرمایہ سے ایک انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کیا گیا ہے، اس نے دس منتخب پروجکٹوں سے متعلق تحقیقات کا کام شروع کر دیا ہے تاکہ یہ صنعتیں جلد از جلد قائم ہو سکیں ان کا مجموعی تخمینی خرچ (۱۹٫۹۵) کروڑ روپے رہا۔
- چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے قیام اور ترقی کے لیے بھی ایک علحدہ کارپوریشن قائم کیا گیا ہے جس کے لیے حکومت نے (۲۰) لاکھ روپے سرمایہ حصص کے تحت اور (۳۵) لاکھ روپے قرض کے طور پر دیے ہیں۔
- اسٹیٹ مائننگ کارپوریشن جس نے ایک سال پہلے کام شروع کیا ہے، اب ضلع کرشنا میں لوہے کی کچ دھات کے ذخیروں کی کھدائی میں مصروف ہے۔ جہاں کان کنی کی کارروائیاں دسمبر ۱۹۶۱ء میں شروع ہوئیں اور ایک لاکھ ٹن سے زیادہ کچ دھات نکالی گئی ہے۔ اس کارپوریشن نے بہت سی دوسری معدنی چیزوں کی کھدائی، نیز اسبسطوس، تانبے اور گرافائٹ وغیرہ کے ذخائر کی تلاش اور کان کنی کی کئی اسکیمیں تیار کر رکھی ہیں۔
- کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کو (۲۲۴۱۷) گاوؤں تک وسعت دی جا چکی ہے جو (۱۱۲۴۸۰) مربع میل کے رقبے میں واقع ہیں اور جن کی آبادی (۲٫۹۰۴) کروڑ ہے۔ ریاست میں (۴۰۸) بلاک قائم ہو چکے ہیں۔
- لازمی تحتانی تعلیم کی اسکیم کے علاوہ اسکولوں کے بچوں کے لیے دوپہر کے کھانے کے انتظام سے متعلق بھی دو اسکیمیں نافذ کی جا چکی ہیں۔

تیسرے منصوبے کی اسکیموں کی عمل آوری کے لیے ضروری ذریعے اور وسیلے مہیا کرنے کی غرض سے نئی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں لیکن ہمارے اولوالعزم عوام کا والہانہ تعاون ہی اس کی کامیابی کے لیے نہایت موثر قوت ثابت ہوگا۔

جاری کردہ :- ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ، آندھرا پردیش

حسن اسیم

دہلی میں مشاہدے سطحی اور سنجیدہ

برسوں بعد دہلی جانے اور چند دن فرصت اور اطمینان سے گذارنے کا موقع ملا۔ اس عرصہ میں دلی بہت بدل گئی اور ان تبدیلیوں کے بارے میں کوئی اہل نظر یا صاحب تحقیق لکھنا چاہے تو اچھی خاصی کتاب لکھ سکتا ہے، مگر میں اس مختصر مضمون میں چند ایسے مشاہدے قلم بند کر رہا ہوں جو وسیع حلقے کے لیے قابل دلچسپی ہو سکتے ہیں۔

اردو دانی اردو فہمی

سب سے زیادہ اور سب سے پہلے جو چیز خاص کر اردو دانوں کے لئے جاذب توجہ ہو سکتی ہے وہ زبان ہے۔ بلّی ماراں اور جامع مسجد کے مغربی علاقہ کو چھوڑ کر آپ کو اردو بولنے والے گھرانے شاذ ہی ملیں گے، خاص کر نئی دہلی میں جس قسم کی اردو بولی جاتی ہے وہ اردو نہیں "کردو" ہے۔ کردو کا مفہوم سمجھنا چاہیں تو بس خیال کیجے کہ جیسے پوت سے کپوت ہوتا ہے ویسے ہی اردو سے کردو! مثلاً

محض حسن اتفاق ہے کہ ایک صاحب سے ملاقات ہوی جو خود نہ صرف کافی عرصے تک دکن میں رہ چکے، بلکہ دہلی میں بھی کئی حیدرآبادیوں سے رسم وراہ رکھتے ہیں بیان کر رہے تھے کہ دلی کی صحیح زبان جن گھرانوں میں بولی جاتی ہے وہ ٹکسالی اور معیاری بھی ہے اور مستند بھی۔ ان کا خیال بالکل صحیح ہے کہ اردو کا مستقبل دوآبے سے ہی وابستہ ہے۔ . . . .

. . . .

. . . . آپ چاہے ان کے خیال سے اتفاق کریں یا نہیں، حیدرآبادی زبان کے بارے میں ان کے چند اعتراضات قابل غور ہیں سب سے پہلے تو یہ کہ ہر دوسرا حیدرآبادی تکیہ کلام کے طور پر "جو ہے" جس کثرت سے استعمال کرتا ہے اس سے بڑی بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔ جہاں چاہے آپ بھی کیجے۔ بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور ڈگری داروں سے لے کر انپڑھوں تک ہر دوسرا شخص ہی نہیں تین چوتھائی سے زیادہ افراد کا تکیہ کلام "جو ہے"[1] ہوتا ہے۔ مثلاً اس قسم کے جملے آپ یہاں بہ کثرت سنیں گے۔

---

[1] جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہم فاضل مضمون نگار کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ حیدرآباد میں ہر دوسرے شخص کا تکیہ کلام "جو ہے" ہوتا ہے بلکہ اب تو ڈھونڈنے سے بھی ایسے لوگ کم ملیں گے جو "جو ہے" یا "جو ہے سو" کی تکیہ کلام کے طور پر بولتے ہوں۔ (اڈیٹر)

"وہ جو ہے کل ہی محبوب نگر سے آئے اور آج جو ہے بمبئی جانے والے ہیں۔"

"عثمانیہ یونی ورسٹی جو ہے ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی تھی۔"

اس بات سے ہر شخص اتفاق کرے گا کہ تکیہ کلام نہ صرف مہمل بلکہ فالتو لفظ ہوتے ہیں جن کا استعمال کسی زبان میں پسندیدہ نہیں ہو سکتا اور ہم لوگ واقعی "جو ہے" کا استعمال عیب کے درجے تک کرتے ہیں۔

حیدرآبادی اور دکنی پچاس اور چار کو (۵۴) چون کی بجائے چوپن کہتے ہیں اور سریلی کا تلفظ سری لی کی بجائے سرئیلی کرتے ہیں۔ اگرچہ عام ڈگر کے خلاف تلفظ کرنا کوئی پسندیدہ بات نہیں مگر پھر بھی زیادہ قباحت نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اچھے اچھے اردو دان بلکہ اردو لکچرار، استاد اور غالباً پروفیسر صاحبان بھی "بھاگنے" کا صحیح مفہوم نہیں جانتے۔ چناں چہ تیز جانے کے لیے وہ اکثر کہتے ہیں "بھاگو" حالاں کہ انہیں "دوڑو" کہنا چاہیے۔ بھاگنا کے معنے ڈر کر یا شکست کھا کر چلے جانے کے ہیں۔ تیز جانے کے لیے دوڑنا ہی صحیح ہو سکتا ہے۔

دنیا کی سب زبانوں کی طرح اردو میں بھی لفظوں کی معنوی پرچھائیاں ہوتی ہیں۔ بدنصیبی سے ہم ان کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں تب ہی تو دوڑنے اور بھاگنے میں فرق نہیں کرتے۔

ایک بار تو میری موجودگی میں اس کا تجربہ ہوا۔ جانکی پرشاد صاحب، محمد سلطان صاحب، بیگم وہاب الدین اور دوسرے افراد کی پارٹی جس روز حیدرآباد کے لیے روانہ ہونے والی تھی میری طرح ایک اور دکنی صاحب بھی نئی دہلی کے اسٹیشن تک جانے والے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے کہا،

"میں بھی جانکی پرشاد صاحب کو چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

دہلوی صاحب میرا منہ دیکھنے لگے اور مسکرا کر کہا،

"چھوڑنے کی بھی ایک ہی رہی۔"

اس غریب کو یہ معلوم نہ تھا کہ "چھوڑنا" ٹکسالی اردو میں ترک کرنے، تعلقات منقطع کرنے کے لیے بولا جاتا ہے کسی کے ساتھ اس کی منزل، اسٹیشن یا ہوائی اڈے وغیرہ تک جانے کے لیے پہنچانا کہتے ہیں نا کہ چھوڑنا۔ اگر آپ چار مینار کی طرف جا رہے ہوں اور آپ کا کوئی عزیز یا ملاقاتی بھی افضل گنج تک جانے والا ہو تو اس سے کہیے،

"چلو میں تمھیں افضل گنج تک پہنچا دوں۔"

نہ کہ "چلو، میں تمھیں چھوڑ دوں۔"

حیدرآباد میں اضافت اور جمع الجمع کا استعمال بھی بڑی کثرت سے ہوتا ہے۔ کوئی "بین ملکی" کہتا ہے تو کوئی "بین اقوامی"۔ کوئی احکام اور اسناد پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ احکامات اور اسنادات کو [illegible] حالاں کہ اردو میں:

"ہر مذکر اسم جس کے آخر میں الف یا ہ نہ ہو واحد اور جمع میں یکساں ہوتا ہے [illegible] آدمی

دو لکھوار، چار پروفیسر۔"

پھر ہمیں خواہ مخواہ جمع در جمع یا جمع الجمع بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ حکم کی جمع حکم ہی کافی ہے، احکام تحریبانہ اردو ہے احکامات غلط ہی نہیں جہل ہے، اسی طرح سند کی جمع اردو طریقے کے بموجب سندیں صحیح اور فصیح ہے۔ اسناد عربیانہ اردو یا شکل اردو ہے۔ اسنادات "علمی" اردو تو در کنار جاہلانہ اردو ہے۔

خود حرکتی سیڑھیاں:

دہائیوں پہلے یورپ کے کئی شہروں میں خود حرکتی سیڑھیاں یعنی (ESCALATOR) لگائے گئے تھے۔ برقی قوت سے سیڑھیاں اوپر نیچے آتی جاتی ہیں اور انسان نچلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر اوپر تک یا اوپری سیڑھی پر کھڑے ہو جانے سے نیچے تک خود بخود پہنچ جاتا اور چڑھنے اترنے کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔ اسی قسم کی خود حرکتی سیڑھیاں اتری ریلوے نے پرانی دہلی کے اسٹیشن پر لگوائی ہیں۔ دو مرتبہ دہلی کے اسٹیشن سے سوار ہونے اور اترنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں مرتبہ ریل اسٹیشن کے اس مخصوص پلیٹ فارم سے نہ تو چھوٹی اور نہ آئی جہاں یہ سیڑھیاں لگی ہیں۔ دہلی کے اسٹیشن پر پندرہ بیس پلیٹ فارم ہیں۔ خود حرکتی سیڑھیوں سے وہی خوش نصیب مسافر اور قلی مستفید ہو سکتے جن کی ریلیں اس کے قریبی پلیٹ فارموں سے چھوٹتی اور یا وہاں پہنچتی ہوں! گویا نیکی تو ہوئی مگر محدود اور مشروط!

مرکزی حکومت کی وسعت نظری:

نئی دہلی انگریزوں نے بنائی اور انہیں نے اسے بسایا تھا۔ وہاں کی متعدد سڑکوں کے نام کرزن روڈ، ارون روڈ ہیسٹنگ روڈ جوں کے توں برقرار ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ راشٹرپتی بھون سے پورب کی سمت جانے والی عالیشان سڑک پر پانچویں جارج کی مورتی اور برطانوی شہنشاہیت کی خاطر پہلی عالمی جنگ میں مرنے والے افسروں اور سپاہیوں کی یادگار "انڈیا گیٹ" یا "ہند دروازہ" قائم ہے۔ یونین گورنمنٹ یا مرکزی سرکار کی یہ وسعت نظری، حقیقت شناسی اور تحمل پسندی کا نتیجہ ہے کہ اس نے پرانے مخالفوں کی یادگاریں برقرار رکھی ہیں۔ آن "بابایان شہر" کو کیا کہا جائے جنہوں ریزیڈنسی کے رعب داب یا سطوت بھرے برج نما دروازے یا فتح میدان کی عمارت کی شاندار بالکنی کو اس مغالطے میں تڑوا دیا کہ انہیں ڈھا دینے سے تاریخ کی حقیقتیں بھی فنا ہو جائیں گی۔ جتنے لوگ پہلے یہ جانتے تھے کہ فلاں عمارت یا فلاں دروازہ فلاں بادشاہ یا حاکم نے بنوایا وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ فلاں عمارت یا فلاں دروازہ خوبصورتی اور افادیت کو بالائے طاق رکھ کر تنگ نظری اور جہل ذہنی سے گروا دیا گیا۔

کہاں تو مرکزی حکومت کی یہ رواداری اور بردباری کہ اس نے اکبر اور جہانگیر، روشن آرا اور جہاں آرا کی موسومہ سڑکیں برقرار رکھی ہیں اور کہاں ایک اسٹیٹ واری اور جز ملکی حکومت کی یہ تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کہ وہ نظام شاہی روڈ کو جواہر لال نہرو روڈ یا آصفیہ کتب خانے کو سنٹرل لائبریری کے نام دے کر اپنی "ذہانت" "کارکردگی" "حریت پسندی" اور "وطن دوستی" کے ثبوت دے رہی ہے۔

ہندستانی پرچار سبھا کی ابتدائی اور موجودہ حالت:

ہندستانی پرچار سبھا کا افتتاح جب بابائے قوم مہاتما گاندھی کے ہاتھوں ۱۹۴۲ء میں ہوا تھا تو ہندستان کے ہر اخبار میں کئی کئی کالمی رپورٹیں شائع ہوئی تھیں خاص کر ہندی اور اردو کے اخباروں میں کئی دنوں تک ہوا افقانہ، مخالفانہ، جانب دارانہ، عدم متعلقانہ، شرانگیز یا پروپگنڈائی مضمون شائع ہوتے رہے تھے۔ اس افتتاحی اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے علاوہ ڈاکٹر تاراچند، پنڈت سندر لال جی، علامہ سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید محمود، سدرشن جی کاکا صاحب کالیلکر، آچاریہ ونوبا بھاوے وغیرہ جیسی کل ہند شہرت رکھنے والی ہستیاں تشریف لائی تھیں اور راجندر بابو پنڈت جواہر لال وغیرہ نے معذرت نامے بھیجے تھے کہ وہ کسی نہ کسی سبب سے شرکت سے معذور رہیں۔ اسی ہندستانی پرچار سبھا کی حالیہ میٹنگ باپو کی آخری یادگار راج گھاٹ کے قریب ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ہوئی تھی۔ دوسرے دن کے اخباروں میں جلی عنوان کے ساتھ روداد میں چھپنا کیا معنے اردو اور ہندی کے اخباروں نے کسی کونے میں بھی کوئی اطلاع شائع نہیں ہوگا کہاں تو چار چار پانچ پانچ کالمی سرخیوں کے تحت ہندستانی پرچار سبھا کی روداد میں چھپتی تھیں اور کہاں اب چار پانچ سطریں بھی شائع نہیں ہوئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندستانی پرچار سبھا بستر مرگ پر پڑی ہے اور بابائے قوم کی متعدد یادگاروں کی طرح یہ سبھا بھی بظاہر صرف داستان پارینہ ہو جائے گی۔ مہاتما گاندھی کی مورتیاں اور تصویریں، ان کے نام سے منسوب شدہ ادارے اور سڑکیں آپ کو شہر شہر گاؤں گاؤں، محلے محلے اور دفتر دفتر ملیں گی مگر مہاتما جی اصولوں کے حقیقی نمونے اور گاندھیائی مسلکوں کے موثر ادارے آپ کہیں نہیں پائیں گے۔ بابائے قوم کے مجسمے اور ان کی یادگاریں ان کی کتابیں اور ان کے نام لیوا بلا مبالغہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں، ان کے سچے پیرو سو پچاس رہ گئے ہیں اسب کے سب بے اثر اور اکثر و بیشتر گمنام۔ گاندھی بیڑی، اور باپو پان گھر ہی نہیں ایسے شراب خانے بھی ہیں جہاں گاندھی جی کی تصویریں آویزاں ہیں۔ ہر دفتر کے ہر کمرے میں بابائے قوم کی تصویر تو آویزاں ہے مگر اس کی طرف پشت کیے ہزاروں سرکاری عہدیدار اور ملازم اپنی رشوت اور غیر ملکی بدکلامی اور ناانصافی، تساہل اور لاپروائی سے کرپشن (CORRUPTION) کا نمونہ ہیں۔ بنکوں میں بھی ایسی ہی چور بازاری اور رباخوری (USURY) سے لکھ پتی اور کروڑ پتی بننے والوں کے مکانوں کوٹھیوں اور حویلیوں میں گاندھی جی کی قد آدم تصویریں لگی ہیں اور بیشتر صدر دفتر والوں میں بھی ان تصویروں کی آنکھوں کے سامنے رشوت کا لین دین ہوتا رہتا ہے۔

نئی دلی کی نئی کششیں:

۱۔ جانور گھر

نئی دلی میں جو نیا جانور گھر اور چڑیا گھر قائم کیا گیا ہے [illegible] سے زد میں مختلف جانوروں کے لیے وسیع پنجرے اور احاطے بنائے گئے ہیں [illegible] سے خوش وضع اور [illegible]۔ اگر اس زو کی سیر [illegible] متقسم ہو گیا جو شمر اعلا رکشا اعلا نے کی اجازت دی جائے تو بہتر ہے لوگوں کو [illegible]

باصحت نہ ہوں) زو کی سیر کے لیے آسکیں گے اور زو کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ موجودہ حالات میں داخلے سے قریب ترین پنجرے تک پہنچنے کے لیے بیس پچیس سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں اور ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ گاندھی میوزیم:

نئی دلی اور پرانی دلی کے بیچوں بیچ راج گھاٹ کے بالکل قریب مہاتما گاندھی کا میوزیم قایم کیا گیا ہے جس میں باپوئے قوم کی تصنیفیں اور تالیفیں رکھی گئی ہیں اور ان کی ادارت میں شائع شدہ اخبار اور رسالے جمع کیے گئے اور ان سے متعلقہ مطبوعات یکجا کی جا رہی ہیں۔ بچپن سے لے کر راج گھاٹ میں سپردِ آگ کیے جانے تک کی تصویریں قرینے سے جمع کی گئی ہیں۔ خود راج گھاٹ کے اطراف ایک حسین چہار دیواری زیرِ تعمیر ہے۔ تکمیل کے بعد باپوئے قوم کی سمادھی ان کے شایانِ شان ہو جائے گی۔ اگر اس میوزیم میں گاندھی جی سے متعلق مختلف اخباروں میں شائع شدہ خبروں کی اہم کترنیں خاص کر ان اخباروں کی جو گاندھی جی کی تحریکوں کے مخالف تھے یا ان کی موافقت میں خامہ فرسائی کرتے تھے یکجا کی جائیں، نیز مختلف اخباروں میں شائع شدہ کارٹون جمع کیے جائیں تو مہاتما کی شخصیت اور ان کی زندگی میں ان کی عظمت اور قدر بندی کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ تقریباً ۴۰ برس پہلے ۱۹۲۲ء یا ۲۳ء میں ایک اطالوی ماہنامے نے گاندھی جی کا ایک بہت ہی موثر کارٹون شائع کیا تھا اس کے ایک سال بعد ہی ایک جرمن اخبار میں ایک بڑا کارٹون شائع کیا گیا تھا جس میں مزاحیہ طور پر یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل کرنے کے لیے گاندھی جی کو وائسرائے نامزد کرنا چاہیے، چنانچہ کارٹون میں بتلایا گیا تھا کہ گاندھی جی اپنے معمولی لباس میں مگر وائسرایانہ شان و اہتمام کے ساتھ ہاتھی پر سوار چلے آ رہے ہیں۔

۳۔ بال بھون:

نئی دہلی میں بال بھون کے نام سے بچوں کی سیر و تفریح کے لیے ایک خوبصورت باغ قایم کیا گیا ہے جس میں بچکانی ریل بھی ہے۔ اس قسم کی سیرگاہ ہر بڑے شہر میں بنائی جانی چاہیے۔

چند جاذبِ توجہ حقیقتیں:

پرانی دلی کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز نظر آئی جس سے حیرت ہوئی۔ ایک مرتبہ عورت نما مرد (ان کا مکروہ نام میں نے جان بوجھ کر نہیں لکھا) کافی تعداد میں نظر آئے۔

ایک بار ہٹے کٹے تندرست توانا فقیروں کی جماعت نظر آئی۔ ایک مرتبہ ایک عیسائی مبلغ کو دیکھا جو سرِراہ تصویردار کاغذ یعنی ILLUSTRATED LEAFLETS تقسیم کر رہا تھا۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اتنی ترقیوں پر ایسا جمود کہ ہزاروں افراد جو زورِ بازو سے روزی کما سکتے ہیں نکمے پن کے باوجود مزے میں ہیں اور ہندو مسلم تناؤ اور کھنچاؤ کے زمانے میں ایسے مذہب والے بھی ہیں جو کھلے بندوں اپنے مذہب کی تبلیغ سرِراہ کر سکتے ہیں۔

مٹی کا کرشمہ:

ہم دکنیوں کے لیے اتری ہندوستان کی اینٹیں بھی باعثِ حیرت ہوتی ہیں۔ چنانچہ متعدد پل ہیں جو اینٹوں کے

کمانوں سے تعمیر ہوئے ہیں۔ نئی دہلی میں تو ان اینٹوں کے نیچے لوہے اور سمنٹ کی تہہ ہے مگر پرانی دہلی کے ایک قدیم پلیا میں تو یہ تہہ بھی نہیں ہے اور خالص اینٹوں سے بنی ہوئی کمانوں پر سے دن رات ریلیں گزرتی ہیں۔ سارے اتری علاقے میں ایسی بے شمار کوٹھیاں، رہائشی مکان اور سرکاری دفتر ہیں جن کی دیواریں، کمانیں، ستون، سیڑھیاں اور فرش بھی صرف اینٹوں سے بنے ہیں۔ جو کام ہمارے یہاں پتھر سے لیا جاتا ہے وہ اتری بھارت میں اینٹوں سے ہوتا ہے۔ ملنے یا نہ ماننے کئی سڑکوں کے دونوں طرف سمنٹی اور ڈامری سڑک کو محفوظ رکھنے کے لیے سڑک پر اینٹیں لگی ہیں۔

کھل جا سم سم:

علی بابا اور چالیس چور نامی قصہ بچپن میں سنا تھا اور لڑکپن میں پڑھا تھا۔ اس افسانے کے مطابق ایک خزانے کا دروازہ "کھل جا سم سم" کہہ دینے سے کھل جایا کرتا تھا۔ نئی دہلی میں ایر انڈیا انٹرنیشنل (بین اقوامی ہوائی ہندستان) کے دفتر میں داخل ہونے کے لیے آپ کو "کھل جا سم سم" کہنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ جب آپ دروازے کے قریب پہنچتے ہیں تو آپ کے وزن ہی سے متاثر ہو کر ہوائی سفر کے دفتر کا دروازہ خود بخود کھلتا اور آپ کے اندر داخل ہو کر تین چار قدم آگے بڑھ جانے کے بعد بند ہو جاتا ہے۔ برسوں پہلے پڑھا تھا کہ امریکہ میں گراج کے دروازے اس طرح بنائے گئے تھے کہ ان کے قریب موٹر پہنچنے سے وہ آپ ہی آپ کھل جاتے تھے۔ اسی اصول پر اور مغربی ملکوں میں رواج یافتہ سہولتوں کی تقلید میں یہ دروازہ نئی دہلی میں لگا ہے۔ بڑھاپا دوسرا بچپن ہوتا ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر جب کبھی اس دفتر پر سے گزرنے کا اتفاق ہوتا تھا خواہ مخواہ کام نہ کاج اس میں داخل ہوتا اور ترنت ہی واپس آ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ دربان پر نظر پڑی۔ اس نے جس عفو پسندانہ مسکراہٹ سے دیکھا اس سے دل خوش ہو گیا۔

راشٹرپتی بھون کی سیر:

راشٹرپتی بھون کا ذکر آچکا ہے۔ یہ پہلے VICEREGAL LODGE کے نام سے موسوم تھا۔ اب ریپبلک ہند کے صدر کی رہائش گاہ اور بیرونی مملکتوں کے بادشاہوں، صدر صاحبوں اور مشہور افراد کا مہمان خانہ ہے۔ یہاں بے اثر اور گمنام افراد کو قدم رکھنے کا بھی کیوں موقع ملتا۔ مگر خوش قسمتی سے سماج کاری کی کل ہند کانفرنس کے ڈیلیگیٹوں اور ممبروں کو جب عام بلاوا آیا تو ہم بھی شریک کر لیے گئے۔ راشٹرپتی بھون بڑی عالیشان عمارت ہے۔ داخلے کے دروازے سے لے کر اندرونی کمروں تک جا بجا تزک و احتشام کی نشانیاں اور عملی ثبوت! مخصوص وردیاں پہنے ہوئے سپاہی اور دربان، خانساماں اور بیرے۔ مغربیت میں ڈوبی ہوئی ہند سرکار کی علامتیں نہ صرف فن تعمیر واضح بلکہ آراستگی ساز و سامان سے بھی۔ دعوت بھی خاص مغربی وضع کی یعنی ایٹ ہوم۔ صدر مملکت ہند عالیہ علالت کے بعد رو بہ صحت ہو رہے تھے اس لیے وہ تو نہ آ سکے، ان کی قائم مقامی نائب صدر رادھا کرشنن نے کی۔ مہمانوں کو البتہ یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ صدر مملکت مغلیہ باغ میں چہل قدمی فرما رہے تھے۔

راشٹرپتی بھون کے جس حصے میں سماج کاروں کی دعوت تھی وہاں آخری وائسرائے ہند اور ان کی شریکِ حیات کی قدِ آدم تصویریں آویزاں تھیں۔ راشٹرپتی بھون میں آتے اور جاتے جن کمروں اور گلیاریوں میں سے گزر ہوا وہاں بھی جابجا تیل کی رنگین تصویریں تھیں۔ ان میں سے چار تصویریں پنڈت جواہر لال کی اور ایک نہایت عالیشان باپوئے قوم مہاتما گاندھی کی تھی۔ جنگِ آزادی کے بڑے بڑے سورماؤں کی تصویروں میں انصاری صاحب، لاجپت رائے، حکیم اجمل خاں اور سروجنی دیوی کے علاوہ، مانیے یا نہ مانیے، محمد علی صاحب (برادر شوکت علی) کی تصویر بھی تھی۔ یہ بھی مرکزی حکومت کے موجودہ رہنماؤں کی وسعتِ نظری اور وسیع قلبی کا ثبوت ہے کہ وہ ان دوستوں کی یاد برقرار رکھتی ہے جو بعد میں روٹھ گئے تھے یا کسی مصلحت سے ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

آصف علی صاحب کی تصویر راشٹرپتی بھون میں کیسے نہ ہوتی جب کہ دہلی دروازے سے اجمیری دروازے تک جانے والی سڑک ان کے نام سے موسوم ہے اور اسی لیے قریب ہی کے وسیع حلقے کے بیچ میں ان کی قدِ آدم مورتی کھڑی کی گئی ہے۔ آصف علی روڈ کی طرح کئی شاہراہیں قومی نیتاؤں کے نام سے منسوب ہیں یا ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے محلے بسائے گئے ہیں۔ مثلاً راجندر نگر، پٹیل نگر، تلک روڈ، مولانا آزاد روڈ، سرسید احمد خاں روڈ، وغیرہ۔ تلک روڈ کے چوراہے پر لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کی ایک جز مورتی نصب کی گئی ہے جو فنکارانہ نقطۂ نظر سے اچھی خاصی اور جاذبِ توجہ ہے اسی طرح مجھے وہ آئیل پینٹنگ بہت پسند آئی جو راشٹرپتی بھون میں آویزاں ہے اور سروجنی دیوی کی شبیہہ پیش کرتی ہے۔ اس دلکش تصویر کے سامنے میں کئی منٹ مسحور کھڑا رہا۔ سروجنی دیوی اور ان کے معروف مکان "سنہری دہلیز" کی کئی ادبی اور تہذیبی محفلوں کی یاد تازہ ہوئی اور صاحبۂ خانہ کے بارے میں چند خیال اجاگر ہوئے جنھیں میں نے یوں قلمبند کیا ہے۔ یہ شعر نہیں ہیں، نظم نہیں ہے، سروجنی دیوی کے ایک مخلص قدردان کے جذباتِ عقیدت پیش کرنے والی عبارت ہے۔ یوں تصور کیجئے کہ اس مشہور خاتون کی ایک دلکش تصویر آویزاں ہے جس کے نیچے ایک تختی پر یہ لکھا ہے۔

سروجنی دیوی

حیدرآباد کی مایۂ ناز دختر،

آسمانِ شعر و ادب کی تابندہ اختر،

میدانِ سیاست کی شیرنی

محفلِ خوش طبعی و ظرافت کی بلبلِ ہزار داستان،

گلشنِ عالم کی چہکتی ہوئی مینا،

نثر نویس شاعرہ،

شعر نویس ساحرہ،

سحر نواز مقررہ

دلی کی قدیم یادگاریں:

۱۔ پرانا قلعہ:۔ یہ اشوک واکبر اور شیر شاہ سوری جیسے عالی دماغ حکمرانوں کا بنایا ہوا ہے اسی میں کتب خانے کی وہ عمارت واقع ہے جس کی سیڑھیوں سے گر کر ہمایوں جانبر نہ ہو سکا تھا۔

۲۔ مقبرۂ ہمایوں:۔ یہ تاج محل نامی مشہور آفاق عمارت کا پیش رو ہے۔

۳۔ حوض خاص:۔ یہ علاء الدین خلجی کی یادگار ہے جہاں فیروز شاہ کے تعمیر کردہ کالج کے کھنڈر ہیں اور خدوہ محو خواب ہے۔

۴۔ قطب صاحب کی لاٹھ:۔ یہ درحقیقت غیر مکمل اور غیر تعمیر شدہ مسجد کا مینار ہے جس کا نام قوت الاسلام تجویز کیا گیا تھا۔ اگر یہ مسجد مکمل ہو چکی تو رعب دارانہ نام کی طرح وہ بھی عظمت اسلام کی رعب دار یادگار ہوتی اس کے قریب تقریباً ۲۴ فٹ اونچا لوہائی کھمبا ہے جو قدیم ہندستانیوں کے فن لوہاگری اور دھات سازی کی یادگار ہے۔

۵۔ درگاہ نظام الدین اولیا:۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم افراد بھی عقیدت سے حاضر ہوتے ہیں یہ سب عمارتیں پرانی دہلی میں نہیں بلکہ نئی دہلی میں واقع ہیں۔ گویا نئی دلی میں آپ کو قدیم ترین اور جدید ترین عمارتیں ملیں گی۔ پرانی دلی میں صرف لال قلعہ اور جامع مسجد ہر شخص کی کشش کا مرکز رہ گئے ہیں۔ اگر یہ بھی نئی دلی میں ہوتے تو لاکھوں اندرونی اور بیرونی سیاح جو ہر سال دلی میں آتے ہیں پرانی دلی کا رخ ہی نہ کرتے۔

نئی دلی کی قدیم اور جدید عمارتیں:

ان قدیم یادگاروں کے علاوہ ظاہر ہے نئی دلی میں سیکڑوں اور ہزاروں نئی نئی عمارتیں ہیں۔ ایک سے ایک بہتر ہے، ایک سے ایک بڑھیا، ایک سے ایک عالی شان۔

مختلف بیرونی ملکوں نے جو سفارت گاہیں بنائی ہیں ان میں بعض نے اپنے ملک کے ڈیزائن اور ہندستانی فن تعمیر میں امتزاج پیدا کیا ہے، کسی نے ہندستان کی آب و ہوا کے لحاظ سے مناسب تبدیلیاں کی ہیں مگر سب ہی اچھی ہیں، سب ہی شاندار ہیں اور کوئی عمارت ایسی نہیں ہے جو بہترین اور اعلیٰ ترین معیار کے لحاظ سے نمایاں ترین نہ ہو۔ اکثر سرکاری عمارتوں کے نام اس طرح رکھے گئے ہیں کہ ان سے عمارت کی کاروباری نوعیت ظاہر ہو خصوصیت ظاہر کرنے والے اس لفظ کے ساتھ "بھون" ہے۔ "آنند بھون" کے نام سے تو ہم مدتوں سے واقف ہیں۔ یہ پنڈت موتی لال نہرو کی کوٹھی ہے جو انھوں نے الہ آباد میں رہائش کے طور پر بنوائی تھی اور جہاں بابائے قوم سے لے کر معمولی معمولی ہستیوں تک آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے والے ہزاروں افراد رہ چکے یا کانفرنسوں پر غور کیا ہو چکے ہیں۔ حیدر آباد کی طرح ہر جز کلکتی یا اسٹیٹ وارے راج [illegible] لکھنؤ سے ہراں ہند کا گر [illegible]

[illegible] اور سب سے

گاندھی بھون کی خوش نما عمارت کی وجہ سے جو ہمارے شہر میں بنائی گئی ہے غرض نئی دلی میں بھون ہی بھون ہیں. زراعت کے محکمے کی عالیشان کوٹھی کا نام ہے کرشی بھون. فنون لطیفہ کے صدر مقام اور نمائش گاہ کا نام ہے کلا بھون، اور تو اور جرمن سفارت گاہ نے جس جگہ جرمن تعلیم، جرمن تشہیر اور جرمن کتابوں کا مرکز قائم کیا ہے اسے ایک مشہور جرمن مستشرق کے نام سے منسوب کرتے ہوئے "ماکس میولر بھون" رکھا ہے.

دہلی کے شاندار بھون دیکھ دیکھ کر مجھے اکثر خیال آتا تھا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے بیس برس پہلے جو انجمن ترقی اردو کے لیے دفتر، مرکزی کتب خانے، کانفرنس ہال، مطالعہ گھر اور مہمان خانے پر مشتمل ایک عالیشان عمارت تعمیر کروانی چاہی تھی (جس کے لیے عمارت فنڈ بھی قائم کیا گیا تھا اور ایک ایک روپے سے لے کر پچیس پچیس ہزار کے چندے ملے تھے) اگر واقعی بنوائی گئی ہوتی تو اب دس گنی مالیت کی ہوتی. اس زمانے میں تعمیری سامان لوہا اور سمنٹ، لکڑی اور اینٹیں نہ صرف آسانی بلکہ بازار کے نرخ سے کم تر مول پر مل جاتی. افسوس کہ وہ موقع جاتا رہا جس کی وجہ سے خود انجمن ترقی اردو کو اردو کے اصلی وطن سے چلے جانا پڑا. اب دہلی میں "اردو بھون" بنانے کا ارادہ وہی کر سکتا ہے جس کی نظر عقاب کی سی، دل شیر کا سا، حوصلہ اور ہمت شہد بٹورنے والی مکھی کا سا ہو مگر ایسا شخص دہائیوں بعد پیدا ہوتا ہے. پھر کیا ضرور ہے کہ وہ اردو بولنے والے خاندان ہی میں پیدا ہو؟ اور پیدا ہو بھی تو اسے سائنس یا میکانیت، علاج اور تحقیق کی دھن نہ ہو بلکہ زبان و ادب کی توسیع و ترقی' اردو کی دھن ہو.

غرض ایک نادر موقع ہم نے کھو دیا جس میں مولوی صاحب کا اتنا قصور نہیں جتنا کہ ان کا جو اس وقت ان کے مقربین میں سے تھے اور انجمن ترقی اردو کے اصلی کرتا دھرتا تھے. ایسے کرتا دھرتا جن سے انجمن ہی کو نہیں بلکہ خود اردو کو نقصان ہی نقصان ہوا، فائدہ کچھ نہیں!

بہر حال دلی کے ان سب بھونوں میں بین اقوامی شہرت اس عمارت کو نصیب ہوئی جس کا نام ہے "وگیان بھون" جسے ہم "معارف منزل" کہہ سکتے ہیں.

یہاں بڑی بڑی کانفرنسیں اور بڑے بڑے جلسے ہو چکے اور ہوتے رہتے ہیں. چوں کہ مختلف ملکوں کی بڑی بڑی ہستیاں یہاں آتی ہیں اور بین اقوامی بلکہ کل سنساری اہمیت رکھنے والے مسئلوں پر تقریریں اور بحثیں ہوتی ہیں اس لیے ہر نشست کے ساتھ کچھ کچھ آلوں اور تاروں کے ذریعے ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ ہر شخص تین چار بڑی بڑی زبانوں سے کسی زبان میں ہر تقریر کا فی البدیہہ ترجمہ سن سکتا ہے. مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ایک جاپانی اپنی مادری زبان میں تقریر کر رہا ہے یہ تقریر وگیان بھون کے ہال کے متصل چھوٹے چھوٹے کمروں میں بیٹھے ہوئے روسی، انگریزی اور فرانسیسی مترجم اپنی زبان میں فی الفور نشر کرتے جاتے ہیں اور جو لوگ ہال میں بیٹھے ہیں وہ اپنی واقفیت اور مرضی کے لحاظ سے منتخب شدہ زبان کا ترجمہ سنتے جاتے ہیں.

وگیان بھون کے سب سے بڑے ہال میں ایک ہزار افراد کے لیے جگہ ہے مگر اس کے علاوہ بھی ذیلی کمیٹیوں یا

کم تعدادی افراد پر مشتمل کانفرنسوں کے لیے دو ڈھائی سو نشست والے کمرے ہیں اور ہر ایک میں وہی انتظام رکھا گیا ہے کہ ضرورت ہو تو مختلف زبانوں میں تقریب کے فی البدیہہ ترجمے کروا کے اس طرح نشر کیے جائیں کہ ہر شخص آلے کے ذریعے سے مطلوبہ ترجمہ سن سکے۔ یہ کہنا غالباً تحصیل حاصل ہوگا کہ وگیان بھون ہو یا کلا بھون، کرشی بھون ہو یا راشٹرپتی بھون ان سب کے اہم کمرے اور ہال AIR CANDITIONED یا موسم بند کر دیئے گئے ہیں۔ باہر چاہے چل چلاتی دھوپ پڑ رہی ہو، سرکار کے ان محل نما دفتروں اور مخصوص فرضی عمارتوں میں "باد شمیم" چلنے کا دھوکا ہوتا ہے۔ یوں بھی دلی کی سرکاری، کاروباری، تجارتی، دفتری، عوامی اور ایک حد تک ۔۔۔ خانگی زندگی فرنگیت یا روسیت اور امریکیت میں اتنی ڈھل چکی اور ڈھلتی جا رہی ہے کہ آپ امریکہ یا انگلستان جائیں گے تو بہتیری چیزیں جانی پہچانی ہوں گی گویا یہ بھی بھارت سرکار کی دور اندیشی، مستقبل شناسی اور معاملہ فہمی کا ثبوت ہے کہ بین الاقوامیت اور عالمیت کے دور میں ترقی پذیر سے وابستہ ہو کر وہ تمام چیزیں تیار یا فراہم کر رہی ہے جو نہ ضروری بلکہ مفید بھی ہیں۔

اتنی ترقیوں کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ راج دھانی کی آبادی کیو سسٹم یعنے قطار بندی یا لائن بندی کی پابند نہیں ہوئی۔ چند مخصوص مقاموں پر اور وہ بھی مخصوص اوقات کے علاوہ ہر جگہ دھکم دھکا، ریل پیل اور ڈھکیل بازی۔ چالیس برس پہلے یورپ کی چھوٹی چھوٹی بستیوں اور گانو کے ڈاک گھروں میں دیکھا تھا کہ کرسمس سے چند دن پہلے جب ہر قسم کے کاروبار میں چہل پہل ہوتی ہے تو لوگ اپنے چہیتوں اور دوستوں کو تحفے یا خط وغیرہ بھیجنے کے لیے آتے ہیں اور خود بخود قطار بن جاتی ہے ایک ۷ سالہ لڑکی کے پیچھے ایک پہلوان کھڑا ہے۔ ایک ۷۰ سالہ بزرگ کے بعد ایک لڑکی کھڑی ہے غرض جو بھی آتا ہے فوقیت اور برتری عمر اور طاقت کے قطع نظر خود کو کیو کا پابند کر لیتا ہے۔ ایسا منظر (مخصوص مقاموں اور مخصوص اوقات کے علاوہ) نہ بمبئی میں نظر آتا ہے نہ کلکتہ میں، نہ مدراس میں، نہ نئی دلی میں! پرانی دلی، دقیانوسی حیدرآباد، جمود میں مبتلا لکھنو وغیرہ کا کیا ذکر! ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ فضا میں تیس چالیس جٹ تیز ترین رفتار سے اڑتے گزر رہے تھے اور بس کے اڈے پر ریل پیل ہو رہی تھی۔ بے تحاشا اکبر کا یہ شعر یاد آیا:

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے
لطف کیا ہے لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے

فرق البتہ یہ ہو گیا کہ موٹر سے زیادہ اہمیت خصوصی طیاروں کو حاصل ہو گئی ہے اور یہ چنداں ضروری نہیں کہ یہ طیارے زر خرید ہی ہوں۔ بہتیرے تو کسی نہ کسی غرض یا مصلحت سے ظاہر و نیکی اور خالص عنایت کے طور پر تحفتہً دیئے جاتے ہیں یا ایسے قرض پر جس کے متعلق دینے والے اور لینے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ اصل تو اصل، اصل کا سود بلکہ سود در سود بھی ادا نہیں ہوگا۔

نئی دلی کی مادی خوش حالی اور نئی دلی والوں کے قبل تاریخی کردار کے مجھے بعض چبھتے ہوئے جملے یاد آتے ہیں۔

"انسان کے دماغ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ اپنی قابلیت کی وجہ سے اس نے زمین اور

سمندر پر کامیابی حاصل کی، ہوا سے مقابلہ شروع کرنے کے بعد نصف صدی میں اسے مغلوب کر لیا۔ چینے جی آسمان کی سیر کر لی۔ اب تو دوسروں سیاروں سے ربط قائم کر کے ساری کائنات میں اپنا اقتداری جال پھیلانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے یہ دھن بھی ہے کہ سمندر کی تہہ سے غذا اور چاند اور مریخ کی سطح سے دھاتیں حاصل کرے۔ اس نے خاص کر میکانیت اور صنعیت میں اچنبھے میں ڈالنے والی ایجادیں اور اختراعیں کیں، تحقیق اور تفتیش کے سہارے اور فن کاریوں کے بل بوتے نیچر کے مقابلے میں ایک ذاتی قدرت پیدا کی۔ اصل قدرت کی غلطیاں دور کیں۔ پہاڑ کاٹے، غار بنائے، پل تعمیر کیے، ندیاں روکیں، خلیج پاٹے، سمندروں کو ملایا، عظیم الشان آبشار بنائے، بجلی کو مقید کیا، فاصلے کی اہمیت گھٹائی، بلندی و پستی کا فرق کم کرنے والی ہموار سڑکیں بنائیں، پہاڑوں سے مقابلہ کرنے والی عمارتیں، پاتال میں چلنے والی ریلیں، شاہین اور عقاب سے بلند تر اوران سے بھی تیز تر چلنے والے ہوائی جہاز تیار کیے۔ غرض ایجادوں اور فن کاریوں کے ذریعہ انسانی دماغ نے اپنی قابلیت کا بہترین سے بہترین اعلیٰ ترین ثبوت دیا۔"

یہ سب صحیح ہے مگر انسان کے دماغ ہی نے ترقی کی انسان کی خصلت و طینت میں بہتری تو کجا، کسی قسم کی تبدیلی بھی نہیں ہوئی۔ ہمارا کردار، ہماری ذہنیت اور ہمارے اخلاق وہی ہیں جو آج سے سو ہزار یا دس ہزار سال پہلے تھے۔

انسانی دماغ کے اطراف نور کا ہالہ ہے تو دل میں حسب معمول تاریکی پائی جاتی ہے۔ عقل ترقی کر رہی ہے، سیرت جمود میں مبتلا ہے، مادی تمدن بڑھ رہا ہے اور پھیل رہا ہے لیکن روحانی تہذیب معطل ہے۔ بدی بڑھ رہی ہے، جسم اپنا کے جنگل میں چھنا ہے۔ غرض دماغ ترقی کر رہا ہے مگر اخلاق و کردار، افعال و اعمال سیرت و بشریت میں کوئی بہتری نہیں پائی جاتی۔

انتہائیاں:

مختلف افراد نے ہندستان کی ایک خصوصیت "انتہائیت" بیان کی ہے یعنے ہمارے ملک میں قدرت اور تہذیب سے متعلقہ انتہائیاں جیتے ہی تضادی یا برعکسی نوعیت رکھنے والی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں اگر کشمیر کی سی پر فضا اور انتہائی خوبصورت وادیاں ہیں تو دوآبے جیسے سپاٹ اور یکساں علاقے بھی ہیں۔ اگر ہمالیہ جیسے سربفلک اور سدا برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں تو بیچ دکن میں پائی جانے والی چھوٹی بڑی ٹیلے نما پہاڑیاں بھی ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں گنگا اور جمنا سے سیراب ہونے والا انتہائی زرخیز علاقہ ہے تو راجپوتانے میں ویرانستان۔ اگر ہمارے ملک میں انتہائی گرمی اور انتہائی سردی پائی جاتی ہے تو مدراس میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں سردی ہوتی بھی ہے تو برائے نام۔

جو قدرت کا حال ہے وہی یا ویسا ہی تہذیب و تمدن کا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ ہیں جن کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند انسانوں میں ہوتا ہے۔ ایسے کاروباری افراد ہیں جو کروڑپتی ہیں اور لاکھوں روپیہ کماتے ہیں ہمارے ملک میں ایسے سلیقہ شعار، باتہذیب، باہنر، تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے ہیں جن پر خود تہذیب فخر کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہی ملک میں انتہائی افلاس، انتہائی جہالت اور انتہائی بدتہذیبی پائی جاتی ہے۔ چناں چہ ان کے بہتیرے

جیتے جاگتے نمونے دہلی میں ملیں گے۔

اگر جدید دہلی میں راشٹرپتی بھون سے دروازۂ ہند تک جانے والی ایک فرلانگ کشادہ کئی کئی سڑکوں اور ــــ ہنروں پرمشتمل شاہراہ ہے تو نئی دہلی میں چھوٹی چھوٹی گلیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر صاف شفاف علاقے ہیں تو کناٹ سرکس کے پچھواڑے میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ اگر نئی دہلی میں ایسی متعدد (بیسیوں ہی نہیں سیکڑوں) کوٹھیاں ہیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت کم سے کم ایک کروڑ ہے تو ایسے متعدد علاقے ہیں جہاں گھاس پھونس کچی اینٹ ٹین کے گلے سڑے ٹکڑوں وغیرہ سے بنائی ہوئی جھونپڑیاں ہیں جن میں بدترین افلاس اور بدترین غلاظت پائی جاتی ہے۔ ان غلیظ واڑوں میں رہنے والوں کی اوسط آمدنی روزانہ ایک روپیہ سے کم ہے تو دوسری طرف نئی دہلی ہی میں ایسے شاندار، آرام بخش اور سجے سجائے ہوٹل ہیں جہاں فی کس ۰۰۰ روپیہ روزانہ محض کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر دہلی میں ایسے مصیبت زدہ اور فلاکت رسیدہ گھرانے ہیں جن کی ماہانہ آمدنی ۲۰ روپے ہے تو دلی میں کئی ایسے بیش خرچ ہوٹل ہیں جہاں کا یومیہ کرایہ ہی کم سے کم ۱۵۰۰ روپے ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ دلی میں چیتھڑے دار مفلسوں کی قطاروں کی قطاریں نظر آتی ہیں اور وہاں بھی نام لی اور رعابدرروڈ کے پچھواڑے کی طرح ایسے بھوک کے مارے نظر آتے ہیں جو ہوٹلوں کا پھینکا ہوا کھانا ٹھونسنے پر مجبور ہیں

اگر اقبال نے یورپ اور امریکہ کی عیش پسند اور عیاش تہذیب کے بارے میں کہا تھا ؎

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

تو ہم دس گنی صحت سے کہہ سکتے ہیں ہندستان کی راجدھانی میں عیش اور عیاشی کے کارن نہیں بلکہ فلاکت و ناداری، مصیبت اور کنگالی کی وجہ سے نہیں بے کاری اور مے خواری نہ سہی انتہائی مفلسی اور تکلیف دہ عریانی نظر آتی ہے۔

لوٹتے وقت ریل نئی دلی کے شہر اور اطرافی علاقوں میں سے تیز رفتار سے گزر رہی تھی اور ایک ایک کرکے کناٹ سرکل، کرزن روڈ، سپرو ہاؤس، راشٹرپتی بھون، ہند دروازہ، نمائش گاہ، سپریم کورٹ کی طرح حکومت اور حاکیت جاہ وجلال، دولت وثروت، طاقت و اقتدار کی کئی جانی پہچانی اور بے شمار ناقابل شناخت کوٹھیاں نظروں سے اوجھل ہوتی جارہی تھیں اور مجھے بار بار خیال آرہا تھا کہ دلی نہ صرف ہمارے ملک کا صدر مقام ہندستان کا دارالحکومت بھارت کی راجدھانی زرپرستوں کا اڈا، منافقوں کا مرکز اور سیاست کا دنگل ہے بلکہ وہ شہر بھی جہاں دوسرے بڑے بڑے شہروں کی طرح قابل رشک عمارتیں، خوش نما باغ، کھیل میدان اور کئی تفریح گاہیں ہیں مگر ان کے ساتھ ہی ٹوٹے پھوٹے مکان، گندی بستیاں، تنگ و تاریک گلیاں بھی ہیں، جہاں کھاتے پیتے لوگوں کی اقلیت کے مقابلے میں تنگ دستی اور مفلسی میں زندگی کے دن برے بھلے طور پر گزارنے والی اکثریت ہے، جہاں تعلیم یافتہ، ہنرمند، محنتی، ایماندار، بےغرض شریف اور سمجھدار لوگوں کے دوش بدوش اَن پڑھ، نااہل، ایمان فروش، خود غرض، کاہل اور جاہل افراد ہیں، جہاں پنڈت سندرلال جی، مولانا حفظ الرحمان، ڈاکٹر تارا چند، رامیشوری نہرو، اور مجیب صاحب کی طرح [illegible]

جمہوریت اور قومیت کا سچا نمونہ پیش کرنے والی جیتی جاگتی ہستیاں ہیں تو طبقہ واریت ذات بندی گروہ پسندی اور جتھ
فرقہ واریت میں لت پت جماعت پرست منافقوں کے غول کے غول ہیں۔

غرض دلی اور نئی دلی تہذیب و تمدن کے دو انوکھے رخ پیش کرتی ہیں۔ منور اور تاریک، روشن اور کالا۔ ہمارا ہم میں سے ہر ایک کا خاص کر نوجوانوں اور سب سے بڑھ کر عہدیداروں اور مختلف سماجوں، انجمنوں اداروں کے لیڈروں اور .... کارندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تدبیر و اعلا کردار، تعلیم و تہذیب، شرافت و اخلاق، محنت اور جفاکشی، انسان دوستی بھارت میں پائی جانے والی برائیاں اور کمزوریاں گھٹتی جائیں اور ہماری قوم میں پائی جانے والی اچھائیاں اور قابل فخر خصوصیتیں عام ہوتی جائیں تاکہ سال بہ سال ہمارے ملک میں اندھیرا کم ہوتا جائے، روشنی بڑھتی جائے جہالت کم ہو، تہذیب ترقی کرے، پھوٹ کم ہو، اتحاد بڑھے، رنگ، نسل، پیدائش زبان، مذہب اور فرقے کے نارو ا امتیاز دور ہوں، قومیت، بین الاقوامیت، عالمیت اور انسانیت کا بول بالا ہو، ہندوستانیوں کی قابل لحاظ تعداد اعلا کردار شریف اور سچی تعلیم کے نمونے پیش کرنے والا ایسا باوقار جیون بتائیں جس سے ہمارے دیس کا نام دنیا جہاں میں روشن اور منور ہوتا جائے اور ہم امید بھرے دلوں ہی سے نہیں بلکہ پورے اطمینان اور یقین آمیز توقع سے یہ آواز بلند کہہ سکیں۔ جے ہند!

فضل الرحمٰن

شہیدِ محبت

(منظوم افسانہ)

(۱)

حُسن جانِ زندگی ہے عشق ارمانِ حیات — سازِ ہستی حُسن سوزِ عشق سامانِ حیات
حُسن روحِ گلستاں ہے حسن باغِ بے خزاں — عشق کے دم سے ہے دنیا میں بہارِ جاوداں
حُسن کے نظاروں سے کون و مکاں میں رنگ و نور — عشق کے ہنگاموں سے قلبِ دو عالم میں سرور
عشق پتھر میں شرر ہے حسن شاخوں پر ثمر — عشق موجوں کی تڑپ ہے حسن دریا کا گہر
زندگی کا مطلبِ پنہاں بتا دیتا ہے عشق — حسن کو جب برملا اپنا بنا لیتا ہے عشق
خاک کو گلشن جہنم کو بناتا ہے ارم — جلوۂ رخسار کا جادو، فسونِ چشمِ نم
حد سے جب بڑھتی ہے لیکن الفتِ خانہ خراب — زندگی عشاق کی بنتی ہے دیوانوں کا خواب
جاں سپاری پر مچلتا ہے جنونِ آرزو — دیدہ و دل سے ٹپک جاتا ہے خونِ آرزو
عہد و پیمانِ وفا بن جاتے ہیں پیمانِ مرگ — ساز و ساماں وصلِ باہم کے سر و سامانِ مرگ
بادۂ ناب میں تیزاب مل جاتا ہے پھر — جامِ آبِ زیست میں زہراب مل جاتا ہے پھر
دل اجل کی نیند پر اس درجہ مائل قہر ہے — دستِ بسمل اپنے حق میں دستِ قاتل قہر ہے
ہاں اے دل اب ابتدائے الفتِ ناکام دیکھ — اس جنونِ عشق کا آغازِ بد انجام دیکھ

(۲)

ہم نشیں و ہمدم و دمساز تھے دو نوجواں — جیسے دو قالب میں کر جائے سرایت ایک جاں
جیسے دو جسموں کو پھونکے ایک شعلے کی تپش — جیسے دو ذروں کو کھینچے ایک مرکز کی کشش
مل کے اٹھیں جیسے دو گام ایک منزل کی طرف — جائیں دو بجرے شکستہ ایک ساحل کی طرف
چھیڑ ڈالے دو غزالوں کے دلوں کو ایک تیر — جیون اک تنہا جزیرے پر بتائیں دو اسیر
دیکھئے جس رخ رخِ جاناں نظر آتا انہیں — عاشقی کا راستہ آساں نظر آتا انہیں
رات دن حاصل تھا گو انبساطِ دید تھا — جن کی شب ہر شب اور ہر روز روزِ عید تھا

کچھ نہ تھا متوالوں کو دنیا و ما فیہا کا ہوش
حسن و الفت کی مئے دو آتشہ اور نائے و نوش

نذرِ آتش تھی کبھی سعی و عمل کی کشت زار
خرمنِ جاں پر کبھی گرتی تھی برقِ شعلہ بار

بادۂ عیش و طرب کے خم لنڈھاتے تھے کبھی
نغمۂ عشق و ہوس کے گیت گاتے تھے کبھی

تھی عجب دلکش جہاں میں زندگانی کی بہار
موسمِ گل سے حسیں تر نوجوانی کی بہار

دولتِ دنیا سے بڑھ کر بے بہا نقدِ حیات
لعل و گوہر سے سوا سرمایۂ گنجِ کائنات

فرطِ عشرت سے نچھاور کرتے سیم و زر کبھی
آسماں سے توڑ لاتے انجم و اختر کبھی

(۳)

جادۂ راہِ محبت میں رفیقو کچھ نہیں
فرقِ مذہب کی خلیجیں اختلافِ کیش و دیں

ہے وہی موجِ ہوا آوازِ ناقوس و اذاں
سبحہ و زنار میں رشتہ وہی سلک نہاں

ایک ہے نسلِ آدمی کی ایک ہے اصل انام
مختلف قومیں ہیں گرچہ مختلف لوگوں کے نام

لذتِ ہستی ہے اک کربِ اجل بھی ایک ہے
ارثِ فطرت ورثۂ علم و عمل بھی ایک ہے

جنگ چھڑتی ہے تو زد میں آتے ہیں ماوشما
کال پڑتا ہے تو دشمن دوست کی تفریق کیا

قحط بیماری وبائیں حادثے رکتے نہیں
بر بنائے ملک و ملت زلزلے رکتے نہیں

درمیاں اہلِ دنیا سخت دیواریں ہیں یہ
واسطے مردم کشی کے تیز تلواریں ہیں یہ

یہ نہ ہوں تو خلق کی بیداد بڑھ سکتی نہیں
ظلم کی کھیتی کبھی پروان چڑھ سکتی نہیں

ہیں ہلاکت خیز انساں کے لیے یہ تفرقے
زہرِ قاتل طفلِ ناداں کے لیے یہ تفرقے

زندگانی کی نفی ہیں موت کے پیغام ہیں
چشمۂ آبِ بقا پر یہ فنا کے جام ہیں

داستانِ عشق کو خونیں بنا دیتے ہیں یہ
جرمِ الفت کو بہت سنگیں بنا دیتے ہیں یہ

زندگی کا خوف ان سے موت کا ڈر ان سے ہے
دو دلوں کے بیچ میں سدِّ سکندر ان سے ہے

(۴)

آہنی دیوار حائل سنگ بستہ بام و در
سخت زنجیر و سلاسل طوق گردن سخت تر

چشمِ ظاہر میں غمِ پنہاں نظر آتا نہیں
حجرہ و دالان میں زنداں نظر آتا نہیں

روزِ روشن کی طرح سب پہ عیاں لب کی ہنسی
جذب ہے پلکوں میں لیکن دل کے اشکوں کی نمی

گونجتے ہیں بزم میں عیش و طرب کے قہقہے
دفن سانسوں میں مگر درد و الم کے زمزمے

فاخرہ ملبوس تن پر زار روح و جان پاک
جیب و دامن ہیں سلامت سینہ و دل چاک چاک

شیوہ و دلبر و سر پھوڑنے سے فائدہ؟
زندگی نعمت ہے پھر اس کو تج دینے سے فائدہ؟

بحرِ طوفاں خیز ہے کوئی کنارا بھی نہیں ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا بھی نہیں
ہو گرفتارِ بلا جو ورطۂ گرداب میں پھر بچا سکتا نہیں کوئی اسے سیلاب میں
زندہ رہنے کی نکالو جانِ من کوئی سبیل زہر کھا کر جان دینا بزدلی کی ہے دلیل
اہلِ قوم اہلِ وطن دشمن نہیں ہیں دوستو باپ ماں بھائی بہن دشمن نہیں ہیں دوستو
چار دن کے ہیں یہ بندھن ٹوٹ جائیں گے کبھی یہ رواج و رسم ہیں چھوٹ جائیں گے کبھی
نذرِ جان و دل یہ مانا عشق کا دستور ہے زندہ رہنے پر مگر ہر ذی نفس مجبور ہے

(۵)

اُف کلیجہ منہ کو آتا ہے وہ منظر دیکھ کر وہ لباسِ زر میں دو ملبوس پیکر دیکھ کر
مسکراتے چہرے وہ جسموں پہ وہ رنگیں ردا نور کی چادر میں جیسے جلوہ گر دو مہ لقا
کیفِ ابدی نیند کا وہ نشۂ خوابِ دوام ہو میسر عاشقوں کو جس طرح وصلِ مدام
وہ عروسی پیرہن و کتخدائی کی قبا وہ نیازِ عاشقانہ وہ محبت کی ادا
وہ جمال و حسنِ صورت وہ جوانی کا نکھار وہ قیافوں کا تغافل وہ نگاہوں کا خمار
دو گلِ تازہ کھلے ہوں جس طرح اک شاخ پر دو ستارے بن گئے ہوں ایک شعلہ ٹوٹ کر
قالبِ بے جاں میں جیسے جان باقی ہو ابھی مستِ جامِ بےخودی سے چشمِ ساقی ہو ابھی
خواب میں اک سمت دم الفت کا بھرتا ہے کوئی ایک جانب دو گھڑی آرام کرتا ہے کوئی
دو گھڑی سستا رہے ہیں نوجواں دو گلبدن خاک پر سوئے ہوئے ہیں چین سے رشکِ چمن
ہاں قدم آہستہ رکھو بیدار ہو جائیں نہ وہ پاؤں کی آواز سے ہشیار ہو جائیں نہ وہ
کتخدائی کا یہ دن تھا تھی عروسی کی یہ شام حیف کس صورت سے دونوں کا ہوا نیلِ مرام

ہر زباں ساکت ہے ہر غنچہ دہن خاموش ہے
دیکھنے والوں کو کب آہ و فغاں کا ہوش ہے

حبیب تنویر

کمندِ حرف

مجھ کو مشاعروں میں بلا کر نہ دیجے داد
کیا شاعری بھی ایک کٹورا ہے بھیک کا
اہلِ کرم کے فیض سے جو نغمہ سنج ہے

رکھ دیجیے رحلِ نیچۂ نسیاں پہ سینت کر
آثارِ نقش ہائے قدیمہ کے طاق میں
اس دورِ نظمِ دہر کا یہ دفترِ غزل
طفلی کی یاد، حرفِ مقفّیٰ کی یہ لغیر
عہدِ شباب میں اسے لے کر کروں گا کیا
جانے کس کی سیج کے مسلے ہوئے پھول
ان کلیوں کے ہار بھلا کیا کروں گا میں
کیجے نہ مجھ سے آج بھی فرمائشِ غزل

اقلیمِ چشم، شہرِ غمِ دل، دیارِ روح
بن کر رہے شکارگہِ شہریارِ حرص
کچھ اس قدر بڑھا غمِ تخریبِ روزگار
میں آج حسن و عشق بھی زندانیٔ شکم
آشوبِ چشم بن گئی ہر حیرتِ نگاہ
ویران شاخِ گل ہے فسردہ دلِ مراد
کیجے نہ مجھ سے آج بھی فرمائشِ غزل

اس دشت میں ہے لیلیٔ محمل نشیں خیال
ہر شعر ایک قیس ہے صحرائے نجد میں
پابستۂ عروض گرفتارِ دامِ حرف
ہے حرف خود ہی قیدیٔ تخیلِ اہلِ فن
فن خود رہینِ منتِ سرمایہ دار ہے
سرمایہ دار اسیرِ تقاضائے زرگری
اور زرگری کے غم کا بجز مرگ کیا علاج؟

میں کون سی زباں میں کہوں مدعائے دل
پیچیدہ رازِ عشق ہے پیچیدہ تر بیاں
انداز ہی سراغِ مزاجِ دل و نظر
عنوانِ شوق ہے مگر اندازِ گفتگو

کہیے مذاقِ علم و ادب کو نگاہِ شوق
علم و ہنر کو شاہدِ رنگین و دلربا
پھر کیجے اپنی بزم کی ویرانیوں پہ غور
دنیا کے کاروبار سے فرصت اگر ملے

آنکھوں کو ہے تلاشِ جمالِ نظر فروز
جلووں کو جستجو نگہِ جلوہ سوز کی
ایسی نگاہِ شوق کہ عرفاں کہیں جسے
اندازِ دلبری کا دبستاں کہیں جسے

ہر آرزوئے دل کی نگہباں کہیں جسے
ذوقِ جمال، ذوقِ نظر، اور یہ نظام!
خود ذوقِ زندگی بھی ہے مائل بہ ابتذال
سارا نظام اسیرِ تمنائے زرگری
اور زرگری کے غم کا بجز مرگ کیا علاج

پندارِ زیست کیسۂ زر میں نہ ڈھونڈیئے
اس دورِ حرص میں جو ذرا کامیاب ہے
الزامِ وضع داریٔ دل سے ہے ماورا
محرومیوں نے مجھ کو کیا ایسا بے نیاز
میں کامراں نہ ہو کے بہت شادکام ہوا

میں کون سی زباں میں کہوں مدعائے دل
پیچیدہ رازِ عشق ہے پیچیدہ تر بیاں
اندازہی سراغِ رموزِ مزاجِ دل
عنوانِ شوق ہے مگر اندازِ گفتگو

نوکِ زباں پہ دشمنِ دل نے رکھی ہے تیغ
جلاد کی جبیں پہ تعصب کی ہے لکیر
کیا کھینچ لے گا نعرۂ دار و رسن سے روح
کیا چھین لے گا لوح و قلم سے بہار و رنگ
پلکوں سے قطرہ قطرہ لکھی ہے کتابِ زیست
ہر حرف گلفشاں دلِ بے اختیار ہے
کیوں بند ہو دریچۂ چشمِ حیرتی
کیوں کر رکے سفر نگرِ بے قرار کا

دریائے موجۂ تہِ تحت الشعور سے
لاتے ہیں علم و فن کے گہر کوہ نور سے
گوہر کا عقدِ گردنِ خوباں سے اوج ہے
سینے پہ رکھ کے اور بڑھا آب و تابِ شعر
فتراک علم و فن میں بھی نخچیر کچھ تو ہیں
اپنی نگاہ تیز سے کچھ تو شکار کر
خامے کے دل سے بھی ہے گریزاں کبھی خیال
زیرِ کمند حرف مگر حرف سے بھی دور
لیکن جو صید ہے وہ ستارہ ہے حسن کا
دل سے ڈھلک کے سینۂ قرطاس پر ہے نقش
ہے عکسِ خونِ دل سے درخشاں گلِ سخن
میں کامراں نہ ہو کے بہت شادکام ہوں

مکروہ و مبتذل بھی حسین و جمیل بھی
دکھلا رہا ہوں ہر رخِ نیرنگِ روزگار
آئینہ دے رہا ہوں زمانے کے ہاتھ میں
اے کاش بوئے ذوقِ تماشہ کسی میں ہو

اس دورِ تیز گامیٔ صنعت کی روح بھی
ہوتی ہے نکہتِ گلِ عہدِ کہن سے مست
لیکن دماغ بوئے غلامی سے تنگ ہے
کہیے نہ مجھ سے آج بھی فرمائشِ غزل
انگور سے اتار چکا ہے تو قدرِ ظرف
تاکِ فسردہ لے کے بھلا کیا کروں گا میں

اس دورِ نظمِ دہر کا یہ دفترِ غزل
طفلی کی یاد حرفِ مقفیٰ کی یہ تفسیر

رکھ دیجیے طاقِ عہدِ گزشتہ پہ سینت کر
لبوں نے نوازِ عہدِ کہن بن کے گھٹ رہے ہیں
عصرِ جدید بانگِ دہل پر ہے نغمہ سنج
سنیے بہ گوشِ روح ربابِ جنونِ نو
فردا کے مطربوں کی صدائے بلند و صاف
آہنگ کارگاہِ خرد میں ڈھلی ہوئی
سر میں جنونِ نغمۂ دار و رسن لیے
ہر تان میں اٹھائے ہوئے جنتِ خیال
سنیے بہ گوشِ روح ربابِ جنونِ نو

مجھ کو مشاعروں میں بلا کر نہ دیجیے داد
کیجیے وہ شاعری جسے کہتے ہیں زندگی
ہے مرشدِ عمل سے خیال بلند و دور
محروم نغمہ زخمۂ سازِ حیات سے
ہے حرف صرفِ حرفت و تخلیقِ اہلِ فن
فن زیرِ بارِ منتِ دربارِ اہلِ زر
اور اہلِ زر اسیرِ تمنائے زرگری
خود یہ نظام صیدِ غمِ آرزوئے مرگ
اور زرگری کے غم کا بجز مرگ کیا علاج
ہے اک طرف تو چاند کے سینے پہ آدمی
اور اک یہ ہے کہ موت کے منہ میں ہے زندگی
کم رو و مبتذل بھی حسین و جمیل بھی
دکھلا رہا ہوں ہر رخِ نیرنگِ روزگار

آئینہ دے رہا ہوں زمانے کے ہاتھ میں
اے کاش ہوئے ذوقِ تماشہ کسی میں ہو

ذوقِ جمال، ذوقِ نظر اور یہ نظام
خود ذوقِ زندگی بھی مائل بہ ابتذال
اقلیمِ روح و دل پہ ہے سوداگروں کا حکم
اور حکمراں ہیں مائلِ تخریبِ روح و دل
خود یہ نظام صیدِ غمِ آرزوئے مرگ
اور زرگری کے غم کا بجز مرگ کیا علاج

نوکِ زباں پہ دشمنِ دل نے رکھی ہے تیغ
میں کون سی زباں میں کہوں مدعائے دل
کیجے نہ مجھ سے آج بھی فرمائشِ غزل
مجھ کو مشاعروں میں بلا کر نہ دیجیے داد
کیجیے وہ شاعری جسے کہتے ہیں زندگی
بحر و عروض و حرف کی زنجیر توڑ کر
آزاد نغمۂ دل آزاد کیجیے
سنیے بہ گوشِ روح ربابِ جنونِ نو
فردا کے مطربوں کی صدائے بلند و صاف
خود یہ نظام صیدِ غمِ آرزوئے مرگ
اور زرگری کے غم کا بجز مرگ کیا علاج

نریندر لوتھر
بندی نریندر لوتھر

(نشری مباحثہ)

صنفِ نازک کون؟

ن: لیڈیز فسٹ۔ آپ ہی شروع کیجیے نا۔

ب: یہ خوب چال ہے آپ کی۔ جس مسئلے پر بحث کے لیے ہم یہاں آئے ہیں اس کا تصفیہ آپ اپنے منہ تھوڑا ہی کر سکتے ہیں۔ پہلے آپ۔

ن: جی نہیں۔ پہلے آپ۔

ب: اس "پہلے آپ پہلے آپ" میں تو گاڑی چھوٹ جاتی ہے۔ اگر آپ کو گھبراہٹ ہوتی ہے تو میں ہی شروع کر دیتی ہوں۔ لیکن بہتر ہے کہ لیڈیز فسٹ قسم کی اصطلاحوں سے آپ احتراز کریں۔

ن: ضرور جو ارشاد۔ فرمایئے کیا خیال ہے آپ کا اس نازک مسئلہ پر۔

ب: پہلے آپ ہی فرمایئے کہ اب دشمنوں کی طبیعت کیسی ہے؟

ن: کیا مطلب آپ کا؟

ب: مطلب صاف ہے۔ روز زکام اور کھانسی اور بخار ہو آپ کو اکثر رہتے ہیں کیا حال ہے ان کا — اب کیا حال ہے آپ کا؟

ن: [illegible]

ب: تعلق تو صاف ظاہر ہے . . . . .

ن: اچھا تو ان باتوں سے آپ یہ جتلانا چاہتی ہیں کہ نازک کون ہیں؟ بھئی واہ کیا وکیلانہ جرح شروع کی ہے۔ ہماری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے ورنہ ظاہر ہے آپ کا سامنا کرنے کی جرات کیسے کر سکتے اور وہ بھی جب اتنے لوگ سن رہے ہوں۔ اچھا کہیے آپ کو ہمارے فرنچ ٹوسٹ پسند آئے تھے؟

ب: کون سے فرنچ ٹوسٹ؟ آپ کہاں سے لے گئے بات کو؟

ن: ارے وہی فرنچ ٹوسٹ جو ہم نے آپ کے ناشتہ کے لیے بنائے تھے۔ پچھلے مہینے کی ہی تو بات ہے بھول گئیں اتنی جلدی؟

ب: (ہنستے ہوئے) ارے وہ ہاں ہاں وہ میں بھول سکتی ہوں؟ اتنے جلے ہوئے ٹوسٹ تو میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں کھائے تھے۔

ن: واہ صاحب یہ بھی خوب رہی۔ اس دن تو آپ تعریف کرتے نہیں تھکتی تھیں اور آج — ہاں بھئی ضرورت کی بات ہوتی ہے۔ بالکل جب خود بیمار ہوں گھر میں لوگ رہ ہو، تو بیچارہ خاوند ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

ب:۔ اس دن پتہ تو لگ گیا ہوگا آپ کو کتنا کام کرنا ہوتا ہے ہم لوگوں کو۔ غالباً اس دن آپ کو کھانا پکانا نہیں پڑا تھا۔

ن:۔ کھانا تو میں ایسا بناتا کہ بس سب باورچی خانے بھول جائیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ شادی سے پہلے تو ہم اپنا کھانا خود ہی بناتے تھے۔

ب:۔ اور برتن کون صاف کرتا تھا؟

ن:۔ (ہنستے ہوئے) اس کے لیے ہم نے کتا رکھ چھوڑا تھا

ب:۔ کتا ؟

ن:۔ جی ہاں کتا۔ وہ سب پلیٹیں اور برتن چاٹ کر صاف کر دیتا تھا۔ ہم ان کو صرف ایک بار گرم پانی سے دھو لیتے تھے۔ اور بس . . . .

ب:۔ (ہنستے ہوئے) آئیڈیا تو بڑا زبردست تھا۔ اور گھر کی صفائی وغیرہ کون کرتا تھا؟

ن:۔ وہ تو ہم چار دوست جو اکٹھے رہتے تھے باری باری سے کر لیتے تھے۔

ب:۔ تو کبھی یہ بھی سوچا آپ نے کہ وہ کام جسے آپ، آپ کا کتا اور تین اور دوست مل کر کرتے تھے اب اس سے کہیں زیادہ کام اکیلے کون کرتا ہے ؟

ن:۔ ہم سب لوگ۔

ب:۔ واہ صاحب یہ بھی ایک ہی رہی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ اور آپ کے صاحبزادے کام پیدا کرتے ہیں اور آپ کی باندی یہ نیچیز، ان سب کاموں کو کرتی رہتی ہے۔

ن:۔ یہ تو آپ کی خوش قسمتی ہے۔

ب:۔ وہ تو خیر ہے ہی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کام کرنا تو نزاکت کا ثبوت نہیں ہے۔ جو دن رات کام کرے، بیل کی طرح جتا رہے اسے کیا آپ صنف نازک میں شامل کریں گے؟

ن:۔ گھر کا کام کاج تو مقابلتاً نازک ہی ہوتا ہے ذرا خیال کرو کہ بیچارے مرد کو کیا کیا جان جوکھم کا کام کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا مزدور اور بڑے سے بڑا افسر، کسان اور تاجر، سپاہی اور دکان دار، وکیل اور ڈاکٹر، انجینئر اور سیاست داں کسی کو بھی لے لو، خون پسینہ ایک کر کے ہی زندگی بناتا ہے۔ اور عورت . . . گھر کی چار دیواری میں راج کرتی ہے، کیا مقابلہ دونوں میں ؟

ب:۔ اجی صاحب کوئی نئی بات کہیے یہ دلیل تو بہت پرانی ہے۔ آج کل کوئی پیشہ ایسا نہیں جس میں عورت مرد کے شانہ بشانہ کام نہ کرتی ہو، اور جو عورتیں گھر میں آپ کے لفظوں میں "راج" کرتی ہیں وہ بھی مشقتی قیدی کی طرح کتنا کام کرتی ہیں۔ آپ ہی اس دن بتا رہے تھے نا کہ امریکہ میں ریسرچ کی گئی ہے جس سے پتہ چلا ہے کہ عام گھریلو عورت دن میں تقریباً تین میل کے برابر فاصلہ طے کرتی ہے۔ مرد سے زیادہ کام کرتی ہے اور عمر بھی مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔

ن:۔ بھئی امریکہ تو میں گیا نہیں، لیکن . . . .

ب:۔ اور پھر عورتیں اور سب کام بھی کیوں نہ کریں؟ کئی مخصوص کام ایسے ہیں جو صرف وہی کر سکتی ہیں اور ہر حال میں انھیں کو کرنا پڑتے ہیں

ان میں مردانِ کار کبھی بھی ہاتھ نہیں بٹا سکتے۔

ن:۔ مثلاً۔۔۔۔

ب:۔ مثلاً بچے جننا۔۔۔۔۔

ن:۔ جی یہ کام تو واقعی ہمارے بس کا نہیں، اور شکر ہے کہ یہ کام ہمارے لیے ناممکن ہے ورنہ کسی نہ کسی طریقے سے آل انڈیا ویمنس کنونشن میں ریزولیشن پاس کر کے یا وزیراعظم تک پہنچ کر یا الیکشن لڑ کے یا اسٹرائک کر کے عورتیں یہ کام بھی مردوں ہی کے سپرد کر دیتیں۔

ب:۔ ہاں پھر تو واقعی آپ کی دلیل مانی جا سکتی کہ سب مشکل کام مرد ہی کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھئے اب پھر آپ پکڑے گئے۔ اگر واقعی آپ مانتے ہیں کہ عورت ہر سخت اور غیر دلچسپ کام مرد کو سونپ رہی ہے تو پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ صنف نازک نہیں بلکہ صنف "کثیف" ہے۔

ن:۔ یہ تو آپ بات دوسری طرف لے گئیں۔ زیادتی اور ناانصافی بھی تو نزاکت کا ایک جزو لازم ہے۔ عورت کی نزاکت نے ہمیشہ مرد کو تڑپایا۔ ہماری سب شاعری سب افسانے، سب لٹریچر اسی بات کی رہینِ منت ہیں۔

ب:۔ خیر تڑپنے تڑپانے کی بات تو دوسری ہے۔ وہ تو "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی" اور پھر آپ تو جانتے ہیں "دیار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ" اس سے تو زندگی ہے۔

ن:۔ اب آپ شاعروں کی مدد لینے لگیں تو پھر میرؔ کو بھی سنیئے اس نے آپ ہی لوگوں کے متعلق کہا تھا

"کیا نزاکت ہے کہ شاخِ گل سے توڑا کوئی پھول
آتشِ گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں"

ب:۔ یہ تو شاید اس شہزادی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے جسے بیس گدوں کے نیچے پڑا ہوا مٹر کا دانہ اتنا چبھ رہا تھا کہ اس کے جسم پر نشان پڑ گئے اور رات بھر اسے نیند نہ آئی۔

ن:۔ جی ہاں وہ بھی عورت ہی تھی، اور آپ جانتی ہیں کہ پرانوں کے مطابق عورت کیسے بنی۔۔۔۔۔
قدرت نے چاند کی گولائی، بیلوں کے کومل خم کی گرفت، گھاس کی لرزش، کائی کی نرمی، پھولوں کی شگفتگی، پتوں کا ہلکا پن، ہاتھی کی سونڈ کی مخروطیت، ہرن کی آنکھیں، سورج کی کرنوں کی تمازت، بادلوں کا رونا، ہواؤں کی تلون مزاجی خرگوش کا ڈرپوک پن، مور کی خود بینی، طوطے کے سینے کی ملائمت، پتھر کی سختی، شہد کی مٹھاس، شیر کا ظلم، آگ کی گرمی، برف کی ٹھنڈک، پرندوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوک، شترمرغ کی ریاکاری، چکور کی لگن ـــــ ان سب عناصر کو ملا کر عورت کو بنایا اور پھر اسے مرد کو سونپا۔

ب:۔ کتنا خوش قسمت ہے مرد جس کو یہ جنس نایاب ملی۔

ن:۔ جی ہاں بے چارہ خود تو صرف خاک کا پتلا ہے۔

ب:۔ اتنی تعریف اور خوشامد کے لیے شکریہ، لیکن کوئی دلیل بھی دیجئے نا، اس سب تعریف میں نزاکت کا تو کہیں نام و نشان نہیں۔

ن:۔ اگر اتنی صفات کے مرکب میں بھی نزاکت نہ پائی جائے تو پھر نہ جانے دنیا میں نزاکت کہاں ملے گی۔۔۔۔

...... نزاکت کوئی ٹھوس چیز تو ہے نہیں کہ بتا دیں صاحب وہ پڑی ہے نزاکت۔ میرے نزدیک تو ایک کیفیت کا نام ہے جو ہمارے خیال میں عورتوں میں ہی پائی جاتی ہے اور پھر ویسے بھی قواعد کی رو سے نزاکت مونث ہے مذکر نہیں۔

ب :۔ قواعد کی رو سے تو بہادری، دلیری، سفاکی، ہمت، دیانتداری، پاکیزگی سب صفتیں مونث ہیں لیکن یہ تو کوئی دلیل نہیں۔

ن :۔ میرا خیال ہے کہ نازک ہونا کوئی بری بات نہیں۔ نہ جانے آپ کو یہ ماننے میں کیا اعتراض ہے۔ نزاکت تو برتری کی علامت ہے۔ انسان بجائے خود جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے بربریت سے انسانیت کی طرف بڑھتا نزاکت ہی تو پیدا کرتا ہے۔

ب :۔ خیر اگر آپ کہنا چاہتے ہیں کہ جیسے مرد لنگور سے زیادہ نازک ہے ویسے ہی عورت مرد سے زیادہ نازک ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن جب آپ نزاکت اور کمزوری کو ایک ہی چیز سمجھنے لگتے ہیں تو ہم آپ سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ ہم "عورت" سے صدیوں سے کی جانے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے ہیں عورت اب کمزور نہیں۔ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔

ن :۔ بھئی آج کل تو قوموں کے لیڈر امن کی نشانی کے طور پر فاختہ اڑاتے پھرتے ہیں تو بیچارے خلیل خاں کو فاختہ کہاں سے ملے گی۔ وہ غریب پتنگ بھی نہیں خرید سکتا وہ کیا اچھے دن تھے جب مرد باہر کام کرتا تھا۔ عورت گھر کا خیال رکھتی تھی، بچے آپس میں کھیلتے تھے اور خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اس وقت عورت کی نزاکت اس کے لیے باعث فخر تھی باعث شرم نہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ نزاکت کے الزام سے بچنے کے لیے عورت گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔

ب :۔ یہ تو آپ بحث کے موضوع سے دور ہوتے جا رہے ہیں عورتوں کی آزادی کی تحریک کا رجحان آپ کو پسند نہیں یہ دوسری بات ہے، لیکن اس وقت تو ہمیں حقائق کو دیکھنا ہے انگریز بھی ہندوستانیوں کو آزادی دینے سے پہلے نالائق سمجھتے تھے، لیکن اب دیکھئے ہم کیسے اپنا کام چلا رہے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ انگریز ہندوستانیوں سے کہا کرتے تھے کہ آپ آزادی کے قابل نہیں اور آپ بڑے چاپلوسانہ انداز میں ہم لوگوں سے کہا کرتے ہیں کہ آزادی ہمارے قابل نہیں۔

ن :۔ یہ تو بڑی نازک خیالی دکھائی آپ نے۔

ب :۔ پھر وہی نزاکت کی بات۔

ن :۔ اچھا تو آپ "صنف نازک" سے تعلق نہیں رکھتیں۔

ب :۔ بالکل نہیں!

ن :۔ تو چلیے اٹھیے......

ب :۔ کہاں؟

ن :۔ ذرا میری موٹر کو دھکا لگا دیجئے۔ اس کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔

ب :۔ ارے واہ! ایسا کام بھی کبھی لیڈیز کرتی ہیں؟

جوگندر پال

(نیروبی سے)

دوبارہ

نصف شب کے اندھیرے میں کشن سنگھ اپنے بستر سے اٹھا تو اس کی بوڑھی ماں کی کمزور نظریں کانپ کر اسے تھامنے لگیں، جیسے اپنی گود سے ایک خوابیدہ پھول گرتا ہوا محسوس کر کے کوئی بوڑھی ڈالی اونگھتی چونک پڑی ہو اور لرزاں آنکھوں سے پھول کو سنبھال لینا چاہتی ہو۔

باہر آنگن میں ٹھٹھری ہوئی چاندنی نے کشن سنگھ کے کپکپاتے چہرے میں جانے کیا بھانپ کر بے اختیار چلانا چاہا۔ "چو — ر!" مگر کشن کی ماں کے سائے نے پشت سے آکر فوراً اس کا منہ باندھ لیا۔ "چپ!"

کشن نے بڑے ہولے سے اپنی بیوہ بھابی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

بیوہ اور برہن کی نیند بڑی کچی ہوتی ہے۔

"کون؟"

دروازہ کھلا۔

"میں" کشن نے بڑی بے قرار دھیمی آواز میں جواب دیا۔

کشن کی ماں نے اپنی سراسیمگی دبا کر بیٹے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن وہ اپنی عینک بستر پر ہی بھول آئی تھی۔

"تم — ؟!" (کون ؟)

عالم بیداری میں بھابی کی کھلی کھلی آنکھیں یوں ہی لگتیں گویا سپنوں میں بھٹک رہی ہیں برہن کی آنکھیں!

"ہاں، میں!"

بڑھیا نے دل ہی دل میں جپ جی صاحب کا پاٹھ کرتے ہوئے ان کی جانب بہ استعجاب دیکھا اور ان کی شکلیں بڑی دھندلی پا کر اپنی عینک لانے کے لیے بستر سے مڑ گئی۔

"نہیں، تم تو اپنے کشن ہو۔ میں تو سنانے میں آ گئی تھی جیسے — جیسے سچ مچ — " مگر جاگا ہوا انسان اپنے دل کی بات تھپک کر باندھ کر دل ہی میں تہ ڈبو دے تو اس کا منہ غوطے کھانے لگتا ہے۔

"پوہ کی پالا رات ہے بابا، اس طرح اپنے بستر سے کیوں نکل آئے ہو؟" بھابی کو اپنا دیور بڑا پیارا تھا۔

"ننگے سر۔ ننگے پاؤں ۔ یہ پتلی سی قمیص ۔ تم باؤلے تو نہیں ہو گئے ہو؟"

"ہاں ۔ !"

ہاں ۔ !" بھابی نے محبت آمیز خفگی سے اپنے دیور کی نقل اتاری اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر اندر کھینچ لیا۔ "چلو اندر آکر بات کرو۔"

اندر آکر کشن دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے ایک چوبی تخت پر بیٹھ گیا جہاں بھابی گرنتھ صاحب کے پانچوں پاٹھ جپا کرتی تھی۔

"اب بولو، ایسا کون سا کام آن پڑا ہے جو اس وقت بھابی کے کمرے میں آدھمکے ہو؟" اس نے کشن کے شانوں کو ایک بھاری کمبل سے لپیٹ کر پوچھا۔ "اگر ذرا صبر سے کام لیتے تو صبح تک میں بھاگ تو نہ جاتی۔"

"میں ۔ مجھے تم سے بڑا پیار ہے بھابی۔"

"ہہ ہہ ہا ۔ ہہ ہہ ہا ۔" بھابی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اپنا بدن چارپائی پر گرایا تو چارپائی کی انتڑیاں چیں چیں کر کے لگاتار ہنستی ہنستی ٹوٹنے لگیں۔

"صرف یہ کہنے کے لیے اس وقت اپنے بستر سے دوڑ آئے ہو ۔ ہہ ہہ ہا ہہ ۔ ہہ ۔ پگلے یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔"

"بھا ۔ بی !"

"میں بھی تم سے بے حد پیار کرتی ہوں کشن۔" وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پاس تخت پر آبیٹھی، مانو کوئی بوڑھی ماں عالمِ تصور میں اپنے ننھے منے لاڈلے کا مستقبل کا نوجوان پیکر دیکھ رہی ہو اور اس پر ریجھ ریجھ کر از سر نو بے حد حسین اور نوجوان نکل آئی ہو۔"

"میں تمھیں بھابی کی طرح محبت کرتا ہوں بھابی۔" وہ بھابی کے قریب سرک آیا۔

بھابی نے اُس کے ماتھے کی لٹ پرے ہٹانے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا لیکن یہ وہیں رکا رہ گیا۔

"اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنی نہائی تالوں سے چھپائے رکھنے کی پرتگیا کر رکھی تھی لیکن تم میرے لیے بڑی سے بڑی پرتگیا سے بھی زیادہ پوتر ہو، زیادہ قیمتی ہو۔ میری بن جاؤ بھابی، تم ہو ہی میری۔"

"کشن سنگھ !" بھابی نے کڑک کر کہنا چاہا، لیکن نوجوان بیوہ کی زبان تو کچھ ہوتی ہی ہوتی ہے۔

"کشنے !" دروازے کے باہر کشن سنگھ کی ماں کے سائے نے بے قابو ہو کر پکارنا چاہا، مگر سائے تو بے زبان ہوتے ہیں۔

"تم میری ہو، بھابی۔ کنوئیں کا پانی دھرتی کا ہی ہوتا ہے، اس کی تہوں سے نکلتا ہے تاکہ اس کا سوکھا منہ دھو دے۔ مجھ میں اب اور زیادہ برداشت نہیں رہی۔ میں نے تمھارے پیار کو پورے تین سال قیدی بنا کر رکھا ہے مگر اب یہ قیدی مجھ سے اپنی آزادی مانگ رہا ہے۔ اور اگر میں نے اب بھی تمھارے پیار کی یہ خواہش سلب کرنا چاہی تو یہ

وحشی ہو کر میرا گلا گھونٹ دے گا، تمہارا کشن سنگھ مر جائے گا بھابی!"

چاندنی کے سکوت میں کشن کی بوڑھی ماں کا سایہ کانپ کانپ کر دیواروں کے کان مروڑنے لگا۔ "اگر دنیا نے سن لیا تو کیا کہے گی؟!"

"بھابی، جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میری یہ خواہش سنگ گراں بن کر بڑے گہرے پانیوں میں ڈوب گئی تم نہیں جانتیں کہ میں ہی تمہارا مالک ہوں۔ میں ہی اپنا سورگیہ بھائی ہوں۔"

"بھابی، میں تم پر اپنا ایک بڑا گہرا راز کھول رہا ہوں۔ دراصل یہ راز تمہارا بھی اتنا ہی ہے جتنا میرا۔ جب میں بھیا کی موت کے بعد پردیس سے لوٹا اور تمہیں پہلی بار دیکھا تو پتہ نہیں ـــــ پتہ نہیں مجھے کیا ہوا مجھے یوں لگا ـــــ نہیں، لگا نہیں بلکہ ہوا ہی یوں، میری نس نس میں بھیا کی روح داخل ہو گئی۔ میں ہی اپنا سورگیہ بھیا ہوں بھابی۔"

"یقین کرو بھابی، میری باتوں کو دھیان سے سنو۔ بھیا کی محبت والہانہ تھی۔ وہ اپنی موت کے بعد بھی اس گھر کی چاردیواری میں منڈلاتے رہے، تمہاری خالی خالی جھولی دیکھ دیکھ کر تڑپتے رہے کہ کسی طرح اسے پھر اپنی محبتوں سے سرلبر لا دیں اور پھر میں پردیس سے لوٹ آیا۔"

"اگر تم نے میری باتوں پر وشواس نہ کیا تو مر کر بھی بھیا سے جدا رہو گی بھابی۔ ساؤں (قسم) واہگورو کی، میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ میرا ایک ایک شبد (لفظ) امرت بانی کی طرح سچا ہے۔ اپنے سچے گرو بھائی کی آتما میرے اندر موجود ہو تو میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں؟"

"پردیس سے لوٹتے ہوئے مجھے تمہارا رتی بھر بھی خیال نہ آیا تھا۔ میں بھیا کے بارے میں سوچتا رہا اور نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا، پر تمہارا خیال مجھے بھول کر بھی نہ آیا۔ میں نے تو ابھی تمہارا فوٹو بھی نہ دیکھا تھا ـــــ اور پھر میں تانگے سے اتر کر اپنے گھر کی چوکھٹ پر کھڑا ہوا، اور تم نے دروازہ کھولا اور تمہاری طرف تکتے تکتے اصل میں میں تمہیں نہیں تک رہا تھا بلکہ بھیا کی روح سے بغلگیر تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو بھیا کی روح میرے انگ انگ میں رچ بس چکی تھی، اور مجھے معلوم ہوا کہ تم ودھوا نہیں ہو، سہاگن ہو!"

دروازے کے باہر کھڑی کشن سنگھ کی ماں کو لگا کہ آواز کشن سنگھ کی نہیں اس کے .... مرحوم بیٹے بچن سنگھ کی ہے۔ یہ آواز ـــــ جیسے آسمان میں چھپا ہوا ساون سر نکالتا ہے تو برستا ہی چلا جاتا ہے۔

"بی بی، بچن ہمارا اول تو بولتا ہی نہیں۔" کشن سنگھ کا مرحوم باپ اکثر بڑھیا سے کہا کرتا۔ "پر کبھی بولتا ہے تو من میں اس کی بات اس طرح اتر جاتی ہے جیسے اپنے گرنتھی جی مہاراج کی بانی۔"

کشن سنگھ کی ماں نے لپک کر کمرے کے اندر جانا چاہا مگر چاندنی نے سحر پھونک کر اس کے بے چین سائے کو سب اطراف سے گھیرے میں جکڑے رکھا۔

"بھابی" اندر بدستور کشن سنگھ کی ماں کا بچن سنگھ بول رہا تھا۔ "ذرا سوچو تمہیں میرے بھائی کی محبت سے

بجتا ہے یا اس کی مٹی کے بُت سے۔ سچ مانو میری چاہ بھیا بچن سنگھ کی چاہ ہی ہے، اور جب تک انسان کی چاہ نہیں مرتی، انسان بھی نہیں مرتا۔ بھیا زندہ ہیں! بھیا زندہ ہیں بھابی! میرے پیار کو ٹھکراؤ گی تو اپنے پتی کے پیار کو ٹھکراؤ گی ۔۔۔ میں ہی تمھارا شوہر ہوں بھابی!"

کشن سنگھ نے اپنی لٹکی ہوئی بائیں مونچھ کو دائیں ہاتھ کی پشت سے اوپر کی طرف جھٹکا تو بھابی کی خالی سونی باہوں پر گویا سہاگ کا چوڑا جھن جھن بج اٹھا۔

"آپ اپنی مونچھیں نکھار کے کیوں نہیں رکھتے ہو؟" اسے ہمیشہ اپنے پتی سے یہ شکایت رہی۔

"میں تو یہ چاہتا ہوں۔" اس کا پتی اسے اپنے فولادی بازوؤں میں لے کر جواب دیتا "کہ میرا سارا نکھار سب خواہشیں اور چاؤ تمھارے کول بدن کو سجائے رکھیں۔ میرا اصل نکھار تو تم ہو۔"

وہ اپنے پتی کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکا کر ہنس پڑتی خوب ہنستی، جیسے لسّی کی ڈھانپی ہوئی کوری چاٹی میں مکھن کا پیڑا تھمی تھمی ناچ رہا ہو۔

"بھابی، چاہ کا کوئی روپ نہیں ہوتا، روپ تو صرف روپ کا ہی ہوتا ہے، مجھے بلاجھجک قبول کر لو بھابی رسم و رواج کے جھوٹ موٹ کے دھوکے میں نہ آؤ!"

"میں بہت بول رہا ہوں۔ ہے نا؟ پر میں کروں بھی کیا؟ اتنا عرصہ منہ پر تالا لگائے رکھا۔ میری خاموشی جانے تم سے کیا کیا کہنے کا جتن کرتی رہی، میرے بول تمھارے کانوں کی مرکیاں بن کر جھولنے کے لیے چپ چاپ رکے رہے۔ میں ڈرتا رہا کہ ایک بار تمھاری آنکھوں سے گر گیا تو اتنی بلندی پر کیسے پہنچ سکوں گا۔ میری محبت نے آج بہت بڑا حوصلہ دکھایا ہے بھابی۔ اسے قبول کر لو، اسے شرمسار نہ کرو، ورنہ انت میں تمھیں خود بھی شرمسار ہونا پڑ جائے گا۔ واہگورو کی سیاؤں، اگر تم نے مجھے قبول نہ کیا تو میں سدا کے لیے چپ سادھ لوں گا، نہ میرے ہونٹ ہلیں گے، نہ آنکھیں بولیں گی، نہ قہقہے نہ آنسو ۔۔۔۔ ساؤں سچے بادشاہ کی!"

بھابی کو یاد آیا کہ بچن سنگھ کو اس سے کوئی بات منوانی ہوتی تو جھٹ واہگورو کی قسم کھا لیتا اور وہ بے چاری لاچار ہو کر رہ جاتی۔

"کہو بھابی!"

باہر کشن سنگھ کی بوڑھی ماں کا لرزاں سایہ بے قرار ہو گیا اور پورے زور سے چاندنی کی ساحرانہ گرفت سے اچھل کر کمرے کے اندر آ گیا۔

کشن سنگھ کی ماں نے دیکھا کہ بھابی کی آنکھوں سے چشمے ابل رہے ہیں، جیسے اس کی بالائی پشت پر لٹکی ہوئی تصویر میں شو جی بھگوان کی جٹا سے پانی کی ایک موٹی دھار پھوٹ رہی تھی اور اس دھار سے پہاڑوں میں رواں لکیریں بن گئی تھیں۔

"کہو بھابی!"

اور بھابی شیو بھگوان کی پوتر دھار کے نیچے نہاتی رہی۔

"رام کورے، بیٹی، یہ مورکو ہوش میں نہیں ہے۔"

"بھا — بی!"

"بیٹی، آج اسے پھر وہی پرانا دورہ پڑا ہے، نیند میں چلنے کا دورہ۔ یہ سویا ہوا ہے!"

"سویا ہوا ہے؟" بھابی کا دل تیز تیز دھڑک کر ایک سانحے کے لیے رکا اور پھر بے تحاشہ اس کے منہ کو دوڑ آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بھا — بی!"

کشن سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کر بھابی پر جھک گیا اور اس کا ہاتھ بھابی کے بھیگے بالوں میں سنہری جھومر بن کر جھولنے لگا۔

"بیٹی" ممتا نے اپنی بہو کے آگے جھولی پھیلا دی۔ "میں تم سے اپنے بیٹے کی جان کی بھیک مانگتی ہوں بہو۔ اسے معاف کر دو!"

بھابی نے اپنی ہچکیاں روک کر سر اٹھایا اور نہایت آہستگی سے کشن سنگھ کو سہارا دے کر اپنی چارپائی پر لٹا دیا۔

اس کی سانس دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

"بڑی گہری نیند سویا پڑا تھا بیٹی، سوتے سوتے اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے تو میں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لینا چاہا مگر پھر ڈاکٹر کی بات کا خیال آگیا۔ دماگ کو کہیں جھٹکا لگ جاتا اور اس کی آنکھ کھل جاتی تو جان کا خطرہ تھا۔" ماں اپنے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

"بیچارے پہ ترس کھاؤ۔ اسے کیا پتہ، یہ کیا کہہ رہا ہے۔"

کشن سنگھ بھابی پر ٹکٹکی باندھے سویا پڑا تھا اور بھابی اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

"نہیں ماں جی، کشن سنگھ اس وقت پورے ہوش میں ہے، جاگ رہا ہے۔" اس نے کشن سنگھ کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے شاید اسے جھنک دینے کے لیے!

"نہیں! نا بیٹی، رام کورے!" کشن سنگھ کی ماں نے اسے فوراً روک لیا۔ "اس تراں اس کے دماگ پر جرب آجائے گی۔"

دفعتاً کشن سنگھ آنکھیں موندنے لگا اور بھابی کی آنکھوں کے سامنے بچن سنگھ کا آخری سماں گھوم گیا۔

"بولو! بولو جاگو!" بھابی نے گھٹنوں پر جھک کر مرنے والے سے فریاد کی تھی۔ "بو — لو!"

اور اب پھر بھابی کی آنکھوں میں وہی بے بسی کی سی منت سماجت متشکل تھی۔ "ماں جی اپنے بیٹے کو سونے نہ دیں اسے جھنک دیں ماں جی۔ اگر یہ اب کے بھی سو گیا تو ساڈوں واہگورو کی یہ ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لے گا۔ اسے جاگا رہنے دیں نہیں تو یہ مر جائے گا — میرے لیے مر جائے گا۔"

چند ساعتوں کے بعد سہاگن نے کشن سنگھ کے ساکت و خوابیدہ وجود کی طرف نظر اٹھائی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک بار پھر بیوہ ہو گئی!

محمد عمر میمن

صبح دم کوئی اگر...

ابھی ابھی سورج ڈوبا تھا اور ایک پگھلی پگھلی سی ارغوانی روشنی ہری بیلوں، لمبے زرّین پتّوں اور سوکھی ہوئی مٹی سے کھیل رہی تھی۔

اور روح کا وہ سدا مہکتا ہوا تازہ تازہ زخم .... انھوں نے کبھی اسے چھونے کی ہمت تک نہ کی۔ ہاں، کم از کم ایک دوسرے کی موجودگی میں انھوں نے کبھی اسے چھونے اسے محسوس کرنے سے احتراز کیا۔

کتنی ہی بار اس نے چاہا بھی تھا، ان زخموں کو کرید دے، لیکن ہر بار بے کس لڑکی کے چہرے پر پھیلی غم انگیز دھند نے اسے باز رکھا ـــ وہ کبھی بھی ایسا نہ کر سکا، اور کتنی ہی بار یوں بھی ہوا، وہ احمق، پاگل سی، ضدی، سرکش لڑکی جس کے قرب دلنواز میں صبحوں کی تازگی کا احساس ہوتا۔ یوں بیٹھے بیٹھے از خود رفتہ سی ہو کر، ماحول سے بے خبر اس اجنبی کے خیال میں گم ہو گئی تو اس سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ اسے اپنی دنیا میں بھی کھینچ لاتا .... پر خواب سے جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی سکت اس میں نہ تھی۔

وہ دونوں آتش دان کے نزدیک بیٹھے ہیں جس میں لکڑیاں چٹخ چٹخ کر راکھ ہو رہی ہیں۔ لکڑیاں تک جب جلتی ہیں تو اپنی چٹخ سے آس پاس کے لوگوں کو اپنا درد سمجھا دیتی ہیں، لیکن اس کا دل تو اتنی خاموشی، اتنی آہستگی راز داری سے ٹوٹا ہے کہ آواز تک نہیں آئی۔ وہ کچھ بُن رہی ہے اور وہ اخبار کے مطالعے میں غرق ہے۔ اچانک اس نے بُننا بند کر کے دور خلاؤں میں بے مقصد گھورنا شروع کر دیا جیسے یک لخت کوئی بھولی بسری کہانی پھر یاد آ گئی ہو۔ وہاں دور خلاؤں کے جھروکوں کی اوٹ سے کوئی محبوب چہرہ جھانک رہا ہو۔ کوئی محبوب چہرہ اس کی یادوں کے دامن میں مسکراتے ہوئے ڈولنے لگا ہو۔ لیکن وہ کیسے یوں مسلسل ٹکٹکی باندھے تکے جا رہی ہے؟ کیا پھر وہی مانوس گہری رنگت کے بالوں اور سخت چمکیلی آنکھوں والا اجنبی لوگوں کے اژدحام سے نکل کر یوں چپکے سے سامنے آ گیا ہے کہ بنا دیکھے چارہ ہی نہیں؟ کیا وہ اسے کبھی بھی نہ بھول سکے گی؟ نہیں، شاید نہیں! وہ اس کی دنیا سے کبھی بھی نہ روپوش ہو سکے گا، ہاں کبھی بھی نہیں! وہ تو ان دریچوں کو بند کرنا ہی بھول گئی ہے جہاں سے اس کی یاد کے نکل آنے کا احتمال ہے۔ اور اب اٹھ کر مقفل کر دینے کی اس میں تاب نہیں۔ ذہن میں ایک پُراسرار وجیہ شخصیت کا ہیولیٰ ابھر کر اب بھی ناچ رہا ہے۔

وہ ـــ جو برسوں پہلے، بڑی آہستگی سے دبے پاؤں غیر محسوس طریقے پر اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ وہ ـــ

اس کے ایوانوں میں چپکے سے نکل آنے پر باز نہیں رہ سکے گا۔ وہ وقت شاید کبھی نہ آسکے، جب وہ دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں تنہا رہ سکیں! یہ تیسرا آدمی پہلے ہی سے ہمیشہ وہاں موجود ہوگا، اپنی اسی مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ! اور وہ۔۔۔۔ وقت کی محرابوں تلے، نیم دیوانی، آشفتہ سر، سرگرداں ہی رہ جائے گی، وہ کبھی بھی اس کی یاد کو اپنے دامن سے نہ جھٹک سکے گی۔

اور یہ۔۔۔۔ جو اس کے جسم، اس کی روح کا۔۔۔۔ یہ بھی جانتا ہے۔۔۔۔ وہ اجنبی ہے! یوں ہی بلا اجازت اس کے تصورات، اس کی دنیا میں گھس آیا ہے۔ لیکن وہ اسے یہ ہرگز نہیں بتائے گی، وہ اپنی روح کا ایک حصہ، اپنی زیست کے چند لمحات وہ پہلے ہی، بہت پہلے ہی کسی کے حضور معنون کر چکی ہے۔ ایک راز! وہ اس کے لیے بہت کچھ ہے، سب کچھ ہے۔ اور یہ۔۔۔۔

وہ یک لخت چونک کر اپنی دنیا میں آگئی اور اس کی جانب بڑی غیر یقینی، شدید اضطراب اور شک سے دیکھ رہی ہے، کہیں اس نے ان سوگوار آنکھوں کی پرنم دھند کے عقب میں جھانک کر اس کا راز تو نہیں پا لیا ہے؟ روح کی بیکلی تو نہیں محسوس کر لی ہے؟ نہیں وہ تو اخبار میں گم ہے۔ یک لخت وہ سر اٹھاتا ہے تو دونوں کی نظریں مل جاتی ہیں۔ وہ مسکراتی ہے! ایک مسکراہٹ جو اپنے جذبات چھپانے کے لیے اس کے لبوں پر مچل اٹھی ہے۔ اور پھر پسندیدہ نرم پھول آپ ہی آپ مرجھا گئے ہیں۔ جھلس کر رہ گئے ہیں! محبوب چہرہ! وہ تو کب کا جا چکا ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں۔ اور اس کی وجیہ شخصیت کے سائے دیر ہوئی ڈول کر معدوم ہو چکے ہیں۔ اور اب تو زندگی کی تنہائیاں اور حبیب رہگذار اس کے آگے تا حد نگاہ منہ پھاڑے لیٹی ہیں۔

اور کتنی ہی بار یہ بھی ہوا کہ اس نے سوچا شاید یہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اس نے اس دکھیا لڑکی سے شادی کی۔ ایک ایسی لڑکی سے جس کے تصور میں جو پیکر ہے وہ اس کا تو نہیں! اس پیکر کو وہ دیوانگی کی حد تک پوجتی ہے۔ شاید وہ اسے کبھی نہ بھلا سکے گی۔ کبھی بھی نہیں!

یہ احمق، گمڑیا لڑکی ۔۔۔ آخر وہ اسے کیوں اتنی دیوانگی سے پسند کرتا ہے؟ اس کی یادوں کی ڈولتی چلمن تلے جو عکس ہے وہ اس کا اپنا تو نہیں! اور یہ جان کر بھی کہ وہ کسی اور کو اس قدر والہانہ انداز میں چاہتی ہے، اس نے کیوں ۔۔۔ ؟ وہ دوسرا تو اس کے لیے سب کچھ ہے۔ اس کی زیست کا حاصل اور روح کی تکمیل ۔۔۔ شاید ماضی اس کے لیے کبھی نہ مر سکے گا۔ جب بھی تنہائیاں آئیں گی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان راہوں پر نکل پڑے گی جن پر اس کے قدموں کی گرد ہے، جو اس کی یاد سے معمور اور اس کی بوباس سے مہک رہی ہیں! جب بھی ساون کی پہلی پھوار پڑے گی تو سوندھی سوندھی نم خوشبو کے ہمراہ یہ پھوار روح اور احساس پر چھائی ہوئی گرد کی تہوں کو دھو دے گی اور کچھ اس طرح کہ نیچے کے کلبلاتے ہوئے کچے پکے مہکتے تازہ زخم اوپر سطح پر جھلکنے لگیں گے۔ شاید وہ تمام عمر اسے بڑی نرمی سے خاموشی سے آہستگی سے اور پرسکون سے پوجے جائے گی، آج تک وہ اسے والہانہ چاہتی آئی ہے لیکن آج تک اپنی چاہت کو کبھی اس پر ظاہر نہیں کیا ہے۔ "بے چاری دکھیا لڑکی! میں اسے الزام کیوں دوں"؟ شاید اس لیے کہ وہ مجبور ہے۔۔۔۔۔ اور ایسے سوگوار لمحات میں، جب درد کے قافلے اس پر اور بھی گراں ہو جاتے، وہ اسے اور بھی شدت سے چاہنے لگتا!

کیا یہ سب کچھ سچ بھی ہو سکتا ہے؟ ہاں، یہ سب؟ ۔۔۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح بے روح اور سپید پڑ گیا۔ دل

اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ شدت سے کانپا۔ اور، اور ...... مگر وہ تو ابھی بہت کم عمر تھا، اور خوبصورت تھا اور وہ اسے بے حد چاہتی تھی۔ ہاں اب اسے اعتراف کر ہی لینا چاہیے، مگر اب اس اعتراف سے کیا حاصل؟ بعد از وقت۔ اس نے بہت جلدی کی، کاش وہ لمحہ پھر اور ٹھہر جاتا۔ اور وہ لمحہ منجمد ہو جاتا۔ وقت تو اس کی پہنچ سے اتنی دور نکل گیا ہے کہ وہ تمام عمر دوڑ کر بھی اسے نہیں پا سکتی، اور اب تو راہ کی گرد بھی پُرسکون ہو کر راستوں پر جم گئی ہے۔ اس طرح ـــ کہ قدموں کے نشانات تک مٹ گئے ہیں۔ وہ جائے بھی تو کس سمت؟ ... اس کا دل جلنے لگا، ایک خلش جس سے اس کی روح تک مضطرب ہو کر رہ گئی۔

اور، اور، اور وہ تو روئے زمین پر سب سے اہم سب سے خوبصورت انسان تھا، بے پناہ ذہین اور پُروقار۔

اور اس نے تو بڑی لاپرواہی سے ایک بار شانوں کو جھٹکتے ہوئے اس سے کہا تھا جیسے صدیوں پہلے!

"مگر بتاؤ تو سہی، آخر تم میں کون سے لعل و گہر ٹکے ہیں؟ آخر میں تمھاری کیسے ہو سکتی ہوں، تم مجھ سے محض تین سال ہی تو بڑے ہو، اور پھر ہم باہم ٹھیک سے رہ بھی نہ سکیں گے۔ تم، تم جانتے ہو ..."

یہ سب اس نے بڑی لاپرواہی سے کہا تھا، یوں جیسے دنیا میں اسے ایک حقیر کیڑے سے بھی کم لائق اعتنا سمجھتی ہے جیسے انسانوں کے اس بے کنار سیل رواں میں وہ بھی ایک انسان ہے، محض ایک انسان، اور بس! مگر اب تو اس کی زندگی میں درد کی سرحدیں بڑی دور تک پھیل چکی ہیں، تا حد نگاہ، اور چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے دو قدم بھی تو وہ چل نہیں سکتی اور وہ تمام پھول جنھیں کبھی اس نے دیوانگی کی حد تک چاہا تھا، اس کے سامنے سوکھے پڑے تھے۔ جن کی سوکھی سوکھی ننگی منتشر پتیوں سے اس کے غرور، بے جا فخر اور تکبر کی لاشیں چمٹی پڑی تھیں اور اس کی زندگی میں کونسا ایسا لمحہ تھا جب اس کی روح نے شدت سے اس کی تمنا نہ کی تھی؟ وہ یاد کرتی تو تھک جاتی اس نے پھر کوشش کر ڈالی لیکن وہ اس شدت سے چاہے گئے محبوب چہرے کو نہ دیکھ سکی۔ وہ تو کب کا جا چکا تھا۔ اس نے بہت جلدی کی، اور اب تو چاروں طرف دبیز اندھیرا اور گہری دھند تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

"تو میں نے کب تمھاری پرستش شروع کی تھی؟" اسے یاد نہ آسکا، یہ تو جنم جنم کی بات تھی، وہ تو صدیوں سے اس کی منتظر تھی، اور جب وہ آیا تو اسے پہچاننے میں شمہ برابر بھی دقت نہ ہوئی۔ بس نسوانی غرور کے سبب وہ اس سے دور دور رہی۔ برسوں پہلے وہ اس سے ملی تھی۔ جب زندگی علم ہی علم تھی، عشق نہ تھی وہ زینہ پر کھڑی تھی اور وہ نیچے نیلے سوٹ میں بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہا تو اس نے گھور کر دیکھا، بڑی تمکنت اور غرور سے پھر وہ سرک گئی، لیکن اس کے بعد کیا ہوا ہم کب ایک دوسرے کو چاہنے لگے؟ نہیں وہ درمیانی کڑیوں کو نہ ملا سکی! اور پھر وہ جا رہا تھا، اسے چھوڑ کر اس کے قدیم خوبصورت شہر کو چھوڑ کر دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ وہ اپنے گھر کے پورٹیکو کی بڑی سی محراب کے نیچے یوں ہی گم سم سی کھڑی تھی، جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو ـــ یہ سب کیسے سچ ہو سکتا ہے؟ اور پھر وہ اس سے رخصت کی اجازت چاہ رہا تھا ......

"میں اتنا ضرور کہوں گا، تم ساری عمر اپنے آئیڈیل کی تلاش میں سرگرداں رہو گی لیکن وہ صرف ضخیم کتابوں کی کرم خوردہ

جلدوں ہی میں مستور ہے! عملی دنیا میں کبھی قدم نہیں رکھتا، میں کچھ ایسا برا بھی تو نہیں، اب یہ اور بات ہے کہ مجھ میں انسانیت کی عظمت کی نسبت کمزوریاں زیادہ ہیں لیکن ان سے مفاہمت غیر ممکن نہیں! اچھا خدا حافظ۔"

اور پھر پورٹیکو سے گیٹ تک نیم دائرے کی شکل میں جاتی ہوئی سرخ بجری والی سڑک پر اس کے جاتے قدموں کی آواز بتدریج مدھم سے مدھم تر ہوتی گئی، ایک دو بار اس نے پلٹ کر بھی دیکھا.... شاید، شاید...... وہ جا رہا ہے، وہ جا رہا ہے، شاید پھر نہ آئے۔ وہ اس کا جذبۂ سپردگی! ہلکی ہلکی آرزو، ایک جھنجوڑی ہوئی روح کی نرمی، حلم اور سکون، پہلی محبت کی پگھلتی ہوئی تب و تاب، گلابی گلابی خمیدہ ہونٹوں کے حساس کناروں پر دبی ہوئی کسمساتی خواہشیں! اب بھی وقت ہے، اب بھی وقت ہے! بعد میں پچھتاوے ہی پچھتاوے ـــــ وہ کب تک یوں ہی گم سم، کھوئی کھوئی سی ستون کے سہارے پورٹیکو کی بڑی سی محراب کے نیچے کھڑی رہی پھر اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ریت کا ہر ہر ذرہ اجنبی کے قدموں سے دبا ہوا سا تھا۔ جیسے ابھی چند لمحے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہاں سرخ بجری والے راستے سے کوئی جھنجوڑی ہوئی بیکل روح گزری ہی نہیں ہے "شاید وہ ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے، کبھی لوٹ کر ہی نہ آئے، ممکن ہے، بہت ممکن ہے۔" یا خدا! تنہائی کا کیا احساس ہے؟ اکتاہٹ، نڈھال اکتاہٹ جیسے ایک مسلسل انتظار ہو، ایک بیزار کن تھکن! ایک مجہول سی جھنجلاہٹ، ایک لامتناہی سستی، غبار کی طرح روح پر چھاتی جا رہی ہے۔ یہ کس غیر مرئی وجود، کس بے نام ہستی کس شخصیت کا انتظار ہے؟

اس نے ہلکی سی آہ بھری "آہ یہ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، محض حماقت، نری بے وقوفی خبط ہے!" لیکن سکون پھر بھی میسر نہ ہو سکا، اس کا دل ایک پر ہول خلا کے احساس سے جل اٹھا۔

پھر کتنی ہی مرتبہ یوں بھی تو ہوا، اس نے اپنی بے چین روح کو دلاسا دینے کی کوشش کی، مگر گرد کے نیچے سے وہ گدگداتا ہوا زخم سطح پر آ کر جھکنے لگا۔ تازہ بہ تازہ! ـــ ہر آتے اجالے اور جاتے اندھیرے کے ساتھ اس کی گہرائی بڑھتی گئی۔ وہ کبھی نہ مندمل ہو سکا "اوہ مجھے یقین ہے، میں اسے جلد ہی بھلا دوں گی پلک جھپکتے ہی!" لیکن لانبی پلکیں کتنی ہی بار جھکیں، جھپکیں ـــ اور وقت دبے پاؤں کتنی عجلت سے پورٹیکو کے محراب کے نیچے سے نکل گیا۔ وہ اسے آج بھی یاد ہے! وہ مبہم سی مسکراہٹ، وجیہ شخصیت! اس کا دل ان تیز تیز الجھی الجھی سانسوں کی میٹھی میٹھی پرنم حرارت، نرمی اور ملائمت کو نہ بھول سکا جو جاتے وقت بڑے ہولے ہولے اس کے چہرے سے مس ہوئی تھیں ـــ سانسیں ـــ جو اتنے قریب تھیں اس کے ـــ! اور پھر وہ گھونگھریالی لٹوں کے گیسری رنگت والے ہالے میں گھرے ہوئے زرد چہرے میں کالی خموش سوگوار آنکھیں! ـــ اس کے جاتے قدموں کی بوجھل آہٹ ـــ وہ انہیں کیسے بھول سکتی ہے۔ اس کی یادوں میں اجنبی کے مسکرانے کی تصویر سب سے زیادہ روشن تھی! مبہم سی مسکراہٹ جب رخساروں میں کسی داخلی سرخوشی کے خمار اور دباؤ سے مبہم گڑھے پڑ جاتے ـــ وہ اسے نہ بھول سکی، اس کی روح اپنی تمام تر شدت سے اسے چاہے گی، اور آگ ـــ من مندر کے سب سے مخفی طاقچے میں اب بھی مدھم مدھم فروزاں تھی۔

"اور تم، میرے دل! ہاں تم انتہائی احمق اور بھولے بھالے ہو۔ ہو نا!"

ــــ کسی کی چاہت میں مدھم مدھم ۔ جلتے ہوئے اس نے اپنے دل سے کہا "دیکھو نا، محض تم جیسا ایک بھولا بھالا بے وقوف

دل ہی یوں ہی بلا مقصد مل سکتا ہے۔ عقلمند تو ایسی فاش غلطیاں نہیں کرتے۔" وہ بہت ہولے سے ہنس دی۔ پھر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔ ڈرائینگ روم کی پوری فضا مرتعش ہو گئی۔ مینٹل پیس پر پڑے بدھ کے چوبی مجسمے نے (جو صدیوں سے اسی طرح سوچ میں سر جھکائے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا) بڑی ناگواری سے اسے دیکھا۔ "تم کون ہو میری خلوتوں میں مخل ہونے والی؟" لیکن یہ قہقہہ تو ان آنسوؤں سے بھی زیادہ غم انگیز تھا۔

"بے وقوف لڑکی! میری تنہائی کو کیوں مجروح کرتی ہے، دیکھو تو سہی میں تجھ جیسے ہی مغموم لوگوں کی مکتی لے کے تو یوں گیان دھیان میں مگن ہوں!" وہ مجسمے کو دیکھ کر یک لخت سہم گئی۔

پھر کتنی ہی بار اس نے اجنبی کا نام کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھا تھا۔ پھر انھیں ریزہ ریزہ کر کے آتش دان میں جھونک دیا تھا۔

"بہتر ہے جل بجھو! — آخر اس سب حماقت کا فائدہ ہی کیا ہے"

اور اسے خط لکھنے کی خواہش نے کیسے کیسے مجبور کیا تھا، ہاں ایک خط، محض ایک رسمی خط نہیں بلکہ صحیح معنوں میں ایک خط، ایک شکست خوردہ، اپنی ہی آگ میں جلتی ہوئی جھنجوڑی گئی روح کی سپردگی کا امین! ایک خط! "پیارے!" پھر وہ کاغذ کے پرزے پرزے کر دیتی۔ اگلی دفعہ محض اس کا نام لے کر اسے مخاطب کرتی۔ اور آگے — "میں نے کتنی بار تمھیں یاد کیا ہے۔ میں گن بھی نہیں سکتی" لیکن اس کے باوجود دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ خط کبھی ختم نہ ہو سکا۔

اور جب اس کا پہلا خط ملا تو اسے اپنے دل میں ایک میٹھی سنسنی کا احساس ہوا، بالکل جیسے دل کی اتھاہ جلتی گہرائیوں میں وہ قطرہ قطرہ ٹھنڈا شہد ٹپک رہا ہو، چھتے سے کنوارے پنے کے زہد سے کوئی نرم نرم نسوانی دمک سی چھننے لگی پھر خط آتے ہی گئے۔ لیکن جواب دینا ایک مرحلہ تھا۔

اور وہ ہزاروں آدمی جن سے وہ ملتی تھی — ہنہ! وہ سب کے سب اس کے مقابلے میں کتنے حقیر اور گھٹیا تھے وہ ہمیشہ اسے دوسروں کے مقابلے میں لا کھڑا کرتی اور پھر اسے ایک بلند ترین سنگھاسن پر رکھ کر ہولے ہولے پوچھتی! زندگی — اُف یہ کتنی اندوہناک تھی۔ "میں زندگی سے کبھی بھی مطمئن نہ ہو سکوں گی، شاید!" وہ اسے نہ بھول سکی۔ اس وقت بھی جب وہ دوسروں کے ہمراہ ہوتی، دھند کے پیچھے وہی دو گہری رنگت والی آنکھیں جھانک رہی ہوتیں۔ ذہنی طور پر وہ ہمیشہ اس کے ساتھ تھی . . . . یہ کیسی وارفتگی تھی — والہانہ، کیسا جنون تھا — ناپیدا کنار!

اور تم سے محبت کا دعویٰ تو کبھی بھی نہ کروں گی، کبھی بھی نہیں، ہاں الفاظ کہہ دیے جانے پر اپنی ساری عظمت کھو دیتے ہیں، اور پھر اعتراف میں کیا رکھا ہے — میرے جذبات، نہ کچھ بھی سہی، مگر کھو کھلے ہرگز نہیں۔ میں تم سے شادی کبھی بھی نہ کر سکوں گی شاید! تم دوسروں کی نظروں میں کبھی بھی میرے نہ ہو سکو گے۔ لیکن میرا دل تمھیں اچھی طرح پہچانتا ہے۔ ارے اتنی سختی سے تو مجھے نہ گھورو، شکست خوردگی کا احساس دلانے والی نظروں سے مجھے اپنی آنکھوں میں تو جھانک لینے دو ہاں تم میرے ہو کیا نہیں؟ میں نے وقت کی کمان کے نیچے آشفتہ سر صدیوں تک تمھارا انتظار کیا ہے، پھر تم آ گئے، اور

میرا یہ دور دور رہنا، سمجھے کیوں نہیں ـــــ ہر لڑکی اپنے غرور کے سائے میں پلتی ہے! اور میں تو تم سے.... پھر تم چلے گئے، اور رخصت ہوتے وقت وہ تمہارا جذبۂ سپردگی، اف ہلکی ہلکی آرزو، ایک پامال روح کی نرمی اور سکون، پہلی محبت کی پگھلتی ہوئی تب وتاب...... تم اب کہاں ہو؟ کہاں ہو؟ میں پاگل تھی، خدارا لوٹ آؤ، میری طرف تو دیکھو، کیا تم مجھے نہ پہچانتے؟

یہ وارفتگی، یہ پاگل لڑکی، کس سے باتیں کر رہی ہے؟ وہ کہاں ہے؟

خدا ـــ اتنی بھری پُری دنیا میں یہ کیوں اپنے کو اتنا تنہا محسوس کر رہی ہے؟ کیا بات ہے؟ اس نے کیا گم کر دیا ہے؟ اور کیا کچھ گم کر دینے کو باقی رہ گیا ہے؟ سب کچھ تو لٹ چکا ہے! اپنے بے جا غرور کے نشے میں دھت کچلی ہوئی لاش ـــ وہ کیا سوچ رہی تھی، وہاں بیٹھے بیٹھے جہاں سامنے میز پر گلدان میں پھول یوں ہی بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

"اور یہ عجیب غیر معلوم جگہ ہے، جہاں شناسا چہرے نہیں، سب اجنبی ہیں، اپنے احساس کے خاکستری سائے، جو بے مقصد ایک دوسرے کے پیچھے ڈولتے رہتے ہیں، ایسے مسافر جو آوارہ چکراتے پھر رہے ہیں، ہوائیں بے مدعا تند ہیں اور منزلیں کہیں چھپی بیٹھی ہیں۔ ایک مہیب رہگذار، تاحد نگاہ پھیلی ہوئی ہے، یہ میرا گھر تو نہیں ـــ یہ میرا گھر بھی تو نہیں جس کے پورٹیکو کی محراب کے سائے میں غرور نے سب کچھ ہارا ہے ـــ زندگی لٹائی ہے، اپنی ہی لاش کو روندا ہے۔ میں اپنے گھر کی تنہا، مانوس فضا میں چلی جانا چاہتی ہوں۔ جہاں مجھے سکون ملے گا۔ پھر میں تمام کواڑ بند کر کے اپنے بستر پر بیٹھوں گی اور پھر وہاں اندھیرے میں جی بھر کے روؤں گی

... میں یہاں کیسے پہنچی ہوں؟ یہاں تو شدت سے میرا دم گھٹ رہا ہے!

اور یہ کون کمرے میں سائے کی طرح پھر رہا ہے۔

اور کتنی ہی بار اس نے اپنے دل سے کہا تھا: دنیا کس قدر حسین ہے! خوبصورت دل نواز! اور پھر بھی سب اس نے اس کے سامنے بھی کہہ دیا تھا۔

"اوہ نہیں، تمھیں شدید غلط فہمی ہوئی ہے، یہ اس لیے کہ ابھی تم نے اسے دیکھا تک نہیں، تم، تم ایک منہ بند کلی ہو جسے رات کے پچھلے پہر کی شبنم نے ابھی چھوا تک نہیں ہے، تم صرف ابھی ایک معصوم بچی ہو" اور اس نے یوں جواب دیا تھا تو وہ بڑی تیزی اور ادا سے بولی تھی۔

"حضرت اس زعم میں نہ رہیے گا، ٹھیک ہے، آپ مجھ سے محض تین سال ہی تو بڑے ہیں!"

تو وہ اپنی اسی مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

"تب تو مجھے ضرور بتاؤ ـــ تم اپنی دنیا میں کیا حسن اور کشش پاتی ہو؟"

"ارے ـــ واہ، یہاں تو اتنا بہت سا حسن ہے! یہاں حسین پھول ہیں، چمکتے ہوئے ستارے ہیں اور راتیں ہیں جب چاند محبت سے مدھم سروں میں سرگوشیاں کرتا ہے اور تنہا خواب آور نیلے چشمے ہیں، اور بڑی ہم آہنگی سے رواں سہمی ندیاں ہیں اور، اور، اور یہ اس لیے حسین ہے کہ تم یہاں ہو!"

اسے محسوس ہوا، یہ سب اس نے کہاں کہا تھا۔ یہ سب تو آج تک اس کے دل میں ہی اظہار کے لیے تڑپ رہا ہے!

اے کاش اس نے یہ سب کچھ کہہ دیا ہوتا۔ واقعی تب دنیا حسین ہو جاتی، وہ کب یہ سب ادا کر سکی ہے۔ اس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ محض خاموشی سے اسے گھورے گئی تھی، اور وہ یوں ہی مسکراتا رہا تھا۔

"یہاں پھول کہاں ہیں۔ صرف خار ہیں خار، اور تم بہت ہی امید پرست ہو! اور کچھ نہیں۔"

"اور آپ شاید قنوطی ــــ ہوں! ہے نا؟" اس نے جوابی حملہ کر دیا۔

لیکن اب اس کا وہ قنوطی کہاں تھا۔ وہ پیلی رنگت والا اجنبی جس کی آنکھیں بے چمکیلی اور گہری تھیں اور جس کے بال خشک الجھے الجھے سے تھے۔ بہت دیر ہوئی جا چکا تھا لبوں پر امیدوں کے مدفن لیے۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔

"میں تمھیں دیکھنا چاہتی، اور دنیا جو کبھی بے حد حسین تھی اب تمھارے بغیر بے حد سونی ہو گئی ہے۔ اب یہ بالکل بھی حسین نہیں۔ وہ پھول جنھیں دیوانگی کی حد تک میں نے چاہا تھا کب کے مرجھا گئے ہیں۔ خدارا آ جاؤ اور پھر میں تمھیں بتاؤں گی چاہت کیا ہے؟"

اور پھر انھیں اپنی اپنی دنیاؤں میں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو کر الگ الگ رہنا تھا ــــ

"تم مجھے کتنے عزیز ہو، ہاں، کبھی تمھارے سامنے میں نے اس کا اقرار نہیں کیا ہے! مگر اب میں اعتراف کیے بنا نہیں رہ سکتی اب تمھیں میں اپنا پیرہن، روح کا ہر ہر گوشہ دکھا دینا چاہتی ہوں، میں تمھیں اپنی زیست کا ہر ہر لمحہ دکھاؤں گی، ہر ہر لمحہ! ہاں، یقین کر لو، کر لو نا، ہر ہر لمحہ میری یاد کے اہرام میں محفوظ ہے۔ صرف تم لوٹ آؤ۔ اور میں تم پر منکشف کروں گی تنہا تم ہی وہ تھے جسے میں آج تک پوجتی رہی ہوں۔ ہاں یہ بھی نہیں یہ جو میرے سامنے بیٹھا اخبار میں غرق ہے، جس نے دیوانگی کی حد تک مجھے اور میرے غموں کو چاہا . . . . . خدارا ماضی کو فراموش کر دو، بھول جاؤ ان یادوں کو جن میں میرا استغنا اور عدم اعتنا کی تلخی بھری ہے۔ صرف اس قدر یاد رکھو۔ ہر لڑکی اپنے غرور کے سائے میں پلتی ہے اور میں تمھیں دیوانہ وار چاہتی ہوں۔"

اور کتنی ہی بار، ہاں، اس نے اجنبی کو دکھ پہنچایا تھا۔ اس کے جذبات سے کھیلی تھی، اس کے احساسات کو مجروح کیا تھا۔ اور وہ اجنبی ــــ اس نے ہمیشہ، ہنستے کھیلتے خندہ پیشانی سے اس کی ستم ظریفیوں کو یوں جھیل لیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، جیسے یہ سب اس کا مقسوم ہو! وہ کس قدر پاگل تھی۔ بے وقوف لڑکی، وہ تو صرف اپنے غرور اور نسوانی تمکنت کا اظہار تھا۔ کیسے کیسے اس نے اپنی لاپرواہی اور لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔ عدم اعتماد۔ جیسے یہ کوئی بہت معمولی سی بات ہو جیسے وہ انسانوں کو اس عظیم سیل رواں میں محض ایک انسان ہو اور بس۔

یہ کون کمرے میں سائے کی طرح پھر رہا ہے!

اب تو اسے یاد بھی نہ رہا تھا، اس نے ہمیشہ اپنے کو بہت زیادہ مصروف ظاہر کیا تھا جیسے اسے دوسروں سے فرصت ہی نہ تھی جو اس سے ملتی، اور کام بہت اہم تھے جو اس کی طرف ملتفت ہوتی، توجہ کرتی۔ اس کی شخصیت، وہاں کوئی ایسا عنصر تھا جس پہ پیار نثار کیا جا سکے، اور وہ اجنبی ــــ بڑے صبر و تحمل سے محض اسے گھورے ہی گیا۔ آخر ایک روز تو وہ اس کے جذبات پر چھا جائے گا! اس کی اس ادا پر جو اندر ہی اندر اس کا دل مسوس رہی تھی اس نے

اسے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ صرف جذبات نہیں یوں دکھاوے کی مصروفیت میں اسے منہمک پاکر اسے گھورتا اور پھر بے قدموں ان گزرگاہوں سے کترا کر نکل جاتا۔ جہاں اس سے ملنے کا احتمال ہو۔ بس شاید دو ایک بار ہی وہ اس قدر کہہ سکا تھا۔

"محسوس ہوتا ہے بڑی پرانی ملاقات ہے!"

"ہاں!" اس نے یوں ہی لاپرواہی سے سر ہلا دیا تھا، اور پھر سوچا تھا "یہ گہری آنکھوں والا، اُف میں کس قدر اس سے اپنا دامن بچانا چاہتی ہوں" لیکن اس لمحے میں وہ یہ بھی جانتی تھی وہ اسے اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ چاہتی ہے!

اور پھر وہ اجنبی زمین و آسمان کے تمام فاصلے عبور کر کے اتنی دور چلا گیا کہ عقب میں قدموں کا ایک نشان تک نہ بچا۔

وہ اپنے کام میں منہمک تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، پھر مسلسل بجتی ہی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ بڑی بے دلی سے اٹھا، اور کال ریسیو کی ۔۔ ایک پرانا دوست دوسرے سرے سے بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ راکھ کی طرح سفید پڑ گیا۔ اُف میرے خدا!

اس نے بھی یہ خبر سن لی ہوگی، بیچاری پاگل لڑکی! میں جانتا ہوں یہ اس کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔ کتنی اہم ہے اس کے لیے! وہ بڑے مضطرب قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے میں غرق تھی۔ ساکت گم سم حیران! وہ کیا سوچ رہی تھی؟ بے قرار! اور وہ تو اس قدر خوبصورت اور جوان تھا، جاذب، پرکشش، پیارا!

یہ کون کمرے میں سائے کی طرح پھر رہا ہے!

ایک لفافہ ماتمی، سیاہ حاشیہ، اس کی گود میں! اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور میز پر گلدان میں پھول یوں ہی بے ترتیبی سے پڑے تھے ۔ اُف خدا۔ تو اسے معلوم ہو گیا۔ . . . ! اس کا چہرہ احساسات سے قطعی عاری اور بالکل سپاٹ تھا۔ جیسے وہ شعور اور احساس کی تمام حدیں عبور کر کے ایک ایسی کیفیت میں سانس لے رہی تھی جہاں صرف سانسیں ہی زندگی کا احساس اور حرارت قائم رکھتی ہیں۔ اس کی آنکھیں بہت بوجھل مگر خشک تھیں۔ وہ باوجود کوشش کے ان میں ایک سیال حرارت نہ پا سکا، اور سیاہ حاشیہ والا لفافہ مرجھائے ہوئے پھول، یا خدا! یہ روتی کیوں نہیں؟ وہ اس پر تقریباً جھک گیا۔

"یہ میں ہوں۔ تم مجھے پہچانتی کیوں نہیں؟ اور تم جانتی ہو، وہ اب ۔ تمہیں بھول کر" اس نے ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کون ۔۔؟" وہ بمشکل اتنا کہہ سکی۔ اس کی بات اس کے دل میں بھالے کی طرح دور تک پیوست ہو گئی۔

"بھولی بچی! ۔۔ وہ جیسے تم سب ۔"

کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی، وہ لرزہ براندام ہو گئی، چہرے پر اضطراب اور خوف کے

اثرات امڈ آئے، اور آنسو ــ قطار اندر قطار بہہ نکلے!

یہ کون کسے میں سائے کی طرح پھر رہا ہے۔

اس نے آہستہ سے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھ دیا، وہ سسکیاں لے رہی تھی، اس کا پورا جسم خزاں کی تند ہواؤں میں چکراتے سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سیاہ، ماتمی حاشیے والا لفافہ اس کی گود سے لڑھک کر قالین پر جا پڑا ــ اور وہ تو اتنا حسین، اتنا وجیہ، ذہین، کم عمر اور پرکشش تھا۔ اس نے تو اسے خدا حافظ بھی نہ کہا۔ ایک ٹوٹا ہوا سا لفظ "الوداع" اب وہ ہمیشہ جا چکا ہے دور، بہت دور، وہ اب کبھی نہ لوٹے گا، دھند کے پیچھے سے دو گہری رنگت والی آنکھیں مسکرا رہی ہیں ــ تم نے مجھے اپنا پایا نہیں! بے مانگے بے چاہے کوئی جی کر کیا کرے گا ــ اور وہ زندگی کے اس درد کو جس کی حدیں بہت دور تک پھیل گئی تھیں۔ یوں ہی سینے سے لگائے سسکتی رہے گی اس کی میت میں بھی! زیست کے ہنگاموں میں بھی! کاش اس نے اس پر اپنی محبت ظاہر کر دی ہوتی! اور اب تو طویل پچھتاوے ہی رہ گئے ہیں اور ایک روح ــ جو یوں ہی مدھم مدھم جل جل کر بجھ جائے گی ــ

شام کی پگھلی پگھلی ارغوانی روشنی بھی رات کے سیاہ سناٹوں میں کھو گئی ہے!

یہ کون کسے میں سائے کی طرح پھر رہا ہے!؟

بانو طاہرہ سعید

نئے عنواں بہت کچھ دشمنوں کے ہاتھ آئیں گے
اگر رازِ محبت ہو گیا افشا تو کیا ہوگا

مجھے مہجوری و دوری گوارا ہے گوارا ہے
انھیں دیکھے سے دل کچھ اور بھی دھڑکا تو کیا ہوگا

کوئی شوریدہ سر جامِ شرابِ شاعری لے کر
حریمِ کعبۂ دل میں چلا آیا تو کیا ہوگا

٭

پھر یاد آ گئی کسی شیریں دہن کی بات
جس کی ہر ایک بات ہے شعر و سخن کی بات

انجان بن کے حالِ غمِ دل نہ پوچھیے
آ جائے گی زباں پہ زخمِ کہن کی بات

دلی بہت حسین ہے دلکش ہے لکھنؤ
لیکن کچھ اور ہی ہے ہمارے دکن کی بات

٭

ڈھونڈا تھا کہکشاں میں عبث نقشِ پا ترا
گردِ غبارِ راہ ہے یہ رہ گزر کہاں

صحرا میں کوئی قیس نہ محمل میں جانِ قیس
اس بیسویں صدی میں مذاقِ نظر کہاں

٭

سونی پڑی ہے منزلِ دیوانگیِ عشق
کیا ہو گیا کہ کوئی سرِ دار بھی نہیں

واعظ شراب نوشی کے بیحد خلاف ہے
مل جائے مفت کی تو کچھ انکار بھی نہیں

کب ہوگی ختم طاہرہ شامِ غمِ حیات
اب تک نمودِ صبح کے آثار بھی نہیں

٭

پھول، شبنم، کہکشاں، مہتاب کیا عنواں ہیں کم
بد مذاقی ہے اگر تلوار کی باتیں کریں

٭

کوشش یہی ہے اپنی نگاہوں کو دوں فریب
تیرے سوا نہ کچھ نظر آئے تو کیا کروں

دوری نے کر دیا ہے تجھے اور بھی قریب
تیرا خیال آ کے نہ جائے تو کیا کروں

راتوں کی خامشی میں انوکھی سی اک صدا
تاروں کی انجمن میں بلائے تو کیا کروں

روحی علی اصغر

پیش آؤ نہ مہربانی سے — دل دھڑکتا ہے شادمانی سے
کچھ محبت کا حق ادا نہ ہوا — مجھ کو شکوہ ہے زندگانی سے
ساری دنیا مری مخالف ہے — آپ کی ایک مہربانی سے

یہاں کتنا گراں ہے مسکرانا * کلی کا کوئی دل لائے کہاں سے
کمالِ عشق سے سرشار ہو کر — جبیں اب منحرف ہے آستاں سے

کہاں تک چھپاؤ گے تم حال اپنا * نظر کر گئی دل کی خود ترجمانی

اب گراں ہے ہر ایک چیز مگر * صرف ارزاں حیات کا غم ہے
تیری رحمت کو کیوں کروں رسوا — میری فریاد میں اثر کم ہے
میری حالت نہ دیکھ اے ساقی — جام لینے کا ہاتھ میں دم ہے

بات بھی ہم سے کی نہیں جاتی * ہم سے کوئی سوال کیا ہوگا
موت نے ہم کو زندگی بخشی — زندگی کا مآل کیا ہوگا

* گردش میں رہے برسوں شیشہ ہو کہ پیمانہ * بس ایک ہی عالم ہے میخانہ بہ میخانہ
ہم دیر سے گزرے ہیں کعبے کو بھی دیکھا ہے — یہ بھی ہے صنم خانہ وہ بھی صنم خانہ

نہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی نہ آنکھوں میں نمی آئی * وہ کیوں سمجھے کہ اقرارِ محبت کر لیا ہم نے

شکوہ ہے اپنی سہل پسندی کا اب ہمیں * اٹھتے ہیں پاؤں راہ کو ہموار دیکھ کر

ابوالخیر صہبا

موسمِ گل ہو، ترشح ہو، گھٹا چھائی ہو
اک نئے طور سے پھر انجمن آرائی ہو
آج صہبا کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے
کیا تعجب ہے جو پہلے سے شناسائی ہو

ناکامیٔ قسمت کا گلہ کس سے کریں ہم
تھے موت کے خواہاں تو ملا زیست کا الزام
اک آپ کی دنیا ہے بدلتی ہے ہر اک آن
اک اپنا جہاں ہے کہ وہی صبح وہی شام

رو کر نہ دردِ ہجر کا چرچا کریں گے ہم
اب یوں نہ اپنے عشق کو رسوا کریں گے ہم
ذرے میں آفتاب ہے قطرے میں بحر ہے
اپنے ہی دل میں آپ کو ڈھونڈا کریں گے ہم

ساتھ دیتے رہے زمانے کا
اک نہ اک انقلاب میں گزری

محبت میں محبت ہی دلیلِ زندگانی ہے
جو اس منزل کو پاتا ہے اسی کی کامرانی ہے
یہ ہستی صورتیں یہ دل لبھانے والی سب شکلیں
یہ سب دھوکے نظر کے ہیں حقیقت سب کی فانی ہے

تغافل ہے دلیلِ ربطِ پنہاں
انھیں میرا خیال آتا ہی ہوگا
گلوں سے کھیلنے والوں کا دامن
کبھی صہبا الجھ جاتا ہی ہوگا

بڑھ گئی جب سے دل کی الجھن
کیسا گریباں کیسا دامن
دل میں تم ہو تم ہو نظر میں
پھر یہ پردہ پھر یہ چلمن

ضبط کی حد ہو چکی اب دل جلے یا گھر جلے
دیر سے ہیں منتظر اے جلوۂ [illegible] ہم
یہ میکدہ بردوش آنکھیں کیسی ہیں آپ کی
[illegible] مستی کی ہم [illegible] ہم

عزیز قیسی

فلم کی کہانی

لکھنے اور سنانے کا فن

یہاں پلاٹ کو سبجکٹ کہا جاتا ہے اور تھیم کو آئیڈیا۔ آپ ہمیشہ ایسے فقرے سنیں گے۔

"ایک آئیڈیا ہے اس پر سبجکٹ تیار کرنا ہے۔"

"بڑا اچھا سبجکٹ سنا آج۔"

"سبجکٹ اچھا ہو تو مزہ آتا ہے۔"

ان فقروں سے آپ پر یہ بات نہیں کھلے گی کہ سبجکٹ کسے کہا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ سبجکٹ آپ سبجکٹ ہی کو سمجھیں گے جیسے شراب خوری بری چیز ہے۔ عشق ایسی طاقت ہے جو موت سے ٹکرا جاتی ہے، ہر گناہ کی سزا ضرور ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ مگر یقین کیجیے کہنے والے کا یہ مطلب نہیں ہوگا۔ اس کے بعد کے جملوں سے آپ پر کھلے گا وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ مثلاً وہ کہے گا "صاحب کیا سبجکٹ ہے۔ خدا کی قسم لڑکی کالج کی ہے اور لڑکا اس کے دوست کے چچا کا بیٹا۔ دونوں میں رائٹر نے رومانس لکھا... قربانی ہے بلا کی ہے" یا

"ایک سبجکٹ ہو تو ایسا ہو۔ رومانس کا وہ اینگل نکالا ہے کہ طبیعت پھڑک جاتی ہے۔" یا

"وہ ایسا سبجکٹ ہے کہ دس گانے پورے کھپتے ہیں۔"

یہاں کہانیاں نہیں ہوتیں سبجکٹ ہوتے ہیں، یہاں کا ہر کہانی سننے والا فن افسانہ کے ہر باریک نکتے سے آگاہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں یہ الفاظ دھڑلے سے استعمال کرتا ہے۔

اینگل (ANGLE) جی نیس (GENIUS) اپروچ (APPROCH) ٹریٹمنٹ (TREATMENT)

آرٹسٹک ٹوئسٹ (ARTISTIC TWIST) ایٹماسفیر (ATMOSPHERE) رومانٹک ویوز (ROMANTIC VIEWS) وغیرہ وغیرہ ان بھاری بھرکم اور پیچیدہ لفظوں کو سن کر آپ مرعوب اور متاثر ہو جائیں گے کہ یہاں کا ہر آدمی فن داں اور فنکار ہے۔ بہتر نقد و نظر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مشکل سے مشکل نکات اور اصطلاحات سے واقف ہے ان کو برتنے کی پوری قدرت بھی رکھتا ہے۔ اگر آپ خدا نخواستہ کسی کو کہانی سنانے چلے جائیں

تو آپ وہاں سے اپنے آپ کو اس دھرتی کا کمترین کج فہم اور کم فہم آدمی سمجھ کر لوٹیں گے اور سوچیں گے کہ اب تک آپ نے صرف قلم گھسا ہے، صرف کاغذ کالے کیے ہیں اور آپ کو ان تمام خرافات کو دریا برد کر دینا چاہیئے اور آئندہ نہ کبھی اپنا دماغ چاٹنا چاہیئے نہ دل نوچنا چاہیئے نہ شب بیداری سے اپنی اور اپنی اہلیہ کی صحت خراب کرنی چاہیئے، کہانی سوچنے میں اپنا خون مفت نہیں جلانا چاہیئے اور پہلی گاڑی سے وطن مالوف ٹھنڈے ٹھنڈے لوٹ جانا چاہیئے جہاں آپ کی طرح عارفان بافراغت اپنی کم بصری اور دون علمی میں مگن کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح اپنی زندگی گزار رہے ہیں بلکہ ٹرا رہے ہیں اور میدان صنعت و فن میں اپنے آپ کو بھاؤ پر اٹھانے کا خیال ابدالآباد تک چھوڑ دینا چاہیئے۔

مگر آپ یہ خیال اس لیے نہیں چھوڑ سکیں گے کہ اس کے سوا آپ کچھ اور نہیں کر سکتے۔ لازماً جھک مار کر آپ اپنا یہ ارادہ راتوں رات بدل دیں گے اس لیے کہ فلم کی زندگی میں یہی تو ایک خوبی ہے کہ ہر رات کو آپ مرجاتے ہیں اور صبح پھر جی اٹھتے ہیں آپ پھر جی کر اٹھیں گے بلکہ یوں کہیئے کہ آپ اپنے بستر سے چائے پی کر اٹھیں گے اور کسی دوسرے حاجت روا کے آگے اپنا پشتارہ کھول کر بیٹھ جائیں گے اور بڑے ادب اور بڑی امید سے زبان کھولیں گے کہ میری کہانی کا موضوع ہے ؟

وہ بات کاٹے گا "موضوع کیا؟"

"جی تھیم"

"آپ کا مطلب ہے IDEA"

"جی وہ یہ ہے کہ آدمی لاکھ پردوں میں چھپ کر گناہ کرے اس کا گناہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔"

وہ بولے گا "یہ تو معلوم ہے۔ سبجکٹ شروع کیجیے۔"

"یہ سبجکٹ ہی تو ہے حضور" یہ جملہ آپ کے ذہن میں آئے گا۔ ہونٹوں پہ نہیں اس لیے کہ آپ کا مخاطب (یا آپ کا بات کاٹنے والا) اپنے جیسے پر رام پوری چاقو کھولے بیٹھا ہوگا۔ اگر آپ نے بہت جی کڑا کر کے سوچا کہ چلو دو ایک تمہیدی ...... اور توضیحی جملے اور داغ دیں تو شاید یہ فولاد نرم ہو۔ آپ بول پڑیں گے، "تو میں کہہ رہا تھا کہ اس کہانی میں ایک قاتل کی نفسیاتی الجھنیں میں نے دکھائی ہیں۔"

"الجھنیں اچھی نہیں ہوتیں MIND صاف ہونا چاہیئے۔"

میں قاتل کی الجھنیں بتا رہا ہوں اپنی نہیں میرا MIND تو آئینے کی طرح صاف ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اس کہانی میں یہ دکھایا ہے کہ کس طرح قاتل کے ذہن میں گڑبڑ ہوتی ہے اور کس طرح مقتول کی لاش کا خیال اور واقعہ قتل کی باقیات اس کا پیچھا کرتی ہیں اور کس طرح اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

یہ کہتے کہتے اگر آپ چور نظروں سے مخاطب کو دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ وہ جمائیاں لیتے ہوئے اس نظر سے دیکھ رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو آپ میری نیند کیوں حرام کر رہے ہیں.......

اگر آپ نظر شناس ہیں تو کہانی سنانے کی امنگ کا گلا گھونٹ دیں گے ورنہ بے حسی میں سناتے جائیں گے کہ اس مقصد

کے لیے میں نے دو کردار چنے ہیں "ایک جان دو قالب"۔

"ایک جان اور دوسرا غالب، ایک کرسچن اور دوسرا مسلمان۔"

"جی نہیں دونوں کرسچین ہیں۔"

"اوہ تو لڑکی۔"

"لڑکی ایک دوست کی بیوی ہے۔"

"بیوی" آپ کا مخاطب چونکے گا۔ بیوی سے کیا رومانٹک ویلیوز (ROMANTIC VALUES) پیدا ہوں گی
سبجکٹ میں بیوی ویوی نہیں چلے گی اسے معشوقہ کر دیجئے۔

آپ یہ سوچ کر... معشوقہ کر دیتے ہیں کہ اسے پسند آجائے ورنہ آپ دبے لہجے میں بول پڑیں گے۔

"معشوقہ کر دینے سے کہانی کے INCIDENTS میں شدت نہیں رہے گی۔

"شدت بُری چیز ہے اسے ختم کر دینا چاہیئے۔"

اور آپ سوچیں گے۔ شدت سے زیادہ زندگی بری چیز ہے۔ اس لیے وضاحت کریں گے کہ حضور آپ آگے تو سنیے
میں نے کس طرح ان دوستوں اور اس کی بیوی کا (TRIANGLE) پیدا کیا ہے۔

"ٹرینگل تو ہے مگر اینگل کیا ہے۔"

"اینگل، اینگل تو کچھ نہیں رکھا۔"

اب آپ کا مخاطب آپ کے ہاتھوں سے نکل چکا ہوگا۔ وہ پنجے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑ جائے گا کہ صاحب آپ رائٹر ہیں
اور اینگل نہیں رکھا آپ نے۔ اینگل کے بغیر سبجکٹ میں کلر کیا خاک آئے گا، اور کلر نہ آیا تو آرٹسٹک ٹچس کہاں سے آئیں گے اور
ان کے پیور ٹریٹ منٹ کیا ہوگا، اور وہ نہ ہوا تو کہانی کیا خاک کہانی ہوئی۔ اب دیکھیے "چودھویں کا چاند" ٹریٹ منٹ پر تھا (حالانکہ
سو فیصدی پلاٹ پر تھا) اور آرٹسٹک ٹوسٹ کے لیے آپ، آپ "عقل مند" دیکھیے (حالانکہ تین چار انگلش پکچروں کا معجون تھا) اور پکچل
پلاٹ کے لیے "دل لے کے پھینکو" دیکھیے جس میں پلاٹ کتنا خوبصورت تھا (حالانکہ پلاٹ بے تکا تھا)

"جی! میں نے سب پکچریں دیکھی ہیں ان میں یہ سب..."

"دیکھیے مجھے لیکچر کی عادت نہیں۔ میں بات بہت مختصر کرتا ہوں۔ رائٹر کسے کہتے ہیں میں آپ کو بتاؤں۔ آپ لے
ایس۔ ایس گوہر کی کہانیاں دیکھیے۔"

"مگر گوہر صاحب تو انگریزی پکچروں کو دیکھ کر۔"

ہم کو معلوم ہے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گوہر سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے فلاں انگلش پکچر دیکھی
اس نے جواب دیا کہ میں نے تو وہ بیچ بھی دی۔ مگر یہ سب بیکار باتیں ہیں، وہ جینیس ہے جینیس اور سچ پوچھیے تو فلم کی کہانی ہر ایرے غیرے
کا کام نہیں۔

آپ دل میں کہہ رہے ہوں گے خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم۔ یہاں تو ہرایرے غیرے کا یہی کام ہے یہ گفتگو جو آپ کو میں نے گفتگو کے نمونے کے طور پر سنائی ہے جو بول سکتا ہے۔ بہت سے کارساز وکارباز ایسے ہیں جو یہ نہیں بول سکتے تو وہ ساری بھرا مات سن کر آپ سے دو لفظوں میں کہہ دیں گے۔

نہیں جما۔ مجا (مزہ) نہیں آیا وغیرہ وغیرہ۔

کچھ مجھ سے ایسے بھی سننے میں آتے ہیں کہ کسی کیپٹن کا آفس بوائے کسی ہیرو سے ملنے گیا اور اسے اکیلے میں لے جا کر کچھ اس طرح کہانی سنائی۔

"آپ فلاں فلم میں ڈاکو بنتے ہیں۔"

"جی۔"

اب آپ چاکو بن جائیے۔ میرا مطلب ہے دادا ایک دم فرسٹ گنڈہ چاکو باج۔ کہانی پسند آئی اور وہ کہانی پسند آجاتی ہے۔ کوئی سیٹھ (فینانسر) کہے گا کہ رائٹر لوگ تو یوں ہی مغز کھاتے ہیں اپنے پاس فسٹ کلاس سبجکٹ ہے ایسا کہ اگر پکچر بنے تو تھیٹر سے اترے ہی نا۔ پولیس آ کے اتارے۔ لمبی چوڑی تمہید کے بعد وہ چپکے سے کہے گا نام ہے۔ فرض ادا۔ (جس کے معنی ادا کا فرض نہیں بلکہ فرض کی ادائیگی ہوں گے) لڑکی بے چاری معصوم "فرض ادا" میں ایک آدمی سے شادی کر لیتی ہے۔ ملائیے ہاتھ اور اس گرم جوشی سے آپ کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے کہ اگر آپ نے اپنا ہاتھ بھی جوابا اسی گرمجوشی سے نہ بڑھایا تو شانے سے آپ کا بازو اتر جائے گا۔

باقی سبجکٹ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔ ایک کہانی سنانے والوں کا گروہ بھی ہے جو عقل مند کے لیے کوئی اشارہ نہیں رکھتا۔ کیوں کہ وہ ہر سننے والوں کو بے وقوف سمجھتا ہے۔ (اور واقعہ بھی بڑی حد تک یہی ہے) "فرض ادا" اور "چاکو باج" میں تو کوزے میں دریا بند ہے۔ یہ لوگ کوزے سے دریا نکالتے ہیں۔ مثلاً وہ شروع کریں گے وہ منظر کیسا ہے جہاں سے کہانی شروع ہو رہی ہے۔ آسمان پر کتنے ابر کے ٹکڑے ہیں اور زمین پر کتنے سبزے کے پھول اور لڑکی کیسی ہے، کیسے کپڑے پہنے ہوئے، زیور کیا پہنے ہوئے، کس طرح ملتی ہے، چال، جال، ڈھال، بال وغیرہ کیسے ہیں۔ مسکراتی ہے تو کتنے پھول جھڑتے ہیں روتی ہے تو کتنی جھڑ بیریاں جھڑتی ہیں۔ ایک لفظ "نہیں" یا "ہاں" کس ادا سے بولتی ہے کہ "ضمیر کن" ڈول جاتا ہے۔ مزے لے لے کر وہ ایک ایک تفصیل آپ کو سنائیں گے۔ جہاں ڈراما آئیگا وہاں سر کے بل کھڑے ہو جائیں گے۔ جہاں ویلن کا گلا ہیرو نے پکڑا ہو یا ہیرو کا ویلن نے ——— وہ آپ کا گریبان پکڑ لیں گے۔ آپ کے چاک گریباں پر چونک کر معافی نہیں مانگیں گے۔ اس لیے کہ کہانی روانی پر ہوگی۔ جہاں چانٹا مارنا ہو وہاں آپ اپنا دوسرا گال بھی پیش کرنے تیار رہیے۔ اس لیے کہ شاید جوابا کوئی کردار چانٹا مارتا ہو۔ جب کسی کو کوئی کردار گالیاں دے رہا ہوگا تو وہ آپ کو وہ کردار فرض کر کے گالیاں دیں گے، اور اتنی روانی میں گالیاں دیں گے کہ آپ کی مادر و خواہر کی بے حرمتی پر آپ زبان بھی نہ کھول سکیں گے۔ اگر کسی کو اٹھا کر نیچے پھینکنے کا ایکشن ہو تو وہ آپ کے آفس کا

ٹائپ رائٹر، ٹیپ ریکارڈر، تھرماس، پیپرویٹ، کچھ ہاتھ نہ آئے تو آپ کی ٹوپی یا اپنا عمامہ اٹھا کر نیچے پھینک دیں گے۔ جب ٹریجک منظر ہو تو ان کی آنکھوں سے دجلہ و فرات بہہ نکلیں گے، اور آپ اپنی سنگدلی کے ساتھ اس سیلاب اشک میں غوطے لگا رہے ہوں گے۔ اگر آپ اس کہانی سے نہ بچ سکے تو اس سیلاب اشک کی بجائے آپ کی آنکھیں سیلاب اشک اُٹھلنے پر مجبور ہوں گی۔ اس لیے کہ جب یہ کہانی اسکرین پر آئے گی تو "خالص زبان" کی کہانی ہو جائے گی جس میں ذہانت اور تالو کہیں نظر نہ آئے۔

اب بتائیے کہانی سننا یا سنانا کس دل گردے کا کام ہے؟ یہ ناٹک کیا آپ کر سکتے ہیں؟ اصطلاحی دشنام آپ برداشت کر سکتے ہیں، یہ کلیجہ آپ لا سکتے ہیں؟ اور اگر اس کے باوجود آپ فلم لائن میں بچ جائیں تو آپ بے شک مستحق آفریں ہیں کہ جو کام رستم سے نہ ہو سکا آپ نے کر لیا، اور اگر آپ اس نادر شاہ کے دور حکومت میں زندہ بچ گئے تو بخدا آپ کو موت بھی نہیں مار سکتی۔

فلمی تبصرے — حق گو

ایک مسافر ایک حسینہ

ایس مکرجی ہمارے ملک کے ان فلمسازوں میں سے ہیں جو فلم کو بنیادی طور پر تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور محض تفریحی فلمیں بنانے کے لیے فلم کے بنیادی آرٹ، فلم کے حقیقی حسن اور تاثر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایس مکرجی نے اپنے ادارہ فلمالیہ کی تازہ ترین پیشکش "ایک مسافر ایک حسینہ" میں فلم بینوں کی تفریح کے زیادہ سے زیادہ سامان یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے فلم "چوں چوں کا مربہ" بن کر رہ گئی ہے۔ اس فلم کی کہانی میں واقعات ہی واقعات ہیں اور جگہ جگہ ان واقعات پہ نیا رنگ چڑھانے اور ان میں انوکھاپن پیدا کرنے کی کوشش نے کہانی اور واقعات کی رفتار کو اس قدر تیز کر دی ہے کہ تسلسل کی کڑیاں جا بجا ٹوٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں — یہی اس فلم کا سب سے بڑا نقص ہے۔ ایک فلم میں دنیا بھر کی باتیں مسلسل بلکہ دھڑا دھڑ واقعات — کبھی رومانی فضا تو کبھی جرائم اور سراغ رسانی کی مہمات — جا و بے جا گانے اور وہ بھی طویل اور تفصیل کے ساتھ فلمائے ہوئے۔ کبھی مسخروں کی طرف سے ہنسانے کی کوشش، کبھی کشمیر کے مناظر کی سیر — اور ان کے علاوہ بہت سی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن ان میں ہم آہنگی، ربط اور ہر واقعہ ہر بات کے جواز کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔

او۔ پی نیر دو ڈھائی سال سے بالکل بجھے بجھے سے اور آوٹ آف مارکٹ تھے۔ اس فلم میں انھیں دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا گیا لیکن صبح کا بھولا شام کو واپس نہیں آیا — دو تین گانوں کی دھنیں کافی محنت سے تیار کی گئی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس فلم کی موسیقی کوئی غیر معمولی نہیں کہی جا سکتی۔ اداکاری کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس فلم کی "ایک حسینہ" (سادھنا) خوب ہے۔ لیکن "ایک مسافر" (جائے مکرجی) اپنی منزل پر پہنچنے میں ناکام اور جگہ جگہ بھٹکتا اور عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ویلن کے کردار کے لیے ہمارے ملک میں ایک سے بڑا ایک فنکار پڑا ہوا ہے لیکن اس فلم میں سدھو ویلن کم اور بدھو زیادہ لگتا ہے — مسخروں کی جوڑی (راجندر ناتھ اور دھومل) ہنساتی کم ہے اور "مسخرا پن" زیادہ کراتی ہے۔ فالی مستری کی عکاسی بہت عمدہ ہے، لیکن وہ بھی فلم کی بے ربطی کا شکار بنے بغیر نہ رہ سکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعض گانوں کے بول بہتر ہیں اور "سچویشن" کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ "ایک مسافر ایک حسینہ" فلمالیہ کی پچھلی دو تصویروں "دل دے کے دیکھو" اور "لو ان شملہ" کے مقابلے میں بہتر کوشش ہرگز نہیں توقعات سے کم ہے۔

میں چپ رہوں گی

جنوبی ہند کی ہندوستانی زبان کی فلمیں بھی عام طور پر ایک خاص ٹائپ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ گھریلو زندگی اور گھریلو کردار اور عام فلم بین طبقہ کو متاثر کرنے والی باتیں ان فلموں کی ایک خصوصیت ہوتی ہیں۔ اے وی ایم کی تصویر "میں چپ رہوں گی" بھی ایک ایسی ہی

کوشش ہے۔ کہانی میں نیا پن نہیں ہے۔ فلم طویل ہے اور کردار زیادہ ہیں بہت سے واقعات اس سے قبل بھی فلموں میں دیکھے جا چکے ہیں۔ اس طرح ایک فلم میں سب کچھ سمو دینے کی کوشش میں یہ فلم بھی بے اثر ہو گئی ہے۔ اس فلم کی سب سے اہم خصوصیت مینا کماری کی اداکاری ہے۔ مینا کماری نے ایک مصیبت زدہ ہندوستانی عورت کے کردار کو ایک بار پھر ادا کیا ہے۔ فلم میں جہاں جہاں اسے موقع ملا ہے اس نے اپنی اداکاری کے گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ ایک منظر میں جب اسے بتایا جاتا ہے کہ اس کا نومولود بچہ ختم ہو چکا ہے اس نے اداکاری کی ان بلندیوں کو چھو لیا ہے، جن بلندیوں کو اس وقت تک ہمارے ملک کی کوئی دوسری اداکارہ چھو نہیں سکی ہے۔ سنیل دت کی اداکاری بس معمولی ہے۔ جاگیردار اپنے مختصر رول میں خوب ہے۔ نانا پلسیکر ایک ہی ٹائپ کی اداکاری کر رہا ہے یہ بات خود اس کے حق میں مفید نہیں ـــــ موہن چھوٹی تیزی کے ساتھ ابھر رہا ہے۔

اس فلم میں ننھے بابلو کی زبان سے جو مکالمے کہلوائے گئے ہیں اور بچے کے کردار کو جس طرح پیش کیا گیا ہے ویسی غلطی کسی صاحب عقل و ہوش کو نہیں کرنی چاہیئے۔

چترگپت کی ترتیب دی ہوئی دھنوں میں نیا پن نہیں ـــــ ایک دوگانے "چاند کہاں کھو گیا" کی دھن فائن آرٹس اکیڈیمی حیدر آباد کے فنکاروں کے مشہور کورس اک چنبیلی کے منڈوے تلے" سے لی گئی ہے۔

روپ کی رانی چوروں کا راجہ

عام ڈگر کی فلموں سے مختلف یہ فلم اپنے جاندار مکالموں، خوبصورت عکاسی اور اچھی موسیقی کے ساتھ اوسط درجہ کی ایک دلچسپ فلم ہے۔ کسی فلم میں مخصوص حالات میں مختلف کرداروں اور مختلف چہروں کو پیش کرنے کے تجربے اس سے قبل بھی کیے گئے ہیں، اور بعض تجربے بے حد کامیاب رہے ہیں اس فلم میں یہ تجربہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہدایت کار اور کہانی نویس اگر مزید کرداروں کو پیش کرتے اور ان کا کہانی سے تعلق پیدا کرتے تو کہانی کی سست رفتاری ختم ہو سکتی تھی ابرار علوی نے مکالموں کو دلچسپ بنانے پر ہی زیادہ توجہ کی ہے۔ بعض مقامات پر مکالمے غیر ضروری طور پر زیادہ اور فرسودہ بن کر رہ گئے ہیں۔ طنز کے تیر و نشتر اتنے تیز اور تیکھے نہیں ہیں جتنے کہ ہونے چاہئیں۔ منورما اور جیون کے کردار خوب ہیں اور ان کا انجام عبرتناک۔ سندر کے کردار پر زیادہ محنت کی جا سکتی تھی۔ ہیرالال کا کردار بھی تشنہ رہ گیا ـــ لیکھک اور بال ودھوا کے کردار نامکمل ہیں۔ اس قسم کی فلموں میں چھوٹے چھوٹے کرداروں، چھوٹے چھوٹے واقعات اور اشاروں کے ذریعہ بہترین کام لیا جا سکتا ہے۔ "روپ کی رانی چوروں کا راجہ" کے ہدایت کار اور لیکھک نے فلم کے اس پہلو پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ فلم کی یہی کوتاہی اس کا سب سے بڑا نقص بن گئی ہے۔ دیوآنند اپنی عمدہ اداکاری کے ذریعہ اور شنکر جے کشن نے اپنی عمدہ موسیقی کے ذریعہ تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ وحیدہ رحمٰن نے (غالباً پہلی مرتبہ) ایک مکمل رقص پیش کیا ہے جو خوب ہے۔ . . . . سنسر بورڈ نے ایک گانے "ارے بھائی ہم تو چلے ہی تھوڑی دیر" میں سے "پی لی" کو کاٹ کر "پالی" بنا دیا ہے۔ سنسر والوں کی یہ حرکت مضحکہ خیز ہے!

تبصرے

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

جام صہبا

اردو غزل کے سلسلے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ لکھنا بیکار ہے۔ کچھ لوگ اب بھی غزل کو اردو شاعری کی آبرو سمجھتے ہیں اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ غزل اب انتہائی ناکارہ اور بے دم ہو چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حشرات الارض کی طرح ابلتے ہوئے شاعروں نے غزل کی جی کھول کر مٹی پلید کی ہے۔ مگر پھر بھی آج کی غزل کسی طرح بھی ایسی نہیں کہ اسے ناکارہ کہہ دیا جائے ابوالخیر صہبا بھی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ "جام صہبا" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ وہ گوشہ نشین شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے مجموعے کو بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ گزشتہ تیس پینتیس برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ جہاں وہ قدیم رنگ سخن کے دلدادہ ہیں وہاں جدید رنگ اور انداز سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اور قدیم اور جدید رنگوں کے اس امتزاج نے ان کی غزلوں کو خاصہ نکھار دیا ہے۔ "جام صہبا" میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں اور قطعات بھی ہیں۔ پیش لفظ عبدالقادر سروری صاحب کا ہے اور نہایت روایتی قسم کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر پیش لفظ نہ بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیوں کہ شاعر کا سب سے بڑا تعارف خود اس کا شعر ہوتا ہے جس کے بعد مزید کسی تعارف کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس مجموعے کی کتابت اور طباعت اچھی ہے نیشنل بک ڈپو حیدرآباد نے اسے شائع کیا ہے اور دو روپے قیمت کچھ زیادہ بھی نہیں ہے۔

(کیف رضوانی)

برگ سبز

بانو طاہرہ سعید ادھر چند برسوں میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ لیکن ان سے بہت سی اچھی توقعات رکھی جا سکتی ہیں۔ حیدرآباد کی شاعرات میں وہ ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بانو نظم اچھی کہہ سکتی ہیں مگر میں سمجھتا ہوں وہ غزل ہی اچھی کہتی ہیں۔ "برگ سبز" میں نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی اور قطعات بھی۔ ویسے دو تین نظموں سے قطع نظر نظمیں بھی بری نہیں ہیں مگر غزلوں کی ہم پلہ نہیں ہیں۔ برسوں بعد ملاقات، الجھنیں، اندھیرا وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔

خارجی مسائل پر خواتین نے بہت کم قلم اٹھایا ہے۔ اس لحاظ سے بانو قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی اور زندگی کے بیشتر مسائل کو انھوں نے غزل میں سمو دیا ہے۔

تغزل کو برقرار رکھتے ہوئے مسائلی شعر کہنے کے بہت سے کامیاب تجربے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ بانو کے پاس بھی بہت سے خوبصورت مسائلی شعر ملیں گے۔ مجموعے میں چند کمزور چیزیں بھی شامل ہیں اگر انھیں نکال دیا جاتا تو مجموعہ اور اچھا ہو سکتا تھا۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہے جس کے لیے مکتبہ سعدی مبارکباد کے قابل ہے۔ قیمت دو روپے۔

(کیف رضوانی)

نیرنگ نظر

روحی علی اصغر حیدرآباد کی ایک اور خاتون شاعر ہیں۔ سلجھی ہوئی فکر، سلاست اور سادگی کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

روحی غزل بھی کہتی ہیں اور نظم بھی۔ مجموعہ چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ عرفانیات کے لیے ہے۔ اس سلسلے میں "نور بصیرت" "خدا" "قدرت کا شاہکار" اچھی نظمیں ہیں۔ دوسرے حصے میں مختلف شخصیتوں پر قلم اٹھایا گیا ہے جس میں مہاتما گاندھی، "قلی قطب شاہ"، "ڈاکٹر اقبال" اور "ٹیگور" پر جو نظمیں ہیں وہ کامیاب ہیں۔ تیسرے حصہ میں مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں جن میں روپ سنگھار، بہشت نظر، نظام ساگر، نمائش، فاتح فضا وغیرہ کامیاب نظمیں ہیں۔ چوتھا حصہ غزلوں کا ہے اور وہ بھی اچھا خاصا ہے۔

یہ مجموعہ باطنی خوبیوں کے ساتھ ظاہری حسن بھی رکھتا ہے۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ (کیف رضوانی)

حیدرآباد کا سب سے بڑا ہوٹل

• مقوّی غذاؤں • فرحت بخش چائے • مفرح مشروبات

اور خوش خدمتی کے لیے آپ اپنا جواب ہے

مدینہ ہوٹل

فون نمبر (۴۶۸۶) مدینہ بلڈنگ

ہماری خصوصی پیش کش :۔ ایرانی مصری

ہمیشہ تازہ اسٹاک

جھینگا۔ بمبل مچھلی اور تمام اقسام کی خشک مچھلیاں

واجبی داموں پر

ہم سے خریدیئے

فش سنڈیکیٹ

منڈی میر عالم حیدرآباد

پروپرائٹر :۔ مبارک بن عمر



گجرات میں برقی کی ترقی

- ۳۰ ملین واٹ کا سیٹ سابرمتی پاور اسٹیشن پر نصب کیا گیا۔
گجرات میں برقی قوت کی سپلائی میں اضافے کی کئی اسکیمیں رو بہ عمل آ رہی ہیں۔
- گجرات میں روز بروز بڑھنے والی موجودہ اور نئی صنعتوں میں برقی قوت کی سپلائی کی ممکنہ کوششیں جاری ہیں۔
- تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے خاتمے پر گجرات اسٹیٹ میں جملہ نصب شدہ برقی قوت کی گنجائش ۵۷۱ ملین واٹ ہوگی

برقی قوت کی پیداواری اسکیمیں

	جملہ نصب شدہ گنجائش	تاریخ تکمیل پراجکٹ
۱۔ دھوراں تھرمل پاور پراجکٹ	۲۵۴ ملین واٹ	۱۹۶۳ء کے اختتام تک
۲۔ کنڈلا سیلم اسٹیشن توسیعی اسکیم	۱۶ ملین واٹ	۱۹۶۳ء کے اختتام تک
۳۔ شاہ پور تھرمل توسیعی اسکیم	۱۶ ملین واٹ	۱۹۶۳ء کے اختتام تک
۴۔ ۱۳۱ء۹۲ لاکھ کی ڈیزل اسکیمیں (ویجاپور، گندلوی، جام نگر اور رولبھ و دیانگر)	۴۸ء۴ ملین واٹ	اپریل ۱۹۶۳ء کے اختتام تک

برقی قوت کی سپلائی کی صورت حال

۱۔ دوسرے منصوبے کی ابتدا میں جملہ نصب شدہ گنجائش	۲۱۳ء۲۸ ملین واٹ
۲۔ دوسرے منصوبے کے اختتام پر	۳۰۱ء۷ ملین واٹ
۳۔ تیسرے منصوبے کے اختتام پر متوقع نصب شدہ گنجائش	۵۷۱ ملین واٹ

دیہات میں برقی قوت

۱۔ دوسرے منصوبے کے آغاز میں ان دیہاتوں کی تعداد جہاں برقی قوت پہنچ چکی ہے	۱۰۵
۲۔ دوسرے منصوبے کے اختتام تک	۶۴۳
۳۔ تیسرے منصوبے کے اختتام تک ان دیہاتوں میں برقی قوت پہنچ چکی ہوگی	۱۱۴۳

نامہ

حیدرآباد



Re. 1/-

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

زرِ سالانہ : ہندو پاک سے (۱۰) روپے۔ ششماہی (۶) روپے۔ بیرونِ ہند سے (۲۰) شلنگ

شمارہ (۹، ۱۰) ۔ جلد (۸) ۔ ماہ، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ء ۔ قیمت : ایک روپیہ

ماہنامہ حیدرآباد دکن

صبا

فون (۵۲۰۲)

ایڈیٹر :- سلیمان اریب

کتابت :- محمد مظہر

پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ : ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۷۰۲) کراچی ۲

پروپرائٹر، پرنٹر، پبلشر سلیمان اریب ● ۷، اجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ● مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان

اس شمارے میں

سرورق:- بیکسی   عمل:- فاطمہ احمد

پہلی بات

۷ نومبر کو مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے انتقال کو پورے سو سال ہو چکے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر نہ صرف ذوق و غالب اور مومن و شیفتہ جیسے باکمال شعراء اور مولانا فضل حق خیرآبادی و مفتی صدر الدین آزردہ جیسے جید علماء کا مربی اور خود بھی ایک صاحب دل شاعر تھا بلکہ وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک ایسا ہیرو بھی تھا جس نے ناموس وطن پر اپنا تخت و تاج اور اپنے بیٹوں کے سر تک نچھاور کر دیئے۔ اس شاعر اور مجاہد بادشاہ کی صد سالہ برسی منانے کا حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت ضروری بھی تھا اور مستحسن بھی ہے۔

ہم چاہتے تھے کہ اس نمبر میں بہادر شاہ ظفر کے بارے میں کم سے کم ایک سیر حاصل مضمون دیتے ہوئے ان کی شاعری کا مختصر سا انتخاب بھی پیش کریں۔ لیکن افسوس کہ ہم یہ معمولی خراج عقیدت بھی پیش نہ کر سکے۔ انشاء اللہ دسمبر کے پرچہ میں یہ دونوں چیزیں شامل رہیں گی۔

— ۰۰ ۰۰۰ ۰۰ —

"صبا" کا یہ شمارہ کئی حیثیتوں سے آپ کو پسند آئے گا۔
سراج اورنگ آبادی کی غزلوں سے انتخاب، مولانا عبد الماجد دریابادی کا مضمون، "ڈاکٹر اشرف مرحوم پر پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر آل احمد سرور، میکش اکبرآبادی اور اسد اللہ کے مضامین۔ ان کے علاوہ "عقیدے کی بازیافت" کے عنوان پر پروفیسر داملے کا مضمون (مترجمہ مغنی تبسم) اور قطب شاہی طرز تعمیر پر مولوی غلام ربانی کا مضمون۔ شاعری میں سکندر علی وجد، عبد العزیز خالد، فضا ابن فیضی اور راکبر حیدرآبادی کی غزلیں اور شمیم کرہانی، جگن ناتھ آزاد، شہاب سرمدی اور میر ہاشم کی نظمیں اور قطعات، پھر آسکر وائیلڈ اور ٹیگور کی دو خوبصورت کہانیوں کے کامیاب ترجے جو محمود جبین (ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی) اور اشتیاق بچھرایونی نے کیے ہیں۔ اور آخر میں یوسف ناظم کے مواعظ۔

— ۰۰ ۰۰۰ ۰۰ —

"صبا" کو دیدہ زیب اور مستحکم بنانے کے لیے اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا آپ کا فرض ہے۔

— ۰۰ ۰۰۰ ۰۰ —

"صبا" ڈاکٹر زور اور شاہد صدیقی پر بہت جلد اپنے خصوصی نمبر پیش کریگا

صفِ ماتم

۲۵ستمبر کو کشمیر میں ڈاکٹر زور کا انتقال ہوگیا یعنی ایوانِ اردو کا ایک اور مضبوط ستون گر گیا۔ دنیائے اردو سے ایک اور پیکرِ عمل اٹھ گیا۔ ڈاکٹر زور کی موت ایک محقق، ایک ماہرِ لسانیات، ایک نقاد، ایک استاد، اردو کے ایک بےلوث خدمت گزار اور قومی یکجہتی کے ایک پرجوش علمبردار کی حیثیت سے واقعی اتنا بڑا ثقافتی اور قومی نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر زور نے اردو ادب کے دکھنی دور پر جو یادگار کام کیا ہے ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات کی شکل میں قدیم مخطوطات اور کمیاب کتابوں کا جو بے مثل ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ایوانِ اردو کے روپ میں سرزمینِ دکن کو اینٹ اور پتھر کی جو خوبصورت نشانی دی ہے اور ڈاکٹر زور نے یومِ محمد قلی قطب شاہ کی بنیاد ڈال کر قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی جو عظیم روایت قائم کی ہے وہ ہمیشہ ان کے نام کو زندہ رکھے گی، اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا زور صاحب کی اردو سے غیر معمولی محبت، ان کی گرانقدر ادبی خدمات ان کی بےپناہ تنظیمی صلاحیتوں اور ان کی علمی و عملی شخصیت کی بڑائی کا احساس ہم میں پیدا ہوگا۔ ابھی تو ہم ان کے کارناموں کو تعصب کی عینک کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ افسوس کہ زور صاحب نے ساٹھ برس کی عمر بھی نہیں پائی۔

۱۲ اکتوبر کی رات کو اردو کے مشہور کہن سال شاعر حضرت نوح ناروی الہ آباد میں انتقال کر گئے۔ نوحؔ، داغؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور ایک مسلم الثبوت استادِ فن۔ انتقال کے وقت نوحؔ کی عمر نوے سال کے لگ بھگ ہوگی۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں حکومتِ ہند ان کو دو سو روپے اور حکومتِ یو۔پی سوا سو روپے وظیفہ دیتی تھی۔

پچھلے ماہ موت نے قابل اجمیری کو ہم سے چھین لیا۔ قابل اجمیری نے کم عمری ہی میں اپنی شاعرانہ حیثیت منوالی تھی۔ اردو غزل کو اس جواں مرگ شاعر سے بڑی امیدیں تھیں۔

۱۳ نومبر کی رات کو ڈاکٹر غلام یزدانی اس جہاں سے سدھار گئے۔ ڈاکٹر یزدانی کا وطن یوں تو دہلی تھا لیکن وہ تقریباً پچھلے پچاس سال سے حیدرآباد میں رہ رہے تھے۔ اور حیدرآباد کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر یزدانی ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے ملک کے ان گنے چنے بزرگوں میں شمار کیے جاتے تھے جن کی بیرونِ ملک بھی بڑی عزت تھی۔ حیدرآباد کی حکومت میں وہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ڈائرکٹر تھے۔ ان کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایڈورڈ ہشتم کی سالگرہ کے موقع پر انھیں O.B.E کا خطاب دیا گیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی، اور ۱۹۵۹ء میں حکومتِ ہند نے انھیں پدما بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔ یزدانی نے اپنے فن پر اردو اور انگریزی میں کئی بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ جن کو اہلِ نظر اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھتے ہیں۔ انتقال کے وقت یزدانی صاحب کی عمر پورے اسّی سال تھی۔

سراج اورنگ آبادی

اے جانِ سراج ایک غزل درد کی سن جا
مجموعۂ اول ہے دیوان ہمارا

گھٹا غم، اشک پانی آہ بجلی
برستا ہے عجب برسات تم بن

زنجیر بھلی قید بھلی موت بھی جیوں تیوں
پن حق نہ کرے کس کو گرفتار کسی کا

دامن تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں
کیا خاک میں ملی ہیں مری جاں فشانیاں

گلی میں یار کی ہر بوالہوس کو بار کہاں
نشانِ گلشنِ فردوس زاغ پاتا نہیں

عالم دیوانگی کیا خوب ہے
بے کسی کا واں کسی کو غم نہیں

جہاں مجھ غم کی آتش جلوہ گر ہے
وہاں دوزخ کا قصہ مختصر ہے

روشن ہے سبب عشق کے کیفیتِ عالم
آئینۂ دل ساغرِ جمشید ہوا ہے

تڑپنا، تلملانا، غم میں جلنا، خاک ہو جانا
یہی ہے افتخار اپنا یہی ہے اعتبار اپنا

بہت محال ہے ہونا سراج کی مانند
برہ کی آگ میں جلنے کی گو کوئی لاف کرو

چشم ساقی کے وصف لکھتا ہوں
لے قلم ہاتھ شاخِ نرگس کا

تم نے پائی ہے حسن کی دولت
پوچھتے کیا ہو حال مفلس کا

بے کسی مجھ سے آشنا ہے سراج
نیں تو عالم میں کون ہے کس کا

ہوئی جوشِ محبت سے زباں بند
صنم کا درمیاں جب نام آیا

جس پھول نے ترے سے کیا دعوئے جمال
وہ پائمالِ آفتِ بادِ خزاں ہوا

مصحفِ حسن کو دکھا، کہ ہوا
تیری زلفوں سے دین میں اشکال

دوانے دل کو سمجھاتا ہوں لیکن
کہاں لگ ہو کوئی حائل کسی کا

حجابِ جلوۂ دیدار ہے مجھے مانع
وگرنہ یار سے آساں ہے ہم زباں ہونا

نیاز و عجز و ارادت، یہ سب مری تقصیر
پہ یہ نگاہِ تغافل، گناہ کس کا ہے

میری طرف سے یار کو جا بول اے سراج — عالم ترے جمال کا امیدوار ہے
لے لیے سب سے خط آزادی — ہم تو آپ ایک کے غلام ہوئے
بیان عشق کی بے ہودہ گفتگو مت کر — نہیں سراج یہ قصہ تمام ہونے کا
طواف کعبۂ معنی کو جا یار — نہ کر صورت میں یہ اوقات مصروف
پی کر شراب شوق کو بے ہوش ہو بے ہوش ہو — جیوں غنچہ لب کو بند کر خاموش ہو خاموش ہو
تجھ کو اگر ہے آرزو اس خوش ادا کے وصل کی — اے دل سراپا شوق میں آغوش ہو آغوش ہو
ترے سلام کی درج دیکھ کر میرے دل نے — شتاب آ کے مجھے رخصتی سلام کیا
مجھے نگاہ تغافل رقیب پر الطاف — ادائے مصلحت آمیز نے غلام کیا
اور عاشقوں مثال مجھے تم نہ بوجھیو — سب مبتلائے عام ہیں میں مبتلائے خاص
خون دل آنسوؤں میں صرف ہوا — گر گئی یہ بھری گلابی سب
یا برگ گل پہ سبزۂ سیراب ہے عیاں — یا لعل لب پہ خط زمرد نگار ہے
رخسار یار حلقۂ کاکل میں ہے عیاں — یا چاند ہے سراج اماوس کی رات کا
مشتاق ہوں میں تیری فصاحت کا ولیکن — رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز
صبر کے باغ کے منڈوے سے جھڑا ہوں جیوں پھول — اب تو لاچار گلے ہار ہوں، کن کا اُن کا
گلشن وصل میں رہتا ہوں غزل خوان فراق — عندلیب گل رخسار ہوں، کن کا اُن کا
حال دل اشک و آہ سے پوچھو — نہیں غلط دو گواہ سے پوچھو
دل آشفتہ کا مرے احوال — اپنی زلف سیاہ سے پوچھو
روشنی اس جمال روشن کی — تابش مہر و ماہ سے پوچھو
دیوانے کو مت شور جنوں یاد دلاؤ — ہرگز نہ سناؤ اسے زنجیر کی آواز
ہم فقیروں پر ستم جیتے رہو — خوب کرتے ہو بجا کرتے ہو تم
یا تو گلزار آپ ہو جانا — یا کسی گلبدن کے ہو رہنا
دو رنگی خوب نہیں یک رنگ ہو جا — سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا
تکیۂ مخمل سرہانے رکھ — لیکن آنکھوں سے اپنی خواب نکال
کام جاہل کا ہے سخن چینی — اے سراج اس کو تو جواب نہ دے

زبانِ حال سے کہتا ہے ان کا نقش قدم   بہشتِ دیدہ و دل خوش قدوں کی گلیاں ہیں
مینائے تن میں بوجو غنیمت مئے حیات   جیوں، دورِ جام دورِ فلک بے درنگ ہے
ہمیشہ دورِ عالم مختلف ہے   کہ ہے گردش میں ہردم نیلگوں طاس
آبِ رواں ہے حاصلِ عمرِ شتاب رو   دہرِ فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا
عوض نقد دعا کے مفت ہے دشنام اس لب سے   ارے دل عشق کے سودے میں پھر تکرار مت کیجو
چشمِ عبرت سے تماشائے جہاں کرتا ہوں   خاک در خاک ہے یہ انجمن گل در گل
روشن ہے اے سراج کہ فانی ہے یہ جہاں   مطرب غلط ہے جام غلط، انجمن غلط
اے زاہد و تمھیں فردوس کی تمنا ہے   ہمیں تو آگ میں گلزار کا تماشا ہے
زاہدِ خشک کو شراب نہ دے   آگ دے خار و خس کو آب نہ دے
اگر مسجد میں اے زاہد وہ مستِ نیم خواب آوے   ترے ہر دانۂ تسبیح سے بوئے شراب آوے
سنا ہے جب سے ترے عشق کا شور   لیا زاہد نے مسجد کا کنارا
اگر خواہش ہے تجھ کو اے سراج آزاد ہونے کی   کمندِ عقل کو اپنے گلے کا ہار مت کیجو
خدا جانے اٹھے کیا دھوم میخانے میں عالم کے   اگر دل نشۂ بے اختیاری میں بہک جاوے
کہتے ہیں تری زلف کو دیکھ اہلِ شریعت   قربان ہے اس کفر پر ایمان ہمارا
اگر ثابت ہے اے دل کفر میں تو   قیامت میں یہی اقرار کرنا
مشربِ عشق میں ہے شیخ و برہمن یکساں   رشتۂ سبحہ و زنار کوئی کیا جانے
کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کی   آخرش دونوں کا سنگم ایک ہے
گر حقیقت کی سیر ہے خواہش   راہِ عشقِ مجاز لازم ہے
شربتِ دیدار کے بن زندگانی ہیچ ہے   بے رخِ ساقی حیاتِ جاودانی ہیچ ہے
کب نظر آوے گا یارب وہ مرا آرامِ جاں   دوست بیگانے ہوئے جس دل ربا کے واسطے
کاش کے بر میں نہ ہوتا پیرہن   یہ گریباں درد کا غماز ہے
پنہاں رکھو جگر میں برہ آگ جیوں سراج   پوشیدہ رازِ عشق کو مشہور مت کرو
نہ پوچھو خود بخود کرتا ہوں تعریف اس کے قامت کی   کہ یہ مضمون مجھ کو عالمِ بالا سے آتے ہیں
ادائے دل فریب سرو قامت   قیامت ہے، قیامت ہے، قیامت ہے
دیکھا ہے جس نے مصرعِ موزونِ قدِ یار   دیوانِ حسن کا ہے اسے انتخاب یاد

ہر صفحہ اس کے حسن کی تعریف کے طفیل — گلشن ہوا، بہار ہوا، بوستاں ہوا
نازک بدن سے مت مل کئی بار میں کہا ہوں — جامن تری خوشی ہے رسوائے عام ہونا
پتلی ہماری نین حجرے کے میں بیٹھ کر — بیکل ہو جھانکتی ہے پیارا کب آئے گا
میں سمجھا تھا کہ اس یار کا ہے نام و نشاں — یار بے نام و نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ہمارا خونِ ناحق نیں ہوا ضائع ارے قاتل — زمیں سے گل ہو نکلا آسماں پر ہو شفق پھیلا
مدتوں لگ حرم و دیر پھرا — میں ترے واسطے کیا کیا نہ کیا
جل گیا شوق کے شعلوں میں سراج — اپنی ذات میں بے جا نہ کیا
پلا کر جام اپنی چشم کی گردش سے پے در پے — کیا ساقی نے مجھ کو بے خبر آہستہ آہستہ
مرے حالِ پریشاں کی حقیقت کو سنا جا کر — صبا کوچے میں گل رو کے گزر آہستہ آہستہ
نہ پہنچے گا انجام کو یہ تسلسل — تمہاری جفائیں ہماری وفائیں
خلوت انتظار میں اس کی — در و دیوار کا تماشا ہے
جو چڑھا دار پر ہوا منصور — یہ محبت کی پہلی منزل ہے
سرِ منصور ہے انگور نہیں ہے — شجر دار کا بار او رہی ہے
کیا ہوا گرچہ یار ہے نزدیک — آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
ہوش کھونے کو مئے نہیں درکار — گردشِ چشم مست کافی ہے
خودی ہے کفر اگر ہم اٹھیں تو یہ جاوے — ہمارے بعد خودی جانے یا خدا جانے
خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی! — نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
چلی سمتِ غیب سے وہ ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا — مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

(ایڈیٹر)

عبدالماجد دریابادی

اردو کے چند مظلوم ادیب

شہرت اور کمال فن مترادف نہیں کتنے طبیب حاذق شہرت عام سے محروم رہ جاتے ہیں، اور کتنے ہی "نام آور" طبیب حذاقت فن سے کورے نکل جاتے ہیں، اور ایک طب پر موقوف نہیں، شعر، ادب، صحافت، وکالت ہر علم و فن اور پیشہ میں یہی حال نظر آتا ہے۔ اس وقت اردو کے چند ایسے ہی ادیبوں کے نام گنا دیتے ہیں جنھیں شہرت کا وہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ ہر طرح مستحق اپنے کمال فن کے لحاظ سے تھے ـــــ غیر معروف رہ جانے کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں، اور رہتے ہیں، یہاں مقصود ان اسباب کی تشخیص اور ان کا تجزیہ نہیں بلکہ نفس واقعہ یعنی ان ادیبوں کی غیر معروفیت بلکہ مظلومیت کا ذکر کر دینا ہے۔

ان مظلوموں میں نمبر اول پر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ مولانا کی نفس شہرت میں کلام نہیں ان کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ اس نے ملک و ملت کے گوشہ گوشہ پر اثر ڈالا ہے اور ہندوستان کی دنیا ان کے نام کی آواز سے گونج رہی ہے۔ سوال ان کی عمومی شہرت کا نہیں ان کی ادبی شہرت کا ہے۔

تاریخ ادب اردو میں اب تک خدا معلوم چھوٹی بڑی کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں سے کتنوں میں ان کے ادبی مرتبہ کا ذکر ہے؟ اسے بھی جانے دیجئے۔ ان کا نام نامی ہی کتنی ادبی کتابوں میں آیا ہے؟ ان کی کتابیں سرکاری و خانگی، ملکی و ملی، کتنی درسگاہوں کے ادبی نصاب میں داخل ہیں؟ کتنوں کو اس کا علم ہے کہ ان کی تحریریں اردو ادب و انشاء کے بہترین نمونوں کا کام دے سکتی ہیں؟ کتنے اس سے باخبر ہیں کہ مولانا کی سیاسی سربلندیوں اور مذہبی عظمتوں میں ایک بڑی حد تک دخل مولانا کے ادب و انشاء کو بھی رہا ہے؟

کتنوں کی رسائی اس حقیقت تک ہے کہ موافقین ہی نہیں مولانا کے مخالف بھی ان کے کمال انشا کے قائل و معترف اور ان کے زور قلم سے متاثر رہے ہیں؟ بہتوں کے کان میں یہ بھنک بھی نہیں پہنچی ہے کہ مولانا کی نظر، زبان خصوصاً زبان دہلی کے کن کن گوشوں اور باریکیوں پر تھی اور انھیں زبان کے محاورات، کنایات، تلمیحات پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔

مولانا ابوالکلام کے ساتھ ہی دہلی کے مظلوم ادیب خواجہ حسن نظامی کی یاد آ جاتی ہے ان کے قلم میں آزاد کی سی عظمت و بلندی تو نہ تھی لیکن سلاست اور دل نشینی درد و گداز ترنم و شیرینی تاثیر و کشش میں خواجہ صاحب کسی سے

پیچھے نہ تھے ابوالکلام اگر خواص کے ادیب تھے تو خواجہ صاحب عوام کے اور دہلی کی مستند اور ٹکسالی زبان پر عبور میں یہ اپنی نظیر آپ تھے۔ عام اردو داں طبقہ کو سکھانے پڑھانے، اسے مہذب و شائستہ بنانے، اسے ادب قاعدہ سے لگانے میں جو حصۂ عظیم خواجہ صاحب کا رہا ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی اور کسی ایک انسان کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔ رنج کی بات ہے کہ ایسے محسن اردو کو اس درجہ بھلا دیا گیا! اور بھلا کیا دیا گیا، انھیں اردو ادب کے تاریخ نویسوں نے یاد ہی کب رکھا تھا کسی تاریخ ادب میں غریب کا نام تک بھی شاید نہیں آنے پایا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی علمی فاضلانہ، محققانہ شخصیت ہندوستان و پاکستان ہی کو نہیں کہنا چاہیئے کہ عالم اسلام کو مسلم ہے۔ لیکن انتہائی حق تلفی سید صاحبؒ کی ادبی حیثیت سے ہو رہی ہے۔ مدیر معارف اور مصنف نقوش سلیمانی کی ذات اس کا حق رکھتی تھی کہ اس کے ادب پارے نصاب ادب کے مختلف کلاسوں میں داخل ہوتے اور تاریخ ادب کے اوراق میں اس کا ادب و احترام کے عنوان جلی کے ساتھ درج ہوتا۔

مولانا محمد علی کا نام ملک و ملت کے بلند پایہ رہنما اور ایک فعال عوامی لیڈر کی حیثیت سے ممکن ہے کہ رہتی دنیا تک رہ جائے اور نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے مسلم و غیر مسلم بلکہ عالم اسلام کے باشندے بھی انھیں خراج عقیدت مدتوں ادا کرتے رہیں جوہر کے شاعرانہ جوہر اور ایڈیٹر کامریڈ کی انگریزی انشا پردازی بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو مسلم رہے، لیکن مولانا نے باوجود اردو کے معنف ہونے کے، اپنے سیکڑوں اردو مقالوں اور خطبوں سے جو مستقل اثر اپنے وقت کے اردو ادب پر چھوڑا ہے اس کی طرف سے آنکھ بند کر لینا ایک اعلیٰ درجہ کی حقیقت ناشناسی ہی ہے، محمد علی کی ہر تحریر، خواہ وہ خفگی اور غصہ کے ہیجان میں لکھی گئی ہو، یا مسرت و انبساط کے جوش میں، مایوسانہ ہو یا پر امید بہر حال اور ہر صورت میں اپنے اندر ایک جان رکھتی تھی اور اپنے لکھنے والے کی زندہ، متحرک، فعال جاندار شخصیت کی آئینہ دار بھی ہوتی تھی، ظلم ہے ظلم کہ ایسے جاندار ادیب کو ادب کی تاریخ میں جگہ نہ ملے۔

دہلی کے راشد الخیری اور لکھنؤ کے رتن ناتھ سرشار دونوں کے نام افسانہ نویس کی حیثیت سے اب بھی زندہ ہیں، اور افسانہ بھی ادب ہی کی ایک شاخ ہے، لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کے نام خالص ادب کی تاریخ میں بھی جگہ پائیں۔۔۔ افسانوی دلکشی سے بالکل قطع نظر دونوں کے ان اوراق میں گویا دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں کا عطر کشید کیا ہوا موجود ہے۔ اردو زبان کی ترکیبوں، تشبیہوں، شعروں، تلمیحوں، محاروں کے لیے دونوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ریاض خیرآبادی اور حسرت موہانی بھی اس باب میں کم نصیب ہی واقع ہوئے ہیں۔ دونوں کی شاعرانہ عظمت مسلم، دونوں کے رتبۂ استادی کا بھی اعتراف سب کو ہے لیکن طلبۂ ادب کی اس محرومی کو کیا کہیے کہ نہ ریاض کے ناولوں اور ریاض الاخبار کی زبان کی شستگی و لطافت کی کسی کو کانوں کان خبر اور نہ حسرت کے اردوئے معلیٰ کی اردو آموزی اور ایک پختہ اور مستقل طرز نگارش سے کوئی واقف۔ حضرت اکبر الہ آبادی بہ حیثیت شاعر، شہرۂ آفاق ہیں لیکن شاعری کی یہ شہرۂ آفاقی ان کی نثاری کے حق میں حجاب اکبر بن گئی۔ کم تر ہی کسی کو علم ہوگا کہ اکبر ایک زمانہ میں اودھ پنچ میں خوب داد نثر نگاری

دے چکے ہیں۔ وہ چہرۂ ادب کی مشاطگی کے لیے بالکل کافی ہیں۔ چھوٹے ہلکے پھلکے، سبک و لطیف جملے ادب و انشا کی جان! لکھنؤ کے منشی سجاد حسین (اودھ پنچ کے ایڈیٹر اور کئی ناولوں کے مصنف) اور دہلی کے میر ناصر علی (صلائے عام کے ایڈیٹر) بھی عجب کس مپرسی کا شکار ہو کر رہے ہیں۔ صلائے عام کا دائرہ اشاعت تو خیر پھر محدود تھا لیکن اودھ پنچ تو اپنے زمانہ میں خوب چمکا۔ وقت کے خواص و عوام دونوں طبقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ آج یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دونوں میں سے کسی کا وجود ہی کبھی نہ تھا۔ زبان کی صحت کا دونوں کو خاص اہتمام بلکہ التزام تھا۔ اور اودھ پنچ اور اس کے اڈیٹر کے ناولوں کے چٹکلے اور لطیفے تو کہنا چاہیئے کہ زبان زدِ عام ہو چکے تھے۔

لیکن وائے زمانہ!

ع کوئی لیتا نہیں اب اُن کا نام

مرزا فرحت اللہ بیگ اور قاضی عبدالغفار تو گویا ابھی کل ہی تک ہمارے درمیان زندہ و سلامت تھے اور کس دلآویزی سے کس خوش نوائی سے چہکتے رہتے تھے۔ آناً فاناً نذرِ فراموشی ہو گئے۔ مرزا صاحب کی ٹکسالی اردو کا کیا کہنا اہلِ زبان ہی تھے اور ان کے لطیف و جمیل نثر کا کیا پوچھنا۔ قاضی صاحب گو اہلِ زبان نہ تھے لیکن ابھی جیتے جاگتے، بندہ ایسے ہی صحت زبان کے اہتمام کے ساتھ کسی اہلِ زبان سے کم بھی نہ تھے۔ حیف کہ اتنی جلد دونوں طاقِ نسیاں پر بٹھا دیے گئے ابھی کچھ دنوں تو دونوں کو بہرحال رونقِ بزمِ ادب رہنا تھا —— اور یہ تثلیث مکمل ہو جائے اگر اس ذیل میں نام عبدالمجید سالک کا بھی لے لیا جائے یہ محض اتفاق ہے کہ سالک مرحوم اخبار نویس ہو پڑے ورنہ ان کا قلم صحافت سے زیادہ ادب کے میدان میں رواں تھا، اور اگر کسی کو ان کے صحافی ہی رکھنے پر اصرار ہو جب بھی انھیں ایک ممتاز ادیب صحافی تو بہرحال ماننا پڑے گا۔

سید محفوظ علی بدایونی (علیگ) اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (صدر یار جنگ) بھی اپنی اپنی جگہ پختہ قلم ادیب ہوئے ہیں۔ ایک ظریفانہ رنگ میں دوسرے سنجیدہ شوخی لیے ہوئے دونوں کے چند مقالے بھی اگر پڑھ لیے جائیں تو ذوقِ سلیم پر جلا ہو جائے اور شریفانہ ادب کے معنی روشن ہو جائیں۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام اور کام مدتوں چلا۔ لڑکوں کی کم سے کم دو نسلوں کو اردو تو انھیں ریڈروں سے آئی جو بڑا کام وہ کر گئے اسے مٹنا کبھی بھی نہ تھا الیاس احمد مجیبی بیچارے ع

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

کے مصداق ثابت ہوئے۔ مشہور ہونے ہی کہاں پائے تھے کہ گم نام ہو گئے! لیکن بچوں کے ادب کے لیے جو کام کر گئے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ کوئی دوسرا ان کی ٹکر کا نظر نہیں آتا۔

اور مرحومین کی فہرست میں سب سے آخری چودھری محمد علی ردولوی "آخر" ترتیب زمانی کے لحاظ سے نہ کہ مرتبہ و حیثیت ادبی کے لحاظ سے لکھنؤ کی پیاری زبان کے ماہر، بات بات میں موتی پرونے والے جس نے انھیں نہیں پڑھا وہ لطف زبان کے چٹخارے سے ہی محروم رہا —— اور جی میں آتا ہے کہ خواجہ عبدالرؤف عشرت کا نام خاتمہ پر لا کر ان سارے

گمنام و مظلوم خادمان ادب پر حسرت کے ساتھ فاتحہ خیر پڑھ دیجئے۔

زندہ حضرات پر قلم اٹھانا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ماشاء اللہ ان کی تعداد بھی خاصی بڑی۔ پھر بھی دو چار نام لیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی، ثم لاہوری۔ سید ہاشمی فرید آبادی ثم لاہوری، اور ملا واحدی دہلوی ثم کراچوی۔ اپنے اپنے طرز خاص کے مالک ہیں، اور جس ادبی شہرت کے مستحق ہیں وہ اب تک ان کے حصے میں نہیں آئی ہے واحدی صاحب کا طبعی انکسار انھیں گمنام رکھنے میں مدد دے رہا ہے، اور سید ہاشمی کو روشناسی مورخ کی حیثیت سے کچھ اس غضب کی ہوئی کہ ان کے ادبی چہرہ کا رنگ روپ سب ماند ہی پڑ گیا، اور ایسا ہی میر صاحب لاہوری کا ہے۔ ابوالکلام ثانی تو کوئی اب ہونے سے رہا۔ پھر بھی ابوالکلامی طرز و اسلوب کی کچھ جھلکیاں اگر نظر آتی ہیں تو میر ہی کے ہاں۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی کے "حضرت آوارہ" (سید آل عبا مارہروی) اپنی ذات سے خود ایک انجمن یا ادارہ ہیں۔ ہر ہر طبقہ کی زبان پر جو عبور کامل انھیں ہے وہ بس ان ہی پر ختم ہے اور جو میرے لیے قابل رشک ہے اور زبان سے مراد محض الفاظ کا تحریری استعمال نہیں بلکہ تلفظ اور لب و لہجہ اور آواز کا اتار چڑھاؤ سب اسی میں داخل ہے۔ "من کی موج" کے مصنف کی یہ گمنامی جتنی حیرت انگیز ہے، اتنی ہی طلبا ادب کے لیے تاسف انگیز بھی۔ مدیر معارف مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی (مصنف ادبی نقوش) اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آفتاب احمد ردولوی کبھی کبھی سادہ سلیس، شگفتہ زبان لکھنے والوں میں ممتاز ہیں۔ لیکن اپنے استحقاق سے کہیں کم درجہ مشہور —— اور ڈاکٹر عابد حسین (جامعہ ملیہ والے) کا ادبی کام گو مقدار و کمیت میں بہت کم ہے لیکن کیفیت و درجہ میں بہتوں سے زیادہ بلند —— گمنام ترین ہستی ان ادبی مظلوموں کی فہرست میں علیگڑھ کے مرد بزرگ مولوی مقتدیٰ خاں شروانی اطال اللہ عمرہٗ کا ہے بلکہ عجب نہیں جو بہت سے اس پر چونک پڑیں کہ ان کا نام ادیبوں کے زمرہ میں آیا کیسے!

سب سے آخری نام فہرست میں جوش ملیح آبادی ثم کراچوی کا آتا ہے جن کی شاعری کی دھوم دھام نے ان کی نثر نگاری کے چہرہ پر گہرا نقاب ڈال رکھا ہے۔ الفاظ کے صحیح و بامحل استعمال پر جو قدرت انھیں حاصل ہے کم ہی کسی کو ہے اور زبان کے جن جن گوشوں پر ان کی نظر پہنچ چکی ہے کم ہی کسی ادیب کی پہنچی۔ (لکھنؤ سے براڈکاسٹ)

مجنوں گورکھپوری

ڈاکٹر اشرف

آج اخبار میں ڈاکٹر اشرف کی موت کی خبر پڑھی تو دل دھک سے ہو کے رہ گیا۔ کسی طرح یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہا کہ یہ خبر صحیح ہے۔

اشرف کو میں ۱۹۲۶ء سے جانتا ہوں جب کہ وہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور میرے والد مولوی محمد فاروق صاحب کی نگرانی میں رہتے تھے جو اس زمانہ میں وہاں شعبۂ ریاضیات میں لیکچرر تھے۔ ان دنوں اشرف سے علی گڑھ کے علاوہ گورکھپور میں بھی خاطر خواہ صحبتیں رہتی تھیں اس لیے کہ وہ والد صاحب کے ساتھ چھٹیوں میں اکثر گورکھپور آجاتے تھے پھر ۱۹۳۵ء میں جب ڈاکٹر ضیاالدین مرحوم مجھے علی گڑھ لے آئے تو اشرف سے روز گھنٹوں تعلیم منزل میں ملاقاتیں رہا کرتیں۔ اس کے بعد الہ آباد میں ہر تیسرے چوتھے مہینے ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا، اور میں روز بروز ذہنی اعتبار سے ان کو اپنا ساتھی پاتا گیا۔

پیدائش اور موت اخباروں کی بہت عام خبریں ہیں میں ان خبروں سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کرتا تا نہ مجھے نغمۂ شادی نے کبھی مبہوت کیا اور نہ میں نوحۂ غم میں کبھی مبتلا ہو سکا۔ میرے خیال میں زندگی درحقیقت شادی اور غم دونوں سے بالاتر ہے لیکن خسارہ کا احساس ایسا قدرتی احساس ہے جس سے بڑے سے بڑا قلندر بھی بے نیاز نہیں رہ سکتا اور اشرف کی موت یقیناً ایک خسارہ ہے۔

فکر و ابلاغ کے میدان میں مجھے کم شخصیتیں ملی ہیں جن کے اندر میں نے اتنی رسائی اور ایسی گہرائی پائی ہو۔ گزشتہ ۲۵ سال کی مدت میں جتنی صحبتیں اشرف کے ساتھ رہیں ان میں کوئی صحبت ایسی نہیں تھی جس میں زندگی کے ٹھوس اور اہم مسائل پر تبادلۂ خیالات نہ ہوا ہو۔ تاریخ، تمدن، ہیئت اجتماعی کا ارتقاء، ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کی ابتداء اور ان کی غایت، دنیا بالخصوص ہندوستان کا اقتصادی اور سیاسی مستقبل یہ تھے وہ موضوعات جن پر ہم باتیں کرتے تھے اور میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ یہ شخص نہایت شفاف ذہن اور پُر اعتماد لب اظہار کا مالک ہے اور ہر موضوع پر تحمل کے ساتھ دوسروں کی باتیں سنتا ہے اور جواب میں سلیقہ کے ساتھ اپنی باتیں کہتا ہے۔ اشرف تقریر اور تحریر دونوں کے آداب سے واقف تھے شائستگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے مقام پر قائم رہنا اور اپنے ایمان کو متزلزل نہ ہونے دینا بہت

بڑا کام ہے۔

اشرف کی فکر غیر معمولی حد تک توانا اور جری تھی اور ان کی گویائی شدّت کے ساتھ بے دریغ اور بے باک تھی وہ سوچنے اور اپنی بات کو نظم اور ضابطے کے ساتھ کہنے میں مردِ مجاہد کا انداز رکھتے تھے لیکن قیاس واستدلال کے اصول کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پھر ایک خصوصیت اور بھی تھی جو بڑی قابلِ قدر تھی اشرف محض ایک مفکر یا منطقی نہیں تھے ان کی رگوں میں انسانی خون کی حرارت تھی اور وہ سینے میں بڑا حساس دل رکھتے تھے وہ جب سوچتے تھے تو دماغ کے ساتھ دل شریک ہوتا تھا اور جب وہ محسوس کرتے تھے تو دماغ دل کا رفیق ہوتا تھا۔ ایسے شخص سے ہماری توقعات وابستہ ہوتی ہیں اور ایسا شخص ہمارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن دنیا کی موذی طاقتوں نے اشرف کی زندگی کو پراگندہ رکھا اور روزی کی روٹی کے تردد نے ان کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ ہمارے لیے وہ کچھ کر جاتے جس کے وہ اہل تھے اور جس کو کر ڈالنے کا ان کو ارمان تھا ان سے اس بارے میں اکثر باتیں ہوئیں اور انھوں نے مجھے برابر اطمینان دلایا کہ وہ مواد فراہم کر رہے ہیں اور بہت جلد میری امیدوں کو پورا کر سکیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اہتمام اور التزام اور ضابطے اور سلیقے کے ساتھ کام کرنے والے آدمی ہیں، اور ایسا آدمی کام کرنے میں وقت لیتا ہے لیکن وہ وقت نہ آسکا کہ اشرف کے حوصلے بر دئے کار آتے اور میری طرح سینکڑوں کی امیدیں پوری ہوتیں۔

اشرف تمام بنی نوعِ انسان اور بالخصوص اپنے وطن کی بے لاگ خدمت کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ہمارے وطن ہمارے سماج، ہماری حکومت نے ان کی قدر نہیں کی اور ان کو ضائع ہو جانے دیا۔ ایسی دوسری ضائع ہو جانے والی ہستی... منظر علی سوختہ کی ہے جو ہر طرف سے آزردہ اور مایوس ہو کر کانپور میں گنگا کے کنارے ایک آشرم میں ختم ہو گئے۔ ایسے لوگ ابھی زندہ اور برسرِ اقتدار ہیں جن کو ایک مجرم ضمیر کے ساتھ منظر علی سوختہ کی یاد آرہی ہوگی۔ منظر علی سوختہ اور اشرف دونوں یکساں بے نفس اور سرفروش تھے۔

اشرف کو آج کسی اہم علمی اور ثقافتی ادارے کا سربراہ کار ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے ۱۹۳۵ء کا زمانہ یاد ہے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین کی وائس چانسلری تھی اور پروفیسر حلیم پرو وائس چانسلر اور شعبۂ تاریخ کے صدر تھے۔ نواب اسمٰعیل خاں نے اشرف کو تاریخ کے شعبہ میں جو عارضی جگہ دے رکھی تھی اس کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر ضیاءالدین کی مصلحت نے جس کو پروفیسر حلیم سے تقویت ملی اس کو نامناسب سمجھا کہ جس جگہ پر اشرف تھے اس کو مستقل کیا جائے یا اس کو توسیع دی جائے۔ اشرف بے روزگار ہو گئے اور جب وہ ادارۂ اسلامیات (اس زمانہ میں علومِ اسلامیہ شعبۂ تاریخ کا ایک جز تھا) کھولا گیا تو اشرف نے بہت چاہا کہ اس میں ان کو رکھ لیا جائے وہ علی گڑھ میں رہنا چاہتے تھے اس لیے کہ ان کو علی گڑھ سے محبت تھی اور وہ علی گڑھ کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر ضیاءالدین اور پروفیسر حلیم دونوں نہیں چاہتے تھے کہ اشرف علی گڑھ میں رہیں اس لیے کہ وہ ان دونوں میں کسی ایک کے بھی گون کے آدمی نہ تھے۔ وہ صرف حق و صداقت کے گون کے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا یہ ایک نہایت عبرت ناک واقعہ ہے کہ اشرف جیسے جوہرِ قابل کو یہاں سو روپے (جس کے اس زمانے میں صرف ۹۰ روپے ملتے تھے)

کی ادبی لکچرر شپ نہ مل سکی جب کہ نہ جانے کتنے نااہل اور ردکردہ اشخاص کے لیے یونیورسٹی میں کھپت نکالی گئی۔ اسلامیات میں جس جگہ کے اشرف خواستگار تھے وہ ڈاکٹر امیر حسن کو دی گئی، جن کو ڈاکٹر ضیاالدین کے سر پر سوار ہو کر اپنا مطلب پورا کر لینے کا گر معلوم تھا۔ اس کے بعد اشرف ایسے دل برداشتہ اور بے زار ہوئے کہ شاید پھر علی گڑھ میں ملازمت کا خیال اپنے دل میں نہیں لائے۔ ان کی ساری زندگی پریشان حالی اور پراگندہ روزگاری میں گزر گئی۔ کچھ دنوں سے وہ دلی میں جم گئے تھے اگرچہ ان کے شایانِ شان کام ان کو دلی میں بھی نہیں ملا تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام ناموافق خارجی اسباب و عوامل کا رواقیانہ (STOIC) بے نیازی سے مقابلہ کر گئے اور دو وقت کی روٹیوں کا ذریعہ نکال کے اپنی زندگی میں اب ٹھہراؤ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے نظر آ رہے تھے۔ میں اسی وقت وہ مشرقی جرمنی بلائے گئے میں سن کر خوش ہوا، اس خیال سے کہ اتنی عمر ضائع ہو جانے کے بعد اب اشرف کی شخصیت اور قابلیت کا اعتراف ہوا ہے، اور ان کو وہ منصب دیا گیا ہے جو ایک مدت سے ان کا حق چلا آ رہا تھا۔ مگر اس کو قسمت کی ستم ظریفی کہیے کہ المیہ کا ناگزیر قانون کہ جب اشرف کی زندگی میں ایک اطمینان کی صورت پیدا ہوئی تو انھوں نے خود زندگی سے منہ موڑ لیا۔ وہ ایک ایسے اچانک مرض کی نذر ہو گئے جو جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس سے پہلے ان کو کبھی نہیں ہوا تھا۔

میں اس کو کردار کا المیہ ہرگز تصور نہیں کر سکتا۔ اشرف کردار اور گفتار دونوں میں بڑے سچے اور کھرے تھے۔ جھوٹ کی طاقتیں ہی ان کو تباہ کر سکتی تھیں۔

میں رسمی ماتم کا قائل نہیں اور میری ان غیر مربوط اور منتشر سطروں کو محض تعزیت نہ سمجھا جائے یہ میرے دل کے اصلی تصورات ہیں جن کو میں ضبط نہ کر سکا اور ظاہر کر دینے پر مجبور ہو گیا۔ (عوامی دور)

آل احمد سرور

ڈاکٹر اشرف کی یاد میں

۱۰ر جون کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کہ ڈاکٹر اشرف کا مشرقی برلن میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا جو لوگ ڈاکٹر اشرف سے واقف تھے، ان کے لیے یہ خبر ایک بہت بڑے سانحے کا اعلان تھا۔ اخبار والے تو ان کو صرف ایک مشہور کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے جانتے تھے، مگر ہندوستان کے علمی حلقوں میں وہ اور بھی بہت کچھ تھے تاریخ کے ایک ممتاز استاد اور ایک بلند پایہ محقق، اردو کے بہت اچھے ادیب، شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھنے والے، بڑی شاندار تقریریں کرنے والے، بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک۔ افسوس انھوں نے وطن سے اتنی دور پردیس میں جان دی۔ غالب نے شاید انھیں کے لیے کہا تھا ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

ڈاکٹر اشرف کو پہلے پہل میں نے علی گڑھ کی جوبلی میں ۱۹۲۵ء میں دیکھا تھا۔ میں غازی پور کے ایک اسکول میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ جوبلی کا شوق کھینچ کر علی گڑھ لے آیا تھا۔ یونین میں ایک مباحثہ تھا۔ بڑے بڑے علماء اور لیڈر جمع تھے مگر ان کی موجودگی کے باوجود نوجوان نائب صدر جس قابلیت اور متانت سے مباحثے کو چلا رہا تھا اس سے سب متاثر تھے۔ یہ نوجوان کنور محمد اشرف ہے۔

اشرف نے اس کے بعد الور میں مہاراجہ کے یہاں ملازمت کر لی۔ پھر کسی طرح انگلستان پہنچ گئے۔ وہاں سے تاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد واپس آئے۔ میں ۱۹۳۲ء میں انگریزی میں ایم اے کرنے علی گڑھ پہنچا اور یونین میں تقریریں کرنے لگا۔ وہیں ایک دن اشرف سے ملاقات ہوئی۔ اردو کا آل انڈیا مباحثہ تھا۔ اشرف اور رشید احمد صدیقی جج تھے علی گڑھ کی نمائندگی انصار ہروانی اور میں نے کی۔ موضوع یہ تھا کہ سرمایہ داری کا نظام اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ مجھے مخالفت میں بولنا تھا۔ میں نے مختصر سرمایہ داری کی خوبیاں بیان کیں اور ان خوبیوں کو گنانے کے بعد کہا کہ جس نظام کے یہ کمالات ہوں وہ اسلام کی تعلیم کے منافی کیسے ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اسلام ہر اچھی چیز کی خوبیوں کو تسلیم کرتا ہے ظاہر ہے کہ میری تقریر ایک طالب علم کی سی تھی مگر چوں کہ اس میں مغز خاصا تھا اس لیے اشرف نے اس کی بڑی تعریف کی۔ اس کے کچھ دن بعد میرس روڈ پر ایک مشاعرہ تھا۔ میں پہنچا تو وہاں اشرف بھی موجود تھے۔ رات بھر مشاعرہ ہوتا رہا۔ شاعروں کا

کلام میں نے کم سنا۔ اشرف کے تبصرے چبھتے ہوئے جملے، برجستہ اشعار زیادہ سنے۔ جب سپیدۂ سحری نمودار ہوا تو ساحر دہلوی نے اپنی غزل پڑھی اور پھر ہم لوگ گھر آ گئے۔

دو سال تک اشرف یہ کوشش کرتے رہے کہ انھیں یونیورسٹی میں جگہ مل جائے مگر کسی نے ان کی بات نہ پوچھی بالآخر نواب اسماعیل خاں نے ۱۹۳۴ء میں انھیں سو روپے ماہوار کی جونیئر لیکچرری دے دی۔ سال بھر بعد جب ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر ہوئے تو وہ بھی ختم ہو گئی ہمارے تعلیمی نظام کا یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اشرف کو باوجود لندن سے پی ایچ ڈی کرنے کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ایک لیکچرر کی جگہ نہ مل سکی۔ لطف یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اس بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ وہاں صرف قابلیت دیکھی جاتی ہے۔ سیاسی خیالات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اگر اشرف کی علمی صلاحیت سے علی گڑھ میں یا کسی علمی ادارے میں کام لیا جاتا تو نہ ان میں اتنی تلخی پیدا ہوتی ہے نہ وہ اس قدر انتہا پسند ہوتے۔ علی گڑھ سے صاف جواب ملنے کے بعد اشرف، پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ کانگریس کے دفتر میں کام کرنے لگے۔ اسی زمانے میں غالباً جے پرکاش نرائن، آچاریہ، لوہیا، ڈاکٹر زیڈ اے احمد اور سجاد ظہیر بھی وہیں تھے۔ اب اشرف نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے دھواں دھار تقریریں کرنا شروع کر دیں اور بہت جلد ملک کے ممتاز مقررین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ جب کمیونسٹ کانگریس سے الگ ہو گئے اور اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک وہ ایک کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے سیاسی سرگرمیوں میں لگے رہے۔ اس زمانے میں . . . علم وادب سے ان کا رشتہ ٹوٹا تو نہیں مگر کچھ یوں ہی سا رہ گیا۔ مگر ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا علمی حلقوں میں چرچا ہوتا رہا۔ جب ملک آزاد ہوا تو اشرف سوات میں تھے۔ سنا ہے کہ . . . . وہاں انھوں نے کسانوں کو منظم کیا۔ اور جب حالات ان کے لیے خطرناک ہونے لگے تو چپکے سے پاکستان پہنچے۔ وہاں بھی خطرہ نظر آیا تو کسی طرح انگلستان چلے گئے۔ انگلستان کے قیام میں اشرف نے زیادہ وقت برٹش میوزیم میں صرف کیا اور ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بہت سا مواد فراہم کر لیا جسے وہ مرتب کرنا چاہتے تھے مگر کر نہ سکے۔ میں نے وہ مواد دیکھا ہے اور اگر اشرف اس کو اسی طرح شائع کر دیتے تب بھی وہ اس میدان میں کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ہوتا۔ اس زمانے میں انھوں نے تاریخ ہند پر کئی معرکۃ الآرا مضمون لکھے اور سر سید نے جو مواد ایلیٹ اور ڈاسن کے لیے جمع کیا تھا اس کی نشان دہی کی۔ انھوں نے ثابت کیا کہ برطانوی مورخوں نے کس طرح ہماری تاریخ کے ان حصوں کو نظر انداز کیا ہے جو ہماری تہذیب اور تاریخ کے شاندار کارناموں کے مظہر ہیں۔

اشرف کے لیے ہندوستان آنا آسان نہ تھا وہ عجیب وغریب حالات میں یہاں سے گئے تھے۔ یہ ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی قدر شناسی اور فراخ دلی کی دلیل ہے کہ انھوں نے باوجود اشرف کے سیاسی خیالات سے اختلاف کے انھیں واپس آنے کا موقع دیا۔ وہ اشرف کے بال بچوں کی شروع سے مدد کرتے رہے تھے اور ان کے ایک لڑکے کو انھوں نے برسوں اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں وہ ہندوستان واپس آئے۔ حکومت کشمیر نے انھیں کشمیر کی تاریخ لکھنے کے لیے مامور کیا۔ مگر وہ کام شروع ہی کر پائے تھے کہ کروڑی مل کالج دہلی

میں تاریخ کے ریڈر مقرر ہو گئے۔ انھوں نے بہت جلد دہلی کے علمی حلقوں میں اپنی ایک جگہ بنا لی اور بڑی یکسوئی اور انہماک سے لکھنے پڑھنے لگے۔ عملی سیاست میں انھوں نے ہندوستان واپس آنے کے بعد کوئی حصہ نہیں لیا۔ اب ان کے دوستوں اور شناساؤں کو یہ امید ہو چلی تھی کہ اشرف تاریخ ہند پر اپنا قیمتی مواد مرتب کر کے شائع کر سکیں گے۔ مگر ۱۹۶۰ء میں انھیں ایسٹ برلن کی ایک یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا اور غالباً اپنی بیوی کے اصرار پر وہ چلے گئے۔ دسمبر ۱۹۶۰ء میں جب علی گڑھ میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو اشرف برلن سے اس کے ازمنۂ وسطیٰ کے شعبے کی صدارت کے لیے آئے تھے اور اس موقع پر انھوں نے ایک نہایت خیال انگیز خطبہ بھی پڑھا تھا۔ اس وقت ان کا خیال یہ تھا کہ وہ دو تین سال برلن میں رہنے کے بعد ہندوستان واپس آ جائیں گے۔ چند روز ہوئے ان کا ایک خط بھی برلن سے آیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ وہ ۱۹۶۴ء میں بین قومی اورینٹل کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے ضرور آئیں گے۔ میں اس خط کا جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ اخبار میں ان کی موت کی خبر آ گئی۔

اشرف علی گڑھ کے ان فرزندوں میں سے تھے جن کی قابلیت اور صلاحیت کا دوست دشمن سب کو اعتراف تھا۔ معلوم نہیں عملی سیاست میں اشرف کا کیا کارنامہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کو علمی کاموں ہی میں صرف کرتے تو ہندوستان کو ایک اور بڑا مورخ مل سکتا تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظری بہت ہے۔ ہم سیاسی اختلافات برداشت نہیں کر پاتے۔ ہمارے یہاں ڈاکٹر رادھاکرشنن، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت سندر لال، تارا چند، حفظ الرحمٰن جیسے کتنے لوگ ہیں جو سیاسی اختلافات کے باوجود اچھے اور قابل لوگوں کی قدر کرتے ہیں۔ اشرف نے اپنی زندگی میں خاصی تکلیفیں جھیلیں۔ انھوں نے نا اہلوں کو سرفراز ہوتے دیکھا مگر ان کے حصہ میں محرومیاں زیادہ آئیں۔ ان کے مزاج میں جو طنز کی لہر آ گئی تھی وہ تجربات کی ایسی ہی تلخی کی وجہ سے تھی۔ گو ایک مقالے کے علاوہ اشرف کا کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ مگر ان کے انگریزی اور اردو کے مضامین اگر جمع کیے جائیں تو دو قابل قدر کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مسلم فرقہ پرستی پر اشرف کے مدلّل مضامین پوری کتابوں پر بھاری ہیں۔ وہ بڑی گٹھی ہوئی جاندار اور پُر زور نثر لکھتے تھے انھوں نے فارسی اور اردو کے کلاسیکل ادب کا بڑا رچا ہوا مذاق پایا تھا۔ مولانا محمد علی کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ وہ غیر معمولی آدمی تھے مگر ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے شاید یہ بات اشرف پر بھی صادق آتی ہے۔ یوں بھی محمد علی اور اشرف میں ایک رشتہ ہے۔ اس کی طرف اشرف نے اپنے ایک مضمون "شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا" میں اشارہ بھی کیا تھا۔

تاریخ کو کچھ لوگوں نے واقعات کی کھتونی اور کچھ نے مشاہیر کی سوانح عمری، کچھ نے ایک ہلکا پھلکا آرٹ اور کچھ نے ایک مشکل سائنس کہا ہے۔ جدید دور میں تاریخ کی معروضیت پر بڑا زور دیا گیا ہے جسے دیکھو کہہ رہا ہے کہ خود کچھ نہ کہو واقعات کو سب کچھ کہنے دو۔ یہ کوشش قابل قدر ہے، مگر واقعات کے انتخاب میں معنی خیز اور

سطحی پہلوؤں کے الگ الگ کرنے میں سلیقے اور گہرے رنگ استعمال کرنے میں کچھ نہ کچھ داخلیت آ ہی جاتی ہے۔ ٹوائن بی اور اسپنگلر ہوں یا مارکس اور اینگلز، کالنگ وڈ اور کار ہوں یا سرکار وپانی کر سب اپنے آئینے میں حقیقت کا نظارہ کرتے ہیں اور آئینے کا رنگ اس حقیقت پر بھی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ کس کے آئینے میں تہذیب کے ارتقا کی، سماج کی تبدیلیوں کی، قوموں کے عروج و زوال کی تصویر بھی ملتی ہے۔ بادشاہوں کے جشن و جلوس کی داستان بھی عوام کے مادی و روحانی وسائل کی روشنی میں معنی خیز ہوتی ہے۔ اشرف تاریخ میں مارکسی نظریۂ حیات کے ماننے والے تھے۔ اس نظریے کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر ہماری تہذیبی بساط سے جن لوگوں کو دلچسپی ہے اور جس کے نقش و نگار کی جنت میں ایک بنیادی وحدت کے دیکھنے والے ہیں، انھیں اشرف کے مقالات میں گہرائی بھی ملے گی اور گیرائی بھی اور ان کے پڑھنے والے مشترک تہذیب کے اس عاشق، فرقہ پرستی کے خلاف لڑائی کے سورما اور تحریر و تقریر کے اس مرد میدان کو بھلانا چاہیں گے بھی تو آسانی سے نہ بھلا سکیں گے۔ (ہماری زبان)

میکش اکبرآبادی

ڈاکٹر کنور محمد اشرف

ڈاکٹر اشرف کو کبھی میں نے اپنا بڑاپن ظاہر کرتے نہیں دیکھا۔ انھوں نے کبھی غیر ممالک کے قصّے اور اپنے کارنامے بھی نہیں سنائے۔ مجھے برسوں یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ وہ تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔

جب میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے بے عملی کے طعنے دیتے ہیں اور میرے لیے سزائیں تجویز کرتے ہیں، اور خود کچھ نہیں کرتے۔ فضول تقریروں میں وقت ضائع کرتے ہیں، تو وہ ہنسے اور کہنے لگے میرا موضوع ایسا ہے کہ اس پر ہندوستان میں کام کرنا مشکل ہے۔ لندن ایسی جگہ ہے جہاں ایک کاغذ کے چٹ پر کسی کتاب کا نام لکھ کر دے دیتا اور دس منٹ میں وہ کتاب میز پر آجاتی تو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے لندن بھی دیکھا ہے۔

ڈاکٹر اشرف کی سب سے اہم خصوصیت ان کی موہ لینے والی شخصیت اور ان کی دل میں اتر جانے والی باتیں تھیں۔ سب سے پہلے مجھ سے ان کا تعارف ساغر نظامی نے کرایا تھا۔ ساغر صاحب کو مجھ پر بڑا تعجب ہوا کہ میں اشرف کو نہیں جانتا، مگر میں نے اس سے پہلے کبھی ڈاکٹر اشرف کا نام نہیں سنا تھا۔ مجھے وہ سن یاد نہیں، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب اشرف فیروز آباد کے حلقے سے کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لیے امیدوار تھے۔ میرے پھوپی زاد بھائی سید عظمت علی شاہ مرحوم کانگریس کے بڑے مخلص اور سرگرم کارکن تھے اور اشرف کے لیے کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اشرف ان کے ساتھ میرے یہاں آتے اور قیام کرتے۔

ایک بار میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب [illegible] اپنا بستر خود اٹھائے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ انھوں نے بستر کونے میں ڈال دیا اور بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے میرے پاس آ بیٹھے۔ ان کے چہرے پر نہ حجاب تھا نہ معذرت کوئی۔ مجھے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی اور بہت اچھی بھی۔ ڈاکٹر اشرف میرے ہم عمر بھی تھے اور ہم مذاق بھی لیکن میں دوستی اور ملاقات میں نہ ہم عمری کا پابند ہوں نہ ہم مذاق ہونے کا، البتہ ناشائستہ اور غیر مہذب آدمی سے نباہنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہر قسم کے آدمی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ بیٹھ سکتے تھے بلکہ نبھا لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ جوتے کے کچھ کاریگر انھیں اپنے پیر کے یہاں ایک قوالی کی محفل میں لے گئے۔ میں وہاں پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آکر ہماری صف میں بیٹھ گئے۔ میں قوالی سننا بھول گیا اور ان کی حرکات سکنات دیکھتا رہا۔ وہ دو زانو گردن جھکائے ہوئے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی صوفی بیٹھا ہو، اور جیسے وہ ساری عمر قوالی کی محفلوں میں بیٹھتے رہے ہوں۔ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتے اور فوراً نظریں چرا لیتے۔ محفل کے بعد میں نے

ان پر بہت سے فقرے کسے اور ان کے سلیقے کی داد بھی دی۔ کہنے لگے آج پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ تمہاری نظروں میں اتنی شرارت بھی ہو سکتی ہے۔

ان کی باتوں میں محبت آمیز طنز ہوتا تھا، ایسا کہ اگر وہ طنز نہ کرتے تو میں انھیں اس پر مجبور کرتا اور پھر ہم خوب ہنستے۔ یہاں تک کہ علمی بحث میں بھی یہی انداز رہتا۔ جب وہ آگرہ میں تھے تو اکثر آدھی آدھی رات تک بحثیں ہوتی رہتیں۔ ان کا بحث کرنے کا انداز بھی بڑا دلچسپ اور شگفتہ ہوتا اور علمی بحثوں میں بھی ہم کافی ہنس لیتے تھے وہ میرے موضوع پر اتنی ہی گہری واقفیت رکھتے تھے اور اتنی ہی سلجھی ہوئی بات کرتے تھے جیسی اپنے موضوع پر۔ میں نے نقد اقبال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ ڈاکٹر اشرف ہی تھے کہ جنھوں نے طعنے دے کر مجھے اس محنت پر آمادہ کیا اور جب یہ کتاب میں نے انھیں بھیجی تو انھوں نے مجھے بڑا دلچسپ خط لکھا۔

سعید منزل راج باغ۔ سرینگر، ۲۰ ستمبر ۵۵ء

میرے محترم میکش صاحب میں سمجھتا تھا کہ معتقدین کو قابو میں رکھنے کا فن خواجہ حسن نظامی پر ختم ہو گیا۔ مگر نہیں آپ کی منزلیں دہلی والوں سے بہت آگے ہیں۔ حضور میں تو آپ کا ویسے ہی احسان مند ہوں۔ اس نوازش سے گرانبار کیے آپ نے محض اس کا ثبوت دیا ہے کہ اس نیاز مند کو آپ اپنے عقیدت مندوں میں اب بھی شمار کرتے ہیں۔ اس ذرہ نوازی کا میں صرف ایک جواب دے سکتا تھا کہ آپ سے قریب آنے کی کوشش کروں، چنانچہ میں ۱۴ اکتوبر کو دلی مستقل قیام کے خیال سے روانہ ہو رہا ہوں اور نقد اقبال اور حرف تمنا زاد راہ کے طور پر تمام راستے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ کسی اتوار کو اپنی اہلیہ کے ساتھ آگرہ حاضر خدمت ہوں انھوں نے ابھی تک تاج محل اور آگرہ (اکبرآباد نہیں) کی کثافت نہیں دیکھی اور انھیں دیکھے بغیر میرے نزدیک ہندوستان کا مطالعہ پورا نہیں ہوتا بہرنوع میرا آئندہ پتہ نوٹ فرمالیں۔ . . . . . میں کروڑی مل کالج کے شعبہ تاریخ کا چیرمین مقرر ہو گیا ہوں سردست کشمیر کی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف ہوں، اور اس میں ابھی سال بھر اور صرف ہوگا۔ اس کے بعد ہندوستان پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ بہرنوع یہ ہمہ قسم کے منصوبے زندگی کے ساتھ ہیں۔ کبھی کبھی خیریت سے مطلع کیا کریں تو بڑا احسان ہو۔

نیاز کیش

محمد اشرف

ایک دفعہ میں نے انھیں کچھ تانبے کے سکے دکھائے اور پوچھا کہ یہ کس زمانے کے ہیں، ان میں سے کچھ تو تغلق کے دور کے تھے اور کچھ ایسے تھے جن پر کچھ نہ لکھا تھا۔ بلکہ کچھ نشان سا بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب انھیں دیکھ کر کہنے لگے، ہم کمیونسٹوں کی حکومت ہو گئی تو سب سے پہلے میں آپ کو جیل بھیجوں گا یہ سکے اس ناقدری کے ساتھ رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کس طرح رکھنا چاہیے تھا۔ کہنے لگے کہ ایک مخمل کا خوبصورت کیس بنوا کر رکھنا چاہیئے تھا۔

مجھے اب تک ہر طبقے اور ہر قابلیت کے بے شمار آدمیوں سے بات چیت کا موقع ملا ہے۔ مگر ڈاکٹر اشرف ان چند مخصوص آدمیوں میں سے تھے جن کی باتوں سے میں انتہائی لذت اور مسرت محسوس کرتا تھا۔

وہ پاکستان اور لندن اور جانے کہاں کہاں ہو کر جب دلی آگئے ہیں تو انہی زمانے میں انجمن ترقی اردو ہند کا اجلاس دلی میں ہوا جس میں مولانا آزاد مرحوم نے آخری تقریر کی تھی۔ میں اس کے ایک جلسے میں شریک تھا اور میرے پاس روش صدیقی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہیں ڈاکٹر اشرف بھی مل سکتے ہیں۔

روش صاحب کہنے لگے ابھی ملاقات کرادوں تو؟ اور یہ کہہ کر انھوں نے قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہا ۔ ۔ ۔ میکش صاحب آپ کو تلاش کر رہے ہیں اور دوسرے لمحے میں ڈاکٹر صاحب مجھ سے لپٹ گئے۔ اور پھر ہمیں نہیں معلوم کہ یہ اجلاس کب ختم ہوا۔ ہم تینوں اٹھ کر پنڈال کے قریب ہی ایک چائے کی معمولی دکان پر آ بیٹھے اور نہ جانے کب تک بیٹھے گپیں ہانکتے رہے اور پھر کئی سال بعد ڈاکٹر صاحب آگرے آئے کچھ پارٹی کے کام تھے اور آگرہ کالج میں انھیں کچھ پڑھنے تھے، وہ شبلی ایم این شنداغی کے یہاں ٹھیرے تھے۔ کام بہت تھے اور وقت کم، مگر وہ دوپہر سے پہلے میرے پاس آگئے، اپنے ساتھیوں کو انھوں نے رخصت کر دیا اور پانچ گھنٹے میرے پاس بیٹھے رہے۔

اس صحبت کا قابل ذکر اور یادگار واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کاغذ کا ایک بڑا لفافہ مجھے دیا اس میں نظیر اکبر آبادی کا سے متعلق چند کتابیں تھیں جو لندن سے انھوں نے آل احمد صاحب سے اور مجھ سے منگوائی تھیں اور میں نے لکھ دیا تھا کہ یہ میری طرف سے نذر ہے لیکن وہ ان سب کتابوں کو بڑی حفاظت سے لائے تھے۔ انھوں نے دکھایا کہ یہ پاکستان جیل کی مہریں ہیں۔ بغیر اس کے کتابیں میرے پاس نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک یہاں تک کہ جیل میں بھی ان کتابوں کو لیے پھرے تھے، اور خود لا کر مجھے واپس کی تھیں جن کا واپس کرنا نہ ضروری تھا اور نہ اس کے لیے کوئی تقاضا تھا ان کتابوں میں جو غیر ضروری کاغذ ان کے لیے رکھے تھے وہ بھی بدستور محفوظ تھے میں اس بات سے بہت زیادہ متاثر ہوا، میں نے کہا خدا کو نہ ماننے والے بے دین آدمی بھی اتنے ایماندار ہوتے ہیں، اس پر انھوں نے اخلاق پر لکچر دے ڈالا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں جب بھی کسی مولوی، پنڈت اور حاجی کو بے ایمانی کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے اشرف کا یہ واقعہ برابر یاد آتا رہے گا۔ میں خدا کی ہستی پر اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا اپنی ہستی کا اور مجھے خدا سے امید ہے کہ وہ اشرف پر ضرور رحم کرے گا جو زبان سے کافر اور کردار سے مومن تھا۔ (عوامی دور)

محمد اسد اللہ (از برلن سے)

ڈاکٹر محمد اشرف ــــ کچھ یادیں اور کچھ باتیں

"ڈاکٹر صاحب آپ سے تو ملاقات ہی نہیں ہوتی۔"
"جانے آپ ہی خود کہاں غائب رہتے ہیں۔"
"لیجیے ڈاکٹر صاحب یہاں موجود ہوں آئیے چل کر کہیں بیٹھیں۔"
"اچھا تو ذرا صبر کرو۔ یہ کتابیں لائبریری میں لوٹا دوں تو چلتے ہیں۔"
"ضرور ڈاکٹر صاحب۔"

ڈاکٹر صاحب نے کتابیں اسٹیٹ لائبریری میں لوٹا دیں تو ہم گھومتے ہوئے ہوٹل اڈلان پہنچے پہلی منزل پر ریستوران میں بیٹھے بیئر پی رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"آج بے حد گرمی ہے۔ اب یورپ میں بھی اتنی گرمی پڑنے لگی حیرت ہے۔"
"ہاں ڈاکٹر صاحب واقعی آج کا دن بڑا گرم ہے۔"

ڈاکٹر صاحب یکایک ہنسے اور پھر کہنے لگے "گرمی کے دن ہوتے ہیں تو مجھے آپ اور آپ کا دہلی کا گرم لباس فوراً یاد آجاتا ہے۔"

"وہ مجھے بھی یاد ہے ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر اشرف سے جب میں پہلی دفعہ دہلی میں ملا تو وہ دن گرمیوں کے تھے۔ کئی برس یورپ میں رہنے کے بعد جب میں انگلستان سے دہلی پہنچا تو میں گرم کپڑے پہنے ہوئے تھا پہلی وجہ یہ تھی کہ میرے پاس صرف گرم سوٹ ہی تھے۔ دوسرے یہ کہ میں پہلی دفعہ دہلی گیا تھا اور مجھے دہلی کی قیامت کی گرمی کا کوئی اندازہ نہیں تھا تیسرے یہ کہ دہلی پہنچتے ہی میں ٹھنڈے کپڑے خریدنے کے موقف میں نہ تھا۔

جب ڈاکٹر اشرف اور میں ان کے ڈرائنگ روم میں پہنچے تو پہلی بات ڈاکٹر اشرف نے کہی۔

"حضرت یہ آپ کیا پہنے ہوئے ہیں۔ اس قدر گرمی میں یہ کپڑے؟"
"ڈاکٹر صاحب انگلستان سے دہلی آیا ہوں مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ کے شہر میں اتنی گرمی ہوتی ہے۔" میں نے کہا
"اچھا تو اب آپ فوراً ان کپڑوں کے بدلنے کی ترکیب کیجیے۔" ڈاکٹر اشرف نے مشورہ دیا۔

"پیسے نہیں ہیں ورنہ یہ ممکن تھا کہ میں ٹھنڈے کپڑے خرید لیتا۔" میں نے صفائی پیش کی۔
"اچھا تو آپ فوراً کمیونسٹ پارٹی پارلیمنٹری آفس جائیے وہاں آپ کے حیدرآباد کے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہیں ان سے یا پھر کسی اور کامریڈ سے پاجامہ کرتا مانگیے۔" ڈاکٹر صاحب نے راہ بتلائی۔
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مسز اشرف کمرے میں داخل ہوئیں اور انھوں نے اشرف سے پوچھا "کیا پیو گے؟"
اشرف نے کہا "کافی" اور کچھ دیر بعد وہ کافی کا صرف ایک کپ لیے کمرے میں دوبارہ آئیں اور ڈاکٹر اشرف کو وہ کپ تھما کر لوٹ گئیں۔
ان کے لوٹنے پر ڈاکٹر اشرف نے مجھ سے کہا "لو کافی پیو۔"
میں نے کہا "جی نہیں آپ پیجیے کافی میں نہیں پیوں گا۔"
ڈاکٹر اشرف کافی پینے لگے پھر باتیں ہوتی رہیں، ہندوستان کی سیاست پر، انگلستان کی کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں روس کی ۲۰ ویں کانگریس اور نئی پارٹی لائن پر ــــــ جب دو گھنٹے گزر گئے تو میں نے رخصت کی اجازت چاہی مجھے بس اسٹاپ تک پہنچانے ڈاکٹر اشرف میرے ساتھ چلے۔ میرے ساتھ دو سوٹ کیس تھے۔ ایک سوٹ کیس میں اٹھائے ہوئے تھا، دوسرا سوٹ کیس ڈاکٹر اشرف ــــــ وہ کروڑی مل کالج ہی کے احاطے میں رہتے تھے ان کے گھر سے بس اسٹانڈ دور تھا راستے میں جتنے ان کے کالج کے طالب علم ملے ان کے سلاموں کا جواب دیتے مجھ سے باتیں کرتے سوٹ کیس اٹھائے ڈاکٹر اشرف بس اسٹانڈ تک میرے ساتھ آئے۔ بس اسٹانڈ پر ڈاکٹر اشرف نے کہا۔
"اچھا تو پھر کل شام یہاں آجانا پھر اکٹھے ہی کناٹ پیلیس چلیں گے وہاں بنے کو آنے کے لیے میں پارٹی آفس ٹیلیفون کر دوں گا، کل ملاقات ہوگی۔"
دوسرے دن میں ڈاکٹر اشرف کے پاس نہ جا سکا اور باوجود وعدہ کے میں علی گڑھ چلا گیا۔
پھر ڈاکٹر اشرف سے ملاقات ہی نہیں ہوئی جب میں واپس انگلستان پہنچا تو وہاں لندن کے پتہ پر ڈاکٹر اشرف کا میرے نام ایک خط رکھا تھا۔ ڈاکٹر اشرف کو کچھ کتابوں کی ضرورت تھی برٹش میوزیم سے دو ایک مسودوں کی نقل درکار تھی اور کچھ اسی طرح کے کام ــــــ وہ میں نے کر دیئے۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے، جب کام ختم ہوگیا تو ڈاکٹر صاحب نے خط لکھنا بھی بند کر دیا۔
پھر میں انگلستان سے چیکوسلواکیہ چلا گیا۔
پراگ میں ایک دن ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہاں چٹرجی نے مجھے بتلایا کہ "جانتے ہو ڈاکٹر اشرف برلن آگئے ہیں۔ وہاں یونیورسٹی میں پڑھانے لگے ہیں۔"
یہ خبر میرے لیے بڑی اہم تھی میں پراگ میں خود کو بڑا تنہا محسوس کرتا تھا اور جب میرے بہت عزیز دوست "م" مجھے پراگ میں چھوڑ کر خود ماسکو چلے گئے تو پھر تو اور بھی تنہا ہوگیا تھا ــــــ خوش قسمتی سے میں جن بڑے لوگوں کا مہمان تھا وہ لوگ مجھ پر بے پناہ مہربان تھے اور میرے آگے ممکنات کی ایک وسیع دنیا تھی۔ میں چاہتا تو پراگ میں ٹھہر سکتا تھا، جی چاہتا تو ماسکو تعلیم کے لیے جا سکتا تھا

برلن یونیورسٹی کا انتخاب کرسکتا تھا جب میں نے چپڑجی سے یہ سنا کہ ڈاکٹر اشرف برلن میں ہیں تو مجھے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے کہاں جانا چاہیے، میں نے برلن کا انتخاب کیا۔

برلن پہنچا تو وہاں دو ایک دن تو ان لوگوں کے ساتھ ضیافتوں کی نذر ہوگئے جن کا مہمان بن کر میں برلن آیا تھا جوں ہی پہلی فرصت ملی یونیورسٹی پہنچا کہ ڈاکٹر اشرف کا پتہ چلاؤں۔

ہندوستانی شعبہ کی سکریٹری نے بتلایا "ڈاکٹر اشرف تاریخ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ہندستان گئے ہیں۔

"کب لوٹیں گے؟"

"ایک ماہ بعد"

ایک ماہ یورپ کی پرکیف زندگی میں بھلا کیا ہوتا ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ ہر طرح کا آرام حاصل ہو لیکن یہ ایک ماہ مجھے بڑا طویل لگا، ڈاکٹر اشرف سے جلد سے جلد ملاقات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک دن ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ وہ برلن پہنچ گئے ہیں۔ اسی دن یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی لنچ کا پروگرام بن گیا طے پایا کہ کھانا کھائیں گے اور ساتھ ہی باتیں ہوں گی۔

جب باتیں شروع ہوئیں تو ختم ہونے کو ہی نہیں آتی تھیں۔ ڈاکٹر اشرف کس موضوع پر بات نہیں کرسکتے تھے؟ سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا تھی، مارکسزم ان کا خاص موضوع تھا، تاریخ سے ان کو دیوانہ وار دلچسپی تھی یعنی ان کا پیشہ تھا، ادب سے انھیں شغف تھا، ریسرچ کے کاموں سے انھیں وابستگی تھی، زبانوں کا انھیں شوق تھا، باتیں کرنے کا انھیں ہنر آتا تھا۔

باتیں ہوئیں اور اس وقت تک ہوئیں جب تک ہوٹل کے بند ہونے کا وقت نہ آگیا۔

ہوٹل سے نکلے تو میں نے سوچا کہ اجازت لوں اور خدا حافظ کہوں لیکن ڈاکٹر صاحب نے فوری تجویز پیش کردی۔۔۔ "چلو کہیں اور چل کر بیٹھیں"۔

میں نے کہا "گیارہ بجے ہیں مسز اشرف انتظار کررہی ہوں گی۔"

"آج کل وہ لندن میں ہیں" ڈاکٹر اشرف نے جواب دیا۔

"اچھا تو یوں آپ فری ہیں" میں نے کہا اور ہم لوگ ایک اور ہوٹل پہنچے۔

* * *

ڈاکٹر اشرف ایک تاریخ تھے بہ ذات خود ایک تاریخ ــــ ہندوستان کے پچھلے چالیس سال کی جیتی جاگتی تاریخ۔

وہ ۱۹۰۳ء میں ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے اپنے خاندان کے پہلے فرد تھے جو کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے شوق میں مصائب جھیلتے آگے بڑھتے رہے علی گڑھ یونیورسٹی سے نکلے تو جامعہ ملیہ پہنچے جامعہ ملیہ سے ڈگری لی اور بہترین مقرر کی حیثیت سے شروع ہی سے نام پیدا کیا۔ ایک جلسہ میں علی گڑھ میں مہاراجہ الور سے ملاقات ہوگئی اور ان پر مہاراجہ اس قدر مہربان ہوگئے کہ وظیفہ دے کر "آداب" سیکھنے کے لیے لندن بھیجا۔ لندن سے واپس ہوئے تو مہاراجہ کے مصاحب بنے۔ لیکن اشرف اور مصاحبت کریں۔ ایک دن چپکے سے الور کی حدود سے نکل آئے اور پھر اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اس زندگی میں مہاراجہ اور شاہ کا سوال ہی نہ تھا دوبارہ لندن پہنچے تو وہاں

ہندوستانی فاقہ مستوں کی ٹولی میں شامل ہو گئے۔ لندن میں ایک صبح ہائی گیٹ پہنچ کر کارل مارکس کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور جو پیمان وفا باندھا اسے زندگی بھر نباہ دیا۔

میں نے ڈاکٹر اشرف کو زیادہ قریب سے برلن ہی میں دیکھا۔ پراگ میں جب وہ میرے مہمان ہوئے تو وہاں میری زندگی اتنی مصروف تھی کہ باوجود خواہش اور کوشش کے ڈاکٹر اشرف کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکا۔ اور جب میں نیا نیا جرمنی پہنچا تو چھ مہینوں کے لیے جرمن زبان سیکھنے لیپزگ چلا گیا اور جب میرا قیام مستقلاً برلن میں ہوا تو پھر انھیں دیکھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقع ملا۔ گو برلن میں بھی ایسے کئی دور آئے کہ ان سے ہفتوں ملاقات ہی نہیں ہوئی سر راہ بھی شکل نہیں دیکھی لیکن پھر جوں ہی ملاقات ہوئی تو صبح سے شام تک یا پھر شام سے آدھی آدھی رات تک کی ملاقاتیں رہیں اور ایسی ہی ملاقاتوں میں میں نے ان کا درد بھرا دل دیکھا ہے، ان کی نازک مزاجی دیکھی ہے، ان کا قلندرانہ انداز دیکھا ہے۔ ان سے دبے دبے الفاظ میں ان کی محرومیوں کا بھی ذکر سنا ہے اور کارناموں کا بھی — کیا پیارے انسان تھے کیا طبیعت میں خاکساری تھی کیا وسیع علم کے مالک تھے کیا ذہن رسا پایا تھا — بولنے پر آتے تو زبان فراٹے بھرتی تھی۔ سننے والا دنگ ہو کر منہ دیکھتا رہ جاتا تھا جس موضوع کو چھوتے اس کے ہر ہر پہلو کو روشن کرتے جاتے اور اپنے علم کا دریا بہاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا دماغ ایک طرفہ چلتا تھا جو بات دماغ میں آ جاتی اسے لے بیٹھتے تھے پھر یہ نہیں دیکھتے تھے کہ دوسرا شخص دلچسپی سے سن بھی رہا ہے یا نہیں۔ کام بھی کچھ اسی طرح کرتے تھے کوئی ایک موضوع لے لیتے اسی کے پیچھے پڑ جاتے، جانے کہاں کہاں سے کتابیں ڈھونڈ لاتے اور پڑھتے — صرف پڑھتے تھے لکھتے نہیں تھے نوٹس جمع کرتے جاتے اور ان نوٹس کو صندوقوں میں بھرتے جاتے تھے میں کہا کرتا تھا کہ "لوگ صندوق کپڑوں کے لیے خریدتے ہیں اور آپ نوٹس بھرنے کے لیے" ڈاکٹر صاحب ہنس پڑتے تھے برٹش میوزیم میں بیٹھے تو ہزارہا صفحے نوٹس جمع کیے۔ برلن آئے تو یہی کیا، ماسکو اور تاشقند گئے تو صرف اور صرف یہ کیا کہ پڑھتے رہے نوٹس لیتے رہے — لکھا یا چھپوایا کچھ نہیں۔ ایک دن اچھے موڈ میں تھے کچھ بیئر کے گلاس خالی کرنے کے بعد میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کے مرنے کے بعد قبر پر لکھا ہوگا "یہ بزرگ صرف پڑھتے تھے" اور میری قبر پر تحریر ہوگا "یہ صاحبزادے صرف لکھتے تھے۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے "لکھوں گا، ضرور لکھوں گا کچھ اور پڑھ لوں تو پھر لکھنا ہی تو ہے"!

ایک اور دفعہ پڑھنے لکھنے کا ذکر چلا میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ تو کچھ لکھنے سے رہے اب صرف یہی ایک صورت ممکن ہے کہ میں لکھوں اور آپ لکھائیں"۔

کہنے لگے "تو پھر موضوع چن لو"۔ موضوع کے انتخاب کی ذمہ داری میرے سر تھی۔ میں نے جو موضوع تجویز کیے وہ یہ تھے (۱) اسلام کا تاریخی رول (۲) ہندوستان کی تقسیم کا مارکسی تجزیہ (۳) اردو ادب میں انقلابی رجحانات اور (۴) ہندوستان کی چند شخصیتیں.. (جن کا ڈاکٹر اشرف سے برسوں تعلق رہا ہے) ڈاکٹر صاحب کو یہ سب عنوان پسند تو آئے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک بہت بڑے پلان کا نقشہ کھینچا اس نقشہ میں مذہب، سیاست، مارکسزم، ادب تاریخ، جمالیات، فلسفہ سب ہی کچھ تھا۔ طے ہوا کہ میں کوئی سوال کروں وہ جواب دیتے جائیں گے کوئی اور اسے قلمبند کرتا جائے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک سطر بھی نہیں لکھائی، وعدے تو بہت کیے اور میں نے جب بھی یاد دہانی کی وہی پرانا ہر بار کا دہرایا ہوا جملہ دہرا دیا کہ "پیارے اسد جلدی کیا ہے تھوڑا سا اور پڑھ لینے دو پھر لکھنے ہی کا کام باقی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کو نئے نئے دوست بنانے کا بہت شوق تھا اور عجیب بات ہے کہ پرانے دوستوں سے وہ دور رہنے لگے تھے۔ سجاد ظہیر جب برلن آئے تو میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر اشرف کافی وقت بنے بھائی کے ساتھ رہیں گے لیکن ڈاکٹر اشرف صرف بنے بھائی کو لینے ایرپورٹ گئے اور پھر جو غائب ہوئے تو بالکل ہی غائب ـــ بنے بھائی جب ماسکو چلے گئے تو اشرف صاحب ماسکو میں ہی تھے میں نے بنے بھائی کو لکھا کہ "وہاں اشرف صاحب سے ملاقاتیں رہتی ہونگی" بنے بھائی کا جواب آیا کہ "صرف ایک بار ٹیلیفون پر بات ہوئی تھی"۔ جب ڈاکٹر صاحب ہسٹری کانگریس میں شرکت کر کے لوٹے تو میں نے بڑے اشتیاق سے ڈاکٹر عبدالعلیم اور دوسرے چند بزرگ دوستوں کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ بہت سے لوگوں سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی اور جن سے ہوئی وہ سرسری۔

ڈاکٹر صاحب گو ادیب نہیں تھے لیکن ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی پسند اور ناپسند قطعیت لیے ہوئے ہوتی تھی جس میں ترمیم ممکن نہ تھی۔ میں کرشن چندر کی حمایت کرتا تھا اور ڈاکٹر اشرف کو آج کل کرشن کی تحریریں روکھی نظر آتی تھیں۔ میں سردار جعفری کی بڑی شدومد سے وکالت کرتا تھا اور ڈاکٹر اشرف سردار کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔ میں کہتا تھا کہ "سردار کی شاعری ہماری آئیڈیالوجی سے سب سے زیادہ قریب ہے" وہ جواب دیتے تھے "ہاں آئیڈیالوجی ہوگی لیکن شاعری تو نہیں ہے نا"ـــ میں جوش، فیض اور سردار ـــ ان تینوں کی شاعری میں بہت نرالی سج دھج اور آن بان دیکھتا تھا اور اس پر اصرار بھی کرتا تھا وہ مسکراتے جاتے تھے اور فیض کے بارے میں تو میری رائے سے اتفاق کر لیتے لیکن جوش اور سردار پر خوب اعتراض کرتے تھے ـــ فیض کو جب لینن امن انعام ملنے کی خبر آئی تو میں نے ہی سب سے پہلے یہ خبر ڈاکٹر اشرف کو سنائی بیٹھے ہوئے تھے خوشی سے جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے "فیض ڈے" منانے کے لیے چھوٹی سی پارٹی کی جس میں اشرف صاحب بھی آئے کچھ جرمن دوست، کچھ روسی مہمان تھے۔ اشرف صاحب خوش خوش سارا وقت بولتے رہے۔ فیض کی شاعری پر انھوں نے فیض کے چند شعروں کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے ایک بڑی پیاری سی تقریر بھی کی ـــــــ تاشقند سے لوٹ کر مجھے سنایا کہ وہاں نیاز حیدر ملے تھے میں ان سے کہہ آیا ہوں کہ "یہ آپ ستاروں سے آگے وغیرہ وغیرہ کیا باتیں کر رہے ہیں تیس پینتیس سال پہلے اقبال مرحوم یہ باتیں کر چکے ہیں"۔ ممبئی سے لوٹ کر مجھے سنایا کہ "وہاں جب مجروح اور سردار دونوں ساتھ تھے میں نے سردار سے کہا کہ سردار جعفری تم ایک بھی شعر ڈھنگ کا غزل کا نہیں کہہ سکتے۔ مجروح تم سے ہزار درجہ خوبصورت شعر کہتا ہے"ـــ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے "تم نے روش صدیقی کو پڑھا ہے"۔ میں نے کہا "ہاں پڑھا ہے کیوں خاص بات کیا ہے"؟ کہنے لگے "ایک بار روش کو پھر پڑھو خوب شعر کہتا ہے"۔ میں نے کہا "روش خوب شعر کہتا ہے؟ وہ تو بکواس کرتے ہیں"۔ کہنے لگے "تم کو تو میری رائے سے اختلاف کرنا ہی ہے"ـــ ڈاکٹر اشرف کو شکایت تھی کہ ہندوستان ہی وہ واحد بدنصیب ملک ہے جہاں انقلابی ادب پیدا نہیں ہوا۔ ایک دن کہنے لگے "اردو والوں میں مخدوم انقلابی شاعری کر سکتا تھا لیکن اب وہ حضرت غزل کہتے ہیں"۔

مجھے ڈاکٹر اشرف سے جو شکایت تھی کہ وہ لکھتے ہی نہیں ہیں وہی شکایت انھیں سبط حسن سے تھی کہتے تھے کہ "۳۰ سال سے وہ شخص تحریک کے ساتھ ہے۔ ایک سطر بھی نہیں لکھی اس نے" سبطے کا اشرف صاحب بڑے پیار سے ذکر کرتے تھے جس میں ان کے اس قالین کا بھی ذکر آجاتا جو انھیں بہت محبوب تھا اور جب کبھی وہ سبطے کی قالین کا ذکر کرتے میں اشرف صاحب سے ان کی بلّی کا ذکر کرتا۔

ڈاکٹر اشرف نے ایک بلّی پال رکھی تھی اس بلّی کو وہ تین سو روپے خرچ کرکے ہوائی جہاز سے برلن لائے تھے۔ سب سے پہلے تو مجھے ان پر اعتراض تھا کہ یہ کیا حرکت ہے کہ آپ اسے دہلی سے برلن لائے ہیں اور پھر یہ کہ آپ اس کی اتنی نگہداشت اور ناز برداری کرتے ہیں ڈاکٹر اشرف اس پر مجھ سے بگڑتے تھے۔ قصور میرا بھی نہیں تھا ان کے ساتھ گوشت کی دکان میں آدھ آدھ گھنٹہ قطار میں بلّی کے لیے گوشت خریدنے کھڑا ہونا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مجھ پر کچھ اس طرح مہربان تھے کہ ان کی بارگاہ "میں کبھی کبھی گستاخی" بھی کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تو دوسرے ہی دن پوچھ لیا کہ "شادی کب کر رہے ہو؟"

میں نے فوری جواب دیا "نہیں جانتا ہندوستان کب لوٹوں گا بہر حال جب بھی لوٹوں تب ہی کروں گا۔"

کہنے لگے "کیوں یہاں یورپ میں نہیں کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہاں یورپ میں صرف چغد ہی شادی کرتے ہیں" اس پر وہ مجھ پر بڑے ہی ناراض ہوئے ایک اور دفعہ شادی کا ذکر چلا میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب شادی کبھی خوبصورت لڑکی سے نہیں کرنی چاہیے۔"

پوچھنے لگے "کیوں؟"

میں نے کہا "خوبصورت لڑکی کا شوہر شوہر کم چوکیدار زیادہ ہوتا ہے میں بھلا یہ غم کہاں پالوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب ہنس کر کہنے لگے "آپ بھی کبھی کبھی سمجھ کی بات کر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس دفعہ آپ مجھ پر بگڑے نہیں ایک بار پہلے میری "شادی کی فلاسفی" پر آپ بگڑ چکے ہیں۔

کہنے لگے "وجہ تم سمجھ سکتے ہو۔"

اور جو لوگ ڈاکٹر اشرف کو جانتے ہیں وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر اشرف مجھ پر کیوں نہیں بگڑے!

اور میں جس کنور محمد اشرف سے واقف ہوا ہوں وہ لاکھ بھی ہوی ڈاکٹر اشرف کی شخصیت سہی لیکن تھی تو شخصیت ڈاکٹر اشرف ہی کی اور وہ شخصیت اپنے میں اتنا "چارم" رکھتی تھی کہ دل خود بخود ان کی طرف کھنچتا تھا، مجھے ہندوستان کے کونے کونے کے آدمی سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ میں جن لوگوں کو جانتا ہوں ان میں ڈاکٹر اشرف اور سجاد ظہیر دونوں میں میں نے یہ خوبی دیکھی کہ دونوں ہی نوجوانوں کو آگے بڑھانے والے ــــ جب میں سجاد ظہیر کے ساتھ ماسکو اور لندن میں تھا میرے لیے یہ بات بے حد فخر اور خوشی کی ہوتی تھی کہ سجاد ظہیر دنیا بھر کے اپنے جاننے والوں سے بہترین الفاظ میں مجھے متعارف کراتے تھے ــــ یہی خصوصیت ڈاکٹر اشرف کی تھی۔ وہ جانے مجھے کہاں کہاں لے جاتے اور کن کن سے ملاتے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات پر بہت خوش ہوتے تھے کہ مجھے بہت سی یونیورسٹیوں میں پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ میرا جس سے بھی تعارف کرواتے اس کا ذکر ضرور کرتے تھے ــــ میں نے کچھ عرصہ ہوا نئی نسل کی نئی نسل اٹھانے والے کچھ

حضرات کے مضامین پڑھے تھے۔ مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ کاش یہ لوگ ان بزرگ شخصیتوں کی قربت حاصل کر کے تو دیکھیں کہ کتنے شفاف دل کی مالک ہیں یہ شخصیتیں!

میں یہاں جرمنی میں ایک ایم اے اردو پاس سے واقف ہوں جس کو ساری کمزوریوں اور گھٹیا ذہنیت کے باوجود اشرف صاحب قبول کیے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ میں ڈاکٹر اشرف کے پاس گیا تو انھوں نے "عوامی دور" کا ایک پرچہ میری طرف بڑھایا اور کہا "پڑھو اس میں تمھارے دوست کا مضمون شریک ہے۔"

میں نے نام دیکھ کر پوچھا "کیسا مضمون ہے؟"

کہنے لگے "ظاہر ہے اس بیچارے کا مضمون کیسا ہوگا؟ اردو کا ایم اے پاس ہے لکھنو کا رہنے والا ہے اردو کے اخبار میں کام کر کے آیا ہے اور صحیح اردو تک نہیں لکھ سکتا۔ ظلم ہے۔"

اور پھر میں نے اسی اردو کے ایم اے کے لیے ڈاکٹر اشرف کو متفکر دیکھا ہے، اس کی سفارشیں کرتے دیکھا ہے دراصل یہ بزرگ شخصیتیں نئی نسل کو اس کی کمزوریوں سمیت قبول کرتی ہیں۔ نئی نسل کو اپنی کمزوریوں سے آگہی نہ ہو تو اس میں ان حضرات کا کیا قصور؟

اسی اردو کے ایم اے پاس سے مجھے کئی دفعہ دکھ اور نقصان پہنچا۔ ایک دفعہ میں نے ڈاکٹر اشرف سے کہا "میرے چند الفاظ اس کی ساری زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں" ڈاکٹر اشرف فوری کہنے لگے "بھائی لوگوں کو ان کی غلطیوں پر معاف کر دیا کرو۔ اور اب تو تمھاری لڑائی بڑی شخصیتوں سے ہے" بچوں "سے الجھنا تمھارے لیے زیبا نہیں۔"

ڈاکٹر اشرف واقعی بڑے خلوص کے ساتھ مشورے دیا کرتے تھے وہ اگرچہ فیض انسان تھے تو ان معنوں میں کہ کسی طرح کی عملی امداد ان کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ کوئی ان سے مشورہ کرنے چلے جائے تو ان کے دل کے دروازے ان کے دماغ کی کھڑکیاں سب ہی کھل جاتی تھیں۔ گو ان کے مشورے غلط بھی ہوتے تھے اور انتہا پسندی کا شکار بھی لیکن ہوتے خلوص پر مبنی تھے ——— میرے بارے میں جب بھی گفتگو کرتے مجھ سے بار بار اصرار سے کہتے "وطن میں چاہے کچھ ہو، دھول خاک، گرمی اور ہر طرح کی تکالیف اسی میں رہ بس کر آدمی آدمی بنتا ہے ——— تم ہو کہ میں، ہماری جگہ ماسکو اور برلن میں نہیں اپنے وطن میں ہے۔ مجھے دلی جانا چاہیے اور تمھیں حیدرآباد۔"

وہ اپنی آرزو کے مطابق دہلی نہیں لوٹ سکے اور میں ابھی برلن ہی میں مقیم ہوں۔

۸ جون کی صبح میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے فون پر بڑی دکھ بھری آواز میں کہا "اسد آج ڈاکٹر اشرف چل بسے مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ مسز اشرف اُن کو اٹھانے گئیں تو وہ ہمیشہ کے لیے سو چکے تھے۔"

یہ سن کر مجھ سے بات نہیں کی گئی میرے ہاتھ سے ریسیور گر گیا اور میرے دماغ پر جرمن شاعر شلر کی ایک نظم ہتوڑے برسانے لگی۔

کتنا پیارا تھا دوست میرا

کل لوگوں نے مجھ سے کہا وہ مرگیا
اب کچھ لوگ کہیں گے "کتنا پیارا تھا وہ"
اور کچھ کہیں گے "وہ برا آدمی تھا"
وہ جو کچھ بھی تھا
وہ تو کل چل بسا
اب لوگ اسے اچھا کہیں کہ بُرا
مرنے والے کو اس سے کیا
وہ تو مرگیا

۱۰ر جون کے اخبار "NEUES DEUTSCHLAND" نے ڈاکٹر اشرف کے سب جاننے والوں تک یہ خبر پہنچا دی تھی کہ جمعرات کے دن ۸ر جون کو ڈاکٹر اشرف انتقال کرگئے اور ۱۳ر جون کو منگل کے دن برلن یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں تعزیتی جلسہ ہوگا چنانچہ صبح ہی سے لوگ یونیورسٹی میں جمع ہونے لگے اور ٹھیک ایک بجے اس سوگوار تقریب کا آغاز ہوا۔ ہال کے درمیان ایک تابوت پر کالا غلاف چڑھا ہوا تھا اور چاروں طرف پھول رکھے تھے اوپر ڈاکٹر اشرف کی تصویر تھی۔ ہندوستانی اور جرمنی پرچم سرنگوں تھے ہال میں جرمن روسی، بلغارین اور ہندوستانی طالب علم اور استاد جمع تھے آگے کی صف میں ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر KURT SCHRODER بیٹھے تھے۔ درمیان میں ہندوستانی شعبے کے ڈائرکٹر پروفیسر والٹر روبن ——— اور دوسرے کنارے پر ڈاکٹر اشرف کی انگریز رفیقۂ حیات، اشرف کی نواسی حسن بانو اور اشرف کے لڑکے جاوید اشرف (جو اس تعزیتی جلسہ میں شرکت کے لیے ماسکو سے آئے تھے) بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر روبن کی تقریر سب سے پہلے تھی انھوں نے تین منٹ کی خاموشی کی درخواست کی پھر اس کے بعد پروفیسر روبن نے اشرف کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اشرف کی ۵۹ سالہ زندگی کا جائزہ لیا۔ پروفیسر روبن کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر تھیں اور الفاظ حلق سے مشکل سے نکل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب پروفیسر روبن کو صبر کا یارا نہ ہوگا، اور آنسو بہہ نکلیں گے۔ یہ بڑا دردناک سماں تھا، ایک عالم دوسرے عالم کے بارے میں بڑے ہی شدید دکھ کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ ہم سب اپنے آنسوؤں کو پیے بیٹھے تھے وطن سے بہت دور اس شہر برلن میں ڈاکٹر اشرف کی موت نے ہم پر بڑا کاری زخم لگایا ہے۔ اشرف مرحوم کے بارے میں اس بڑے محقق اور ہندوستانی عظمت کے رسیا پروفیسر والٹر روبن ۳۵ منٹ تک بولتے رہے۔

پھر جاوید اشرف اپنے پیارے باپ کے بارے میں بولنے کے لیے اٹھے۔ جاوید اشرف ڈاکٹر اشرف کو "آبا" یا "پاپا" نہیں "اشرف" کہا کرتے تھے اسی اشرف کے بارے میں جاوید نے اپنی تقریر کا آغاز ان الفاظ میں کیا "میں نے اپنا باپ کھویا ہے، لیکن ہندوستان نے ایک اچھے مارکسٹ، طالب علموں نے ایک اچھے استاد کو اور

اور دوستوں نے ایک مخلص دوست کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ میرا غم ذاتی غم ضرور ہے لیکن اس غم میں وہ سب برابر کے شریک ہیں جنھوں نے اشرف کو دیکھا ہے اشرف سے باتیں کی ہیں، اشرف کے ساتھ رہے ہیں۔"

ماتمی جلسے میں شرکت کر کے لوٹا تو میں بہت اداس تھا۔ میری جرمن دوست کرسٹال کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ایک دوست کے بچھڑ جانے پر میں اتنا رنجیدہ کیوں ہوں —— وہ یورپ کی رہنے والی ۱۹ سالہ لڑکی مشرق کی روح کو کیا خاک سمجھ سکتی ہے! میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہی، مجھ سے پڑھا بھی نہ گیا، لکھنے کو بیٹھا تو ایک سطر بھی لکھی نہ گئی۔ ڈاکٹر اشرف کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ "پیارے اسد ذرا کچھ اور پڑھ لینے دو پھر لکھنا ہی تو ہے" اور "اسد خاک ہو کر دھول، گرمی ہو کہ دوسرے مصائب اُسی خاک اور آگ میں تپ کر آدمی نکھرتا ہے۔ اپنی جگہ اپنے وطن میں ہے جلا وطنی کی زندگی میں نہیں۔"

سکندر علی وجد

ہمارے ضبط کی اُن کے ستم کی آزمائش ہے
خداوندا، تری شانِ کرم کی آزمائش ہے

چمن میں پھول ہنستے ہیں نہ کلیاں مسکراتی ہیں
یہاں پیہم نسیمِ صبحدم کی آزمائش ہے

دلِ وحشی ابھی عادی نہیں طوق و سلاسل کا
تمھارے گیسوئے پُر پیچ و خم کی آزمائش ہے

جنونِ عشق کس کس مرحلے میں ساتھ دیتا ہے
معاف عمر میں اس ہم قدم کی آزمائش ہے

محبت صرف ہوتی ہے زیادہ کم نہیں ہوتی
نہ اس میں کچھ زیادہ اور کم کی آزمائش ہے

کوئی دیر و حرم کے درمیاں آواز دیتا ہے
خدا کی آزمائش ہے! صنم کی آزمائش ہے

امینِ شادی و غم، وجد میرے شعر کا نغمہ
مسلسل زندگی کے زیر و بم کی آزمائش ہے

عبدالعزیز خالد

میں اس ارضِ سیہ کا سودائی ‏ ‏ سا تھ ہی چاند کا تمنائی
غمِ دنیا و فکرِ ما فیہا ‏ ‏ سرد برگِ جنون و رسوائی
چرخِ زنگار گوں و مینا رنگ ‏ ‏ گوہر افروزِ نورِ مینائی
ہے بہشت اک مقام روح افزا ‏ ‏ حور، غلمان، سبزہ، تنہائی
گلِ لالہ معانق ریحاں ‏ ‏ عاشقوں کی امید بر آئی
عود و عنبر کی منقلیں روشن ‏ ‏ باجے مدھم سُروں میں شہنائی
باادب باملاحظہ ہشیار ‏ ‏ دست بستہ کھڑے ہیں مجرائی
سلسبیل قمر گرے شب بھر ‏ ‏ رہے شب بھر بہم شکر خائی
لیٹے ہوں گے کنارِ نہرِ لبن ‏ ‏ ساکنانِ سپہرِ مینائی
اور ہم روئے فرش بیٹھے ہیں ‏ ‏ ہو رہی ہے خیال آرائی
لفظ و معنی کے بیچ لڑتے ہیں ‏ ‏ نرد بازی، نبرد آرائی
کلک و قرطاس کے ستم خوردہ ‏ ‏ کرمِ شب تاب کے تولائی
محفلیں شوق کی سجاتے ہیں ‏ ‏ آبِ صہبا ہیں آپ صہبائی
نخلبندِ حدیقۂ اسرار ‏ ‏ گلشنِ راز کے تماشائی
منطق الطیر سن کے وجد آئے ‏ ‏ بانگِ نے صوتِ موجِ دریائی
کبھی ذرّے کو آفتاب کہیں ‏ ‏ کبھی سمجھیں پہاڑ کو رائی

ہم بھی آتے ہیں آگ لینے کو — چمک اے برقِ طورِ سینائی
لن ترانی ہے شانِ محبوبی — ارنی کی صدا پسند آئی
ہم بھی ہیں قافیوں کے چرواہے — گو سخندانِ حرف کے راعی[1]
کدخدا ہیں عروسِ معنیٰ کے — بادپیمائے دشتِ تنہائی
قصدِ بیت الحرامِ عشق کرو — بنو چندے رجالِ صحرائی
روحِ ربی سے ناامید نہیں — ہم سمجھتے ہیں رمزِ مولائی
ظلمتِ شب کی بخشش آبِ حیات — بارِ دل ہے عذابِ تنہائی
پھر بھی افسردگی برن بدلے — چور دروازے سے چلی آئی
دردِ ہمزادِ سرخوشی سا یہ — غم وفادار عیشِ ہرجائی
غیر سے گرم اختلاطی ہے — ہم سے اعراض و بحث و کج رائی
اے نسیمِ سحر نہ کر دف دف — جرسِ غنچہ کی سن استائی
اے شباہنگ نالۂ شب گیر — غمِ محبوب کی پذیرائی
سربلندی کی آرزو ہے تو کر — درِ جاناں پہ ناصیہ سائی
آدمی آدمی کا ہے شیطاں — مفت خورہ، خوشامدی ناعی[2]

فخر شیوہ نہیں شریفوں کا
غرّۂ علم کیا مرے بھائی!

---

[1] [2] یہ دونوں قافیے صوتی لحاظ سے استعمال کیے گئے ہیں

فضا ابنِ فیضی

اسے کبھی نہ مل سکا مرے جنوں کا بانکپن / خرد نے یوں تو بارہا سیے ہیں چاکِ پیرہن
اے کاش زندگی میں ہو کبھی نصیبِ اہلِ فن / مرے خیال کی کسک مرے شعور کی چبھن
یہ دونوں ہی دخیل ہیں نظامِ کائنات میں / ہمارے تیوروں کے بل تمھاری زلف کی شکن
ابھی تو گردشِ جہاں تھی اپنے اعتدال پر / یہ مجھ سے کیوں بدل گئی تری نگاہ دفعتاً
بس ایک خوں شدہ کلی کا ماجرا ہے دل نہیں / یہ میری داستاں کوئی بکھیر دے چمن چمن
شمیمِ زلف کی قسم نسیم آج کہہ گئی / تمھاری خلوتوں کی بات انجمن در انجمن
تجھے شعورِ بے خودی نصیب ہو خدا کرے / کہ چاکِ پیرہن ترا ہے آبروئے پیرہن
انھیں تو شبنمِ چمن کی تازگی سے کام ہے / یہ پھول کیا سمجھ سکیں ہمارے زخم کی جلن
خبر نہیں ہے غالباً یہ حسنِ بے پناہ کو / کہ خلوتِ نظر بھی ہے تجلیوں کی انجمن
فسانے کتنے کہہ گئی نہ جانے اک نگاہ میں / مخاطب اک ذرا ہوئی جو تیری چشمِ کم سخن
بکھر رہے ہیں گردِ راہِ اہلِ کارواں جیسے / بکھر گئی ہے راستوں پہ میرے پاؤں کی تھکن
صبا نے اس کو پھول کہہ کے شاخ پر جو چن دیا / سمٹ کے رہ گئی تھی کچھ تری نگاہ کی کرن

حلاوتِ زبان و ندرتِ بیاں کے ساتھ ساتھ
غزل میں چاہیے فضاؔ خیال کا شگفتہ پن

اکبر حیدرآبادی (آکسفورڈ سے)

یہ جبر وقت دلوں کا زیاں نہ ہو جائے
مذاق نغمہ رہین فغاں نہ ہو جائے

ہے نوک جھونک سی یزداں و اہرمن میں ابھی
یہ بات بڑھ کے کہیں داستاں نہ ہو جائے

پھڑک رہی ہے رگِ سنگ ایک مدت سے
شرارہ شعلۂ آتش فشاں نہ ہو جائے

بقائے خلق بس اک لغزشِ خرد تک ہے
خطا کسی سے کوئی ناگہاں نہ ہو جائے

بھٹک کے راستہ ٹکرا نہ جائیں سیارے
زمیں پہ معرکۂ آسماں نہ ہو جائے

فروغِ رنگِ چمن میں جو کام آیا ہے
وہ خونِ لالہ و گل رائیگاں نہ ہو جائے

اسیری اور یہ زندان بال و پر اکبر
قفس ہمارے لیے آشیاں نہ ہو جائے

پروفیسر والے
ترجمہ:۔ مضی تبسم

عقیدے کی بازیافت

"عقیدے کی بازیافت" سلسلے کی اس تقریر میں، میں چاہتا ہوں کہ "عقیدے کے بحران" پر اپنے چند خیالات پیش کروں۔ یہ ایک برجستہ موضوع ہے اور اس عالمی بحران کے نفطۂ نظر سے خاص مطابقت رکھتا ہے جس نے آج لوگوں کے اذہان کو سخت تشویش اور اذیت ناک خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ عقیدے کی بازیافت یا روحانی شعور کی از سر نو بیداری کے ذریعہ اس نازک صورت حال کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور ہم اس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

تاریخ کے ہر دور کو عبوری دور اور ہر زمانے کو نازک زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں جب کبھی ایسے خطرناک حالات پیدا ہوئے ان کا دائرۂ عمل بہت محدود رہا لیکن بیسویں صدی کا یہ بحران ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ حیرت انگیز سائنسی اور صنعتی ترقی کے ساتھ رسل و رسائل اور حمل و نقل کی تعجب خیز سہولتوں نے عملاً فاصلے کو مٹا کر دنیا کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے بہت ہی قریب کر دیا ہے۔ لیکن ہنوز یہ جسمانی قربت مختلف قوموں کے ذہنوں اور دلوں کو باہمی اتفاق اور ہمدردی کے رشتے میں منسلک نہیں کر سکی۔ دنیا کی ساری قومیں آج بھی پر امن فضا میں خوشحالی اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتی ہیں بشرطیکہ وہ مل جل کر رہنے اور سوچنے کا گر سیکھ جائیں۔ چند ہم سر بڑی طاقتیں اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی خوف اور نفرت کے جذبات لیے ہوئے انتہائی ہلاکت خیز نیوکلیر ہتھیاروں کو کسی بھی ناگہانی لمحہ میں استعمال کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔ ان کے قبضہ میں ان خطرناک ہتھیاروں کی موجودگی کرۂ ارض پر زندگی اور تہذیب کو تاراج کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ یہ عالمگیر بحران ہے۔ دنیا کے چپے چپے پر اس کا گہرا سایہ پڑ رہا ہے اور اس نے ساری انسانیت کو مکمل تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے ــ انسانوں کے دل خوف، تشویش اور ہیبت کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ وہ غیر مطمئن اور مضطرب ہیں، اور شک، بے یقینی اور عدم تحفظ کے طوفانی سمندر میں کسی مقصد کے بغیر ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کے عمومی تصور کو انا، وہم، حزن اور قنوطیت جیسی اصطلاحوں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تصور حیات اس عینیت، زندہ دلی اور رجائیت سے جداگانہ اور متضاد ہے جو انیسویں صدی میں مغربی ممالک میں عام تھی۔

عصر حاضر کے اس خطرناک عارضے کو بہت سے مفکر اور حساس لوگوں نے فکر و عمل کے مختلف دائروں جیسے فلسفہ،

مذہب، فطری اور عمرانی علوم وغیرہ میں ہونے والی ترقیوں اور واقعات سے منسوب کر دیا ہے۔ فکر و خیال کے ان رجحانات نے اپنے عملی نتائج میں زندگی کی اعلیٰ قدروں مثلاً نیکی، حسن، امن، آزادی اور ترقی میں انسان کے عقیدے کو شدت سے متزلزل کر دیا ہے۔ ان قدروں کے مجموعے کو ایک لفظ "تقدس" سے موسوم کیا جا سکتا ہے جو زندگی کا اعلیٰ ترین روحانی تصور ہے۔

ان میں سے بعض رجحانات پر تبصرہ کرنے سے پہلے مجھے اجازت دیجئے کہ میں انیسویں صدی میں مغربی یورپ کے تصوریات اور اس کی ہمہ جہتی نشو و نما کا مختصر خاکہ آپ کے آگے پیش کروں۔ اس صدی کے بارے میں گفتگو کرتے وقت حقیقت میں ۱۸۱۴ء سے ۱۹۱۴ء تک سو سال کا زمانہ اور انگلستان اور فرانس جیسے ممالک مد نظر ہیں۔ ۱۸۱۴ء نپولین کے زوال کا سال ہے اور ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تھا۔

اس صدی میں طبعی علوم میں جاذب توجہ انکشافات ہوئے، اور ان کو انجینئرنگ، صنعت اور طب میں مہارت اور کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اس کی وجہ سے زندگی کے مادی حالات میں معتد بہ ترقی ہوئی۔ علم حیاتیات میں ڈارون کی دریافت عہد آفریں حیثیت کی حامل ہے۔ ایک طرف کاپرنیکس کے نظریہ نے کائنات میں زمین کی مرکزی حیثیت کا خاتمہ کر دیا تو دوسری طرف ڈارون کے انکشاف نے انسان کو اس تفوق سے محروم کر دیا کہ خدا نے خاص طور پر اسے پیدا کیا ہے۔

یہ صرف سائنسی اور صنعتی ترقی، معاشی خوشحالی اور نوآبادیاتی نظام کی توسیع کا زمانہ نہیں تھا بلکہ اس دور میں بہت سی سیاسی، سماجی اور تعلیمی اصلاحیں بھی ہوئیں۔ شخصی اخلاق اور سماجی قانون سازی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچانے کے اصول کو معیار بنایا گیا۔ یہ انسان کی عقلیت اور فطری نیکی اور تہذیب کی ناگزیر ترقی میں اعتقاد کا دور تھا۔ لوگ "حال" سے اتنے مسرور اور مستقبل کے بارے میں اس قدر پر جوش اور پر امید تھے کہ یوٹوپیائی نصب العین کو ناقابل حصول نہیں سمجھا جاتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم اور اس کے چند سال بعد دوسری عالمگیر جنگ کے سانحے نے انسان کی عقلیت اور نیکی، اور ترقی کی ناگزیریت میں اس عقیدے کا شیرازہ بکھیر دیا۔

اس وقت ہم سرد جنگ کی گرفت میں ہیں۔ اور حقیقت میں تیسری جنگ چھڑ جاتی ہے، جس کا خطرہ ادارۂ اقوام متحدہ اور پنچ شیل کے دیانت دار حامیوں کی متواتر اور پر خلوص مساعی کے باوجود ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے تو ایسی صورت میں ہر سو نیوکلیر ہتیاروں کے مجنونانہ اور غیر انسانی استعمال سے دنیا میں انسان کی زندگی اور تہذیب کا یکسر خاتمہ ہو جائے گا۔ اس امکانی جنگ کے خوف نے عام انسانوں کے دلوں میں دہشت، عدم تحفظ، مایوسی اور شکست کا احساس پورا کر دیا ہے اور ہم یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آیا زندگی کا سرے سے کوئی مقصد بھی ہے۔ ہمارے اس خوف سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم خدا اور مذہب، استدلال اور آزادی اور سائنس اور ترقی میں اپنا اعتقاد کھوتے جا رہے ہیں۔

سائنسی طریقۂ کار کی کامیاب عمل آوری نے انسانوں کے ذہنوں اور حیات اور مسائل حیات کے تعلق سے ان کے رویّہ کو بے حد متاثر کیا ہے۔ وہ ان چونکانے والے اہم سائنسی انکشافات اور میکانی ایجادوں کی ذمہ دار ہے۔ جن میں سے

اول الذکر نے علم کے حدود کو وسیع تر کیا تو موخر الذکر سے انسانی آسائشوں میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ سائنس نے مذہب کو جس کا تعلق نامعلوم دنیا سے تھا اپنا نشانہ بنایا۔ چوں کہ مذہب کی بنیاد، عقیدے اور اسناد پر قائم تھی اور وہ بے لوچ اور محدود ہوتا جارہا تھا، اس لیے اس کے غیر معقول عقیدوں اور توہم پرستانہ رسوم اور اعتقادات کا ابطال کرنا سائنس کے لیے مشکل نہ تھا۔ اب خدا کے مفروضے کے بغیر بھی دنیا کی توجیہ کی جاسکتی تھی۔ تخلیق کی فرسودہ روایتوں کا پردہ چاک ہوا تو آسمانوں نے خدا کے بجائے نیوٹن کی عظمت کا اعلان کیا۔ پھر یہ کوششیں ہونے لگیں کہ خالص میکانیاتی اصطلاحوں کے ذریعہ حیاتیاتی مظاہر کی تشریح کی جائے اور علم نفسیات کی اس طرح تشکیل کریں کہ اس میں روح کا تصور باقی نہ رہے۔ اکثر سائنسدانوں کو خدا، انسان کی انا، مقصد کائنات اور حریت بشر کے بارے میں روایاتی اعتقادات کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ ان کے بیان کے بموجب صرف مادہ اور حرکت حقیقی ہیں باقی سب واہمہ ہے۔

واٹسن کا "نظریۂ کرداریت" مطالعۂ باطن کو مسترد کرکے انسانوں کے ساتھ مشینوں کا سا سلوک روا رکھتا ہے اس کی آخری حد مادیت اور مشینیت ہے۔ فرائیڈ کی "تحلیل نفسی" میں لاشعور کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور وہ غیر عقلی محرکات اور جبلتوں، بالخصوص جنسی جبلت کے عمل کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس کے برخلاف مذہب کو محض توہم اور زندگی کی حقیقتوں سے فرار پانے کی راہ قرار دے کر اس کے وجود ہی سے انکار کرتی ہے۔

ان میکانیاتی اور غیر روحانی، خلاف عقل اور خدا کے تصور سے عاری نظریات کا اثر چاروں طرف پھیل گیا اور اس کی وجہ سے ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے جو عقیدے اور ایقان سے معمور زندگی کے لیے مضرت رساں ثابت ہوی۔

کمیونزم کا اثر مقابلتاً زیادہ قوی اور وسیع تھا۔ ایک جامع فلسفیانہ نظام کے طور پر اس کی نشوونما ہوی، لیکن میں یہاں اس کے صرف ان پہلوؤں اور مطالب کا تذکرہ کروں گا جن کو ہمارے اخلاقی اور روحانی اعتقادات اور تمناؤں کے لیے نقصان رساں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اس کی مادیت اور دہریت کی تعلیم، زندگی کے معاشی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دینا، انفرادی آزادی کو قوت کے ذریعہ دبانا، تشدد پسندی کی تائید اور اس کا یہ نظریہ کہ مقصد ذریعہ کا جواز ہوتا ہے۔

فکر وخیال کی معاصر تحریکات میں "منطقی اثباتیت" "نظریۂ وجودیت" اور غیر مذہبی مسلک انسانیت بھی قابل ذکر ہیں۔ "منطقی اثباتیت" کے نظریہ کی رو سے مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، جمالیات، اور دینیات کے تمام مسائل یا تو بے معنی ہیں یا ان میں حد سے زیادہ تکرار معنوی ہے یا وہ محض شخصی جذبات اور احساسات کا اظہار ہیں۔ اس نظریہ کے بموجب صرف وہی مسائل حقیقی ہوتے ہیں جن کی تصدیق حسی تجربے کے ذریعہ کی جاسکے۔ اس کے نزدیک نیکی اور حسن کے مسائل خارجی قدر نہیں رکھتے۔ منطقی اثباتیت کا نظریہ، خدا، آزادی اور ابدیت کے تصورات کو سرسری جانچ کے بعد ہی رد کردیتا ہے۔

اس نظریہ کو سائنس سے خاص مناسبت ہے کیوں کہ اس میں خارجی دنیاؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف "نظریۂ وجودیت" نے نفسیاتی طریقہ کار اور انسان کی توجہ انسان کی طرف منعطف کرانے کی ضرورت اور اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ ازمنۂ قدیم سے فلسفیوں اور پیغمبروں نے اپنی تعلیمات میں خودشناسی کی بار بار تلقین کی ہے۔ نظریۂ وجودیت خواہ وہ خدا کی ذات

کو ماننے یا اس کا انکار کرے بنیادی طور سے وہ انسانی وجود سے واسطہ رکھتا ہے۔ اس کی تعلیم کا محور یہ ہے کہ "وجود ذات پر مقدم ہے"۔ انسان سے اس کی مراد ایک آزاد خود نگر اور مطلق ذات ہے۔ انسان آزاد ہے لیکن اسے خوف ہے کہ کہیں وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال نہ کر بیٹھے، اور یہ خیال اس کے ذہن میں تردد اور اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ آج کا انسان عدم تحفظ داخلی انتشار اور تنہائی کے اذیت ناک احساس کا شکار ہے۔ وجودیت پرست فطرت انسانی کا بہت ہی مایوس کن خاکہ پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ کرب، خوف، مایوسی، نیستی اور موت جیسی اصطلاحوں کو دہراتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے وجودیت کو ایک اعتبار سے "فلسفۂ بحران" بھی کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں بحران پر قابو پانے کا کوئی راستہ نہیں دکھایا گیا ہے۔

"منطقی اثباتیت" اور "وجودیت" کے مقابلے میں غیر مذہبی انسانیت پرستی کا نظریہ زیادہ معقولیت رکھتا ہے۔ وہ سائنٹفک علم کو بہت اہمیت دیتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی حد بندیوں کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اس نظریہ میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مذہبی عقائد سے ہٹ کر زندگی کی دوسری تمام اعلیٰ قدروں میں وہ ہمارے ایقان کو درست ثابت کرتا ہے۔ اس نظام میں خدا کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ مذہب کی تائید حاصل ہونے کے باوجود انسان عقل، آزادی اور ترقی میں اپنے اعتقاد کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

بسا اوقات خدا اور مذہب کے بارے میں ہمارے عقیدے پر تقابلی مذہبیات کے نظری مطالعہ سے اتنی ضرب نہیں پڑتی جتنا کہ نام نہاد مذہب کے پرستاروں کے خلاف عقل، غیر سماجی اور منافی اخلاق طرز عمل سے اس کو نقصان پہنچتا ہے۔ مذہب کے سب سے بڑے دشمن وہ لوگ ہیں جو زیادہ مذہب پرست ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے زیادہ محبت کرنے کی بجائے شدید نفرت کرنے لگتے ہیں۔ سچا مذہب جس کی بنیاد حق کی جستجو ہوتی ہے خدمت خلق اور تقدس حیات کو باہم مربوط کر دیتا ہے۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے مجھے اجازت دیجئے کہ چند باتیں ہندوستان کے موجودہ حالات اور اس کی پچھلی روایات کے بارے میں عرض کروں۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جس کی آبادی چالیس کروڑ سے بھی زیادہ ہے یہاں کے باشندے مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عقائد بھی جدا جدا ہیں، اور وہ الگ الگ زبانیں بولتے ہیں۔ اس ملک میں جہاں بہت سے لوگ ان پڑھ اور انتہائی پس ماندہ ہیں وہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ بھی موجود ہیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ان میں ایک وحدت بھی ہے جس کو ہندوستان نے اپنی طویل اور بوقلموں تاریخ میں کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اب وہ ایک با اقتدار جمہوریہ بن چکا ہے اور سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ میں تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اس کو یہ ترقی اپنے قدرتی وسائل اور اپنے عوام کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ بیرونی ممالک سے فیاضانہ مالی امداد اور فنی مشوروں کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے کی وجہ سے ..... ہوئی۔ بالخصوص آزادی کے بعد بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات زیادہ گہرے اور وسیع ہو گئے۔

زندگی کے مختلف دائروں میں خواہ وہ ثقافت سے تعلق رکھتے ہوں یا مادّی خوشحالی سے متعلق ہوں قابلِ لحاظ لین
دین ہوتا رہا ہے۔ سائنس، جمہوریت اور تنظیم کار میں مغرب کی کامیابیوں کا ہندوستان کی زندگی اور فکر پر گہرا اثر
پڑا۔ مادیت کی طرف مغربی تہذیب کا میلان اس قدر نظر افروز اور جاذب توجہ تھا کہ ہندوستانی سماج میں اس کی
زبردست ریل پیل ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اب وہ قدیم تہذیبی روایات اور روحانی ورثہ کو بھی دعوت پیکار دے رہا
ہے۔ اس چیلنج کا مناسب اور حاصل خیز جواب دینا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن توقع ہے کہ ہندوستان اس کارِ عظیم کو کامیابی
کے ساتھ انجام دے گا۔ یہ تہذیبیں اگر ہم آہنگ نہ ہوسکیں اور کھچاؤ پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں یا تو ان کے امتزاج
سے ایک عجیب غریب مخلوط تہذیب وجود میں آجائے گی یا پھر اس کا نتیجہ بے اطمینانی، مایوسی اور شکست خوردگی کی صورت میں
ظاہر ہوگا۔ اس کی وجہ سے وہ حالات رونما ہو جائیں گے جن کو "عقیدے کے بحران" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی انقلابی تبدیلی
کہ روایات سے اچانک ایک لخت قطع تعلق کر لیا جائے کہ بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان رساں اور تفرقہ انگیز ثابت ہوگی
لیکن ہندوستان میں ایسے غیر یقینی حالات پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس کا سرچشمہ فلسفہ اور اس کا عظیم
روحانی ورثہ اس قدر مالا مال اور زندگی بخش ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح زندہ اور ترقی پذیر رہے گا۔ وہ اپنے قلب کو
خدا کی محبت سے جلا دے کر انسانیت کی خدمت کے جذبے کے ساتھ نہ صرف قدیم عقیدے کا احیا کرے گا بلکہ تخلیقی طور پر اسے سائنٹفک
علم سے اس طرح ہم آہنگ کر دے گا کہ وہ پختہ ہو کر حکمت اور دانائی بن جائے۔ آج کوئی بھی ملک باقی دنیا سے بالکلیہ قطع تعلق کر کے
الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ مغربی دنیا کا کوئی بڑا بحران ہو مثلاً عقیدے کے بحران ہی کو لیجئے ہندوستان اس سے بالواسطہ طور پر ضرور
متاثر ہوگا۔ مقامی عوامل اور قوتیں جو سیاسی معاشی، سماجی اور تہذیبی دائروں میں سرگرم عمل رہی ہیں وہ مغربی دنیا کے واقعات سے مزید
شہ پاتی ہیں۔ بحران کے عام اسباب اور اس کو دور کرنے کے ذرائع ہر جگہ یکساں ہوں گے۔ سائنس میں اس بحران کا علاج اس لیے نہیں ملتا کہ وہ
انسانی زندگی کے صرف ایک پہلو سے سروکار رکھتی ہے اور دوسری تمام قدریں اس کے دائرۂ عمل سے خارج رہتی ہیں۔ انسانیت
دوستی کے مسلک میں بھی اس کا کوئی ... اوا نہیں ہے کیوں کہ اس میں زندگی کے انسانی اور غیر مذہبی پہلو کو ضرورت سے زیادہ
اہمیت دی گئی ہے۔ اور زندگی کے کائناتی اور الوہی اقدار کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ گویا ایک جانب سائنس ہے جو کل
کی حیثیت نہیں رکھتی اس لیے جانبدار ہوتی ہے۔ دوسری طرف مسلک انسانیت ہے جو تقدیس سے یکسر عاری ہے۔ عقیدے
کے بحران کا واحد علاج بھی یہی ہے کہ سائنس اور مسلک انسانیت کو جس میں مذہبی تقدیس بھی شامل ہے ایک دوسرے میں
مدغم کر دیا جائے۔ مذہب سے مراد یہاں روحانی مسلک ہے اس "کل" کی بازیابی کا تیقن دیتا ہے جو مقدس بھی ہے اور ہر قسم کے
شبہات، کرب، تنہائی اور عدم تحفظ کے خطرات کو زائل کر دیتا ہے۔ وہ ایسا امن عطا کرتا ہے جو اتحاد اور یکسانگی کو پروان چڑھائے
خودی کی نجات اور دنیا کی بھلائی، اس مذہب کا نصب العین ہوگا۔ عقیدے کی بازیافت کا مفہوم بھی یہی ہے۔

غلام ربّانی

قطب شاہی طرزِ تعمیر

دکن کی اسلامی حکومتوں میں بہمنی حکومت سب سے زبردست تھی۔ اس کی بنیاد دلّی کے شہنشاہوں سے بغاوت کرنے پر پڑی تھی۔ چنانچہ ابتدا میں بہمنی فرمانرواؤں کو شمالی ہند سے دغدغہ لگا رہا اور اس وجہ سے وہ علوم و فنون کی طرف زیادہ توجہ دے سکے لیکن یہ حالت بہت دنوں نہیں رہی اور جب سلطنت میں استحکام پیدا ہو گیا تو اس کی شان و شکوہ دولت و ثروت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا۔ اسی زمانہ میں بہمنی دربار ایرانی، ترک اور عرب شعرا، علما اور اہلِ کمال سے بھرا ہوا تھا۔ ایرانی صناعوں اور معماروں کی بھی کمی نہ تھی۔ انھوں نے دکن کے اسلامی طرز میں ایک نئی روح پھونک دی اور بہت سی پاکیزہ عمارتیں بنائیں جو آج بھی ماہرینِ فن سے داد حاصل کر رہی ہیں۔

قلعہ گلبرگہ جامع مسجد، دولت آباد کا چاند مینار اور بیدر کا مدرسہ محمود گاواں نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس زمانہ میں اسلامی طرزِ تعمیر کا سرچشمہ دلی تھا مگر یہ عمارتیں دلی کی عمارتوں سے وضع میں بالکل الگ ہیں۔ اس وقت دلی کی عمارتوں میں یہ صفائی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ان کی وضع، نفاست اور ندرت کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ یہ عمارتیں ایران سے لاکر یہاں رکھ دی گئی ہیں۔ ان میں آرائش نہیں ہے مگر موزونیت اور تناسب اس بلا کا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے لیے آرائش لازمی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کے بغیر کلام بے رنگ اور پھیکا رہتا ہے۔ ایرانی اہلِ کمال نے تعمیر میں صنائع بدائع سے کام لیا۔ چنانچہ صناعوں اور معماروں نے نقاشی، چینی کاری اور سیپ۔۔۔ کی پچی کاری سے اس کمی کو دور کیا۔ یہ کام اس قدر دیدہ زیب ہے کہ آنکھوں میں کھبا جاتا ہے۔

اب تک دکن کے گنبد تغلقی وضع کے چپٹے ہوتے تھے جس سے عمارت کی مجموعی ہیئت ذرا دبی سی معلوم ہوتی تھی اس عیب کو دور کرنے کے لیے گلبرگہ کے معماروں نے گنبدوں کو بلند پایوں پر قائم کیا ہے۔ اس کی شکل اوندھے ہوئے لگن کی سی تھی اس کو انار نما کر دیا۔ یہ تغیر اتنا پسند کیا گیا کہ چپٹے گنبد رفتہ رفتہ غائب ہو گئے۔

تغلقی طرز کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ دیواریں سلامی ہوتی تھیں۔ ان میں یہ حکمت تھی کہ گنبد کا بیرونی جزو تک تلا رہے۔ یہاں اس بدنمائی کو بھی دور کر دیا گیا اور گنبدوں کے پایوں کو اندرونی طرف سے اس قدر استحکام دیا کہ دیواروں کو مخروطی بنانے کی ضرورت باقی نہیں رہی اسی قسم کی اور بھی اصلاحیں کیں یہاں تک کہ بہمنی طرزِ تعمیر ہندوستان کے

فنِ تعمیر میں ایک مستقل عنوان بن گیا۔

پندرھویں صدی کے اخیر میں یہ عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اور اس کے آثار پر پانچ حکومتیں قائم ہوئیں ان میں سے ہر ایک نے اپنی حیثیت کے موافق علوم و فنون کو ترقی دی اور اپنے شہروں کو خوبصورت عمارتوں سے سجایا۔ ان میں بیدر بیجاپور اور گولکنڈہ اپنی طرز کے لیے مشہور ہو گئے۔

گولکنڈہ میں جب قطب شاہی حکومت قائم ہوئی اس وقت یہاں پورے علاقہ میں کوئی اسلامی عمارت نہ تھی۔ اس سے پہلے اگرچہ کودھن میں مسجد موجود تھی مگر اس کا اسلامی فنِ تعمیر سے کوئی تعلق نہیں۔ ان دنوں گولکنڈہ کا قلعہ بھی ایک گڑھی کے مانند تھا جو مٹی کی دیواروں سے محصور تھا۔ سلطان قلی نے قلعہ گولکنڈہ تعمیر کیا، اتنا بڑا قلعہ دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ گولکنڈہ میں سب سے پرانی عمارت یہاں کی جامع مسجد ہے جس کو اس خاندان کے بانی نے تعمیر کرایا اور بعد کو اسی میں شہید ہوا۔ مسجد کی تعمیر میں کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ اس کی دیواریں سلامی نما ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک تغلقی طرز کا اثر باقی تھا۔

قطب شاہی طرزِ تعمیر کو سمجھنے کے لیے شاہی مقبروں کا مشاہدہ ضروری ہے۔ یہ مقبرے سرسری نظر میں ایک سے معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ان کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک کتاب ہے جس میں گولکنڈہ طرزِ تعمیر کے ارتقائی مدارج بڑی وضاحت سے موجود ہیں۔

شاہی مقبروں میں خاندان کے بانی سلطان قلی قطب شاہ کا مقبرہ سب سے چھوٹا اور سیدھا سادا ہے۔ اس کی کرسی بھی کچھ بلند نہیں ہے جس سے عمارت میں وہ شکوہ پیدا نہیں ہوا جو ایک زبردست اور اولوالعزم فرمانروا کی آخری آرام گاہ کا ہونا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ قلی قطب شاہ آخر دم تک سلطنت کے استحکام میں لگا رہا۔ اسے مقبرہ بنوانے کا موقع نہیں ملا۔ مردہ بدست زندہ، یہ اس کے بعد کی تعمیر ہے ورنہ دوسرے تمام تاجداروں نے اپنے مقبرے اپنی زندگی ہی میں بنوا لیے تھے۔

مقبرہ قلی قطب شاہ میں گولکنڈہ طرز کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بالکل پٹھان طرز کا ہے۔ اس میں دلی کے تغلق طرز کی خصوصیات موجود ہیں۔ پٹھان فرمانروا عمارت ۔۔ ۔۔ میں مضبوطی اور استحکام کو سب سے مقدم سمجھتے تھے۔ دیواروں کے آثار بڑے رکھتے تھے مزید استحکام کے لیے ان کو سلامی نما بناتے تھے۔ اس مقبرہ کی دیواریں سلامی دار ہیں جس کی وجہ سے ان کے کونے کمر کی وضع کے ہو گئے ہیں۔ دروازہ بہت چھوٹا اور اندر کو دھنسا ہوا ہے۔ عمارت میں آرائش نہیں ہے۔ گلبرگہ میں بہمنی خاندان کے بانی علاء الدین حسن گنگو کا مقبرہ بھی اسی وضع کا ہے۔

قلی قطب شاہ کے مقبرہ کے برابر جمشید قلی کا مقبرہ ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت چوکور نہیں ہے بلکہ ہشت پہل ہے اور بالکل ایرانی طرز پر بنا ہے۔ اس وضع کا مقبرہ ہندوستان میں کہیں نہیں ہے۔

چوتھے فرمانروا ابراہیم قطب شاہ کا مقبرہ ان دونوں سے بڑا ہے۔ یہ عمارت بیدر کے بہمنی مقبروں کا نمونہ ہے گنبد بڑا اور کروی شکل کا ہے۔ بیدر میں کاشی کاری کا رواج ہو چکا تھا۔ اس مقبرے کی دیواروں پر چینی کا کام تھا جس کے نقش و نگار اب بھی کچھ باقی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

محمد قلی قطب شاہ کا مقبرہ یہاں کے تمام مقبروں سے خوبصورت ہے۔ اب تک جو مقبرے یہاں تعمیر ہوئے تھے، وہ کچھ شاندار نہیں تھے محمد قلی کے زمانے میں پہلی بار بڑا مقبرہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں شاندار مقبرے بنوانے کا رواج ہو گیا تھا۔ سہسرام میں شیر شاہ کا مقبرہ، دلی میں ہمایوں کا مقبرہ، بیدر میں مقبرۂ علی برید اور بیجاپور میں ابراہیم روضہ تعمیر ہو چکے تھے۔ غرض کہ اسلامی فن تعمیر شباب پر تھا۔ ایسی صورت میں محمد قلی کا شاندار مقبرہ بنوانے کا خیال کچھ بے جا نہ تھا۔ وہ بھی ایک بڑا بادشاہ تھا۔ جو دولت اور ثروت میں دوسروں سے کم نہ تھا۔ اس نے مقبرہ کی تعمیر اپنی نگرانی میں انجام دلائی۔ ان ہی دنوں چار مینار بھی بن رہا تھا۔ وہ ایک دن چار مینار کو دیکھتا تو ایک دن اپنے مقبرے کو دیکھتا تھا۔

اس عمارت میں عظمت پیدا کرنے کے لیے ماہروں نے اس کو دوہرے چبوتروں کی کرسی دی ہے دروازوں کے سامنے جو گیلری ہے وہ بالکل چالوکی طرز کی ہے۔ مندروں کی پوری عمارت ستونوں اور سردلوں پر قائم ہوتی تھی، ستونوں کے اوپری سرے پر چار چار توڑے ہوتے تھے جن پر سلیں پاٹ کر چھت بنا دی جاتی تھی۔ مسلمان ستونوں پر محراب بناتے تھے جو دکن میں ایک نئی چیز تھی۔ یہ لوگ چونا بھی استعمال کرتے تھے اور محراب کے اصول پر لداؤ کی چھت تیار کرتے تھے۔ اس مقبرے میں پتھروں کی مسطح چھت ہندو طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔

دیواروں کی چنائی میں پتھر کی لمبی لمبی پٹیاں سطح سے ابھری ہوئی ایک دوسرے کے متوازی بنائی جاتی تھیں۔ اس قسم کی پٹیوں کا رواج دکن کے قدیم مندروں میں عام تھا۔ بعض مندروں میں یہ پٹیاں عمودی ہوتی تھیں، بعض میں افقی۔ اس مقبرے میں افقی ہیں۔ گیلری کے ستون ایک ڈال کے پتھر کے ہیں۔ یہ بھی ہمارے پچھلے طرز تعمیر کا اثر ہے۔ بعد کو کہ مسجد میں تو اتنے وزنی پتھر استعمال کیے گئے کہ ہندوستان کی کسی مسجد میں نہیں ہوئے۔ اس گیلری کے ستون، سردل، چھجے، توڑے اور پٹیاں سب چالوکی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس گیلری میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی مندر میں کھڑا ہے۔ محراب اور مینار جو خالص اسلامی چیزیں ہیں، وہ اس مقبرہ میں کچھ نمایاں نہیں ہیں۔

عمارت کے اوپری حصے میں چھجوں، گلدستوں اور روکار پر چونے کے کام میں بہت خوبصورت نقش و نگار ہیں۔ ان میں بیل بوٹے اور ہندسی اشکال کی جالیاں ہیں۔ مسلمان معمار ایران سے پچی کاری کی صنعت اپنے ساتھ لائے تھے۔ تلنگانہ کے معمار نے اس کا بدل چونے کے نقش و نگار سے کیا چنانچہ اس مقبرہ کی تعمیر کے بعد قطب شاہی عمارتوں میں چونے کے نقش و نگار کی وہ بھرمار ہوئی کہ یہی چیز گولکنڈہ اسٹائل کی خصوصیت بن گئی۔

محمد قطب شاہ، حیات بخشی بیگم اور عبداللہ قطب شاہ کے مقبرے صورت شکل میں ایک دوسرے کے بھائی بند معلوم ہوتے ہیں وہی ایک چبوترہ اس پر اصل عمارت اور اس کے اوپر کروی گنبد۔ ان میں عبداللہ قطب شاہ کا مقبرہ بہت عظیم الشان ہے۔

ان مقبروں میں موزونی اور تناسب کی کمی ہے۔ گنبدوں کی بلندی اور حجم کے لحاظ سے ان کے چبوتروں کی وسعت کم ہے اور مینار تو اتنے چھوٹے ہیں کہ کھلونا معلوم ہوتے ہیں۔

بڑے گنبد بنانے کا رواج بہمنی دور سے ہو گیا تھا۔ چنانچہ دکن میں جتنے بڑے بڑے گنبد ہیں شمالی ہند میں نہیں ہیں۔ بیجاپور کا

گول گنبد تو دنیا کے تمام گنبدوں سے بازی لے گیا۔ اس کا گنبدی رقبہ روم کے مشہور کیتھڈرل کے گنبد سے زیادہ ہے

مختلف قوموں کے عقیدوں کے لحاظ سے ان کی عبادت گاہوں میں بہت فرق ہوتا ہے چنانچہ مسجد اور مندر کے سطحی نقشے، وضع اور اصول تعمیر میں نمایاں فرق ہے۔

مندر عموماً دریا، جھیل یا تالاب کے کنارے بنائے جاتے ہیں۔ بعض وقت بستی سے دور پہاڑوں میں پُرفضا مقام پر ہوتے ہیں۔ مسجد ایسی جگہ بنائی جاتی تھی جہاں زیادہ سے زیادہ مسلمان اذان کی آواز سن سکیں۔ مسجد کشادہ اور کھلی ہوتی تھی، مندر بند ہوتا تھا۔ مسجد میں ہر جگہ روشنی ہوتی تھی، مندر میں یہ بات نہ تھی خاص کر گربھ گریہہ یعنی وہ حجرہ جس میں مورتی ہوتی ہے اس قدر تاریک ہوتا ہے کہ دن میں بھی روشنی کرنی پڑتا ہے، اور عمارت ایک پُراسرار جگہ معلوم ہوتی ہے۔ مسجد کو اگر باہر سے بھی جھانک کر دیکھیں تو اس کے اندر کا حال عیاں ہو جاتا ہے۔ مسجد سادہ ہوتی ہے اس میں آرائش نہیں ہوتی۔ مندر نیچے سے اوپر تک سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونوں، بیل بوٹوں اور دیوتاؤں کی مورتوں سے سجا ہوتا ہے — غرض ایک طرف سادگی ہوتی ہے، دوسری طرف پرکاری لیکن آرٹسٹ کی دنیا الگ ہوتی ہے وہ اپنے فن میں گم رہتا ہے۔ اس کے قلب میں وسعت ہوتی ہے۔ اسے ساری دنیا میں ہم آہنگی نظر آتی ہے، اور جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ایسی چیز بنا رہا ہے جو آگے چل کر یادگار رہنے گی تو اپنے فن میں گم ہو جاتا ہے۔ یہی حال حیدرآباد کے معماروں، سنگ تراشوں اور اہل کمال کا تھا۔ انھوں نے اسلامی عمارتوں میں وہ چیزیں داخل کیں جن کو وہ مندروں میں بناتے چلے آئے تھے۔ مسجدوں میں آرائش کی وہ بھرمار کی کہ ان کو دلہن بنا دیا۔

قلعہ میں حیات بخشی بیگم کی مسجد میں حسین چونے کی گل کاری ہے۔ اس کے مینار، گلدستے، برجیاں، منڈیریں، پاکھے، محرابیں سب نقش و نگار سے پر ہیں۔ بیرونی محرابوں کی پیشانی پر خوبصورت بیل بوٹے اور زنجیرے ہیں۔ رو کار پر ہندسی اشکال ہیں۔ ان چیزوں نے مل کر عمارت میں رعنائی پیدا کر دی ہے۔

قطب شاہی دور کی عمارتوں میں آرائشی کام کا بہترین نمونہ کاروان کی ٹولی مسجد ہے۔ یہ سر سے پاؤں تک آراستہ ہے اس کی سجاوٹ میں بعض ایسی چیزیں بھی آگئی ہیں جن کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ مثلاً ہاتھی ایک مقدس جانور ہے اول تو اس لیے کہ اس کا چہرہ گنیش جی کے چہرے سے مشابہ ہے دوسرے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ آٹھ ہاتھی کائنات کی آٹھوں دساؤں (سمتوں) کی حفاظت کرتے ہیں اور کرۂ زمین کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ تلنگانہ کے معمار نے چھجے کے ٹوڑوں کو ہاتھی دانت کی شکل کا بنایا ہے اس سے بنانے والے کی نیک نیتی ظاہر ہوتی ہے کہ عمارت ہمیشہ قائم رہے۔

کلش کے معنی ہانڈی کے ہیں اس کے اندر سارے دیوتا اور سنسار موجود ہے اس لیے یہ مقدس چیز پوجنے کے لائق ہے شادی ہو یا کوئی اور رسم انجام دینی ہو ہر قسم کی تقریب میں کلش کی پوجا لازمی ہے۔ اس مسجد کو چھوٹے بڑے بے شمار کلسوں سے سجایا گیا ہے۔ دالان کی اندرونی دیواروں اور رو کار پر سنگ سیاہ کے کلسوں کی قطاریں ہر طرف چلی گئی ہیں، یہاں تک کہ قبلہ کی دیوار کی پشت بھی ان سے خالی نہیں۔ یہاں بھی معمار نے اپنا خلوص ظاہر کیا ہے کہ عمارت کی تکمیل اچھی طرح ہو کیوں کہ کلس تکمیل کی علامت ہے۔

اس دور کی مذہبی اور غیر مذہبی عمارتوں میں کنول زیادہ نمایاں ہیں۔ زینت کاری میں جا بجا کنول کی بیلیں، کنول کی کلیاں، کنول کی پتیاں اور کنول کے پھول بنائے گئے ہیں۔ بانی حیدرآباد کے مقبرہ اور چارمینار میں اس خوبصورت پھول سے بہت کام لیا گیا ہے۔ کنول کا پھول برہما جی کا آسن ہے۔ کھلے ہوئے پھول کو اوپر سے دیکھیں تو دھرم چکر معلوم ہوتا ہے اور نکلتے ہوئے سورج سے مشابہ ہے۔

مندروں کی تعمیر میں سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے ہوتے ہیں۔ عمارت کے نقش و نگار اور مورتوں کے درمیان بعض جگہ سکھارا بھی ہوتے ہیں۔ سکھارا مندر کا اوپری حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سے چھوٹے چھوٹے سکھارا تراش کر اس سے مندر کی بیرونی سطح کو سجایا جاتا ہے۔ ٹولی مسجد کے معماروں نے اس چیز کو مسجد میں پیش کیا ہے۔ قبلہ کی دیوار میں ممبر کے دونوں طرف دو چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنائی ہیں جن کے مینار، دالان، محرابیں اور جالیاں ہو بہو ٹولی مسجد کی سی ہیں۔ انھوں نے خوش اعتقادی کے طور پر مسجد کو چھوٹی چھوٹی مسجدوں سے سجایا ہے۔

یہ تمام چیزیں اس زمانہ کی ملنساری اور رواداری کو ظاہر کرتی ہیں۔ رواداری کوئی مادی چیز نہیں ہے۔ مگر قطب شاہی فرمانرواؤں نے اسے مادی بنا کر آنکھوں سے دکھا دیا ہے۔ یہاں کے معماروں کو بھی کھول کر اپنا ہنر دکھانے کی آزادی تھی چنانچہ انھوں نے عمارتوں میں ایسی چیزیں بھی بنا دیں جو اسلامی اصول کے خلاف تھیں۔

اسلامی اصول اور عقائد کے لحاظ سے جانوروں کی تصویریں بنانا منع ہے۔ یہاں کے تاجداروں نے اس اصول کو بھی نظر انداز کر دیا۔ بالاحصار کے دروازوں کی محراب پر جانوروں کی تصویریں پتھر پر کندہ ہیں۔ پرندوں میں مور بھی مقدس سمجھا جاتا ہے یہ شیو جی کے بیٹے کمار اسوامی کی سواری ہے۔ دروازے کی محراب کے پتھر پر دو مور اصلی موروں کے برابر بنے ہیں۔ ان کی چونچوں میں کنول کے پھول اور کلیاں ہیں۔ موروں کے نیچے دو شیر بھی کندہ ہیں غالباً عظمت ظاہر کرنے کے لیے یہ شیر دروازوں پر کندہ کیے گئے ہیں

قلعہ میں مسجد صفا کے برابر بلند کمانیں ہیں، یہ شاید شاہی نقارخانہ تھا۔ اس پر چونے میں اعلیٰ قسم کی محنت کاری تھی مگر زمانے کے گرم و سرد نے اس کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ چنانچہ نیچے کے حصے کی استر کاری خستہ ہو کر جھڑ گئی ہے۔ اوپری حصے میں کچھ نقش و نگار باقی ہیں ان میں عجیب و غریب جانوروں کی تصویریں ہیں۔

ہندو منقولات میں گنڈابرنڈا ایک پرندہ ہے جس کے دو سر اور تین آنکھیں ہیں۔ اس میں اتنی شکتی ہوتی ہے کہ ہاتھی کو پنجوں میں دبا کر اڑ سکتا ہے۔ ان محرابوں کی پیشانی پر کئی جگہ گنڈابرنڈا بھی منبت کیا گیا ہے۔ ایک جگہ وہ ہاتھی پر جھپٹا ہے اور اسے پنجوں میں دبوچ رہا ہے۔ اس کے سامنے کی کمان میں ہاتھیوں کا ایک جھرمٹ ہے اور گنڈابرنڈا ان پر ٹوٹ کر گرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ان کمانوں پر اور بھی جانوروں کی تصویریں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب گولکنڈہ والوں کی رواداری کا کرشمہ ہے۔

قطب شاہی طرز تعمیر بہمنی، ایرانی اور چالوکی طرز تعمیر کا ملاپ ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت عمارت میں آرائشی کام کی کثرت ہے۔ تعمیری قدروں کے لحاظ سے اس دور کی عمارتوں میں چارمینار سب سے بڑھا ہوا ہے، یہاں کا کوئی نقش

کوئی مسجد یا کوئی ایوان اس کی رعنائی کو نہیں پہنچتا۔ فن تعمیر کی بڑی شرط معقولیت ہے اس سے یہ مراد ہے کہ تعمیر میں کوئی اصولی سقم نہ ہو، اور جس غرض سے وہ بنی ہے اس کو لطیف پیرایہ میں ادا کرے۔ چار مینار میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ اس عمارت میں شکوہ اور سطوت ہے مگر ساتھ ہی پاکیزگی اور روحانیت بھی ہے۔ اس کے وسیع محرابوں میں ایک بانکپن ہے۔ میناروں کے کٹہروں کی تعمیر میں ایک ندرت ہے جس سے میناروں میں جان پڑ گئی ہے۔ اگر ان کو تھوڑی دیر تک دیکھتے رہیں تو وہ گلدستوں میں سے ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ قطب شاہی دور کی پہلی اور آخری بہترین عمارت یہی ہے

عمارتیں اینٹ پتھر کی ہوتی ہیں مگر مزاج یہ بھی رکھتی ہیں۔ بعض سے عظمت اور شوکت ظاہر ہوتی ہے، بعض سے نزاکت اور رعنائی، کوئی خوفناک ہوتی ہے اور اسی سے انقباض پیدا ہوتا ہے۔ کسی کو دیکھ کر انبساط پیدا ہوتا ہے۔ بعض عمارتیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ بعض حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں اور جمالیاتی ذوق کو ابھارتی ہیں۔ غرض مختلف عمارتیں مختلف جذبات پیدا کرتی ہیں۔ قطب شاہی عمارتیں بھی ایک جذبہ پیدا کرتی ہیں، اور وہ ہے جذبۂ رواداری۔ ان کی مذہبی اور غیر مذہبی عمارتوں میں رواداری ہر جگہ نظر آتی ہے۔

شمیم کرہانی

میں اور میرا عہد

قلم کو روک لو، کاغذ کو منتشر کر دو
کہ وقت کو نہیں نقش و نگار کی فرصت
کلی کے کھلتے ہی عہد خزاں کی بات چلی
بہت طویل ہے جشنِ بہار کی فرصت

ابھی حیات کے نغموں سے ربط کیا مجھ کو
ابھی حیات کے اسباب ڈھونڈتا ہوں میں
مجھے دکھا دے جو ہلکی سی زندگی کی جھلک
ابھی تو زیست میں وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

جنوں کی داد نہ پائیں مگر بہ فیضِ جنوں
تلے ہوے ہیں گریبان چاک ہونے کو
بنا کے صفحۂ ہستی پہ لازوال نقوش
جزا کی راہ میں پھینک آؤ خاک ہونے کو

خود اپنے حسن کو فنکار کس طرح دیکھے
دل آئینے کی طرح صاف ہی نہیں ملتا
عمل کی قدر نہ تخلیق فکر کی قیمت
مجھے سماج میں انصاف ہی نہیں ملتا

یہ قدر طاق پہ رکھا ہوا دیا تو نہیں
یہ قدر زندۂ زمانے کی ضو فشانی ہے
نقوشِ فن سے اگر وقت پھیر لے آنکھیں
تو یہ زوالِ تمدن کی اک نشانی ہے

مرے قلم کی حیات جنوں کو ہے درکار
شفق بہار، دھنک، چاندنی کنول شبنم
چراغ پھول، شبستاں، نگارۂ پیمانہ
سکونِ دل کی دوا، زخمِ زیست کا مرہم

مگر حیات شکن کوششوں کی دنیا میں
جو دل حیات کا ساغر پئیں تو کیسے پئیں
یہ حوصلہ تو ہم اربابِ فکر ہی کو ملا
کہ آنسوؤں میں جئیں اور مسکرا کے جئیں

حیات ہٹ سی گئی ہے خوشی کے مرکز سے
سکوتِ غم ہی خراماں ہے رہگزاروں میں
جنوں کے دشت میں چھایا ہوا ہے سناٹا
چہل پہل نظر آتی ہے خانقاہوں میں

مرا خیال نئی رہگزر کو کیا ڈھونڈے
کہ رہگزر کی طرف جب نگاہ مڑتی ہے
میں دیکھتا ہوں کہ دیر و حرم تو ہیں شاداب
مگر حیات کے کھیتوں میں خاک اڑتی ہے

جہاں کے کھیت ہوں پامالِ باغ نذرِ خزاں
جہاں کا خوشۂ گندم جلا جلا سا ہے
پھر اس زمین پہ یارو! مقامِ حیرت کیا
اگر حیات کا سورج ڈھلا ڈھلا سا ہے

اسی ڈھلے ہوئے سورج کی زرد زرد کرن
بڑھا رہی ہے اداسی ادب کے گلشن میں
یہ ڈوبتا ہوا سورج اگر ابھر جائے
تو مسکرائے سحر زندگی کے آنگن میں

جو سازگار نہیں، شامِ زندگی نہ سہی
نظر کو تیرہ فضاؤں میں شعلہ بار کریں
جو کوئی تیشہ اٹھاتا نہیں اندھیروں پر
تو آؤ لوح و قلم ہی سے ان پہ وار کریں

جگن ناتھ آزاد

خبر سے بے خبری تک

رودبارِ انگلستان کے کنارے ایک تاثر

(۱)

یہاں ہر اک طرف قدرے سنبھل کر دیکھنا اے دل! | کہ جلوے طور کے ہر اک قدم پر پائے جاتے ہیں
کسی کو اس جگہ فرصت تقاضے کی نہیں لیکن | جو ذرّے ہیں وہ پیہم بجلیاں برسائے جاتے ہیں

(۲)

دل ویراں بھی ہے سرشار ان سے چشم حیراں بھی | زمیں سے عرش تک انوار جو لہرائے جاتے ہیں
یہ لہریں کون سے عالم کے نغمے گنگناتی ہیں | یہ جھونکے کون سے خلد بریں میں پائے جاتے ہیں

(۳)

ہوئیں خاموش لہریں بھی ہوا بھی سو گئی گویا | نہ جانے کیوں مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں
زمیں چپ ہے، زماں چپ ہے فضائے بیکراں چپ ہے | سکوں بردوش نظارے مجھے تڑپائے جاتے ہیں
سفینے چپ، سمندر کا جہانِ نیلگوں چپ ہے | یہ چپ ہیں اور محشر کا سماں دکھلائے جاتے ہیں
سمندر سے فلک تک ایک چپ سادھے ہوئے منظر | مری نظروں کو اک زنجیر سی پہنائے جاتے ہیں

یہ سناٹا یہ نیلے پانیوں میں ڈوبتا سورج
مدد اے دل کہ مجھ کو یہ مناظر کھائے جاتے ہیں

شہاب سرمدی

پہلی کوئل

ڈالی ڈالی بَور سے بوجھل
ٹپکے رس کی بوند
نس نس کانپے، کوپل پھوٹے
چمکیں چیکن پات
بھوشن بھار سہے امرّیاں

جیسے سندر نار
کان میں جھمکا، مانگ پہ جھومر
پہنے جھک جھک جائے

ہر ہر، بھر بھر، بھاگن ڈولے
چھن چھن، رُت بھرمائے
پچھوا چھوڑ چلے چرواہی
باجت گھونگھر، ناچت گوری
گھُنگھر گھُنگھر، چوٹ لگائے
لَے سے لَے ٹکرائے

جیسے جوگن کی سنگت میں
آڑی تال پہ سم آجائے

آمن کی ہریالی مہکے
مہکیں پکے بور
شام سویرے شیاما چہکے
رین بسیرے پیکے مور
کنجن کنج میں بیٹھی کوئل

چیت کی دھوم مچائے
کُہک کُہک ہر ڈال پہ ڈولے
اِت بولے اُت جائے
جیسے کوئی نئی نویلی
بات کرت شرمائے
جیسے برہن کا دکھیا دل
دھڑکے دھڑک نہ پائے

میر ہاشم

قطعات

بہ ایں وحشت، تلاطم، بے قراری
جنوں ہے اور نہ چاک پیرہن ہے
خرد سے کام لیتا ہوں میں اب بھی
یہی شاید مرا دیوانہ پن ہے

ابھی میں جی رہا ہوں، جی رہا ہوں
گریباں سی رہا ہوں، سی رہا ہوں
ہٹا دو جام و مینا سامنے سے
میں آنسو پی رہا ہوں، پی رہا ہوں

مجھے فرطِ ملامت سے نہ دیکھو
نہ یہ رندی نہ یہ آوارگی تھی
وہی میں ہوں کہ جس کی زندگی میں
کبھی تنظیم تھی شائستگی تھی

نہ وہ محفل نہ اب وہ نغمگی ہے
مسلسل تیرگی ہی تیرگی ہے
بہت دکھ درد تھے پہلے بھی لیکن
سراپا درد ہی اب زندگی ہے

کس قدر کرب ہے کیا وحشت ہے
کتنا دل سوز غمِ فرقت ہے
سہہ لیا کیسے ترا غم میں نے
کیسے زندہ ہوں یہی حیرت ہے

پہلے بھی رنجش بے جا تو ہوا کرتی تھی
یوں تغافل ہی تغافل کبھی ایسا تو نہ تھا
تیرے ہوتے میں تجھے بھول گیا ہوں اکثر
تیری یادوں کا تسلسل کبھی ایسا تو نہ تھا

دامنِ صبر و سکوں چھوٹ بھی جاتا ہے کبھی
آبرو حوصلۂ درد کی کھو دیتا ہوں
اب مری آنکھوں میں آنسو تو نہیں ہیں لیکن
کوئی غمخوار جو مل جائے تو رو دیتا ہوں

کوئی غم خوار نہیں، غم کا شناسا بھی نہیں
اس بھری بزم میں رہتا ہوں میں تنہا جیسے
دن کسی طور سے کٹتا ہے تو یوں لگتا ہے
زیست کے کاندھوں سے اک بار ہو ہلکا جیسے

محمود حسین

نایاب تحفہ

شہر کی چوڑی اور بارونق سڑکوں سے ذرا دور چمن کے بیچوں بیچ اونچے چبوترے پر شہزادے کا ایک کانسے کا مجسمہ نصب ہے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے ہوئے جو شہزادے کی خوش دلی اور پُرمسرت زندگی کی آئینہ دار ہے۔ ابروؤں کا خم بتلاتا ہے کہ جوانی میں طرحدار ہوگا، اور نہ جانے اس نے کتنی دوشیزاؤں کی نیندیں اڑا دی ہوں گی اور انہیں اختر شماری پر مجبور کیا ہوگا۔

شاہی دور گزرے برسوں ہو چکے لیکن اس دور کی یادگار کو ہٹایا نہ جا سکا تھا۔ ایک مرتبہ حکومت نے مجسمہ پر مڑھے ہوئے سونے کے پتر، اس کی آنکھوں کے زمرد اور تلوار کے قبضے میں جڑے ہوئے لعل کی حفاظت کی خاطر اس کو ہٹا دینا چاہا تو شہریوں نے مختر گزرانے، جلوس نکالے اور احتجاجی جلسے کیے۔ ان میں پیش پیش اسکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں تھیں

اوائل سرما کی ایک طرب انگیز صبح ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شہر کی بلدیہ کے صدر نشین اپنی توند کو کم کرنے کی خاطر ٹہلتے ہوئے ادھر آنکلے۔ ان کے ساتھ کچھ اور توند والے اور "بے توندے" دوست بھی تھے۔ ان کا کام شاید صرف "جی حضور" اور "بجا ارشاد" کہنا تھا۔ پست قامت صدر نشین نے بلند قامت مجسمہ کے قریب کھڑے ہو کر اس پر نظر ڈالی اور کہا "واقعی کتنا خوبصورت مجسمہ ہے۔ اس کی آنکھوں کے زمرد، تلوار کے لعل اور سونے کے پتر کی قیمت کا اندازہ بہت ہی مشکل ہے"

ایک اہم رکن بلدیہ نے کہا "میرے خیال میں اس کی مالیت کا اندازہ دس ہزار ہوگا۔ دوسرے نے جواب دیا" اجی کیا کہہ رہے ہیں آپ صرف لعل ہی اس قیمت کا ہوگا" صدر نشین نے کہا "میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اور زیادہ قیمتی ہے۔ میں آئندہ اجلاس میں اس قیمتی مجسمے کی حفاظت کی خاطر دو چوکیداروں کے تقرر کی تحریک کرنے والا ہوں۔ آپ لوگ تو تائید کریں گے ہی" ایک رکن بلدیہ نے جن کے بال بڑھے ہوئے اور گال پچکے ہوئے تھے کہا "ساتھیو! اس زمانے میں شہزادوں کے مجسموں پر پیسے نہیں خرچ کیے جانے چاہئیں" یہ سن کر سب کی نظریں ان صاحب کی طرف اٹھ گئیں جن کی چندیا صاف تھی اور جن کی توند کافی آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ مسکرانا شہزادوں کی شان جو ٹھہری۔ عہد ماضی کی یہ زندہ یادگار، اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ صدر نشین نے البتہ جواب دیا "لیکن اس سے دو آدمی تو پلیں گے۔ عوامی حکومت کے دور میں ایسا ہی کام جانا ہے جس سے عوام کو یا ان کے کسی فرد کو فائدہ پہنچے" ایک "جی حضوریے" نے گرہ لگائی "بجا ارشاد ہے۔ میرے خیال میں تو ان چوکیداروں پر نگرانی رکھنے کے لیے ایک اور شخص کو مامور کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کر سکیں

اور کسی سازش کا شکار نہ ہو جائیں۔" ایک اور نے ہاں میں ہاں ملائی اور کہا "صاحب کے میرے بھائی کے پھوپی زاد برادر کے داماد آج کل فرصت سے ہیں۔ ان سے بہتر آدمی اس کام کے لیے نہیں مل سکے گا۔"

لمبے بالوں اور پچکے ہوئے گالوں والے رکن نے گھٹے ہوئے قہقہے کے ساتھ کہا "ہاں ! فن کاری کے اس شہ کار سے متعلق ہو کر یقیناً ان کی حیثیت میں اضافہ ہو جائے گا۔"

اس گفتگو نے صدر نشین کو اپنی بھوک یاد دلائی۔ انھوں نے واپسی کا اعلان کیا۔ ناشتہ کا وقت جو قریب تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں شہزادہ اکیلا رہ گیا۔

لیکن شہزادہ مسکرا رہا تھا۔ شاید اسے پدرانِ شہر کی ان باتوں پر ہنسی آ رہی تھی یا ممکن ہے اسے اپنا زمانہ یاد آ رہا ہو ۔۔۔ خوبصورت محل کی اونچی دیواریں، دور دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار، شفاف حوضوں میں اچھلتے فوارے، حسین خادماؤں کے جھرمٹ، سازوں کے مدھر بول، خوشبو کی لپٹیں، نرم و آرام دہ بستر، جوانی کے دن، امنگوں کی راتیں۔ اس کو کیا حاصل نہ تھا۔ اور اگر حاصل نہ تھا تو ۔۔۔ "درد" نہ اپنا نہ پرایا۔ اس لیے گوشت پوست کے گل جانے کے بعد بھی اس کے دھانی لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی نہ جانے یہ مجسمہ ساز کے ہاتھوں کا اعجاز تھا یا شہزادے کی فطرت کا پرتو۔

❖ ❖ ❖

خاموش بہتے ہوئے دریا کی موجیں کنارے پر لہلہاتے سرکنڈوں کی جھاڑیوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ دھیما ایک رنگین پروں والے طائر نے ایک نوخیز کلی کو تاکا اور پوچھا "تمھاری کمر اتنی لچکتی کیوں ہے؟" ڈالی نے کہا "یہ تو میں تمھیں دیکھ کر شرم سے جھکی جا رہی ہوں۔" پرندے کی ہمت بندھی۔ اس نے پھر سوال کیا "تو پھر کل کیوں تم نے اس بگلے کو اپنے قریب بیٹھنے دیا تھا؟" ڈالی نے کہا "یہ پڑوس میں دریا جو بہہ رہا ہے نا اس سے تو سب ہی سیراب ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اس نے بھی اپنی پیاس بجھانی چاہی ہو۔ میں کیوں کسی کو روکتی۔" پرندے نے دیکھا ہر ڈالی جھوم رہی ہے۔ ایک لانبی ڈالی تو خصوصیت سے ایک طرف کو بہت جھک رہی تھی۔ اس نے پوچھا "وہ لانبی ڈالی کیوں اتنی جھکی جا رہی ہے؟" نوخیز ڈالی نے ادھر دیکھا اور پھر ہمک ہمک کر ادھر ہی دیکھتی رہی۔ وہاں چاندی کے پروں والا بگلا، لانبی گردن اور سخت چونچ لیے اپنی سبک ٹانگوں پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ رنگین پروں والے پرندے نے یہ منظر دیکھا تو سیٹی بجاتا ہوا ایک طرف کو پھدک گیا۔ بگلے نے نوخیز ڈالی کی طرف گردن موڑ دی ایک بار اپنی غلافی آنکھیں جھپکائیں اور خراماں خراماں اس کے قریب آ گیا۔ چونچ کی کھڑک اور پروں کی جھپک سے اس کو اپنی طرف مخاطب کیا اور کہا "نازک بانو! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ سنو گی؟ میرے سب ساتھی آنے والی ٹھنڈی ہواؤں کے تصور سے کانپ کر چل دیے۔ مجھے بھی بہتیرا سمجھایا لیکن مجھ سے جایا نہ گیا تمھیں چھوڑ کر کیسے جاتا، گو مجھے تمھارا موجوں سے کھیلنا، ہوا سے سرگوشی کرنا اور رنگین پروں والے سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے ساتھی کہتے تھے کہ یہ عجیب محبت ہے۔ محبت تو عجیب ہوتی ہی ہے۔ اب میں اس کو کیا کروں۔ سرما آ رہا ہے برف گرے گی، دریا کا پانی تھم جائے گا اور میری رگوں میں خون جم جائے گا لیکن میں تمھیں چھوڑ کر تمازت و حرارت کی تلاش میں نہیں جا سکتا۔ میری روشنی تو تم ہو میرے دل کی

حرارت تو تم سے ہے۔ میں تو آنکھوں کے پتھرا جانے تک تمھیں دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔" نوخیز ڈالی نے گردن جھکا کر کہا "سرما کے تصور سے ہی جھرجھری آجاتی ہے۔ دیکھو تو میں یوں ہی کانپنے لگی ہوں۔ میری وجہ سے تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو۔ تمھارا تو شاید کوئی گھونسلا بھی نہ ہو۔ تم شہزادے کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔ وہاں سر چھپانے کو کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی" بگلے کے سفید چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے غصہ میں اپنی چونچ کھٹکھٹائی اور کہا "مجھے بے جان مجسموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" اتنے میں ایک سنہری مچھلی اٹھلاتی ہوئی آئی اور نوخیز ڈالی کے پیروں کو گدگدایا۔ نوخیز ڈالی لچک کر رہ گئی لیکن سنہری مچھلی کو دیکھا تو مسکرانے لگی۔ بگلے سے اور برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے کہا "نوخیز ڈالی تمھیں میری یک رنگی اور ریاکاری نہیں بھائی اور سنہری مچھلی کی چمک دمک نے تمھیں اتنا لبھایا۔ تم ہرجائی ہو، تمھارا میرا ساتھ نہ ہو سکے گا۔ تم سے تو پتھر کے دیوتا۔" "اچھے، شہزادہ اچھا، بے جان مجسمہ اچھا اس کی زمردیں آنکھیں صرف ایک طرف دیکھتی ہیں۔ تم نازک حسیناؤں کو ہر موج ہوا اپنی طرف جھکا لیتی ہے سنہری مچھلی تمھیں مبارک میں تو چلا۔

٭ ٭ ٭ ٭

پتوں نے تالیاں بجا کر شرمیلے سورج کی تھرکتی ہوئی کرنوں کا استقبال کیا۔ اکیلی کلی چٹا کر پھول بن گئی۔ سورج مکھیوں نے گردن پھیر پھیر کر دمکتے دیوتا کے درشن کیے۔ بگلے کی آنکھ کھل گئی اور اس کی نظر سامنے کھڑے سنہری مجسمے کے مسکراتے ہوئے لبوں پر پڑی۔ بگلے نے دل میں کہا شگون نیک ہے آج تو میں اپنے ساتھیوں سے جا ملوں گا۔ ابھی تو برف گرنے میں کچھ دن اور ہیں لیکن جب اس مجسمہ پر برف جمے گی تو منظر بڑا پر لطف ہوگا۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے شہزادے پر نظر کی تو اس نے شہزادے کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے۔ اس نے پوچھا "کیا بات ہے شہزادے تمھیں کس بات کا رنج ہے۔ کیا تمھیں آنے والے سرما کا خوف ہے یا بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی یاد ستاتی ہے یا پھر کسی دلبر نے منہ موڑ کر تمھارا دل توڑ دیا ہے۔ تمھاری زمردیں آنکھوں میں آنسو کیوں تیر رہے ہیں؟"

شہزادے کی مسکراہٹ میں جیسے تلخی گھول دی گئی اس نے کہا "سادہ لوح بگلے تمھارا کردار بے داغ ہے۔ میں تم سے اپنے دل کی بات نہیں چھپاؤں گا۔ میں برسوں سے یہاں کھڑا گرد و پیش سے بیگانہ اپنے ماضی کی یاد میں مگن تھا۔ کل یہاں سے پدران شہر کا گزر ہوا کسی کے گال پچکے ہوئے تھے، کسی کی توند نکلی ہوئی تھی کسی کی آنکھیں لالچ سے چمک رہی تھیں تو کسی کا ذہن خود غرضی سے اٹا ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ماضی کے محل کی دیواریں گر گئی ہوں، اور مجھے حال کا چٹیل میدان نظر آرہا ہو۔ میں نے چندھیائی آنکھوں سے دریا کی طرف نظر کی اور تمھارے سفید سینے کے اندر دل کا خون ہوتا ہوا دیکھا غصہ سے میرا جسم تمتما اٹھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ خنک ہواؤں نے پنکھا جھل کر مجھے سلانے کی کوشش کی لیکن میں رات بھر نہ سو سکا۔ گزشتہ رات میں نے دھندلے چاند کی پھیکی روشنی میں پہلی مرتبہ شہر پر نظر ڈالی میرے دوست نہ پوچھو میں نے کیا دیکھا۔ میری آنکھیں رات سے آنسو بہا رہی ہیں۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس غم ہوا ہے رات میں نے دیکھا کہ ایک باغیچہ میں ایک چوڑے سینے اور بھرے بازوؤں والا فوجی افسر اپنی حسین محبوبہ سے وعدہ لے رہا ہے کہ

وہ کل کی دعوت میں اپنا نیا لباس پہن کر آئے گی۔ وہ اس لباس میں پری معلوم ہوگی جنت کی کوئی حور، اور سب دیکھنے والے اس سے رشک کریں گے۔ ایک انداز دلبری سے حسینہ نے کہا کہ اس کا لباس اگلی دوپہر تک تیار ہو جائے گا — لیکن میں نے دیکھا کہ ایک غریب بڑھیا اپنی ویران کوٹھری میں اسی لباس کو تیار کرتے کرتے سو گئی ہے۔ دن بھر اس نے فاقہ کیا تھا۔ اس کے چراغ میں تیل نہیں تھا، اس کی آنکھیں بے نور سی ہو گئی تھیں اور اس کی انگلیاں چھلنی۔ لباس تیار نہ کر سکنے کے غم میں وہ نڈھال ہو کر پڑ گئی تھی۔ میرے سفید فام دوست تم ان زمردوں میں سے ایک میری آنکھ سے نکالو اور اس بڑھیا کو دے آؤ۔ وہ کھائے گی پیئے گی تو اس کی انگلیاں پھر سے کام کرنے لگیں گی اور حسینہ کا لباس تیار ہو سکے گا۔ اس بڑھیا کو مزدوری ملے گی اور اس کے دل کو قرار حاصل ہوگا۔ اس سے بے بی بے چینی بھی دور ہوگی۔ آج رات وہ حسینہ اپنے نئے لباس میں پری بن کر اترائے گی۔ اس کا فوجی محبوب اپنے مضبوط بازوؤں کے سہارے اسے محفل میں لیے لیے پھرے گا اور اپنی قسمت پر ناز کرے گا میرے اچھے دوست جلدی کرو میں ان سب کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"شہزادے مجھے جانا ہے یہاں سے بہت دور۔ اس سرد ملک کی سرحد کے پار جہاں سورج چمکتا ہے میرے دوست وہاں خوش فعلیوں میں معروف ہوں گے اور مجھے یاد کر رہے ہوں گے۔ لیکن میرا دل تمہاری بات ٹالنا گوارا نہیں کرتا۔ میں یہ زمرد لیجاؤں گا۔ میں اس بڑھیا کو جیتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس حسین تتلی کو اپنے فوجی محبوب کے ساتھ خوشی میں تھرکتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے پریمیوں کے ملاپ سے خوشی ہوتی ہے گو خود مجھے محبت کے جواب میں غم ملا۔ لیکن شہزادے! کل میں ضرور چلا جاؤں گا درختوں کے گہرے سائے وہاں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

شہر کے ایک ویران محلے میں ایک تاریک گلی ہے۔ ایک اجڑے سے مکان کے اندھیرے کمرے میں ایک نوجوان میز پر سر پھیلائے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے غنودگی کے عالم میں بیٹھا ہے۔ سامنے کاغذات پھیلے پڑے ہیں۔ قلم کھلا پڑا ہے جس کی سیاہی نب پر خشک ہو چلی ہے۔ اس کے بال بڑھے ہوئے ہیں ناخن کئی ہفتوں سے تراشے نہیں گئے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ سامنے سگریٹ کی خالی ڈبی ہے۔ گزشتہ دو دنوں میں اس نے صرف دو پیالی چائے پی تھی۔ اس کا مضمون پورا نہیں ہوا۔ اس کو معاوضہ کیا ملے گا۔ صدر جلسہ کل کیا تقریر کریں گے۔ مجمع تالیاں کیسے بجائے گا۔ اخباروں میں جلی عنوانوں سے کیا چھپے گا۔ آج معاوضہ ملے تو کل درزی صدری دے گا، اور کل اس کی آنتوں میں غذا دوڑ جائے گی۔ نوجوان نے تقریر کے ہر ہر لفظ کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ ہر جملہ اس کے جگر کا ٹکڑا ہے لیکن یہ تقریر اگر پوری نہ ہو سکے تو —

لیکن نہیں یہ تقریر لکھی جائے گی۔ شہزادے کی یہ درخواست کہ ابابیل آج بھی سایوں کے دیس نہ جائے رد نہ ہو سکے گی۔ اس کی خواہش کہ اس کی آنکھ کا دوسرا زمرد نوجوان ادیب کی میز پر رکھ دیا جائے، پوری ہوگی۔ نوجوان چائے پیے گا، سگریٹ کے کش لے گا۔ اپنے ادھورے جملوں میں جان بھر سکے گا، اور دوسرے روز جلسہ گاہ میں تالیاں پیٹی جائیں گی۔ جناب صدر پھولوں سے لد جائیں گے اور اخباروں کے کالم ان کی تعریف میں سیاہ ہوں گے — اور ابابیل دوسرے روز بھی حرارت و تمازت کی دنیا کو نہ جا سکا سایوں کے دیس میں سورج چمکتا رہا، ساتھی انتظار کرتے رہے۔

اس رات فٹ پاتھ پر ایک بچہ اور ایک بچی، بن ماں باپ کے بھائی بہن، سماج کے ٹھکرائے ہوئے، سردی میں ٹھٹھرے ہوئے پڑے ہیں۔ جسم کچھ کھلا کچھ ڈھکا ہے۔ آنتیں جیسے غذا کے لیے پیدائش سے ترس رہی ہوں۔ ماں کا دودھ بھی تو انھیں کبھی پیٹ بھر نہ ملا، بھیک کیا ملتی۔ کون ہے جو انھیں سہارا دے۔ کون ہے جو انھیں آسرا دے۔ لمبی مونچھوں والے چوکیدار کے بوٹ سخت ہیں۔ سیٹھ جی کی گھرکی گرجدار ہے منجھے ہوئے گداگروں کے نہ صرف چہرے خشمناک ہیں بلکہ ان کے کھردرے ہاتھ بھی دراز ہیں۔ دکانوں کے سائے میں "گورکھے" سونے نہیں دیتے۔ پھاٹک کے اندر کتے داخل ہونے نہیں دیتے۔ خدا کی اس وسیع زمین پر انھیں کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ گائے بیل گدھے اور کتے تو جہاں جائیں لیٹ جائیں لیکن گشت کا سپاہی انھیں سانس لینے نہیں دیتا۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ صبح بھی اگر کچھ کھانے کو نہ ملے تو چھوٹی بہن بھوک سے بلک کر مر جائے گی اور بے بس بھائی دل مسوس کر رہ جائے گا۔ کیا شہزادے کی تلوار ان کے کوئی کام نہ آسکے گی۔ شہزادہ بگلے سے کہتا ہے "میرے ننھے دوست یہ لعل ان بچوں کو دے دو۔ میں اپنی ان پھوٹی آنکھوں سے ان کی بے بسی نہیں دیکھ سکتا۔ تمھیں خدا کا واسطہ آج سورج کے دیس نہ جاؤ۔ ان بے ماں باپ کے بچوں کو سہارا دو۔ خدا تمھارے دل کو درد آشنا کردے۔"

بگلے نے کہا "شہزادے! میں نہیں جاؤں گا۔ میں تمھیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں ان بچوں کو بھوکا مرنے نہیں دوں گا۔ شہزادے تم نہیں دیکھ سکتے تو میں دیکھوں گا کہ کون کون یہاں بھوک اور افلاس کے پاٹوں میں پسا جا رہا ہے۔ تم اجازت دو تو اس سونے کے پتر کو بھی اکھیڑ کر ایسے لوگوں کو دے آؤں۔" شہزادے کی مسکراہٹ نے جیسے پھول بکھیر دیے۔ اس نے کہا "کاش میری یہ چمڑی کسی کے کام آجائے۔" بگلا کئی روز تک شہزادے کے جسم سے سونے کا پتر اکھیڑ اکھیڑ کر بے نواؤں کو دیتا رہا یہاں تک کہ سرما آگیا۔

رات قیامت خیز تھی۔ ملگجی صبح نے دیکھا کہ سرد ہوا کے جھونکوں نے سرکنڈوں کی تمام ڈالیوں کو سرنگوں کردیا تھا دریا کی موجیں ساکت و صامت تھیں۔ سورج مکھی کی پتیاں گر چکی تھیں۔ پہلی برف باری ہی نے ہر چیز کو کاغذی پیرہن پہنا دیا تھا۔ اندھے مجسمہ کے قدموں میں بگلے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

* * *

پدران شہر نے جب ہنگامی دورہ کیا تو مجسمہ کی اس حالت کو دیکھ کر انھوں نے تصفیہ کیا کہ چوکیداروں کے تقرر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ نہ جواہر ہی باقی ہیں نہ سونے کے پتر۔ ہر ایک نے رات والے طوفان کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ایک رکن نے کہا "ایسا قانون بنانا چاہیے کہ ہوا طوفانی نہ بن سکے۔" دوسرے نے بگلے کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میری طرف سے ایک دفعہ کا اضافہ کیا جائے کہ پرندے باغوں میں مجسموں کے قریب نہ مرا کریں۔"

صدر نشین نے کہا "ہوا اور پرندے دونوں غیر ذمہ دار ہوتے ہیں ان کے لیے قانون بنانے میں ہم کیوں وقت گنوائیں۔ ہمیں کوئی تعمیری کام کرنا چاہیے۔ لانبے بالوں اور پچکے گالوں والے رکن نے کہا "تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے۔ اس مجسمہ کو گرا دیا جائے۔ اس سرزمین پر اب شہزادوں کی ضرورت نہیں۔" ایک جی حضوریے نے کہا "جو چیز خوبصورت نہیں اس کی افادیت

ہی کیا۔ میرے خیال میں اس مجسمہ کو گلا کر اس دھات سے ایک اور مجسمہ تیار کیا جائے اور اسے کسی بارونق شاہ راہ کے چوراستے پر کھڑا کیا جائے۔" سب نے اس پر اتفاق کیا۔ لیکن اس پر بڑی گرماگرم بحث ہوی کہ یہ مجسمہ کس کا ہو؟ آخر میں "توندوں" نے پچکے ہوے گالوں" پر فتح پائی اور یہ طے پایا کہ یہ مجسمہ صدر نشین بلدیہ کا ہو۔ مسکراہٹ شہزادے کے لبوں سے صدر نشین بلدیہ کے لبوں پر منتقل ہوگئی۔

* * *

کارخانے والوں نے جب مجسمہ گلایا تو ایک زوردار آواز کے ساتھ اس کا سینہ پھٹ پڑا، اور مجسمہ کا دل دو ٹکڑے ہوگیا۔ نہ جانے کس چیز کا یہ ٹوٹا ہوا دل بنا تھا کہ بھٹی کی آگ بھی اسے نہ پگھلا سکی۔ کارخانے والوں نے اس دھات کے ٹکڑے کو "کچرے کی کونڈی" میں پھینک دیا، وہیں جہاں بگلے کی لاش پھینک دی گئی تھی۔

* * *

اسی روز آسمانوں کے پرے خدا نے جب اپنے ایک فرشتے سے کہا "مجھے دنیا سے کوئی نایاب تحفہ لادو" تو فرشتے کی نظر پوری دنیا میں صرف دو چیزوں پر جم کر رہ گئی ـــ شہزادے کا دل اور بگلے کی لاش ـــ خدا کے حضور جب یہ دونوں تحفے پیش کیے گئے تو اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر گئے۔

(آسکر وائیلڈ کے THE HAPPY PRINCE سے ماخوذ)

اشتیاق بچھرایونی

آخری شب

"موسی!"

"سو جاؤ بیتین رات ہو گئی ہے۔"

"ہو نے دو رات، میری زندگی کے دن زیادہ نہیں ہیں۔ میں نے کہا تھا منی کو اس کے پتا کے گھر۔ بھول رہا ہوں، اس کے والد آج کل کہاں ہیں؟"

"سیتارام پور"

"ہاں سیتارام پور، وہیں بھیج دو، اور کتنے دن وہ بیمار کی تیمار داری کرے گی۔ وہ جسمانی طور پر بھی تو کمزور ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹا، تمھیں ایسی حالت میں چھوڑ کر وہ جا بھی کیسے سکتی ہے؟"

"ڈاکٹروں نے جو کہا ہے تو کیا اسے ۔ ۔ ۔ ۔!"

"وہ یہ نہیں جانتی۔ مگر آنکھوں سے تو دیکھ سکتی ہے۔ اس دن ذرا اشارتاً مائکے جانے کی بات کہی تھی تو اس نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا۔" کر گھر بھر دیا۔"

یہاں اس قدر کہہ دینا لازمی ہے کہ موسی کی اس بات میں سچائی کس قدر چھپائی گئی تھی۔ منی مالا کے ساتھ اس دن جو موسی کی بات ہوئی تھی وہ اس طرح تھی۔

"بہو لگتا ہے تمھارے میکے سے کوئی خبر آئی ہے۔ کیا انا تھو تمھارا چچیرا بھائی کوئی خیر خبر لایا ہے؟"

"ہاں ماں نے کہلوایا ہے کہ اگلے جمعہ کو میری چھوٹی بہن کی سالگرہ ہے لہذا میں سوچ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ٹھیک تو ہے بیٹی سونے کا ہار بھیج دو، ماں خوش ہو جائے گی۔"

"سوچتی ہوں میں خود چلی جاؤں، میں نے چھوٹی بہن کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو؟ بیتین کو اکیلا چھوڑ جاؤ گی کیا؟ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا کیا سنا ہے؟"

"ڈاکٹر تو کہتا تھا کہ ابھی ایسی کوئی خاص ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

"خیر کچھ بھی ہو تم اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر جاؤ گی کیسے؟"

"میرے تین بھائیوں کے بعد ایک بہن ہوئی ہے۔ سنا ہے بڑی دھوم دھام سے یہ سالگرہ منائی جائے۔ میں نہیں جاؤں گی تو ماں بڑی۔ ۔ ۔ !"

"تمھاری ماں میری سمجھ سے باہر ہیں بہو! اگر بیتین کو اس حال میں چھوڑ کر جاؤ گی تو تمھارے پتا بہت ناراض ہوں گے یہ سمجھ لینا۔"

"یہ تو جانتی ہوں، تمھیں ایک خط لکھ دینا ہوگا موسی کہ کوئی فکر کی بات نہیں میرے جانے سے کوئی حرج نہیں۔"

"تمھارے جانے میں کوئی حرج نہیں، کیا میں نہیں جانتی؟ مگر تمھارے پتا کو کچھ لکھنا ہی ہے تو میرے دل میں جو کچھ ہے سب کچھ کھول کر لکھ دوں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم کچھ نہ لکھو۔ میں جا کر ان سے کہتی ہوں وہ۔ ۔ ۔ ۔ !"

دیکھو بہو بہت کچھ سہہ چکی ہوں اس بات کو لے کر اگر تم بیتین کے پاس جاؤ گی تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔ تمھارے پتا تمھیں اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ انھیں تم دھوکہ نہیں دے سکتیں۔

اتنا کہہ کر موسی چلی آئی اور منی مالا کچھ دیر کے لیے ناراض ہو کر بستر میں پڑی رہی۔

پڑوس سے اس کی سہیلی نے آکر پوچھا "یہ کیا منی غصے میں کیوں ہو؟"

"دیکھو نہ بہن میری ایک ہی تو بہن ہے اس کی سالگرہ میں یہ لوگ مجھے جانے نہیں دیتے۔"

"ارے یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ کہاں جاؤ گی پتی کو اس قدر بیمار چھوڑ کر۔"

"میں خود کرتی بھی کیا ہوں، دوسرے مجھ سے کچھ ہوتا بھی نہیں۔ گھر میں سب نے ایسی خاموشی اختیار کر لی ہے کہ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ اس طرح مجھ سے تو رہا نہیں جاتا۔"

"تم بھی عجیب عورت ہو۔"

"تم کچھ بھی کہو بہن۔ میں تم لوگوں کی طرح دکھاوا نہیں کر سکتی کہیں کوئی کچھ سوچے اس خوف سے گھر کے کونے میں پڑا رہنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"آخر پھر کرنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں ضرور جاؤں گی۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"افوہ! تم تو بڑی تیز ہو، اچھا تو میں چلی مجھے کام ہے۔"

مائکے جانے کے نام پر منی روئی تھی۔ اس کا پتہ لگتے ہی بیتین مضطرب ہوا تھا۔ اپنے سرہانے کی طرف گاؤ تکیہ کھینچ کر اس کے سہارے ذرا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "موسی یہ کھڑکی ذرا اور کھول دو اور اس بتی کی یہاں ضرورت نہیں۔"

کھڑکی کھلتے ہی پر سکون رات لا انتہائی ساخت کے راہی کی طرح مریض کے دروازے کے قریب آکر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے کتنے سالہا سال کے موت کے گواہ آسمان کے تارے بیتیندر کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

"یتیندر اس بے پناہ اندھیارے کے دامن پر اپنی منی کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس چہرہ کی دو بڑی بڑی غلافی آنکھیں پانی کی موٹی موٹی بوندوں سے بھری ہیں وہ پانی ختم ہی نہیں ہوتا جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھہرا ہوا ہو۔

کافی دیر تک اسے خاموش دیکھ کر موسی کچھ مطمئن ہوئی۔ سوچنے لگی شاید اسے نیند آ گئی ہے۔

تبھی اچانک یتین بول اٹھا "موسی تم برابر سوچتی رہیں کہ منی کا من چنچل ہے۔ ہمارے گھر میں اس کا دل نہیں لگتا لیکن دیکھو. . . . ."

"نہیں بیٹا غلط سمجھا تھا میں نے ـــ وقت آنے پر ہی اصلیت معلوم ہوتی ہے۔"

"موسی!"

"سو جاؤ بیٹا!"

"مجھے ذرا سوچنے دو، بات کرنے دو، اکّا دُکّا موسی!"

"نہیں بیٹا، بولو بولو تم! میں خوب غور سے سنوں گی۔"

"میں کہہ رہا تھا آدمی کو خود کو سمجھنے ہی میں کتنا وقت لگتا ہے۔ ایک دن وہ بھی تھا جب میرا خیال تھا کہ ہم میں سے کسی نے منی کو نہیں سمجھا تب خاموشی سے برداشت کر لیا۔ تم لوگ تب. . . . ."

"نہیں بیٹا ایسا نہ کہو میں نے بھی برداشت کیا ہے۔"

"دل مٹی کا ڈھیلا تو نہیں، جو اٹھا لینے سے ہی مل جائے گا۔ میں جانتا تھا، منی نے اپنے دل کو ابھی سمجھا نہیں، کسی حادثہ سے جب سمجھے گی اس دن پھر. . . ."

"ٹھیک بات ہے بیٹا"

"اس لیے اس کے لڑکپن پر کبھی میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔"

موسی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ اکثر و بیشتر انھوں نے دیکھا ہے کہ یتیندر نے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے رات بتا دی ہے۔ بارش کی بوچھار آئی پھر بھی کمرے میں نہیں گیا۔ کتنے ہی دن وہ سر دبائے بستر پر پڑا رہا اور اندرونی طور پر چاہتا رہا کہ منی آ کر ذرا سر پر ہاتھ پھیر دے۔ منی ایسے موقعوں پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ تھیٹر دیکھنے کی تیاریوں میں مصروف دکھائی دیتی۔ تب وہ خود یتین کو ہوا جھلنے آتیں، مگر یتین انھیں بے دلی کے ساتھ لوٹا دیتا۔ اس بے دلی میں کس قدر افسردگی ہوتی وہ انھیں اچھی طرح معلوم تھی۔ کتنی ہی بار انھوں نے یتین سے کہا ہے، بیٹا، تم اس لڑکی کی طرف زیادہ دھیان مت دو۔ وہ ذرا پہلے چاہنا سیکھ لے۔ آدمی کو ذرا تھوڑا رونا چاہیے۔ مگر یہ سب باتیں کہنے کی نہیں ہیں اور کہنے سے کوئی سمجھتا بھی نہیں۔ یتین کے دل میں عورت کے لیے ایک نہایت ہی مقدس ترین مقام تھا۔ وہیں اس نے منی کو بٹھایا تھا اور اس کے لیے یہ سوچنا بھی آسان نہ تھا کہ اس مقدس مقام میں عورت کا آبِ حیات کا پیالہ ہمیشہ اس کے لیے خالی ہی رہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جانب سے پوجا جاری تھی، پرستش ہو رہی تھی۔ جام اوپر تک بھرا جا رہا تھا حصول کی تمنا شکست

تسلیم نہیں کر رہی تھی۔
موسی کو پھر جیسے ہی خیال ہوا کہ بتین سو رہا ہے۔ تبھی پھر وہ اچانک بول اٹھا "میں جانتا ہوں موسی تم سوچتی ہو کہ منی کو حاصل کر کے ہیں سکھی نہیں ہو سکتا۔ اسی سے تم اس پر ناراض ہوتی ہو۔ مگر موسی سکون اور اطمینان نام کی چیز ان تاروں جیسی ہے۔ سارے اندھیارے کو وہ ڈھکتے نہیں رہتے بیچ بیچ میں وہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ زندگی میں ہم نہ جانے کتنی غلطیاں کرتے ہیں۔ کس قدر غلط سمجھتے ہیں۔ پھر بھی کیا زندگی کی راہوں میں جنّت کے چراغ روشن نہیں ہوتے؟ کس طرح پھر آج یہ میرا دل مسّرت و فرحت سے معمور ہے۔"
موسی آہستہ آہستہ بتین کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ تاریکی میں ان کی آنکھوں سے جو ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے انھیں کوئی دیکھ ہی نہ سکا!

"میں سوچتا ہوں موسی اس کی عمر کم ہے۔ وہ کیا کرے۔"
"کم عمر کیوں ہے بتین؟ یہی تو اس کی مناسب عمر ہے۔ ہم نے بھی تو بیٹا کم سنی ہی میں دیوتا کو دنیا کی طرف بہا کر اپنے دل میں بٹھایا ہے۔ اس سے کیا کوئی نقصان ہوا ہے؟ اور میں تو کہتی ہوں آرام و سکون کی بھی ایسی زیادہ ضرورت کیا؟
"موسی منی کا من جب جاگنے کا ہوا تبھی۔۔۔۔"
"تم اس قدر کیوں سوچتے ہو بیٹا؟ دل اگر بیدار ہوا تو یہی کیا کم خوش قسمتی کی بات ہے؟"
یکایک ایک مدت کا سنا ہوا ایک پرانا سا گیت بتین کو یاد آگیا ؎

اورے من جب جاگا نا رے — تب من کا مانس آیا دوارے
اس کے جانے کی سن آواز — ٹوٹ گئی رے نیند

او تیری ٹوٹی نیند اندھیارے۔۔۔۔!

"موسی گھڑی میں کیا بجا ہے؟"
"نو بجیں گے۔"
"نو؟ میں سوچ رہا تھا کہ شاید دو تین یا کچھ اور بجا ہوگا۔ شام ہی سے میری آدھی رات شروع ہو جاتی ہے تو تم مجھے سلانے کی جلدی کیوں کر رہی تھیں؟"
"کل بھی اسی طرح باتیں کرتے کرتے رات کے دو بجا دیئے تھے، تم سو بھی نہ پائے اسی وجہ سے جلدی کر رہی تھی۔"
"منی سو گئی کیا؟"
"نہیں وہ تمھارے لیے مسور کی دال کا پانی بنا کر سوئے گی۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہو موسی؟ تو کیا منی۔۔۔"
"وہی تو تمھارے لیے تمام چیزیں بناتی ہے کام سے اسے فرصت کہاں؟"

"میں سوچتا تھا کہ منی شاید . . . . "!

"عورتوں کو یہ سب باتیں کیا سکھانا پڑتی ہیں. کام پڑنے پر سب اپنے آپ ہی سیکھ جاتی ہیں"

"آج دوپہر کو جو بیسن بنا تھا اس میں بڑا سوندھا پن تھا. میں سمجھا تمھارے ہی ہاتھ کا بنا ہوا ہے"

"میری اپنی قسمت کہاں ہے؟ مجھے کیا بہو کسی کام میں ہاتھ لگانے دیتی ہے۔ تمھارا تولیہ بھی اپنے ہاتھ سے دھوتی ہے. جانتی ہے نا تمھیں ذرا سی بھی گندگی پسند نہیں. تم اپنی باہر کی بیٹھک دیکھو گے تو دنگ سے رہ جاؤ گے. دونوں وقت اپنے ہاتھ سے جھاڑ پونچھ کر ایسا چمکائے رکھتی ہے کہ بس دیکھتے ہی بنتا ہے. میں اگر اسے اس کمرے میں آنے دیتی نا تو دیکھتے کہ کیسا ادھم مچائے رکھتی"

"منی کی طبیعت کیا. . . "

"ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ مریض کے کمرے میں اس کا آنا جانا ٹھیک نہیں. اس کا دل بڑا نازک ہے. تمھاری تکلیف دیکھنے سے وہ خود بیمار پڑ جائے گی"

"موسی اسے تم روکے کیسے رکھتی ہو؟"

"میرا خیال بہت کرتی ہے نا اس لیے. پھر بھی بار بار جاکر خبر دینا پڑتی ہے. میرے لیے ایک کام یہ اور بڑھ گیا ہے"

آکاش کے تارے مضمحل آنکھوں کی مانند جھپکنے لگے. جو زندگی آج وداع ہونے کے لیے راہ پر کھڑی ہوئی ہے. ستین نے اسے دل ہی دل میں سراہا، اور سامنے موت نے اندھیرے میں آکر جو اپنا ہاتھ بڑھا دیا ہے، ستین نے صادق الیقینی کے ساتھ اس پر اپنا بھرپور ہاتھ رکھ دیا"

لمبی سانس لے کر ذرا ادھر ادھر سرک کر ستین نے کہا "موسی منی اگر جاگ رہی ہو تو اسے ایک بار . . . "

"ابھی بھیجتی ہوں بیٹا"

"میں زیادہ دیر تک اسے اس کمرے میں رکھنا نہیں چاہتا. صرف پانچ منٹ . . . . دو ایک باتیں کرنی ہیں"

موسی نے ایک گہری سانس لی اور منی کو بلانے چلی گئیں. ادھر ستین کی نبض تیز چلنے لگی. ستین جانتا ہے کہ آج تک کبھی وہ منی کے ساتھ اچھی طرح بات نہیں کر سکا. دو سازوں میں دو سر بندھے ہوئے ہیں. دونوں کو ایک ساتھ الاپنا بڑا مشکل ہے. منی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اول فول بکا کرتی ہے، ہنستی ہے اسی کو سن کر ستین ستین کتنی ہی بار حسد سے دکھی ہوتا رہا ہے. مگر اس نے برابر اپنی ذات کو ہی برا بھلا کہا ہے. وہ خود کیوں نہیں اس قدر معمولی معمولی سی باتوں پر ہنس بول سکتا ہے؟ اور یہ بھی تو سچ نہیں کہ وہ ہنس بول نہیں سکتا. اپنے دوستوں میں تو وہ اسی طرح باتیں کرتا ہے، ہنستا ہے، مگر مردوں کی معمولی سی باتوں سے عورتوں کی معمولی باتیں میل نہیں کھاتیں. کوئی بڑی بات ہو تو اسی کو لگاتار کہا جا سکتا ہے دوسرا کوئی اس پر دھیان دے رہا ہے یا نہیں، اس کی پرواہ نہ بھی کی جائے تو کوئی حرج نہیں. لیکن کچھ باتوں میں تو دونوں طرف کی دلچسپی ہونی چاہیے بانسری اکیلے ہی بج سکتی ہے مگر مجیرا تو دو کے بغیر جم ہی نہیں سکتا. ستین نے بار بار رات کو کھلے برآمدے میں چٹائی بچھا کر منی کے ساتھ

کامیاب بات چیت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر کبھی بھی وہ کامیاب نہیں ہوا۔ گفتگو کا تانا بانا ہر بار ٹوٹ جاتا اور بیچ میں رخنہ پڑ جاتا اس کے بعد رات کا پہر ہول سناٹا جیسے شرم کے مارے گڑگڑا جاتا۔ یتین سمجھ لیتا کہ منی یہاں سے کسی طرح چلی جائے تو اس کی جان بچے، اور تب وہ دل ہی دل میں چاہنے لگتا کہ بیچ میں اگر کوئی تیسرا فرد آ جائے تو اچھا ہو۔

یتین سوچنے لگا کہ منی اس کے پاس آئے گی تو آج وہ کس طرح اس سے گفتگو کا آغاز کرے گا۔ مگر خیالی باتیں تو غیر فطری اور طویل ہو جاتی ہیں۔ وہ کہی نہیں جاتیں۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ آج کی رات کے یہ پانچ منٹ بھی فضول جائیں گے۔

"یہ کیا مہو تم کہیں جا رہی ہو؟"

"ستیا رامپور جاؤں گی۔"

"کیسی بات کر رہی ہو تم؟ کس کے ساتھ جاؤ گی؟"

"اناتھ کے ساتھ۔"

"منی بیٹی میری! تم جانا۔ میں منع نہیں کروں گی مگر آج نہیں۔"

"سیٹ ریزرو ہو چکی ہے۔"

"ہو جانے دو اتنا نقصان سہہ لیا جائے گا۔ تم کل صبح ہی چلی جانا، آج مت جاؤ۔"

"موسی میں تمہاری ساعت واعت نہیں جانتی، آج جانے میں برائی کیا ہے؟"

"یتین نے تمہیں بلایا ہے، تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔"

"اچھی بات ہے ابھی تو وقت ہے میں ان سے کہہ آتی ہوں۔"

"نہیں، تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ تم جا رہی ہو!"

"اچھی بات ہے کچھ بھی نہیں کہوں گی مگر میں دیر نہیں کر سکتی۔ کل ہی سالگرہ ہے آج نہ گئی تو پھر کب جاؤں گی؟"

"میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں مہو! میری بات آج ایک دن کے لیے مان جاؤ۔ آج اپنے دل کو ذرا ٹھنڈا کر کے تم یتین کے پاس جا کر بیٹھو، اس قدر جلد بازی اچھی نہیں!"

"تو کیا کروں بتاؤ؟ گاڑی تو میرے لیے کھڑی نہ رہے گی۔ اناتھ باہر گیا ہے دس منٹ بعد آ کر وہ مجھے لے جائے گا اس درمیان میں ان سے مل آتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دو تم جاؤ اس طرح میں تمہیں اس کے پاس نہیں جانے دوں گی۔ اری او ابھاگن! تو نے جیسے اناتھ کو دیا ہے وہ تو سب کو چھوڑ کر آج نہیں تو کل چلا ہی جائے گا مگر تو جب تک جیے گی آج کی بات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ بھگوان اے بھگوان اب تو چھپا نہیں سکتی۔"

موسی کچھ دیر بعد مریض کے کمرے میں آئیں۔ امید یہی تھی کہ یتین سو گیا ہوگا۔ مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ وہ بستر پر ہل جل رہا ہے۔

موسی نے کہا: "ایسی بھی کیا شرم!"

"کیوں، کیا ہوا؟ منی نہیں آئی، تمہیں اتنی دیر کیوں ہوگئی موسی؟"

"جا کے دیکھا تو باورچی خانے میں بیٹھی رو رہی ہے بہو۔ کیوں کہ اس سے تمہارا دودھ جل گیا ہے۔ میں نے کہا تو کیا ہوا اور بھی تو دودھ ہے مگر اس کی بے خبری سے دودھ جل گیا ہے اس کے باعث اس کی شرم کا کیا ٹھکانا؟ خیر آخر میں اسے سُلا آئی۔ آج نہیں لائی۔ اسے ذرا سو لینے دو۔"

منی کے نہ آنے سے اسے چوٹ پہنچی مگر دوسری طرف سکون بھی ملا۔ اسے شبہ تھا کہ کہیں منی خود آ کر اس کے دل حزیں کے تاروں پر ظلم نہ کر بیٹھے کیوں کہ اس کی زندگی میں یہ اکثر ہو چکا ہے۔ دودھ کے جل جانے سے منی کا نازک دل پریشان و بے چین ہوا ٹھا ہے اسی کے لطف سے اس کا دل ناچ اٹھا۔

"موسی!"

"کیا بیٹا!"

"میں خوب سمجھ رہا ہوں میرے دن اب ختم ہونے آئے۔ مگر میرے دل میں کسی قسم کا صدمہ نہیں۔ میرے لیے تم رنجیدہ نہ ہونا۔"

"نہیں بیٹا رنج نہ کروں گی۔ زندگی ہی میں مسرت ہے اور موت میں نہیں۔ یہ میں نہیں مانتی۔"

"موسی میں تم سے سچ کہتا ہوں موت مجھے حسین نظر آ رہی ہے۔"

بیتیندر تاریک آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی منی ہی آج موت کا روپ بدل کر آ کھڑی ہے۔ وہ آج لافانی شباب سے بھرپور ہے۔ وہ بیوی ہے عورت ہے، حُسن ہے اور رحم سے بھرپور ہے۔ اس کی بکھری ہوئی زلفوں پر آکاش کے ستارے آج ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے خود ہی لکشمی کے ہاتھ کی گُنتی ہوئی آشیرواد کی مالا ہو۔ دونوں کی پیشانی پر جیسے تاریکی کا لباس تن گیا ہو اور اس کے نیچے جیسے نور ہی نور ہو، چمک، روشنی! آج کی رات کا یہ اندھیارا جیسے منی کی محبت سے بھر اٹھا ہو۔ اس گھر کی بہو منی نے اس چھوٹی سی منی نے آج جیسے ساری کائنات کی شکل اختیار کر لی ہو۔ جیسے وہ خود آج موت و زیست کے سنگم پر جا بیٹھا ہو۔ پرسکون و خاموش رات جیسے کسی کلس کی طرح آبِ حیات سے بھر اٹھی ہو۔ بیتیندر نے ہاتھ جوڑ کر دل میں کہا اتنے دن بعد گھونگھٹ کھلا ہے۔ اس پُر ہول تاریکی میں پردہ ہٹا ہے — بہت رُلایا ہے حُسن۔ اے حسن — اب تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے!

"تکلیف تو ہو رہی ہے موسی مگر جیسا تم سوچتی ہو ویسا کچھ نہیں۔ میرے مصائب کا جیسے بتدریج خاتمہ سا ہوتا جا رہا ہے۔ سامان سے لدی کشتی کی طرح منی اب تک میری زندگی کے جہاز کے ساتھ بندھی تھی۔ آج اس کا وہ بندھن جیسے ٹوٹ گیا ہے اب وہ اپنا سارا بوجھ لیے مجھ سے دور ہی چلی جا رہی ہے۔ اب بھی وہ مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ مگر اب وہ مجھے اپنی نہیں دکھائی دیتی۔ . . . ادھر دو دن سے منی کو بالکل نہیں دیکھا موسی؟"

"کمر سے ایک اور تکیہ لگا دوں بیٹیا؟"

"اب مجھے ایسا لگ رہا ہے موسی کہ منی بھی چلی گئی ہے ۔ میری ہمدم بالکل کسی دکھ سے بھری کشتی کی طرح!"

"بیٹیا ذرا انار کا رس پی لو تمھارا گلا سوکھا جا رہا ہے۔"

"موسی میرا وصیت نامہ کل لکھا جا چکا ہے، کیا میں نے تمھیں دکھایا ہے۔ یاد نہیں پڑتا؟"

"مجھے دکھانے کی کیا ضرورت ہے بٹیا"

"میری ماں جب مری تھیں تب میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ تمھارے ہاتھوں سے ہی اتنا بڑا ہوا ہوں اسی وجہ سے کہہ رہا تھا۔"

"کیسی بات کر رہے ہو بٹیا؟ میرا تو صرف ایک مکان اور تھوڑا سا روپیہ پیسہ تھا۔ باقی تو تمھارے ہاتھ کی کمائی ہے۔"

"لیکن یہ مکان . . ."

"کاہے کا میرا مکان؟ سب کچھ تو تمھیں نے بڑھایا ہے میرا ذرا سا پرانا مکان تو اب اس میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گا۔"

"منی تمھیں دل سے بہت . . ."

"تو کیا میں نہیں جانتی؟ اب تم سو جاؤ بیٹیا!"

"میں نے منی کے نام سب کچھ لکھ تو دیا ہے مگر رہا سب تمھارا ہی موسی!"

"منی تمھاری بے قدری کبھی نہ کرے گی۔"

"اس کے لیے تم اس قدر فکر مند کیوں ہو؟"

"تمھاری دعائیں ہی میرے لیے سب کچھ ہیں تم میرا وصیت نامہ دیکھ کر کچھ خیال نہ کرنا۔"

"نہیں بٹیا، اپنی چیز تم منی کو دے رہے ہو، اس لیے میں برا مانوں گی، اس میں تو تمھیں مسرت حاصل ہو رہی ہے وہی تو میرے لیے سب سے بڑھ کر ہے بٹیا۔"

"لیکن تمھارے لیے بھی میں نے . . . . ."

"دیکھو بٹیا اب میں ناراض ہو جاؤں گی تم خود چلے جاؤ گے اور مجھے چاندی کے یہ چند ٹھیکرے دے کر بہلا جاؤ گے؟"

"موسی روپیہ سے بڑی چیز اگر تمھیں . . ."

"دی ہے بٹیا، بہت بڑی دی ہے! میرا سونا گھر تو نے بھر دیا تھا۔ یہ میرے جنموں کا اجر تھا۔ اب تک میں نے اتنا پایا تھا کہ میری چھاتی بھر گئی تھی۔ آج اگر میری ملکیت ختم ہو جائے تو میں اس کی کمی سے شکایت نہیں کروں گی بلکہ دو تم سب کچھ منی کے نام لکھ دو بٹیا! مجھ سے اب اتنا بار نہیں اٹھایا جائے گا۔"

"تمھیں دنیاوی چیزوں سے رغبت نہیں لیکن منی کی عمر کم ہے ابھی سے ....؟"

"ایسا نہ کہو بیٹیا، ایسا نہ کہو۔ دھن دولت دینا چاہتا ہے تو دے دے لیکن دل سے اسے استعمال کرنا..."

"کیوں نہیں عیش کرے گی موسی"

"نہیں نہیں عیش نہیں کر سکتی، میں کہتی ہوں تمھارے بعد اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگے گا۔ گلا سوکھ جائے گا کسی چیز میں کوئی کشش باقی نہ رہ جائے گی۔"

یتین خاموش رہا۔ وہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر سکا کہ اس کے بغیر منی کے لیے یہ دنیا بالکل بے مزہ ہو جائے گی۔ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ، سکون کی ہے یا بے چینی کی۔ آسمان کے تاروں نے جیسے اس کے دل سے چپکے سے کہا ہم تو ہزاروں لاکھوں برسوں سے دیکھتے چلے آرہے ہیں دنیا کے یہ سارے بندھن، رشتے ناطے بالکل دھوکہ ہیں دھوکہ!"

یتین نے ایک گہری سانس لی اور اس کے منہ سے نکل گیا "دیئے جانے کے لائق چیز تو ہم کچھ بھی نہ دے سکے۔"

"کم کیا دیا ہے بیٹا؟ اپنا سب کچھ تم اسے سونپے جا رہے ہو۔ اس کی قیمت کبھی تو وہ سمجھے گی؟ جو تم نے دیا ہے اسے سر جھکا کر لینے کی قوت خدا اسے دے۔ یہی میری دعا ہے اس کے لیے۔"

"تھوڑا سا اور انار کا جوس دو، موسی میرا گلا سوکھا جا رہا ہے۔ منی کیا کل آئی تھی؟ یاد نہیں آتا۔"

"آئی تھی مگر تم سو گئے تھے۔ سرہانے بیٹھی کافی دیر تک ہوا جھلتی رہی۔ پھر دھوبی کو کپڑے دینے چلی گئی۔"

"تعجب ہے شاید میں اس وقت خواب دیکھ رہا تھا۔ منی میرے پاس آنا چاہتی ہے۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہے وہ کھولنے کی کوشش کر رہی ہے مگر اس سے کھل نہیں رہا ہے.... مگر موسی تم زیادتی کر رہی ہو۔ اسے دیکھنے دو کہ میں مر رہا ہوں نہیں تو میری اچانک موت اس سے سہی نہ جائے گی۔"

"بیٹیا تمھارے پیروں پر شال ڈال دوں۔ تلوے ٹھنڈے ہو رہے ہیں؟"

"نہیں موسی جسم کو ڈھانپنا اچھا نہیں لگتا۔"

"تمھیں معلوم ہے بیٹا، تمھارے لیے رات رات بھر جاگ کر منی نے یہ بُنا ہے۔ کل ہی تو پورا کیا ہے۔ کیسا نفیس کام کیا ہے دیکھو!"

یتین نے شال لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اون اور ریشم کی نزاکت منی کے دل ہی کی کوئی شئے ہو۔ اس نے یتین کے خیال سے رات رات بھر جاگ کر ایسا حسین کام کیا ہے اس کے دل کی محبت کا وہ جذبہ جیسے اسی کے ساتھ پیوست ہو گیا ہو صرف اون اور ریشم ہی نہیں منی کی نازک انگلیوں کا لمس بھی اس میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے موسی نے جب اس کے پاؤں پر شال ڈال دی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منی ہی اس کے پیروں سے لپٹ گئی ہو۔

"لیکن موسی، میں تو سمجھتا تھا کہ منی کڑھائی جانتی ہی نہیں۔ وہ ان چیزوں کو پسند ہی نہیں کرتی۔"

"دل لگا کر سیکھنا ہو تو دیر کیا لگتی ہے۔ اسے بتانا پڑا ہے۔ اس میں غلطیاں بھی ہیں۔ پھر بھی..."

"ہونے دو غلطیاں، اسے پیرس کی نمائش میں تو بھیجا نہیں جا رہا ہے۔ غلط کڑھائی بنائی سے بھی میرے پاؤں مزے سے

ڈھکے جا سکتے ہیں۔"

کڑھائی میں بہت سی غلطیاں ہیں۔ اس خیال سے تین اور بھی لطف اندوز ہوا۔ بیچاری منی جانتی نہیں۔ بار بار غلطی کرتی ہے۔ اسے آتا ہی نہیں، پھر بھی حوصلہ کے ساتھ رات رات بھر جاگ کر کاڑھتی رہی۔ اس بات کا تصور ہی اسے شیریں اور حسین تر محسوس ہونے لگا۔ اس شال کو وہ پھر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"موسی ڈاکٹر کیا نیچے بیٹھا ہے؟"

"ہاں بیٹا آج وہ یہیں رہے گا۔"

"مگر مجھے سونے کی دوا نہ دی جائے تم دیکھ رہی ہو، اس سے مجھے نیند نہیں آتی صرف تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح جاگتے رہنے دو۔ تمھیں یاد ہے موسی؟ بیساکھ میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ کل وہی تاریخ آ رہی ہے کل اس رات کے تمام تارے آسمان میں جھلملائیں گے۔ منی کو شاید یاد نہیں ہے۔ میں آج اسے یاد دلانا چاہتا ہوں تم صرف اسے دو منٹ کے لیے میرے پاس بھیج دو..... خاموش کیوں ہو گئیں؟ شاید ڈاکٹر نے تم لوگوں سے کہہ دیا ہوگا کہ میرا جسم کمزور ہے اس وقت میرے دل میں کسی طرح کا...... لیکن میں تم سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں، موسی آج رات کو اس کے ساتھ دو چار باتیں ہو جانے سے میرا دل مطمئن ہو جائے گا۔ تب شاید سونے کی دوا دینے کی ضرورت بھی نہ پڑے گی۔ میرا دل اس سے کچھ کہنے کو چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے کل پرسوں دو راتوں سے مجھے نیند نہیں آئی۔ موسی تم اس طرح رو مت۔ میں اچھا ہوں میرا دل مسرت سے معمور ہے میری زندگی میں ایسا موقع پہلے کبھی نہیں آیا۔ اسی لیے میں منی کو بلا رہا ہوں۔ معلوم ہو رہا ہے آج اپنا دل پوری پوری طرح اسے سونپ کر جا سکوں گا۔ اس سے بارہا بہت سی باتیں کرنے کو میرا دل چاہا ہے۔ لیکن کبھی کوئی بات نہ کر سکا۔ لیکن آج لمحہ بھر بھی دیر نہیں کر سکتا۔ اسے ابھی فوراً بلا دو۔ اس کے بعد پھر وقت نہیں ملے گا۔... نہیں موسی۔ تمھارا یہ رونا مجھ سے نہیں سہا جاتا۔ اتنے دن سے تم مطمئن تھیں پھر آج کیوں اس طرح اشک بار ہو؟"

"ارے بیٹا سوچا تھا میرا تمام رونا پورا ہو چکا۔ مگر آج دکھائی دے رہا ہے کہ ابھی باقی ہے۔ آج لاچار ہو گئی ہوں۔ اب ضبط نہیں ہوتا۔"

"منی کو بلا دو، اس سے کہہ دوں گا کل کی رات کے لیے جیسے...."

"جاتی ہوں بیٹا۔ شبنمو دروازے پر کھڑا ہے ضرورت پڑے تو اسے بلا لینا۔"

موسی منی کے کمرے میں جا کر زمین پر بیٹھ کر پکارنے لگی "اری او بدنصیب، آ، آ، اب بھی آ جا ___ اری ڈائن! جس نے تجھے اپنا سب کچھ دے ڈالا ہے اس کی آخری بات تو رکھ لے وہ مر کے بیٹھا ہے اب اسے اور نہ مار!"

تین پیروں کی چاپ سے چونک پڑا۔ بولا "منی"

"نہیں بابو صاحب میں شبنمو ہوں۔ مجھے بلا رہے تھے؟"

"ایک بار اپنی بھوجی کو تو بلا لا۔"

"کس کو؟"

"بھوجی کو"

"وہ تو ابھی آئی نہیں۔"

"کہاں گئی ہیں؟"

"سیتارام پور"

"آج گئی ہیں؟"

"نہیں تو، آج تین دن ہو گئے۔"

لمحہ بھر کے لیے ییتین کے سارے جسم میں خاروں کی چبھن سی محسوس ہوی اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اب تک تکیے کے سہارے بیٹھا تھا اب بستر پر پڑ گیا۔ پیروں پر جو شال پڑی تھی اسے ہٹا کر نیچے پھینک دیا۔

کافی دیر بعد موسی آئیں۔ ییتین نے منی کا کوئی ذکر نہ کیا۔ موسی نے سمجھا وہ بھول گیا ہوگا۔

کچھ دیر بعد اچانک ییتین بولا "موسی میں نے اس دن تم سے اپنے خواب کی بات کہی تھی کیا؟"

"کون سے خواب کی بات؟"

"منی میرے گھر کا دروازہ باہر سے کھولنے کی کوشش کر رہی ہے، دروازہ ذرا سا کھلا، پھر کھلا ہی نہیں اس سے وہ باہر کھڑی دیکھتی رہی، اندر کسی طرح بھی نہ آسکی اور پھر منی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے گھر سے باہر ہی کھڑی رہ گئی۔ میں نے اسے بہت بلایا مگر اس کے لیے یہاں جگہ ہی نہ نکل سکی۔"

موسی کو کچھ جواب ہی نہ سوجھا، اس لیے خاموش رہیں، سوچنے لگیں۔ ییتین کے لیے جھوٹی جنت جو میں تعمیر کر رہی تھی وہ بھی نہ تعمیر ہو سکی۔ مصیبت جب آئے تو اسے منظور کر لینا ہی بہتر ہے۔ اسے ٹالنے کی کوشش بالکل فضول ہے۔"

"موسی تم سے جو میں نے پیار و شفقت پائی ہے وہی میری زیست کا حاصل ہے۔ اسے میں اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ اگلے جنم میں تم ضرور میری لڑکی ہو کر پیدا ہو گی۔ میں تمھیں اپنے سینے سے لگا کر پالوں پوسوں گا۔"

تم کہتے کیا ہو ییتین؟ پھر مجھے لڑکی کے روپ میں جنم لینا پڑے گا؟ نہیں نہیں! اگلے جنم میں میں لڑکا ہو کر تیری ہی گود میں کھیلوں بھگوان سے تو بھی دعا کر بیٹا!"

"نہیں نہیں لڑکا نہیں! بچپن میں تم جس قدر حسین تھیں ویسی ہی حسین ہو کر تم میرے گھر میں آؤ گی، میں سب جانتا ہوں تمھیں کس کس طرح سجاؤں گا۔"

"اب نہ بولو بیٹا ذرا سو لو۔"

"تمھارا نام رکھوں گا لکشمی رانی"

"یہ تو جدید ترین نام نہ ہوا۔"

"نہیں تہذیب یافتہ اور بنا نام نہیں چاہیے۔ موسی تم میری قدیم زمانے اور قدامت پسندی کی یاد ہی رہو گی۔ اپنے قدیم زمانے اور قدیم روایات کو لے کر ہی تم آنا میرے گھر"
"تمہارے گھر لڑکی ہونے کا دکھ لے کر آؤں ایسی تمنا تو مجھ سے نہ ہو سکے گی۔"
"موسی تم مجھے کمزور سمجھتی ہو؟ مجھے دکھ سے بچانا چاہتی ہو؟"
"بیٹا میرا عورتوں کا دل جو ٹھہرا، میں ہی کمزور ہوں، اسی لیے میں نے ڈرتے ڈرتے تجھے تمام تکالیف سے بچانے کی سعی کی ہے مگر میری ہمت کیا ہے، میں کیا کر سکتی ہوں؟ کچھ بھی نہیں، کچھ نہیں۔"
"موسی اس زندگی کی تعلیم کو میں اس زندگی میں کام نہ لا سکا۔ موقعہ اور وقت ہی اتنا نہ ملا۔ مگر سب کچھ جمع رہا۔ اگلے جنم میں دکھا دوں گا کہ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ ہمیشہ اپنی ہی جانب ۔ نظر لگائے رکھنا کتنا بڑا فریب اور دھوکہ ہے وہ میں سمجھ گیا ہوں"
"کچھ بھی کہو بیٹا تم نے خود کچھ بھی نہیں لیا سب دوسروں کو ہی بانٹ دیا۔"
"موسی مجھے فخر ہے میں نے سکھ کے لیے کبھی زبردستی نہیں کی۔ کبھی کسی دن یہ نہیں کہا کہ جہاں میرا حق ہے وہاں میں زبردستی کروں گا۔ جو نہیں ملا اس کے لیے چھینا جھپٹی نہیں کی میں نے وہی چیز چاہی تھی جس پر کسی کا بھی حق نہیں۔ زندگی بھر ہاتھ جوڑ کر صبر سے انتظار ہی کرتا رہا۔ جھوٹ کو نہیں اپنایا اسی لیے تو اتنے دنوں تک بیٹھا رہنا پڑا مجھے، اب سچائی اور راستی کوئی شاید پر رحم ہو سکتا ہے ..... وہ کون، موسی وہ کون ہے؟"
"کہاں، کوئی بھی تو نہیں بیٹا!"
"موسی تم ایک بار ذرا دیکھو تو آؤ اس کمرے میں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ....."
"نہیں بیٹا کوئی بھی تو نہیں ہے۔"
"لیکن میں صاف ....."
"کچھ نہیں ستین، ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔"
"دیکھیے آپ ان کے پاس رہتی ہیں تو یہ بہت زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح جاگتے جاگتے کئی راتیں بیت گئیں آپ سونے جائیے میرا یہ آدمی یہاں رہے گا۔"
"نہیں موسی نہیں! تم نہیں جا سکتیں۔"
"اچھا بیٹا نہیں جاؤں گی ۔ میں اس کونے میں جا کر بیٹھتی ہوں، ایں۔"
"نہیں۔ نہیں تم میرے پاس ہی بیٹھی رہو۔ میں تمہارا یہ ہاتھ ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ آخر تک نہیں، میں تمہارے ہی ہاتھوں سے بنایا ہوا ہوں، موسی، تمہارے ہی ہاتھوں سے بھگوان مجھے لیں گے۔"
"اچھی بات ہے، مگر آپ بات نہ کیجیے ستین بابو دوا پینے کا وقت ہو گیا۔"
"وقت ہو گیا، جھوٹ ہے، وقت تو بیت گیا! اب دوا پلانا محض جھوٹی تسلی ہے، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں مرنے

سے نہیں ڈرتا موسی، اجل کے فرشتے کا معالجہ چل رہا ہے۔ اس کے باوجود تمام ڈاکٹروں کو کیوں جمع کر رہی ہو — وداع کرو، وداع کردو سب ڈاکٹروں کو! اب میری صرف تم ہو — اب مجھے اور کسی کی ضرورت نہیں۔ کسی کی بھی نہیں۔ کسی بھی دکھاوے اور جھوٹ کی ضرورت نہیں مجھے!"

"آپ کی یہ بے چینی و اضطراب اچھا نہیں یتین بابو"

"تو تم لوگ جاؤ مجھے مضطرب نہ کرو۔ موسی ڈاکٹر صاحب گئے۔۔۔؟ اچھا تو تم بستر پر میرے پاس بیٹھ جاؤ، میں تمھاری گود میں ذرا سر رکھ کر سو جاؤں"

"اچھا سو بیٹا، میرے راجہ بیٹا ذرا سو جاؤ"

"نہیں موسی سونے کے لیے نہ کہو مجھ سے، سو جانے پر شاید پھر نیند ہی نہ ٹوٹے — اب کچھ دیر ہی میرا جاگنا باقی ہے — تمھیں آواز نہیں سنائی دیتی؟ — سنو کوئی آرہا ہے بس ابھی آجائے گا!"

"بیٹا یتین، آنکھ کھولو، دیکھو وہ آگئی۔ ایک بار تو دیکھ لو"

"کون آیا؟ خواب؟"

"خواب نہیں بیٹا، منی آگئی، تمھارے خسر بھی آئے ہیں"

"تم کون ہو؟"

"پہچانا نہیں بیٹا، میں تو ہے تمھاری منی مالا"

"منی؟ وہ دروازہ کیا پورا کھل گیا؟"

"نہیں، موسی میرے پاؤں پر یہ شال نہ ڈالو، اسے رہنے دو، جھوٹا ہے یہ شال، دھوکہ ہے، فریب ہے یہ شال!"

"شال نہیں بیٹا، بہو تمھارے پیروں پر پڑی ہے — اس کے سر پر ذرا ہاتھ رکھ کر دعا دے دو — ایسے نہ رُو بہو، رونے کا وقت آرہا ہے — اس وقت ذرا خاموش رہو۔۔۔!!!"

(رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانی کا آزاد ترجمہ)

یوسف ناظم

مواعظ مولانا یوسف ناظم

مولانا یوسف ناظم حال حال تک شاعری اور مضمون نگاری میں مبتلا رہے۔ بہت دنوں تک وہ جناب یوسف ناظم اور پھر شری یوسف ناظم رہے لیکن نہ جانے پچھلے سال ان پر کیا بنی کہ وہ یک لخت مولانا بن گئے۔ سنا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے بل بوتے پر حضرت یوسف ناظم بننے کی بڑی کوشش کی تھی لیکن اس معاملہ میں یار لوگوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور اس قسم کے سارے القاب کہیے یا خطاب، خود آپس میں بانٹ لیے اور بیچارے یوسف ناظم کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی حالانکہ یوں دیکھا جائے تو یوسف ناظم کے حضرت بن جانے کی وجہ سے شعر و ادب کے کسی نقصان کا احتمال نہ تھا لیکن پتہ نہیں لوگ کیوں اتنے محتاط ہو گئے تھے۔ تاہم یوسف ناظم نے ہار نہیں مانی اور یہ سوچ کر اگر وہ حضرت نہیں بن سکتے تو کم سے کم مولانا بننے سے تو دنیا کی کوئی قوت انھیں نہیں روک سکتی۔ انھوں نے مولانا بننے کا فیصلہ کر لیا۔

مولانا بننے سے پہلے کہا جاتا ہے کہ وہ کافی شریف تھے۔ لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ہنسنے بولنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ بات چیت اور نشست و برخاست میں تہذیب اور سلیقہ سے کام لیتے تھے، بڑوں کا لحاظ کرتے، ہم چشموں سے چشم اٹھا کر ملتے تھے۔ بچوں کا چچا بننے میں انھیں عار نہ تھا عورتوں سے گفتگو کرتے وہ نظر نیچی رکھتے تھے لیکن مولانا بن جانے کے بعد انھوں نے روایتی اور رومانوی انداز کی زندگی کو یکسر خیرباد کہہ دیا۔

مولانا بنتے ہی انھوں نے سب سے پہلے تو یہ کام کیا کہ اپنی گردن کو یوں اکڑا لیا جیسے نشاستہ پی کر قمیص کا کالر اکڑ جاتا ہے۔ چہرہ پہلے ہی ان کا کچھ خوشنما نہ تھا لیکن مولانا بننے کے ناطے انھوں نے عمداً اور احتیاطاً خشونت بھی طاری کر لی اور نیم چڑھا کریلا بن گئے۔ ہنسنا بولنا چھوڑ دیا لیکن کھانے پینے کے معاملہ میں بکثرت فراخ دل ہو گئے۔ کہتے تھے دوسروں کے ہاں کھانا کھائے بغیر آدمی مولانا نہیں بن سکتا۔ بالخصوص دعوتوں کے موقعوں پر وہ بلا تکلف پہنچ جایا کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ کوئی دعوت نامہ ان تک کبھی نہیں پہنچا۔ اس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ پہنچے ہوئے بزرگ ایسے ہی ہوتے ہیں جو بن بلائے پہنچ جایا کریں۔ مولانا یوسف ناظم کی اس پہنچی ہوئی بزرگی کی وجہ سے لوگوں نے دعوت دینا بند کر دیا اور جب کسی تقریب کی بنا پر دعوت دینے پر مجبور ہو گئے تو نہایت خفیہ پیرایہ میں دعوت کا انتظام کیا۔ مولانا یوسف ناظم سے جب اس قسم کی دو تین خفیہ دعوتیں چھوٹ گئیں تو پہلے تو غائبانہ میں انھوں نے الداعیان اور ان کے اہل و عیال کے حق میں بددعا دی اور جب اس سے انھیں تسکین نہ ہوئی تو

پھر علی الاعلان گالیاں دیں۔ اس بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ ہر آدمی کو کچھ نہ کچھ دینے کی عادت رکھنی چاہیے، خواہ وہ بددعا ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا نے خفیہ قسم کی دعوتیں دینے والوں کی سرکوبی کے لیے شہر کے سارے باورچیوں اور کرائے کا سامان کرایہ پر دینے والوں سے تعلقات قائم کیے تاکہ یہ لوگ مولانا کو ہر دعوت کی بروقت اطلاع دے دیا کریں۔ مولانا کی یہ ترکیب بے حد کارآمد ثابت ہوئی چنانچہ اس کے بعد . . . . شہر کی کوئی دعوت ان سے نہ بچ سکی۔ دعوتوں کے تعلق سے مولانا کی رائے یہ تھی کہ ولیمہ کی دعوت تو خیر ہوتی ہی عمدہ ہے لیکن چہلم کی دعوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی

مولانا بننے سے پہلے یوسف ناظم کبھی کبھار سچ بول لیا کرتے تھے۔ لیکن مولانا بننے کے بعد انھوں نے اس شغل سے توبہ کر لی فرماتے تھے کہ سچ بول کر کون اپنی "مولانیت" کو خطرہ میں ڈال دے!

مولانا نے چونکہ سچ بولنا چھوڑ دیا تھا اس لیے وعظ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انھوں نے بے حد ضروری سمجھا ہر جگہ وعظ بیان کرتے اور بے حد خوش ہوا کرتے۔ ان کا خیال تھا وعظ کرتے رہنے سے آدمی جانا پہچانا رہتا ہے۔ ان کے وعظ کا عام واعظوں کی طرح کوئی عنوان یا موضوع نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ کسی لمحہ بھی بولنا شروع کر دیتے تھے اور یہ کام سامعین کا ہوتا کہ ان کے وعظ کا موضوع تلاش کریں۔ ہم تو بہرحال اب تک کسی ایسے شخص سے نہ مل سکے جو مولانا کے کسی وعظ کا موضوع متعین کر سکا ہو۔

مولانا یوسف ناظم بولتے وقت بہت بھولے نظر آیا کرتے تھے۔ ان کے چہرے کی معصومیت کسی عارضی آرائش کی محتاج نہ تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ڈاڑھی کا کبھی استعمال نہیں کیا۔ اس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ آدمی کو فروعات سے بچنا چاہیے وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ڈاڑھی رکھنے سے آدمی کا چہرہ زیربار ہوتا ہے۔ مونچھوں جیسی خوشنما چیز سے بھی انھیں دلچسپی نہ تھی اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ جب ہم مونچھوں پر تاؤ نہیں دے سکتے تو مونچھ رکھنے کا فائدہ؟ اس بات کا ذکر وہ اپنے وعظ میں ضرور کرتے اور مونچھ والوں کو شرمندہ کر کے خوش ہوا کرتے۔ سر کے بال رکھنے کی البتہ انھوں نے کوشش کی لیکن بالوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کی پیشانی دن بدن بلند ہوتی ہوگی چندیا بھی نظر آنے لگی تھی لیکن ان باتوں کا مولانا کے وعظ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ ان کے وعظ سن سن کر دوسروں کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو گئے تھے۔ مولانا موصوف کے وعظ سن کر اکثر لوگوں کو بے ہوش ہوتے بھی دیکھا گیا۔ اس کی وجہ اصل میں یہ ہوا کرتی تھی کہ مولانا وعظ بھی کرتے تھے اور گرجتے بھی خوب تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے، وعظ ایک مہمل سی چیز ہے۔ ان کا خیال تھا جو شخص گرج نہیں سکتا برس بھی نہیں سکتا۔ ان کی یہ بھی رائے تھی کہ اگر صرف گرجنے ہی سے سننے والا ڈر جاتا ہے تو پھر برسنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ اصولاً اور اخلاقاً برسنے سے پہلے آدمی کو گرج کر برس پڑنے کے خطرہ کی اطلاع ضرور دے دینی چاہیے یہ کیا کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور برس پڑے۔

مولانا بڑی گہری باتیں کیا کرتے تھے ان کے کئی وعظ تو ضرب المثل بن گئے۔ کئی لوگ تو ان کے وعظ کی نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے اور سننے والوں نے ایسے نقال واعظوں کو درمیان ہی میں یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ مولوی صاحب اپنی کوئی بات فرمائیے یہ تو ہم مولانا یوسف ناظم سے سن ہی چکے ہیں۔

ان مثالوں سے آپ مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کا ایک وعظ تو اس قدر مشہور ہوا کہ سارا ادبی سنسار

تبصرے

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

ہندستان کا دستور اور اس کی مختصر شرح

مولفہ پروفیسر ہارون خاں شروانی

ٹائپ کی چھپائی۔ جلد سادہ۔ گرد پوش۔ ناشر: تلگو اردو اکیڈمی حیدرآباد
صفحات: ۵۵۷ - قیمت: صرف دس روپے

ملک بھر میں یہ اعزاز غالباً صرف آندھرا پردیش کو حاصل ہے کہ یہاں تلگو اردو اکاڈیمی قائم ہے جو نہ صرف ریاست کی یتی زبان تلگو میں بلکہ اقلیتی زبان اردو میں بھی اشاعتی پروگرام پر عمل پیرا ہے۔ ملک کی تہذیبی زندگی میں زبانوں کے بھائی چارے کی فضا کو فروغ دینے اقلیتوں کی زبان کے ساتھ رواداری برتنے اور اقلیتی اور اکثریتی زبانوں کو دوسرے کی تخلیقات سے آشنا کرنے کی یہ مثالی کوشش ہے جو کسی ایک ریاست نے کی ہے۔

اس اکاڈیمی کی طرف سے پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کی انتھک محنت کے ثمر کی شکل میں یہ کتاب اردو داں حضرات سامنے پیش ہے۔ اس کتاب کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ آزاد ہندوستان کا آئین پہلی بار اردو پڑھنے والوں کو حاصل ا ہے۔ ہندوستان کی مختلف عدالتوں نے دستور کی مختلف دفعات کی توضیحات کی ہیں ان کا اجمالی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ ی زندگی سے راست تعلق رکھنے والی اہم دفعات ہر طرح واضح ہو جائیں۔ اس کتاب کا متن انتہائی فنی اور اس کی زبان انی عام فہم ہے، اور ان سب باتوں کے باوجود کتاب مختصر بھی ہے اور سستی بھی۔ اتنی اہم کتاب کے لیے دس روپے دام دہ نہیں ہیں۔ حصول آزادی کے بعد دستور کی تدوین ملک کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ ہندوستانی عوام نے جن عزائم نزلوں اور جن ارمانوں کی خاطر بدیسی سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں جان کی بازی لگادی تھی ان کی تکمیل لیے آخر دستور ہی میں راہیں متعین کرنی تھیں۔ دستور کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ ان عظیم مقاصد ل کے لیے جن کی خاطر ہماری قوم نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک دنیا کے سب سے بڑے سامراج کا مقابلہ کیا آخر ہم نے کیا کار اختیار کیا ہے دستور کے حصہ سوم میں وہ بنیادی حقوق درج ہیں جو ہندوستان کے شہریوں کو حاصل ہیں۔

دفعہ ۱۳ کی رو سے وہ نافذ الوقت قوانین رد کر دیے گئے جو بنیادی حقوق کے مغائر تھے۔

دفعہ ۱۴ کی رو سے قانون کے سامنے سب شہریوں کو برابری کا درجہ دیدیا گیا۔
دفعہ ۱۵ کے مطابق مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش کے لحاظ سے بھی کسی قسم کے امتیاز کی مناہی کردی گئی۔

دفعہ ۱۶ نے سرکاری ملازمتوں یا کسی جگہ تقرر کے معاملات میں سب شہریوں کو برابر کا درجہ دے دیا ہے۔ پھر بھی دستور نے یہ واضح کر دیا ہے کہ پسماندہ طبقات کے لیے تعلیمی سہولتیں اور نوکریوں پر تقرر کے تعلق سے خاص مراعات دی جاسکیں گی۔ قبائلی طبقات، پسماندہ طبقات اور ریزیجنوں کو جو رعائتیں دی جارہی ہیں اور حال ہی میں ترقیات کے تعلق سے بھی جو سرکاری حکم جاری کیے گئے ہیں جن میں ان طبقات کے ملازمین کو خاص رعایتیں دی گئی ہیں وہ سب ان ہی دفعات کے تابع ہیں۔

۱۹۵۶ء میں ریاستی تنظیم جدید کے موقع پر دستور میں ساتویں ترمیم کے ذریعہ دفعہ ۱۶ میں ضمنی دفعات شامل کرکے پارلیمنٹ نے یہ حق حاصل کرلیا کہ خاص قسم کی ملازمتوں پر تقرر کے لیے علاقائی سکونت کی شرط کا قانون بنایا جاسکتا ہے۔ دفعہ ۱۹ کی رو سے ہندوستان کے سب شہریوں کو تقریر اور اظہار خیال کی آزادی، انجمن بنانے کی آزادی، سرزمین ہند پر کسی جگہ بس جانے، جائیداد حاصل کرنے اور کسب معاش کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن پہلے عام چناؤ کے بعد پہلی ہی ترمیم کے ذریعہ اس محیط کل دفعہ میں تبدیلی لاکر حکومت کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ خاص حالات میں "مناسب پابندیاں" عائد کی جاسکتی ہیں۔ یہ "مناسب پابندیاں" کیا ہیں ان کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ یہ عدالتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ فیصلہ دیں مثلاً حال ہی میں یوپی کے گاؤ قصابوں نے سپریم کورٹ میں درخواست پیش کی کہ امتناع گاؤکشی کا قانون ان کے پیشہ پر نامناسب پابندی عائد کرتا ہے اور اس طرح ان کے بنیادی حق کی نفی کرتا ہے تو سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ یوپی کے قانون نے جانور کی جو عمر مقرر کی ہے وہ نامناسب پابندی ہے اور اس عمر کو گھٹا دیا۔ انھیں مناسب پابندیوں کے نام پر آئے دن حکومتیں شہری آزادیوں میں مداخلت بے جا کرتی ہیں اسی لیے اس ترمیم کی مخالفت پارلیمنٹ میں بڑی شدومد سے کی گئی تھی۔ ضرورت ہے کہ حکومتوں پر اس تعلق سے کڑی نگرانی رکھی جائے کہ وہ دستور کی اس ترمیم سے کیوں کر ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ لیکن اس غرض کے لیے دستور کے اس حصہ سے واقفیت اور ان دفعات کی توضیحات کا علم ضروری ہے دستور کے اس حصہ میں چونکہ خانگی جائیداد کا بنیادی حق تسلیم کرلیا گیا ہے اس لیے زرعی اصلاحات اور سماج سدھار کے راستوں میں مفادات حاصلہ روڑے اٹکاتا رہے۔ اگر اجتماعی مفاد کی خاطر فرد کی جائیداد سرکار کے لیے حاصل کرلینا ضروری ہو تو اس بنیادی حق کی وجہ سے اس میں رکاوٹ نہ پڑے اس لیے دستور میں چوتھی ترمیم کے ذریعہ ۱۹۵۵ء میں دفعہ ۳۱، الف شامل کی گئی جس کی رو سے جائیداد کا مفہوم وسیع کردیا گیا ہے اور ہر قسم کی غیر منقولہ ملکیت اس میں شامل ہے اور دوسرے معاوضے کے معاملے کو عدالتی اختیار سے باہر کردیا گیا ہے۔ (یہاں شروانی صاحب سے سہو ہوگیا ہے اور انھوں نے صفحہ ۵۴ پر اسے چوتھی ترمیم کی بجائے دوسری ترمیم کہا ہے)۔ یہ ترمیم ہندوستانی جمہوریت کی سماجی ترقی پسند قدروں کو مستحکم کرتی تھی اس لیے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں یہ دیکھنا ہے کہ دستور کی اس چوتھی ترمیم سے ریاستی سرکاریں فائدہ اٹھاکر

. . . . سماجی مفاد کو آگے بڑھاتی ہیں کہ نہیں۔ دو تین برس ہوئے کہ ملک بھر کے ہاؤزنگ منسٹروں کی کانفرنس میں یہ بات تسلیم کی گئی کہ ریاستی سرکاریں اس ترمیم سے فائدہ اٹھا کر زمینات حاصل کر کے مکانات کی تعمیر کا کام آگے نہیں بڑھا رہی ہیں۔ خود آندھرا پردیش سرکار نے اپنے پرانے LAND ACQUISITION ACT میں اس ترمیم کی روشنی میں ترمیم نہیں کی۔ دستور کا چوتھا حصہ ان اصولوں کے متعلق ہدایات دیتا ہے جن کے مطابق مملکتی پالیسی کا تعین ہوگا۔ اس حصہ کی دفعہ ۳۸ کی رو سے ملک میں ایک ایسا سماجی نظام قائم کیا جائے گا جہاں قومی زندگی کے سب شعبوں میں سماجی، سیاسی اور معاشی انصاف ہو۔ دفعہ ۳۹ کی رو سے روزگار کی فراہمی، قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم، ایسا انتظام کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں اکٹھی نہ ہو جائے، مرد اور عورتوں کو مساویانہ اجرت وغیرہ مقاصد کی تکمیل کی سمت میں مملکتی پالیسی چلنی چاہیئے۔ اسی قسم کی اور ہدایات دستور کے اس حصہ میں مذکور ہیں۔ ہمیں ان سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے وہ قوانین جو پہلے سے رائج ہیں اور خاص طور پر وہ قوانین جو پچھلی جابرانہ سرکاروں نے استبداد کی خاطر روا رکھے تھے اس کسوٹی پر جانچے جائیں اور ان میں تبدیلی لائی جائے۔ لاکمیشن مقرر کیا گیا ہے کہ ان کی جانچ کی جائے۔ لیکن عام شہری زندگی کے اپنے تجربوں پر پرکس کر ان قوانین میں مناسب تبدیلی کا مطالبہ کریں گے۔ انہی ہدایات کی روشنی میں نئے قوانین اور سرکاری پالیسیوں کو بھی جانچا جانا چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ اگر مفادات حاصلہ کسی سماجی بہبود کے قانون کے خلاف عدالت میں رٹ پیش کرے تو عدالتیں بھی اس قانون کو انہیں ہدایات کی روشنی میں جانچیں گی، کیونکہ قانون بنانے والوں کے سامنے مملکتی پالیسی کی یہی ہدایات رہی ہیں۔ غرض دستور میں بنیادی حقوق اور مملکتی پالیسی کے لیے ہدایتی دفعات عام شہریوں کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ عدالتوں سے سرکار کے خلاف حکم جاری ہوتے ہیں کہ اس نے اپنے احکام دستور کی ہدایات کی خلاف ورزی کی ہے اور اگر دفتری کارندوں . . . . کے کارناموں پر نظر رکھی جائے تو پتہ چلے گا کہ عام شہری ان کے ہاتھوں دستور کی عدم تعمیل کا شکار ہو رہا ہے۔ لسانی اقلیتوں کی دلچسپی کی دفعات دستور میں کئی ہیں۔ دفعہ ۲۹ میں عام حفاظت حاصل ہے۔ دفعہ ۳۰ کی رو سے اپنے تعلیمی اداروں کے قیام کا حق اقلیتوں کو حاصل ہے۔ دفعہ ۳۵۰ کی رو سے مادری زبان میں شکایات کی دادرسی کی جا سکتی ہے۔

دفعہ ۳۵۰، الف اور ۳۵۰ ب ۱۹۵۶ء میں شامل دستور کی گئی ہیں جن کی رو سے اقلیتوں کو ان کی اپنی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کی ذمہ داری سرکاروں اور حکومت مقامی کے اداروں پر عائد کی گئی ہے اور لسانی اقلیتوں کی شکایات کی جانچ پڑتال کے لیے ایک کمشنر کا تقرر کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ دستور میں صدر جمہوریہ اور نائب صدر، ان کے چناؤ کا طریقہ، ان کے اختیارات پارلیمنٹ اس کا طریق کار ہندوستان کی عدلیہ، مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے فرائض کا تعین، قانون سازی کے اختیارات کا تعین محصول اندازی کے مدات کا تعین، مالیاتی مسائل شیڈولڈ کاسٹس اور قبائلی عوام کے لیے مخصوص مراعات، سرکاری زبان کا سوال ریاستی سرکاروں کی زبان کا سوال اقلیتوں کی زبانوں کے لیے نظم ونسق میں مقام کا مسئلہ اور ناگہانی حالات کے سربراہ ہونے کے لیے مخصوص اختیارات سبھی کا تفصیلی ذکر کر دیا گیا ہے۔

شروانی صاحب نے بڑی محنت کر کے اردو داں طبقہ کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کر دی ہے۔ وہ اور تلگو اردو اکاڈیمی دونوں ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے اردو داں طبقہ دستور سے واقف ہو کر اپنے حقوق سے آشنا ہو جائے گا

اور ان کی حفاظت کر سکے گا۔ ہندوستان کے شہری کی حیثیت سے ہندوستان کو آگے بڑھانے کے عظیم کام میں بھرپور حصہ لے سکے گا۔

دستور کا مطالعہ اپنے حقوق سے واقفیت کے لیے ہی نہیں اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر کہیں اجتماعی مفاد دستور میں کسی خاص ترمیم کا متقاضی ہو تو اس کی بھی سعی کی جا سکے۔ بہرصورت یہ مختصر کتاب ہر سیاسی اور سماجی کارکن کے لیے ہر پبلک ورکر کے لیے جو صرف اردو سے واقف ہے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔ شروانی صاحب نے ترجمہ کو آسان بنانے کے لیے نیک نیتی ہی سے سہی لیکن کہیں کہیں بے جا ہندی ٹھونس دی ہے۔ صدر جمہوریہ کے لیے راشٹرپتی جب کہ نائب صدر کو نائب صدر ہی کہا ہے، خطبہ کے لیے بھاشن اور اور ایسے ہی الفاظ کھٹکتے ہیں۔ کتاب اردو والوں کے لیے تالیف کی گئی ہے جو الفاظ اردو والوں کے لیے مانوس ہیں ان کی جگہ غیر مانوس ہندی الفاظ کیوں استعمال کیے جائیں؟ کہیں کہیں ترجمہ میں سہو ہو گئی ہے اور کہیں گنجلک پن آ گیا ہے۔ مثلاً تمہید میں اصل دستور میں سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف کا ذکر ہے لیکن ترجمہ میں اقتصادی نظر انداز ہو گیا ہے۔ اسی طرح EQUALITY OF STATUS AND OPPORTUNITY کو اردو میں صحیح طور پر نہیں پیش کیا جا سکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہریوں کی حیثیت برابر ہوگی اور انھیں مساوی مواقع حاصل ہوں گے۔ لیکن شرح میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے "مساوات ملے، حیثیت اور موقعوں کے اعتبار سے" اس سے اصل مطلب واضح نہیں ہو رہا ہے لیکن یہ سب کمزوریاں معمولی ہیں اور نظر ثانی میں انھیں بہ آسانی دور کیا جا سکتا ہے۔ دستور جیسی چیز کا علمی اور اصطلاحی زبان میں ترجمہ تو نسبتاً آسان بات ہے لیکن اس کی عام فہم شرح اور عام زبان ہی میں دفعات کا ترجمہ کرنا معجزہ سے کم نہیں۔ (ڈاکٹر راج بہادر گوڑ)

غالب

از: ڈاکٹر خورشید الاسلام

غالب کی شاعری اس میں کوئی شک نہیں "گلستانِ بے خزاں" یا A GADREN OF EXHAUSTLESS DELIGHT ہے لیکن اس پر اتنا کچھ اور ایسا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اگر کوئی نئی کتاب سامنے آتی ہے تو توقع نہیں ہوتی کہ اس کے مطالعہ سے غالب کی شاعری کا کوئی نیا پہلو سامنے آ سکا ہوگا۔ ایسی صورت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ سبزہ کو جب اُگنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی ہے تو وہ روئے آب پر "کائی" بن جاتا ہے۔ غالب پر ہونے والا کام اب کچھ ایسی ہی ہیئت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ بات جوشِ نمو کا ثبوت تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے خود چمن کی خوبصورتی میں فرق آ جاتا ہے۔ غالب کے چمنستانِ شعر کی جادہ پیمائی کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ خود جادہ کو لالہ کے داغ کا فتیلہ بنایا جائے یعنی اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ برق سے شمع ماتم خانہ کس طرح روشن ہوتی ہے۔ غالب کی شمعِ شاعری سحر ہونے سے پہلے "ہر رنگ" میں جلتی رہی ہے۔ غالب کی شاعری کا یہی وہ حصہ تھا جب کہ وہ تھوڑی دور ہر ایک "تیز رو" کے ساتھ چلتے رہے کیوں کہ وہ ابھی اپنی منزل کو نہیں پہچانتے تھے۔ غالب کا یہ دعویٰ کہ "مبداءِ فیاض" کے سوا کسی اور سے انھوں نے فیض حاصل نہیں کیا خواہ اپنے اندر کتنی ہی صداقت رکھے، ان کی "طرزِ بیدل" میں کہنے کی کوشش کے اعتراف کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ غالب کی شاعری اپنا فطری بانکپن حاصل کرنے سے پہلے "آرائشِ جمال"

سے فارغ نہیں ہوئی تھی۔ غالب کی شاعرانہ شخصیت کا یہ زمانہ ایک زمانے سے تنقیدی اور تحقیقی کاوش کی نبرد آزمائی کی دعوت دے رہا تھا۔ آخر خورشیدالاسلام نے اس طرف توجہ کی اور غالب کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب نے اپنی شعری زندگی کے ابتدائی دور میں کن کن شعراء کے اثرات قبول کیے اور کس حد تک قبول کیے۔ ان اثرات نے غالب کی فکر کو متاثر کیا یا فن کو؟ اگر اثر پذیری فکری ہے تو غالب کے پیشرو شعراء کے فکری میلانات کیا تھے؟ اگر غالب نے فنی اثرات قبول کیے ہیں تو اس زمانے کی فنی اقدار کیا تھیں۔ اگر فکر و فن دونوں پر غالب نے دوسروں کے اثرات قبول کیے ہیں تو خود ان کی اپنی انفرادیت کب اور کیسے ابھری؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات ہیں جو غالب کے ابتدائی دور کی شاعری کے تعلق سے ذہن میں آتے ہیں۔ "غالب" میں ان ہی سوالات کا جواب دیا گیا ہے اور اس عمدگی سے کہ جادہ بھی لالہ کے داغ کا فتیلہ بنتا نظر آتا ہے۔ غالب کی شاعری کے اس حصہ کی افہام و تفہیم کے لیے گہری تنقیدی نگاہ کے ساتھ تحقیقی کاوش کی بھی ضرورت تھی۔ کیوں کہ کسی شاعر کی آواز میں دوسروں کی آواز کے لطیف ارتعاشات کو محسوس کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن تنقید کی تیز نگاہی تحقیق کو نچلی سطح تک لے جاتی ہے۔ اس لیے کہ تحقیق کو جب تک زنگار کی طرح استعمال نہ کیا جائے شعری پیکر کی جلوہ نمائی نہیں ہو سکتی۔ خورشیدالاسلام کی اس کتاب میں تحقیق زنگار ہی کی طرح نظر آتی ہے۔

اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب خاندان، زمانے اور مطالعے سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بات نئی یا دریافت طلب نہیں تھی، لیکن یہاں ان کا جائزہ مختلف زاویہ سے لیا گیا ہے۔ غالب کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر میں خاندان زمانہ اور مطالعہ نے جو حصہ ادا کیا ہے اس کو اجاگر کیا گیا ہے اس حصہ میں خورشیدالاسلام نے لکھا ہے: "بدقسمتی سے ابتدائی زمانے میں انھوں نے اپنی زبان اور ادب کا مطالعہ کم کیا تھا۔" غالب کی یہ بدقسمتی غالب کو غالب بنانے میں کس قدر اہمیت رکھتی ہے دوسرے باب سے ظاہر ہے۔ اسی باب سے مصنف کی کدوکاوش کی جولاں گاہ شروع ہوتی ہے۔ خورشیدالاسلام نے اس باب میں "ہر اس شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جس کا براہ راست اثر غالب کی شاعری پر پڑا ہے۔"

جن شعرا سے غالب نے اثر قبول کیا ان میں شوکت، اسیر، بیدل، غنی، صائب اور ناسخ کے نام آتے ہیں۔ غالب پر ان شعرا کے اثرات کو ظاہر کرنے سے پہلے ان شاعروں کے رجحان طبع، ذہنی کیفیت نظریۂ حیات اور سماجی تصور کو سامنے رکھ کر ان کے کلام کی "تحلیل شعری کی گئی ہے اور ان خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کو غالب نے اپنے اندر جذب کیا تھا لیکن جگہ جگہ ان شعرا سے غالب نے جو اختلاف یا انحراف کیا ہے اس کو نمایاں کر دیا گیا ہے۔ تیسرا باب تمثیل نگاری، خیال بندی اور مناسبات لفظی سے متعلق ہے۔ متاخرین شعرائے فارسی کا یہ مصنوعاتی انداز اس زمانہ کی سماجی زندگی اور ماحول سے گہرا ربط اور تعلق رکھتا ہے اس کو ظاہر کرنے میں خورشیدالاسلام نے بڑی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔" غالب کا اپنا کارنامہ کیا ہے؟ دوسرے شعرا کا چڑھا ہوا رنگ کیوں اترتا ہے؟ خود ان کا اپنا رنگ کس طرح نکھرتا ہے؟ غالب کے اپنے روحانی اور مادی رجحانات نے کیا صورت اختیار کی؟ اور کیوں کی؟ غالب کی ذہنی افتاد اور عمل کیسے بدلنے لگا؟ ان کے تصورات کی نئی صورت گری سے ان کی شاعری کی ہیئت کیا ہوئی؟ غالب نے "ماضی کی روایات"، "حال کے حقائق"، اور مستقبل کے خوابوں کو اپنی شخصیت

میں سموکر ان کو اپنی شاعری میں کیا جگہ دی؟ بعد میں غالب کی شاعری دوسروں کے تمام اثرات کی "شکست کی آواز" کیوں کر بنی؟ ان تمام باتوں کا تجزیاتی جائزہ اس حصہ میں لیا گیا ہے۔ غالب کے اشعار اور ان سے استخراج شدہ نتائج سے ساری کتاب مزین ہے غالب کے الفاظ و تراکیب کے انتخاب سے ان کے ذہنی اور جذباتی کوائف کا پتہ لگایا گیا ہے۔ آخر میں دو ضمیمے بھی شامل ہیں جو اوپر بیان کی گئی باتوں کا نچوڑ ہیں پہلے ضمیمہ میں غالب کے نظیری، عرفی اور بیدل کے اسلوب میں کہے گئے اشعار اور میر، سودا اور درد کی زمینوں میں کہی گئی غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں "غالب کے آنے والے رنگ کی جھلک" بھی ہے اور "خاص غالب کے رنگ" کی غزلیں بھی۔ دوسرے ضمیمہ میں "وہ الفاظ جو ابتدائی شاعری میں بار بار استعمال ہوتے ہیں ان کے تلازمے اور متعلق اشعار" شامل ہیں۔

خورشید الاسلام کی "غالب" "غالبیات" میں ایک بہت ہی خوشگوار اضافہ ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت اس کا استدلالی انداز ہے اور استدلالی رنگ بالکل منفرد ہے۔ کتاب انجمن کی طرف سے چھپی ہے اور لکھائی چھپائی میں اتنا سلیقہ برتا گیا ہے کہ صرف اسی کو دیکھ کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ قیمت چھ روپے۔ (داؤد زاہد)

فلمی ریویو

حق گو

پریم پتر

فلم پریم پتر کا فلم کے شائقین کو کافی عرصہ سے انتظار تھا۔ گزشتہ دو سال کے عرصہ میں بمل رائے پروڈکشنز کی دو فلمیں "اس نے کہا تھا" اور "کابلی والا" ضرور ریلز ہوئی ہیں لیکن بمل رائے ان فلموں کے صرف پروڈیوسر تھے، ہدایت کار نہیں تھے۔ پریم پتر ان کے زیر ہدایت تیار ہوئی ہے۔ لیکن اس فلم کو دیکھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ بمل رائے جیسا نامور ہدایت کار کس طرح اتنی معمولی فلم پیش کر سکتا ہے۔ پریم پتر میں ہدایت کار بمل رائے بہت کم نظر آتا ہے۔ پروڈیوسر اور بزنس مین بمل رائے اس پر چھایا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بمبئی میں باکس آفس کا خیال کیے بغیر فلم بنانا قریب قریب محال ہے لیکن بمل رائے اور چند دوسرے بڑے فلمساز باکس آفس پر نظر رکھتے ہوئے اپنی اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں ان توقعات کے ساتھ جب کوئی "پریم پتر" کا مطالعہ کرے تو بڑی مایوسی ملے گی۔ کہیں کہیں حسن اور فنکاری کی جو جھلکیاں ملتی ہیں وہ بھی قابل لحاظ معلوم ہوتی ہیں۔

سادھنا اور ششی کپور ہمارے ملک کے انتہائی ابھرتے ہوئے فن کار ہیں۔ توقع تھی کہ بمل رائے کی زیر ہدایت انھیں اپنی صلاحیتوں کے بہتر اظہار کا موقع ملے گا لیکن یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی۔ ششی کپور اس سے قبل "مہندی لگے میرے ہاتھ" جیسے معمولی فلم میں زیادہ بہتر اداکاری پیش کر چکے ہیں۔ بمل رائے نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ دلیپ گپتا جیسے معیاری کیمرہ مین نے بھی اس کے ساتھ بے توجہی کیوں برتی۔ سادھنا کے کردار میں نسبتاً زیادہ گنجائش تھی۔ بعض مناظر میں اس نے کافی محنت کی ہے۔ لیکن کہانی اور کردار سازی کی کمزوری نے اس کی اداکاری کو بھی متاثر کیا ہے سادھنا کا وزن بھی تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے جو اس کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوگا۔ معاون اداکاروں میں راجندر ناتھ کا کام غنیمت ہے۔ مراٹھی فلموں کی اداکارہ سیما کا کردار مضحکہ خیز ہے۔

چاند عثمانی کو ایک انتہائی معمولی کردار میں دیکھ کر دکھ ہوتا ہے دس سال پہلے اس اداکارہ نے اپنی پہلی ہی فلم میں دھوم مچا دی تھی لیکن ہمارے ہدایت کار بشمول بمل رائے اسے موزوں کردار دینے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ دلیپ گپتا کی عکاسی کہیں کہیں اچھی ہے۔ سلیل چودھری کی موسیقی بھی غیر معمولی نہیں، اور توقعات کو پوری نہیں کرتی۔ فلم میں سب سے زیادہ قابل تعریف اس کے مکالمے ہیں جو نہ صرف کہانی کو بلکہ پوری فلم کو سہارا دیتے ہیں۔ چست برجستہ اور جاندار مکالمے۔ جو فلم میں دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں جس کے لیے راجندر کرشن مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن ان کے لکھے ہوئے گیت مکالموں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔

کہانی میں کئی موڑ ہیں۔ ڈرامائی واقعات ہیں جن کی رفتار نہ تو غیر ضروری طور پر تیز ہے اور نہ ہی اکتاہٹ کی حد تک سست۔ لیکن ہدایت کار اور کہانی نویس اہم اہم باتوں اور اہم اہم واقعات کا جواز پیش نہیں کرتے۔ سدھیر اور سیما کے کردار ان کی بے توجہی کے سب سے بڑے شکار ہیں۔ خواہ مخواہ انھیں مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سادھنا اور ششی کپور کے کردار بعض معمولی غلط فہمیوں اور معمولی باتوں کی وضاحت کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ اپنے مستقبل اور اپنے کیریئر اور اپنی ساری زندگی کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کہانی میں اور بھی کئی خامیاں ہیں جگہ جگہ جھول ہیں جن پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ بمل رائے نے کہانی ہی معمولی منتخب کی ہے جس میں روایتی غلط فہمیاں، روایتی حادثے اور بہت سی ایسی باتیں شامل ہیں جنھیں ہم اس سے قبل بہت سی فلموں میں دیکھ چکے ہیں۔ بمل رائے جیسے ہدایت کاروں سے تو توقع کی جاتی ہے کہ وہ فلم آرٹ کے نئے تقاضوں، نئے رجحانات اور حقیقت پسندی کی نئی لہر کا ساتھ دیں گے لیکن انھوں نے بے حد مایوس کیا۔

بات اک رات کی

ایک رات کی ایک بات — ایک واقعہ کو زیادہ سے زیادہ پُراسرار اور حیرت انگیز بنانے کی دھن میں ہدایت کار اور کہانی نویس نے کئی انگریزی فلموں سے استفادہ کرتے ہوئے اس فلم کو "چوں چوں کا مربہ" بنا دیا ہے پھر بھی کہانی کو شروع کرنے اور ایک کہانی کو پس منظر میں رکھتے ہوئے دوسری کہانی کو آگے بڑھانے کی کوشش کافی کامیاب ہے لیکن فلم کا آخری حصہ واقعات کی بھرمار کی وجہ سے (جن کا جواز مبہم ہے) بہت کمزور رہ گیا ہے۔ دیو آنند کا شمار صف اول کے مشہور اداکاروں میں ہوتا ہے۔ انھیں اپنی اداکاری اور کردار پر توجہ کرنی چاہیے۔ وحیدہ رحمٰن نے بھی صرف اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ شنکر مکرجی کی ہدایت کاری بحیثیت مجموعی غنیمت ہے۔ میوزک ڈائرکٹر ایس ڈی برمن تقریباً دو سال کے عرصے سے بجھے بجھے سے تھے اس فلم میں انھوں نے اس سال کی ایک بہترین دھن "نہ تم ہمیں جانو نہ ہم تمھیں جانیں۔ مگر لگتا ہے کچھ ایسا۔ میرا ہمدم مل گیا" خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دی ہے۔ مجروح نے اس گانے کے بول بھی خوب لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری دھنیں معمولی ہیں۔ مکالمے کہیں کہیں اچھے اور بحیثیت مجموعی غنیمت ہیں۔ عکاسی اوسط درجہ کی اور آرٹ ڈائرکشن کمزور رہے۔

R. N. 3461/57 SABA-MONTHLY Regd. No. A. 215

9(3)

ماہنامہ

PRICE 50 N.P.

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

زر سالانہ ہند و پاک سے .. ۱۰ روپے
ششماہی .... ۶ "
بیرون ہند سے .. ۲۰ شلنگ

ماہنامہ

صبا

جلد :- ۹
شمارہ :- ۴
ماہ :- مارچ
سنہ :- ۱۹۶۳ء
قیمت :- ۵۰ نئے پیسے

ایڈیٹر :-
سلیمان اریب

حیدرآباد دکن
فون :- ۲۲۴۰۲

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۳،۰۲) کراچی ۴

● پروپرائٹر، پرنٹر، پبلشر سلیمان اریب ● ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ● مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان

ہماری اردو کتابیں

ہندوستانی ڈراما	صفدر آہ	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پنڈت نہرو سے بات چیت	ٹیبر منڈی	دو روپے
ابوالکلام آزاد	—	دو روپے
سائنس کے چند پہلو	سی۔ وی۔ رامن	ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم	ڈاکٹر ذاکر حسین	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	—	ایک روپیہ
ملکی یا تہذیب کا مستقبل	ڈاکٹر رادھا کرشنن	۵۰ نئے پیسے
بھارت آج اور کل	جواہر لال نہرو	۵۰ نئے پیسے
جوالا مکھی (ناول)	اننت گوپال شیوڑے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
دو شہروں کی کہانی	چارلس ڈکنس	پانچ روپے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	—	۵۰ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	—	ایک روپیہ
دیس دیس کی لوک کہانیاں	—	۵۰ نئے پیسے
کلینڈر کی اصلاح	—	۴۰ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	—	۲۵ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	—	
(نمبر ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷)		فی نمبر ۱۰ نئے پیسے

پیکنگ اور ڈاک خرچ کے لیے کم سے کم دس نئے پیسے یا قیمت کا ساڑھے بارہ فی صد مزید بھیجئے۔

رجسٹری کے لیے ۵۰ نئے پیسے اس کے علاوہ ہوں گے — ۲۵ روپے یا اس سے زائد کی کتابیں منگوانے پر محصول ڈاک معاف.

کتابیں مندرجہ ذیل پتہ سے طلب کیجئے

دہلی : پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سکریٹریٹ

بمبئی : ریجنل ڈسٹری بیوشن آفس بوٹا والا چیمبرس سر فیروز شاہ مہتہ روڈ

مدراس : ریجنل ڈسٹری بیوشن آفس آنند ساگر۔ ۸ سنتھوم ہائی روڈ

اس شمارے میں

فارم نمبر ۴ تحت دفعہ ۸ بیان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات "صبا" حیدرآباد

۱۔ مقام اشاعت — حیدرآباد (اے، پی)

۲۔ نوعیت اشاعت — ماہانہ

۳۔ پرنٹر
۴۔ پبلشر
۵۔ ایڈیٹر — سلیمان اریب

۶۔ قومیت — ہندوستانی

۷۔ پتہ — RT ۳/۲۷۴ وجے نگر کالونی۔ حیدرآباد

۸۔ ملکیت — سلیمان اریب

میں سلیمان اریب تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

دستخط سلیمان اریب — ۲ مارچ ۶۳ء

پہلی بات

حسب وعدہ مارچ کا پرچہ فروری کے پرچے کی اشاعت کے فوراً بعد آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اپریل کا شارہ بھی انشاء اللہ آپ کو اختتام اپریل سے پہلے مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اپریل کا شمارہ بھی ۸۰ صفحات کا نہ رہے۔ لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ "صبا" پابندی سے بھی شائع ہو اور اس کے حجم میں بھی کمی نہ کی جائے تو پھر آپ — صبا مفت نہ پڑھیئے اور خود خریدار بننے کے علاوہ کم سے کم ایک خریدار اور بنا دیجئے۔

ہمارا ایقان ہے کہ اردو کے اچھے رسالے اسی وقت زندہ رہ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں جب کہ ہمارا طبقہ مطالعہ کتابیں، رسائل اور اخبار خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالے اور نہ صرف یہ بلکہ سستے ادب کی سرپرستی کرنے کی بجائے معیاری ادب کی سرپرستی کو اپنے اوپر لازمی قرار دے لے۔

. . . .

پچھلے چند سالوں سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں اعلیٰ معیار کی کتابوں پر ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے ۵ ہزار کا نقد انعام دیا جا رہا ہے۔ یہ انعام اب تک اردو کے شاعروں میں جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری کو مل چکا ہے۔ اس سال اخترالایمان کو ان کے شعری مجموعے "یادیں" پر یہ انعام دیا گیا ہے جس پر ہم انہیں مبارکباد دیتے ہیں۔

راجن بابو سابق صدر جمہوریہ ہند کی موت ایک سیاسی رہنما، تحریک آزادی کے ایک مجاہد اور گاندھی جی کے ایک سچے پیرو ہی کی موت نہیں بلکہ ہندی کے ایک ادیب اور سنسکرت کے ایک عالم کی موت ہے اور ہمارا بڑا قومی زیاں۔

. . . .

مارچ میں شفیق جونپوری اور شیخ مختار حسین جونپوری کا انتقال ہو گیا — حضرت شفیق جونپوری غزل کے بڑے استاد تھے۔ اردو، فارسی اور عربی میں ان کی ۳۰ سے زائد کتابیں اور رسائل شائع ہو چکے ہیں شیخ صاحب ایک مشہور خطاط اور اچھے مزاح نگار تھے۔ "تعلیم، خط اور املا" پر یوپی کی حکومت نے انہیں انعام دیا تھا۔

ایک خط ماسکو سے

ارتیب ڈیر

میں اب ٹکٹ بدست ہوں اور خیمہ اکھاڑ کر آ رہا ہوں۔ افسوس کہ میں اتنے عرصے یہاں رہا۔ تم نے مجھ سے کچھ کام نہ لیا بھائی۔ (تمھاری اور شاہد مرحوم کی کتابوں پر تبصرے نکلوانا چاہتا تھا وہ کام بھی نہ ہو سکا)

پرچہ کبھی ملتا ہے، کبھی نہیں ملتا۔ (سالانہ چندہ چیک کی صورت میں بھیج چکا ہوں وصول ہوا یا نہیں، اس کی رسید تک نہیں ملی) غالب پر میں نے اب سے ۴½ برس پہلے ایک مطالعہ لکھا تھا جو کوئی دو سو صفحے سے اوپر میں سمایا تھا۔ یہاں ذرا سکون سے بیٹھ کر لکھا گیا اس لیے رنگ چوکھا آیا تھا۔ اب اس پر نظرِ ثانی کر رہا ہوں کہ آتے ہی (اردو، ہندی میں) شائع کرادوں۔

اس عرصہ میں جو چیزیں غالب پر نکلی ہیں انھیں بھی حاصل کرنے کی کوشش کی، تم مبالغہ نہ سمجھو تو عرض کروں کہ غالبیات میں خرافات کی بڑی بھرمار ہے۔ یہ جو مختلف شعروں کی اینٹیں اوپر تلے چن کر ان کے ذریعہ مضمون درج کر دیا جاتا ہے بڑی ہونق پن کی حرکت ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ کیسا رہے جو غالب پہ لکھنے والوں پر ایک باب اپنی کتاب میں بڑھا دوں کس سے چھپواؤں کہ عمدہ چھپے، ہر گوشے میں پہنچے اور اہلِ نظر سے داد پائے؟ کچھ بتاؤ!

تمھارے پرچے کے مئی ۱۹۵۹ء میں ایک مضمون "غالب کے شعری محرکات" فیض الرحمٰن اعلی کے نام سے ہے۔ میں ان سے نہیں البتہ ان کے نام سے واقف ہوں۔ ظالم نے دیدہ دلیری کی حد کر دی۔ عین مین یہی مضمون ہزار درجہ بہتر الفاظ، جامع تفصیل اور نفیس استدلال کے ساتھ اردو ادب جولائی ۱۹۵۰ء میں چھپ چکا تھا۔ احتشام صاحب کا مضمون تھا "غالب کا تفکر اور اس کا پس منظر"۔ (شاید نقدِ غالب میں شامل ہے) اور تم جانو اس مضمون کو احتشام صاحب اور سرور صاحب سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ اب بھی تم دیکھو کہ فیض الرحمٰن صاحب کا یہ مضمون احتشام صاحب کے مضمون کا ایک ادھورا چربہ ہے کہ نہیں؟

ظ انصاری

۱۶ر فروری ۶۳ء

ڈاکٹر خالدہ یوسف

تذکرۂ بے نظیر

"بے نظیر" عبدالوہاب افتخار کے تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سنہ تالیف ۱۱۷۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ آزاد بلگرامی نے یہ تاریخ کہی ہے ؎

سید صاحب معانی افتخار — کلک گوہر ریز او ابر مطیر
کردہ از آثار عالی فطرتاں — طرح تالیف لطیف دل پذیر
بندۂ آزاد و معتقد باسخن — نام و تاریخش رقم زد "بے نظیر"

ان تاریخی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ کا مذکورہ بالا نام آزاد بلگرامی ہی نے رکھا ہے۔[1] اور اس تالیف کے محرک بھی یہی تھے جس کے بارے میں لکھا گیا ہے "تذکرہ بے نظیر بہ اشارہ میر (غلام علی آزاد بلگرامی) ترتیب می دارد"۔[2]

خصوصیات تذکرہ:

تذکرہ بے نظیر کا مکمل مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں فن تذکرہ ۱۴۳ پر موجود ہے جو کل ایک سو تین (۱۰۳) صفحات پر محیط ہے نہایت ہی خوش خط لکھا ہوا ہے۔ کاتب نے سلیقہ سے کام لے کر ابتدا میں فہرست اسمائے شعراء دے دی ہے۔ اس کا ایک ٹائپ شدہ نسخہ ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ اس تذکرہ میں جملہ ایک سو چھبیس (۱۲۶) شعرا کے حالات اور ان کا فارسی کلام دیا گیا ہے جن میں سے سولہ (۱۶) اورنگ آبادی ہیں جن کے اسماء یہ ہیں:

(۱) آزاد، میر غلام علی (۲) آصف، شاکر، آصفجاہ اوّل (۳) ایجاد، مرزا علی نقی مخاطب بہ نقد علی خاں (۴) امداد، شیخ غلام حسین (۵) افتخار، سید عبدالوہاب (۶) جویا، شیخ محمد فاضل (۷) جرأت، مرزا احمد ہاشم مخاطب بہ موسوی خاں (۸) درگاہ، درگاہ قلیخاں (۹) سالک، سید غلام حسین قادری (۱۰) سراج، سراج الدین (۱۱) شہید، محمد باقر (۱۲) عزلت، میر عبدالولی (۱۳) عاجز، عارف الدین خاں (۱۴) موسوی، میر معز الدین محمد مخاطب بہ موسوی خاں (۱۵) ہریا، عبدالقادر (۱۶) وقار، نواب صمصام الدولہ، میر عبدالحی خاں۔

۱؎ افتخار، بے نظیر مطبوعہ ص۲ ۲؎ شفیق، چمنستان شعرا مطبوعہ ص۵۹

ان کے علاوہ باقی ایک سو دس (۱۱۰) ایسے سخنوروں کا حال درج ہے جن میں زیادہ تر اصفہان، شیراز اور چند برہان پور، سرہند، احمد آباد، دہلی، حیدرآباد اور کشمیر کے باشندے ہیں۔

۲) نسٹی پریس الہ آباد سے یہ تذکرہ ۱۹۴۰ء میں زیور طباعت سے آراستہ کیا گیا ہے۔ سید منظور علی ایم اے ریسرچ اسکالر نے اس تذکرہ کو ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کی نگرانی میں طبع کیا ہے۔ اس تذکرہ کا قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری موجود ہے مرتب تذکرہ نے ناظرین کی سہولت کی خاطر ایک غلط نامہ بھی منسلک کیا ہے اس کے علاوہ ایک نہایت کارآمد چیز یہ ہے کہ اس میں ایک انگریزی دیباچہ کا بھی اضافہ کیا ہے جس میں تذکرہ پر ناقدانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے جو مرتب کا ہی تحریر کیا ہوا ہے۔ اس تذکرہ کا قلمی نسخہ جناب نعیم الرحمٰن استاد الہ آباد یونیورسٹی (شعبہ فارسی و عربی) سے مستعار لے کر اور اس کی نقل کر کے مرتب مذکور نے شائع کیا ہے۔

۳) یہ فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ ابتدا میں مصنف نے ڈیڑھ صفحے کا دیباچہ قلمبند کیا ہے۔ شعرا کے حالات ردیف وار دیئے گئے ہیں۔ دوسرے شعرا کے ذکر کے سلسلے میں ردیف "الف" کے تحت مولف نے اپنے تخلص افتخار کے ساتھ اپنا مختصر حال لکھا ہے اس تذکرہ میں ہر شاعر کے فارسی کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اس میں چند ایسے شعرا پر بھی تبصرہ ہوا ہے جو ضمناً اردو میں بھی مشق سخن کرتے تھے لیکن انتخاب کلام . . . . فارسی ہی کا دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قاسم قاسم کے "تحفۃ الشعرا" میں جو فارسی گو شعرا کے تذکرہ پر مشتمل ہے ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں بعض شعرا کے فارسی کلام کے ساتھ "اشعار ہندی" کی سرخی کے تحت اردو کلام بھی دیا گیا ہے۔

۴) افتخار کی نظر تنقید سے زیادہ حالات کی فراہمی پر رہتی ہے ان کا اسلوب بیان سادہ اور پُرمعنی ہوتا ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔ عاجز عارف الدین خاں کے بارے میں یوں لکھا ہے :-

" پدرش در عہد خلد مکاں از بلخ بہ ہند آمد نواب فیروز جنگ ــــــ پدر نواب آصف جاہ اورا بہ منصب پادشاہی فائز ساخت و با خود داشت، عاجز رفاقت رکن الدولہ از اعاظم امرائے آصف جاہ برگزیدہ و بوسیلہ او بہ منصب جاگیر و خطاب از نواب آصف جاہ کامیاب گردیدہ بعد فوت رکن الدولہ کہ در سنہ سبعین و مائۃ الف واقع شد بہ جاگیر قلیلی قناعت کردہ در تاریخ گوئی و شعر ریختہ علم امتیاز می افرازد" [لہ]

۵) افتخار کا انداز تحریر یہ ہے کہ وہ معمولی شعرا کے متعلق کچھ کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ پایہ کے شعرا پر نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ اس تذکرے میں آزاد بلگرامی، درگاہ، درگاہ قلیخاں، میر عبدالجلیل بلگرامی اور وقار صمصام الدولہ، میر عبدالحی خاں پر تفصیلی مواد ملتا ہے اور عاجز، عارف الدین خاں عزلت، میر عبدالولی اور مہربان، عبدالقادر پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۶) اس میں چند ایسے شعرا کا ذکر بھی موجود ہے جو دوسرے تذکروں میں عدم دستیاب ہیں۔ مثلاً اصیل، میر معصوم

لہ افتخار، بے نظیر قلمی ص۱۰۱

اور خلیل شیخ خلیل اللہ وغیرہ۔

افتخار، عبدالوہاب مولف تذکرہ بے نظیر کے حالات :۔

ان کا نسلی سلسلہ بخارا کے سادات تک پہنچتا ہے ان کے جد امجد عالمگیر عہد میں ہندوستان سے دکن آئے اس بیان کی شہادت میں قاقشال نے لکھا ہے : " جد امجدش در زمان عالمگیر بادشاہ از ہندوستان بہ دکن آمدہ۔"[1]

ان کے خسر مرتضیٰ خاں قلعہ دار دولت آباد تھے جو خلد مکاں (اورنگ زیب) کے عہد میں کئی دن تک قلعہ رام گیر کی خدمت حفاظت پر متعین تھے۔ پھر کچھ دن سلطان پور کی فوجداری بھی ان کے ذمہ رہی۔ سید مجاہد خاں کے تبادلہ کے بعد دولت آباد کی قلعہ داری مرتضیٰ خاں کے تفویض ہوئی تو یہ منصب سہ ہزاری سے سرفراز ہوئے۔ ان کے دو لڑکے تھے بڑے کا نام سید محمود اور چھوٹے کا سید جہانگیر تھا بعد میں سید محمود کو باپ کا خطاب "مبارک خاں" عطا ہوا اور سید جہانگیر کو "مجتبیٰ خاں" ملا۔ مرتضیٰ خاں نے ۱۱۱۲ھ میں انتقال کیا جس کا حوالہ اس طرح درج ہے : " سنہ یک ہزار و یک صد و دوازدہ ہجری انتقال نمود۔"[2] ان کے انتقال کے بعد بڑا لڑکا سید محمود مبارک خاں دولت آباد کا قلعہ دار مقرر ہوا۔ فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے عہد میں انہیں منصب سہ ہزاری عطا ہوا، اس کے بعد ان کا لڑکا مراد علی مبارک خاں قلعہ دار ہوا اور انہیں منصب دو ہزار پانصد عطا ہوا، ان کے انتقال کے بعد سید شیر علی مبارک خاں کو قلعہ دار دولت آباد بنایا گیا۔ مرتضیٰ خاں کے دوسرے لڑکے سید جہانگیر مجتبیٰ خاں عنبر کوٹ کی خبرداری پر مامور تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند سید علی رضا کو باپ کا خطاب مجتبیٰ خاں عطا ہوا، اور فردوس آرام گاہ کے عہد میں منصب سہ ہزاری کے ساتھ عنبر کوٹ کی خبرداری سے بھی سرفراز کیا گیا ان کے انتقال کے بعد سید علی اکبر مخاطب بہ مجتبیٰ خاں کو اپنے باپ کی جگہ متعین کیا گیا۔

اس کے بعد یہ قلعہ صلابت جنگ کے قبضہ اقتدار میں آ گیا۔ اس سے پہلے یہ قلعہ دار، صوبہ داران دکن مثلاً حسین علی خاں امیر الامراء اور نظام الملک آصف جاہ اور ان کے فرزندوں کے ماتحت نہ تھے بلکہ ان کا تعلق راست بادشاہ دہلی سے تھا۔ چنانچہ دو لاکھ روپے سالانہ وہاں سے مقرر تھے۔[3] ذیل میں مرتضیٰ خاں کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کے خاندانی افراد کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

سید مرتضیٰ خاں سید مبارک خاں بخاری قلعہ دار دولت آباد

- سید محمود خطاب مبارک خاں
  منصب سہ ہزار قلعہ دار دولت آباد
  - مراد علی خطاب مبارک خاں قلعہ دار دولت آباد
    - سید شیر علی خطاب مبارک خاں قلعہ دار دولت آباد
- سید جہانگیر خطاب مجتبیٰ خاں
  خبردار عنبر کوٹ
  - سید علی رضا خطاب مجتبیٰ خاں منصب سہ ہزاری خبردار عنبر کوٹ
    - سید علی اکبر خطاب مجتبیٰ خاں خبردار عنبر کوٹ
- زوجہ عبدالوہاب افتخار بجلی
  مولف تذکرۂ بے نظیر

۱؎ قاقشال تحفتہ الشعرا قلمی ص ۱۳۳ ۲؎ صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، ماثر الامرا۔ جلد سوم مطبوعہ ص ۶۴۵

۳؎ صمصام الدولہ شاہ نواز خاں ماثر الامرا جلد سوم مطبوعہ ص ۶۴۵

افتخار کی جائے پیدائش احمد نگر ہے جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں: "مولد و منشا این ہمو د بے بود احمد نگر دار السلطنت سلاطین نظام شاہیہ"[1] لیکن گردیزی نے لکھا ہے "سید عبدالوہاب بیکل، زادگاہش دولت آباد است"[2]۔ اورنگ آبادی تذکرہ نویس مثلاً قاقشال، فتوت اور شفیق وغیرہ افتخار کو دولت آبادی لکھتے ہیں غالباً اس خیال کے تحت کہ وہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد یہاں آکر بس گئے تھے۔ بعد کی اس رہائش کو حقیقت جان کر تمنا نے بھی ان کا مقام پیدائش دولت آباد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے "پیدائش والائش از دولت آباد"[3] حالانکہ تمنا نے تذکرہ بے نظیر کا حوالہ دیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں اس تصنیف کا علم تھا لیکن مقام ولادت غلط بتانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تذکرہ کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا کیوں کہ اس میں جائے پیدائش احمد نگر بتاتے ہوئے بعد کی سکونت کا اس طرح ذکر کیا ہے۔ "در دولت آباد بہ تقریب ازدواج با صبیہ سید مرتضیٰ خاں حارس شہر پناہ دولت آباد اقامت ریخت"[4] افتخار ازدواجی رشتے کے بعد دولت آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ جو اس وقت اورنگ آباد ہی کا ایک محلہ تھا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس بائیس سال قیاس کی جا سکتی ہے لیکن اس تخمینہ سے سنہ پیدائش کا تعین نہیں ہو سکتا۔

افتخار کے محسن :-

افتخار ۱۱۸۲ھ میں نواب اشجع الدولہ بہادر غیور جنگ متخلص بہ غیور کی خدمت میں مقربین کے زمرہ میں سرفہرست تھے۔ نواب صاحب ان کی بڑی عزت و توقیر کرتے تھے یہ ان کی محفل کی رونق تھے۔ ہر وقت لطائف و ظرائف سے نواب کی دلجوئی کرتے تھے۔[5] غیور جنگ اشجع الدولہ، اشجع الملک خانخانان، شیر جنگ منیر الملک بہادر اول کے فرزند کلاں اور نواب سالار جنگ (یوسف علی خاں) کے پردادا ہوتے ہیں۔ شیر جنگ ۱۱۱۳ھ م ۱۷۰۱ء میں تولد ہوئے ان کی پیدائش کا مادۂ تاریخ "عالی بخت" ہے صغر سنی میں منصب صدی عالمگیری سے سرفرازی پائی، جب سن تمیز کو پہنچے تو آصف جاہ اول کی خدمت میں آگئے اور منصب دو صدی و داروغگی فیلخانہ سے ممیز ہوئے، تقرب روز افزوں ہوتا گیا، بالآخر دیوانی صوبجات دکن سے ۱۱۶۸ھ میں سرفراز ہوئے[6]۔ ان کی وفات ۱۱۸۹ھ م ۱۷۷۵ء میں ہوئی۔

اشجع الملک غیور جنگ جو افتخار کے مربی تھے ۱۱۴۵ھ م ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوئے، عہد مغفرت مآب (آصف جاہ اول) میں منصب دو صدی و نیابت داروغگی فیل خانہ سے سرفراز ہوئے۔ مظفر جنگ کے عہد میں منصب پانصدی چار سو سوار و خطاب "خانی" اور زمانہ نواب امیر الممالک صلابت جنگ میں اولاً کوتوالی خجستہ بنیاد سے بار دوم منصب

---

[1] افتخار بے نظیر مطبوعہ ص ۳۳ [2] گردیزی ریختہ گویان مطبوعہ ص ۲۹

[3] تمنا، گل عجائب مطبوعہ ص ۱۵ [4] افتخار، بے نظیر مطبوعہ ص ۳۳

[4] عبدالجبار خاں ملکاپوری، محبوب الزمن جلد اول ص ۲۰۵

[5] دانش، ریاض مختاریہ ص ۴۴ [6] دانش ریاض مختاریہ ص ۴۰

سہ ہزاری دو ہزار سوار و علم و نقارہ و خطاب "بہادری" سے بار سوم بہ عہد غفران مآب نظام علی خاں ۱۱۷۴ھ م ۱۷۶۰ء میں منصب چہار ہزاری و خطاب غیور جنگ بہادر اشجع الدولہ سے سرفراز ہوئے بار چہارم منصب پنج ہزاری چہار ہزار سوار و پالکی اور منصب شش ہزاری شش ہزار سوار سے نوازے گئے اس کے بعد ۱۱۹۰ھ میں خدمت آبائی دیوانی صوبجات دکن اور خطاب "اشجع الملک" سے اور ۱۲۰۴ھ م ۱۷۹۰ء میں خطاب "خانخاناں" سے سرفراز ہوئے۔ یہ فارسی زبان میں شعر کہتے تھے، ان کی شادی درگاہ قلیخاں درگاہ کی دختر موسومہ بہجت بیگم سے ہوئی۔[1] اشجع الملک غیور جنگ کے انتقال کا مادہ تاریخ "حشر او می شود با آل رسولؐ" ہے جس سے ۱۲۰۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ ان کو اورنگ آباد میں ان کے والد شیر جنگ مرحوم کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔[2] افتخار نے اپنے تذکرے میں غیور جنگ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

افتخار کو فارسی و عربی میں اچھی دسترس حاصل تھی، اس کے علاوہ علم حکمت سے بھی واقفیت تھی۔[3] ممکن ہے کہ حکمت کو ذریعہ روزگار کے طور پر استعمال کیا ہو۔

افتخار کی شاعری:۔

افتخار نے اپنے تذکرے کے دیباچے میں نہایت ہی احترام کے ساتھ اپنے استاد آزاد بلگرامی کا ذکر کیا ہے اور خود کو ان ہی کا فیض یافتہ بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں افتخار کا ایک شعر آصفی نے پیش کیا ہے ؎

ہفت اقلیم سخن امروز از استاد ما   دارد این معمورہ را زیر قلم آزاد ما[4]

لیکن گردیزی نے تذکرہ "ریختہ گویاں" میں ان کا استاد عزلت کو گردانا ہے۔[5] اس خیال کی پیروی بعد میں عبدالغفور خاں نساخ نے کی ہے۔[6] گردیزی کا تذکرہ ۱۱۶۶ھ میں تالیف ہوا ہے اور نساخ کا ۱۲۹۱ھ میں لکھا گیا ہے اس سے پتہ چلا کہ گردیزی کے خیال کا چربہ نساخ نے اتارا ہے اور بغیر حوالہ کے افتخار کو عزلت کا شاگرد بتایا ہے، اس سلسلہ میں افتخار کے تذکرہ اور دیباچہ کا مطالعہ کیا گیا کہ شاید کہیں عزلت کی شاگردی کا ذکر ہو لیکن کہیں کوئی شہادت نہیں ملی، اس کے بعد ان ہی کے تحریر کردہ عزلت کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ انھوں نے موصوف کی آمد اورنگ آباد کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ قلعہ دولت آباد آئے اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ممکن ہے کہ دولت آباد کے قلعہ دار کے داماد ہونے کی وجہ سے وہ صاحب ثروت رہے ہوں اور عزلت جو مسافر کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے۔ ان کی قدر دانی اور مہمانداری کی ہو اور تفاخراً انھیں اپنا کلام بھی دکھایا ہو۔ اس کے علاوہ آصفی ملکاپوری کا کہنا ہے کہ افتخار نے ریختہ میں پہیلیاں، کبت اور دوہے بھی لکھے ہیں۔[7] عزلت نے بھی ان اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جس کی بنا پر قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے عزلت ہی کے تتبع میں

۱؎ ریاض مختاریہ مطبوعہ ص ۴۴ ۲؎ دانش ریاض مختاریہ مطبوعہ ص ۴۶ ۳؎ افتخار بے نظیر مطبوعہ ص ۳۳
۴؎ عبدالجبار خاں ملکاپوری محبوب الزمن جلد اول ص ۲۰۵ ۵؎ گردیزی ریختہ گویاں مطبوعہ ص ۲۹ ۶؎ نساخ سخن شعرا مطبوعہ ص ۲۷ ۷؎ عبدالجبار خاں ملکاپوری محبوب الزمن جلد اول ص ۲۰۵

ان اصناف میں کلام موزوں کیا ہو اور ان کے کلام کا اثر بھی قبول کیا ہو۔

افتخار زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں اور اس زبان میں دوہے، کبت اور پہیلیاں بھی کہی ہیں[1]۔ دیوان ریختہ کے ساتھ مولف محبوب الزمن ان کے فارسی دیوان کی توصیف میں بھی رطب اللسان ہیں اور ان کے کلام کو سحر سامری کہاہے فارسی میں ان کے تخلص کے بارے میں لکھا ہے۔ "در فارسی افتخار تخلص می کند"[2] فارسی کلام جو انھوں نے اپنے تذکرہ "بے نظیر" میں انتخاباً پیش کیا ہے کافی معیاری ہے۔ افتخار ریختہ میں بیکل تخلص استعمال کرتے تھے جس کے بارے میں تمنا نے لکھا ہے[3] "در ریختہ بیکل تخلص می ماند" اس کے ساتھ ہی ان کے اردو اشعار کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

نرگس باغی کو ہے آنکھ پر اپنی غرور — آ کے ذرا اس کی تم چشم نمائی کرو

اور ردیف "ی" کے یہ دو شعر ؎

مرا دل گلرخوں نے ساتھ لے گئے — حنا کے رنگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے
تری زلفوں نے کئی کئی پیچ دکھلا — دل بیکل کو راتوں رات لے گئے

قاقشال نے اپنے تذکرے میں ان کے یہ اشعار پیش کیے ہیں ؎

آج دل پھر تپ میں آیا ہے — کس پری کی جذب میں آیا ہے
کوئی اس خورشید رو کے نا مقابل ہو سکا — چاند نکلا ہے کرے گا کیا اُجالا دیکھیے
کوہ ہنگام بارش میں عروس وقت ہے — سر پر اس کے سہرہ مروارید کا ہے آبشار[4]

افتخار نے صنف مرثیہ گوئی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس میں ماتمی تخلص استعمال کیا ہے جس کے بارے میں شفیق نے لکھا ہے "در مرثیہ ماتمی تخلص می کند" لیکن انھوں نے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی البتہ قاقشال نے اس سلسلہ میں ایک شعر پیش کیا ہے ؎

حسین ابن رسول اللہ کے مقتل پہ جا پہنچے — جو خاک ہونا ہو آخر کیوں نہ خاک کربلا پہنچے

جب افتخار نے مرثیوں کے لیے علیحدہ تخلص اختیار کیا ہے تو اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس صنف میں بھی کچھ ذخیرہ چھوڑا ہوگا لیکن نہ تو کسی تذکرہ میں اس نوع کلام ملتا ہے، اور نہ خود افتخار ہی نے اپنی تالیف "بے نظیر" میں کوئی مرثیہ نمونتاً پیش کیا ہے۔

بہرحال افتخار کی نثر اور نظم سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بیک وقت ادیب و شاعر تھے اور ادب کے مختلف شعبوں میں اپنے خیالات کا اظہار بطریق احسن کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام دولت آباد ہی میں گزارے اور وہیں ان کا انتقال ۱۱۹۰ھ میں ہوا[5]۔

۱۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری محبوب الزمن جلد اوّل ص۲۰۵ ۲۔ شفیق چمنستان شعرا ص۹

۳۔ قاقشال تحفۃ الشعرا ص۱۳۲ ۴۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری محبوب الزمن جلد اوّل ص۲۰۵

فاطمہ عالم علی

اباّ کے ساتھ گزرے ہوئے چند لمحے

یوں تو مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے اور جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھا بھی کروں۔ مگر جی کی نہ پوچھئے وہ تو بہت کچھ چاہتا ہے لکھوں تو جب کہ لکھنا آئے کئی مرتبہ لکھنے کے ارادے سے بیٹھی مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ اپنا لکھا خود پڑھا تو خاک سمجھ میں نہ آیا اور گھبرا کر یہ ارادہ کر لیا کہ صرف "زبانی لفاظی" پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے۔ اب اسے بدقسمتی ہی کہئے کہ میں نے اپنے اس لکھنے کے شوق کا اظہار اپنے چند دوستوں سے بھی کیا تھا اور سچ پوچھئے تو انھیں لوگوں کے عنایت آمیز اصرار کا آج مجھے شکار بننا پڑا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک یہ خوش فہمی بھی رہی کہ قاضی صاحب کی بیٹی کے ناتے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیئے۔ تاہم بہت جلد یہ خوش فہمی دور ہو گئی اور یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اگر باپ ادیب یا صحافی تھا تو ضروری نہیں کہ میں بھی ادب کے میدان میں کود پڑوں صاحب یہ تو اللہ کی دین ہے۔ اباّ ہی کو لیجئے ان کا سارا شجرہ اٹھا کر دیکھ ڈالیے سیاسی باغی تو ان کے پرکھوں میں ضرور ملیں گے لیکن مصنف قسم کی کوئی مخلوق نظر نہ آئے گی۔ بہر حال بہت غور و فکر کے بعد آج اباّ کی زندگی کے چند واقعات مضمون کی شکل میں پیش کر رہی ہوں۔ اگر مضمون پسند آ جائے تو اسے اباّ ہی کا روحانی فیض سمجھئے اور پسند نہ آئے تو مجھے معاف کر دیجئے۔

میں صرف گیارہ دن کی تھی کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور مجھے میرے ماموں اسرمحمد یعقوب نے گود لے لیا ان کے کوئی اولاد نہ تھی میں ان ہی کے پاس رہتی تھی۔ اباّ کے پاس میرا آنا جانا ایک بے تکلف مہمان کی طرح ہوتا تھا اور جب اباّ حیدرآباد آ گئے تو پھر تو ان سے دو دو سال ملاقات نہ ہوتی تھی۔

۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء کو اچانک ماموں میاں کا انتقال ہو گیا یہ میری زندگی کا پہلا زبردست حادثہ تھا۔ ماموں میاں کے انتقال کے بعد "پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم" کے مصداق یوں سمجھئے کہ میں دوبارہ اباّ کے گھر میں پیدا ہوئی اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔

ہاں تو جس وقت میں اباّ کے پاس آئی اخبار "پیام" اپنے شباب پر تھا۔ اباّ ہفتہ بھر معروف رہتے تھے حد یہ ہے کہ گھر میں بھی آتے تو اباّ کم اور ایڈیٹر زیادہ معلوم ہوتے جب دیکھئے کچھ لکھ رہے ہیں، اور اگر اتفاق سے ہاتھ میں کاغذ پنسل نہ ہو تو کچھ سوچ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا کہ دماغ میں کوئی مضمون تیار ہو رہا ہے۔ اس قدر کھوئے ہوئے رہتے کہ

---

[1] قاضی عبدالغفار مرحوم

ان کو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں کیا کر رہے ہیں، اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مثلاً کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں میں نے نہایت محبت سے کباب کی پلیٹ سامنے کرتے ہوئے چونکانے کے خیال سے کہا "ابا کباب لیجئے بہت مزے کے ہیں" اور ابا نے گویا سخت معروفیت کے باوجود جواب دینے کی زحمت گوارا کی اور فرمایا "ارے بھئی مجھے فرصت نہیں ہے" اب بتائیے کہ کباب کی پلیٹ نہ ہوئی پکنک کے پروگرام کی کوئی اسکیم ہوئی کہ جس کو عدیم الفرصتی کی بنا پر ٹھکرا دیا گیا! اب یہ فرض بھی مجھی کو ادا کرنا پڑتا کہ ان کو یاد دلایا جائے کہ جناب دفتر میں نہیں کھانے کی میز پر ہیں چنانچہ ان کے پاس منہ لے جا کر زور سے کہتی "یہ دسترخوان ہے" فوراً مسکرا دیتے، اور بڑے پیار سے کہتے "کیوں شامت آئی ہے" اور کھانے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

ابا ہر چیز بھول جاتے سوائے کتاب اور پنسل کے یہ چیزیں تو جیسے ان کی زندگی کا لازمہ بن گئی تھیں۔ بعض مرتبہ سگریٹ کی جگہ پنسل منہ میں رکھ لیتے اور کئی کئی بار جلانے کی کوشش کرتے جو بھی اس وقت ان کی یہ حرکت دیکھ لیتا ان کو یاد دلاتا کہ آپ کے منہ میں سگریٹ نہیں پنسل ہے" اپنی اس حرکت پر بے ساختہ ہنس پڑتے اور لاحول پڑھنے لگتے۔ یہی حال عینک کے ساتھ تھا اکثر عینک چہرے پر ہوتی اور منہ ڈھونڈا لیتے ابا کی عادت تھی کہ رات کو جب پلنگ پر لیٹ کر پڑھتے تو عینک پیشانی پر رکھ لیتے (ابا نے پڑھنے کے لیے کبھی عینک استعمال نہیں کی) اور اس وقت کسی کام سے اٹھنا ہوتا یا کوئی صاحب ملنے آجاتے تو فوراً بستر سے اٹھ کر عینک کی تلاش شروع کر دیتے۔ بڑی لجاجت سے پوچھتے "بھئی فاطمہ تم نے کہیں ہماری عینک دیکھی ہے"؟ اور میں بھی گویا ان پر احسان کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہتی "جی ہاں آپ کی پیشانی پر رکھی ہے" عینک فوراً آنکھوں پر آجاتی۔۔۔ اور کہتے "اچھا دیکھو ابھی آکر کیسی مرمت کرتا ہوں"! اور باہر چلے جاتے۔ خیر بات عینک اور پنسل تک رہتی تو بھی مضائقہ نہ تھا مگر معاملہ بھول کا کافی طویل اور دلچسپ ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ عالم علی صاحب نے (جن سے میری منگنی ہو چکی تھی) ابا کو فون کیا اور ابا نے انھیں نہ پہچانا، وہ بیچارے اپنا نام بتاتے رہے اور ابا کو اصرار رہا کہ معاف کیجئے میں آپ کو نہیں پہچان رہا ہوں"۔ جب انھوں نے کہا میں ہاشم علی صاحب کا لڑکا بات کر رہا ہوں تو ان کو اپنی غائب دماغی پر بہت کوفت ہوئی اکثر لوگوں کے نام تو نام صورت تک بھول جاتے اور اکثر اس بھول کی بدولت معذور کہلاتے۔ غرض آئے دن اس قسم کے بیسیوں واقعات ہوتے رہتے۔

ابا کے زمانے میں جمعہ کو حیدرآباد میں عام تعطیل ہوا کرتی تھی جمعرات کی شام سے ابا کے یہاں چھٹی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں کہیں نہ کہیں پکنک منانے کا پروگرام بنتا۔ موسم کے لحاظ سے کھانے پکتے۔ اگر باہر نہ جاتے تو گھر پر ہی کبھی چوسر کبھی شطرنج جمتی اور ابا جو ایک ہفتے تک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ رہنے کے برابر ہوتے تعطیل کے دن وہ واقعی ہم لوگوں کے درمیان ہوا کرتے۔

ابا نوکروں پر بہت کم غصہ کرتے ہاں اگر ان کے کتوں کی دیکھ بھال میں ذرا سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو نوکروں کی شامت آجاتی۔ کسی نوکر پر غصہ کا یہ انداز بھی خوب ہوتا کہ جس قدر شدت کے ساتھ غصہ آتا اسی قدر ادب سے گفتگو کرتے یعنی آپ اور جناب سے نوکروں کو مخاطب کرنے لگتے۔ ابا کو "بولنا غصہ" بہت کم آتا تھا۔ دفتر میں یا گھر پر ہی کوئی بات خلاف مرضی

ہوجاتی تو خاموش ہو جاتے اور اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے کی صفائی شروع کر دیتے۔ تمام کتابوں اور میز کی صفائی ہوجاتی اخبار جن کا ہر طرف ڈھیر لگا ہوتا قرینے سے ایک جگہ رکھ دیئے جاتے، ورنہ اپنے پڑھنے لکھنے کے سامان کو ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ کمرے کی جھاڑ پونچھ گویا یہ اعلان ہوتا کہ ابا کو غصہ آگیا ہے۔ سارے گھر کو چپ لگ جاتی۔ میں جو ابا کے سب سے زیادہ منہ چڑھی تھی نہ معلوم میری زبان کو بھی تالا سا لگ جاتا اور اس وقت یہ احساس ہوتا کہ ہم لوگ ابا سے کس قدر مرعوب ہیں۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ ہم ڈرتے ہوئے بھی ان کے بگڑے تیور دیکھ کر سہم جاتے۔ عام طور پر ابا کا غصہ میعادی ہوتا تیسرے دن خود بخود بھلے چنگے ہو جاتے۔ گھر بھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی اور ہماری زبانیں پھر قینچی کی طرح چلنے لگتیں۔ غرض یہ بڑا پر لطف زمانہ ابا کے ساتھ گزرا۔ ویسے تو یہ اچھا خاصہ طویل زمانہ ہے مگر سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند لمحے ابا کے ساتھ گزارے ہیں۔

پھر حیدرآباد کے حالات بدلے اور ان بدلے ہوئے حالات نے ابا کو حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا، اور ابا لکھنؤ آگئے لکھنے لکھانے کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا لیکن دفتر کا جھگڑا نہ تھا۔ گھر پر ہی محاورے جمع کرنے کا شوق ہوا کوئی دلچسپ محاورہ نظر سے گزرتا تو ہم لوگوں کو بھی سناتے اور اظہار خیال کا موقع دیتے کبھی کبھی دوپہر کو کوئی پرانا واقعہ یا کتاب سے کہانی پڑھ کر سناتے ایک مرتبہ "غبار خاطر" سے "چڑیا چڑے کی کہانی" سنائی ایک تو کہانی بڑی جاندار اس پر ابا کے سنانے کا دلچسپ انداز آج بھی ان کی آواز کانوں میں گونجتی ہے بس لطف آگیا تھا جی چاہتا تھا کہ ابا کہانی سناتے ہی رہیں۔

کبھی کبھی رات کو کھانے کے بعد بیت بازی کا موڈ آجاتا تھا سب ابا کو گھیر کر بیٹھ جاتے۔ پارٹی بنتی تو سارا گھر ایک طرف اور ابا تنہا ایک طرف پھر ساتھ ساتھ ابا پر پابندی لگادی جاتی کہ جناب فارسی کا شعر نہیں چلے گا۔ لیکن اتنی پابندیوں کے باوجود ہمارے پاس اشعار کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور جیت ابا ہی کی ہوتی۔

تقسیم ہندوستان کے وقت جو فسادات ہوئے انھوں نے ابا کو بہت متاثر کیا ان کو اپنے بچپن کے ہندو مسلم تعلقات یاد آتے تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی پرانا واقعہ اپنے ہندو دوستوں کا لے بیٹھتے ایک مرتبہ سردیوں کا موسم تھا کمرے میں انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں سب لوگ گرم کپڑوں میں لپٹے بیٹھے فسادات پر اظہار خیال کر رہے تھے ابا نے اپنے دادا کا واقعہ شروع کر دیا کہنے لگے "بھئی یہ سب گوری چمڑی کی لگائی آگ ہے ورنہ ہم نے تو ہندو مسلم اتحاد کا وہ رنگ دیکھا ہے کہ کسی مسلمان مسلمان میں ایسا اتحاد نہ ہوگا۔ جب دلی میں غدر ہوا تو اس وقت ہمارے دادا (قاضی حامد علی) مرادآباد کے قاضی تھے اور ہمارے والد کی عمر اس وقت تیرا سال تھی۔ دہلی کے قلعہ میں کہرام برپا تھا اس قیامت میں ایک شہزادہ قلعہ سے بھاگ کر مرادآباد کی طرف آنکلا۔ نفسی نفسی کا عالم کوئی شہزادے کو پناہ دینے پر تیار نہ تھا۔ ہمارے دادا کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے شہزادے کو اپنے یہاں چھپالیا۔ انگریزوں کے پٹھو ہر طرف پھیلے ہوئے تھے کسی نے خبر کر دی کہ مرادآباد کے قاضی نے شہزادے کو پناہ دے کر غداری کی ہے۔ شہر میں تعلبلی مچ گئی ہمارے دادا کے دوست احباب گھبرائے ہوئے آئے اور کہا "قاضی جی آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ اب آپ کی خیر نہیں خدا کے لیے روپوش ہو جائیے۔ آپ پر غداری کا الزام لگ چکا ہے" مگر قاضی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا میں نے غداری نہیں

وفاداری کی ہے۔ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ ہمارے دادا مسجد میں عصر کی نماز ادا کر رہے تھے کہ انگریز ان کو پکڑ لے گئے اور آناً فاناً پھانسی دے دی۔ ادھر پھانسی ہوئی ادھر دادی کو مع بچوں کے گھر سے نکال کر مکان اور جائیداد ضبط کر لی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم سے ہر شخص خائف تھا۔ قاضی جی کی بیوی کو پناہ دینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ مگر کسی اللہ کے بندے نے رات گزارنے کے لیے جگہ دے دی۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی سارے گھر کی جیسے جان نکل گئی لیکن مسلسل کنڈی کی آواز پر مرتا کیا نہ کرتا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ ایک لالہ آئے ہیں اور قاضی جی کی بیوی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری دادی نے دروازے کی اوٹ سے آنے کی وجہ پوچھی تو لالہ نے کہا "بہن قاضی جی کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے اس کے لیے بھی کچھ سوچا" ہماری دادی نے کہا "بھلا لالہ آدھی رات اور وہ بھی قیامت کی بھلا میں مجبور ذات کیا کر سکتی ہوں؟" لالہ نے ہمت دلائی اور کہا چلو "ان کی لاش تلاش کر کے کچھ انتظام کریں" ابا نے ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ لمبی سانس لی اور کہنے لگے "اس زمانے کی عورتیں جنھوں نے زندگی میں کبھی قدم گھر سے باہر نہ نکالا ہو وقت پڑنے پر مرد سے زیادہ ہمت کر جاتی تھیں۔ غرض ہماری دادی لالہ کے ساتھ جہاں سولی لٹکائی گئی تھی وہاں پہنچیں اور ہزاروں لاشوں میں سے شوہر کی لاش تلاش کی، وہیں پر ایک گڑھا کھودا اور اس میں لاش دفن کر کے نشانی کے طور پر ایک لکڑی لگا دی اور گھر آ گئیں۔ اس کے بعد جب حالات درست ہوئے اور ہمارے دادا بے قصور ثابت ہوئے تو جان واپس نہ آ سکی لیکن انگریزوں نے بڑی عنایت کی کہ مکان اور جائداد واپس کر دی بلکہ کچھ انعام بھی دیا۔ پھر اس جگہ ہمارے دادا کی قبر بھی بنوائی گئی۔ چوں کہ دفن کرتے وقت کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ سر کس طرف ہے اور پاؤں کدھر چنانچہ اس لکڑی کی مدد سے قبر پہچانی گئی اور چوکور قبر بنا دی گئی اور وہی حشر کا میدان ہمارا خاندانی قبرستان بن گیا"

جب ابا قصہ ختم کر چکے تو میں نے پوچھا کہ آخر وہ لالہ کون تھے جن کو قاضی جی سے اتنا لگاؤ تھا کہ اتنی ہمت کر گئے تو ابا نے کہا کہ "اس زمانے کے لوگ بڑے وضع دار اور مخلص ہوتے تھے محلہ تمباکو والا میں ہمارے گھر کے قریب ان لالہ کی ایک چھوٹی سی دکان تھی ہمارے دادا شام کو اس دکان پر جا کر بیٹھا کرتے تھے آج کل نہ ویسے دکاندار ہیں نہ ویسی دکانیں اس زمانے کی دکانوں پر بیٹھکیں جما کرتی تھیں ادبی محفلیں ہوتی تھیں حالات حاضرہ پر تبصرے ہوا کرتے تھے ان لالہ کے گھر والوں کا بھی ہمارے یہاں آنا جانا تھا بس یہی تعلقات تھے جن کی بنا پر لالہ نے ہماری دادی کا اتنا ساتھ دیا۔ ہمارا بچپن تھا لالہ کا انتقال ہو چکا تھا ہمیں یاد ہے کہ جب تک دیدی یعنی لالہ کی بیوی دلہن کا منہ نہ دیکھ لیتیں گھر کی لڑکیاں بے چین رہتیں مگر منہ دیکھنے کی اجازت نہ ملتی۔ دیدی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر آتیں اپنے ہاتھ سے دلہن کا گھونگٹ اٹھاتیں دعا دیتیں اور اپنی میلی ساری کے کونے سے ایک اٹھنی کھول کر دلہن کے ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ اس کے بعد منہ دکھائی شروع ہوتی۔ تو بھئی یہ تھے ہندو مسلم تعلقات۔ دونوں اپنے اپنے مذہب کے سختی سے پابند تھے اس کے باوجود بھائی چارہ قائم تھا۔" ابا نے قصہ ختم کر دیا اور ہم سوچنے لگے کہ واقعی جن لوگوں نے اتحاد کے یہ مناظر دیکھے ہوں وہ اب کیوں کر جی سکتے ہیں۔

قصے کہانیوں کے علاوہ ابا کو گانا سننے کا بھی بہت شوق تھا۔ استادی گانوں کا شوق ریڈیو سے پورا کرتے اور

گھر میں اکثر شام کو ڈھولک کے جمتی ڈھولک کے۔ وہ گیت جس میں بیٹی سسرال میں رہ کر اپنے کنوارے پن کو یاد کرتی ہے بہت بجاتے اور بابل سن کر تو ان کی عجب کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔

ابا قہقہہ مار کر بہت کم ہنستے اور اگر کسی وقت بے قابو ہو کر ہنس دیتے تو جلد ہی اس پر قابو پا لیتے ایسا معلوم ہوتا جیسے زور سے ہنس کر انھوں نے کوئی بڑی غلطی کی ہو۔

ابا کو عمدہ کھانے اور بہترین کپڑوں کا بیحد شوق تھا، کپڑا ہمیشہ بہت اچھا پہنتے بڑے جامہ زیب بھی تھے۔ چوڑی دار پاجامہ پر جب ہم رنگ ٹوپی اور شیروانی پہن کر باہر نکلتے تو میں اکثر جھوٹ موٹ کچھ پڑھ کر پھونکتی اور کہتی کہ خدا نہ کرے کوئی بلا سامنے لگ جائے تو ہمیشہ کہتے "دیکھ کہے دیتا ہوں منہ کو لگام دینا سیکھ ورنہ سسرال میں جوتے کھائے گی" جھومتی ہوئی چال پر تو نہ جانے ابا نے کتنوں کو قتل کیا ہوگا وہ بھلا ہم کو کیوں بتلانے لگے!!

ابا کی کتاب زندگی میں کفایت شعاری کا کوئی باب نہ تھا، اور میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ جو کچھ کماتے کھانے اور کھلانے پر اڑا دیتے۔ ابا نے حساب کتاب کا جھگڑا کبھی مول نہ لیا اور ہمیشہ سولہ سو کے ہزار کرتے رہے نہ ان کو کبھی اخبار "پیام" کی آمدنی کا پورا علم ہوا نہ گھر کے اخراجات کے حساب لکھنے کا ان کو خیال آیا۔ وہ کہتے خرچ ہو جانے کے بعد حساب لکھنے سے کیا حاصل؟

ابا میاں دعوتیں بھی بہت کرتے۔ جب دعوت کا دن آتا تو سارا دن پریشانی میں گزرتا دو باتوں کی فکر رہتی ایک تو کھانا عمدہ پکے دوسرے کم نہ پڑے ان چیزوں کے متعلق دن بھر میں اتنے سوالات کرتے کہ ہم لوگوں کے ہاتھ پیر پھلا دیتے طبیعت میں جلدی بھی غضب کی تھی اور اپنی جلد بازی میں اچھا خاصا کام اوندھا کر دیتے یہی عالم ضد کا تھا جب کسی بات پر ضد آ جاتی تو خود ہی نقصان اٹھاتے لیکن ضد پوری کر کے رہتے۔

معمولی معمولی چیزوں کو جن کی طرف ہمارا دھیان بھی نہ جاتا ابا اس کی گہرائی تک پہنچ جاتے۔ ایک دفعہ کا بڑا دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ آپ بھی سنیے ایک دن ہم نے دیکھا کہ ابا صحن میں کبوتروں سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ ۔ ۔ ۔ دیکھا ایک کبوتری ابا کی گود میں بیٹھی ہے اور ایک کبوتر بڑی بے قراری سے ادھر ادھر پھر رہا ہے کبھی سینہ تان کر آتا ہے اور ابا کے پیروں میں چونچ مارتا ہے کبھی دم اٹھا کر سینے سے لگا لیتا ہے کبھی چونچ زمین پہ مارتا ہے کبھی پاؤں پٹختا ہے۔ ہم لوگوں نے پوچھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے کہنے لگے میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں یہ بدمعاش خود تو کھلتے ہی ڈھابک سے باہر آ کر دانہ چگنے لگتا ہے اور یہ غریب کبوتری باہر نکلی کہ اس کے اطراف ناچ ناچ کر اور چونچ مار مار کر اسے ڈھابک میں ٹھہرا دیتا ہے بیچاری کو پیٹ بھر کر کھانے بھی نہیں دیتا۔ پھر کبوتر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "جب تک اچھی طرح زمین پر ناک نہ رگڑو والوں کا کبوتری کو نہ چھوڑوں گا۔ ضرور کوئی مولوی ہے ندا کا معلوم ہوتا ہے۔" ہم لوگوں نے کبھی محسوس بھی نہ کیا تھا کہ اتنے کبوتروں میں ایک مولوی بھی ہے مگر ابا تاڑ گئے اور اس کو سزا دے کر اپنی تشفی بھی کر لی۔ جو مولوی مسجدوں میں عورت کے تعلق سے واعظ کرتے اور صرف عورت کے فرائض گنا نے ایسے مولویوں سے ابا کو نفرت تھی کہتے ان لوگوں نے عورت کو اس کے جائز مقام سے محروم کر دیا ہے۔

ابا کو طلبا سے بڑی دلچسپی تھی اگر ان کے سامنے کالج کے کسی لڑکے کی بدتمیزی کی شکایت کی جاتی تو بڑی ہمدردی سے

کہتے "ارے بھئی ان بیچاروں کو کچھ نہ کہا کرو یہی چند سال تو ان کی زندگی میں بے فکری کے ہوتے ہیں کالج سے نکلنے کے بعد یہ فریب دنیا معاش کے جھمیلوں میں گرفتار ہو جائیں گے ان کو تو معاف کر دینا چاہیے۔"

حیدرآباد سے آنے کے بعد ابا کی صحت گرنے لگی اور علی گڑھ آکر تو باقاعدہ بیمار ہو گئے۔ بیماری کی تشخیص میں کئی سال گزر گئے بمبئی میں پتے کا آپریشن ہوا تو معلوم ہوا کہ جگر میں کینسر ہے جس ہمت سے ابا نے بیماری کا مقابلہ کیا بہت کم ایسے لوگ دیکھنے میں آئے۔ آپریشن کے بعد جب حیدرآباد آئے اور یہاں سے دہلی جا رہے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپریشن کروا کے نہیں تفریح کر کے آئے ہیں۔ آپریشن کے وقت ڈاکٹر معقول علی صاحب موجود تھے وہ ابا کی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے حیدرآباد کے اسٹیشن پر دوست احباب جمع تھے گاڑی روانہ ہونے کو تھی معقول علی صاحب اصرار کر رہے تھے کہ ابا سوار ہو جائیں اتنے میں گاڑی نے حرکت کی اور ابا یہ کہتے ہوئے کہ "اجی ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے بڈھا سمجھا ہے کیا؟" چلتی ٹرین میں اچک کر سوار ہو گئے اور سب لوگ حیران تھے کہ کیا واقعی ان کو کینسر ہے؟ ابا چند مہینے ٹھیک رہے یوں تو پوری بیماری کے دوران کبھی کام سے پیچھے نہ ہٹے لکھنے پڑھنے کا تو یہ حال تھا کہ ریل ہو یا ہوائی جہاز میں ہوں یا بستر پر قلم چلتا ہی رہتا ہاتھ کے ہلنے یا بے ڈھب ہونے سے ابا کے لکھنے پر کوئی اثر نہ پڑتا اور یہ ایک عجیب بات تھی! وہ ہر جگہ اطمینان سے لکھ سکتے تھے بلکہ ٹرین میں اکثر ٹائپ بھی کرتے۔

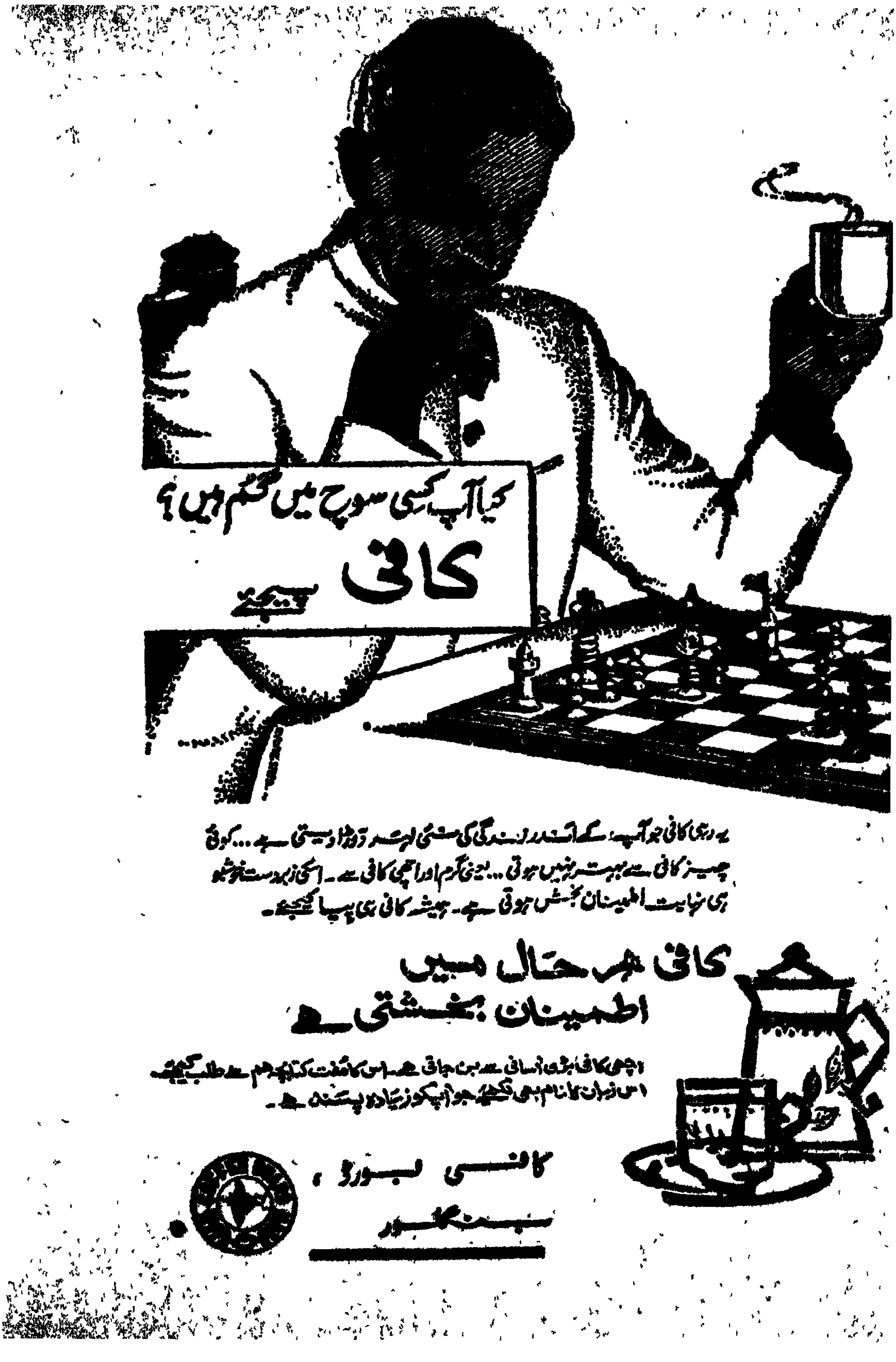
غرض بیماری نے زور پکڑا، کینسر نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا درد کی تکلیف رہنے لگی اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ہاتھ میں قلم ہوتا دوسرے ہاتھ سے گرم پانی کی بوتل پیٹ سے لگائے ہوتے۔ چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا پہلو بدلتے جاتے اور لکھتے جاتے سنا ہے کہ بارہ بجے تک جس دن انتقال ہوا ہے کام کرتے رہے۔ خود نہ لکھ سکے مگر لکھواتے رہے اور جب دفتر سے مضمون ٹائپ کرا کے چپراسی گھر پر لایا تو ابا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے تھے بس یوں سمجھئے کہ جیسے جیسے مرض میں شدت ہوتی تو کام میں بھی شدت پیدا کر دیتے ہم لوگ کام سے روکتے تو کہتے کہ کام کرتا ہوں اس لیے مرض کا مقابلہ کر رہا ہوں اگر میرے ہاتھ میں قلم نہ ہوتا تو کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ پھر آپریشن ہونا چاہیے لیکن مسلسل بیماری نے مالی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا مولانا آزاد مرحوم نے آپریشن کرانے میں پس و پیش کی وجہ کو تاڑ لیا اور اخراجات کی پوری ذمہ داری لی اور ابا دہلی کے نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے۔ میرے پاس تار آیا کہ فوراً آؤ تمہارے آنے کے بعد آپریشن کی تاریخ مقرر ہو گی خیر میں بھی پہنچ گئی اور آپا بھی آگئیں۔ لیکن ان کی حالت غیر تھی معلوم ہوتا تھا کہ آپا کا ہی آپریشن ہونے والا ہے ابا نے آپا کی پریشانی کا اندازہ صورت دیکھ کر ہی لگا لیا اور تسلی دینے لگے جیسے واقعی آپا کا آپریشن ہو رہا ہو کہنے لگے "بھئی بالکل معمولی آپریشن ہے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ صرف آدھے گھنٹے کا آپریشن ہوگا۔" ابا اپنی بیماری میں جتنے مضبوط تھے اپنے بچوں کے معاملے میں اتنے ہی بودے اور کمزور۔ بچوں کو انجکشن بھی لگتا تو کمرے سے باہر چلے جاتے لیکن خود اپنے آپریشن کے روز بے حد مطمئن تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس عمر میں اور اتنے بڑے آپریشن کے لیے اتنا باہمت مریض ہم نے نہیں دیکھا۔ پریشانی سے اکثر نبض اور دل کی حرکت دونوں متاثر ہوتی ہیں لیکن قاضی صاحب کا دل اور نبض دونوں نارمل ہیں جس وقت پہیوں کا پلنگ ان کو لینے آیا تو خود ہی ہنستے ہوئے اٹھے کہنے لگے "دیکھئے جناب ہماری سواری آگئی ہم چلتے ہیں" اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ اس آپریشن کے بعد ابا کو کئی دن ہوش نہ آیا ہم لوگ تو مایوس ہو چکے تھے لیکن ابھی زندگی باقی تھی

شروع ہوئے بات چیت کرنے لگے تھا نپے اطراف کے ماحول سے دلچسپی لینا شروع کی۔ ایک دن قریب سے کسی مریض کے کراہنے کی آواز آئی کہنے لگے تم لوگ اس مریض کی آواز سے اس کا حلیہ بتا سکتے ہو نا۔ میں نے کہا ہم لوگ تو اس کو دیکھ چکے ہیں۔ آپ بتائیے۔ تو یقین مانیے مریض کا رنگ، اس کی جسامت، اس کا قد، اس کی عمر سب ہی کچھ ابا نے بتا ڈالا۔ ہم لوگ تو حیران رہ گئے تھے۔ لیکن عجیب بات تو یہ تھی آواز سے حلیہ پہچاننے والے ابا کبھی دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکے ہر شخص کو سچا اور قابل بھروسہ سمجھ لیتے اور جب مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا تو بڑی حسرت سے کہتے " آخر انسان ایسا کیوں ہوتا ہے؟" ابا چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے کام کی بھی وہی رفتار تھی لیکن آپریشن کامیاب نہ ہوا کینسر نے سارے جسم پر قبضہ جما لیا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ شمع گل ہونے کو ہے ابا نے تو اس بات کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا چنانچہ جب وہ آخری بار حیدرآباد آئے ہوئے تھے تو ایک دن میں باوجود کوشش کے سارا دن ان کے کمرے میں نہ جا سکی ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ شام کو گئی تو مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے " آج صبح سے کہاں غائب تھی؟ دیکھو جو وقت ابا کے ساتھ گزارتی ہو اسے غنیمت سمجھو ورنہ جب ابا نہ ہوں گے تو پچھتاؤ گی کہ تھوڑی دیر ابا کے پاس بیٹھی بھی نہیں" اور ابا کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ دسمبر میں حیدرآباد آتے وقت جب ان سے رخصت ہوئی تو کہنے لگے جاؤ بیٹی اب تو تم ہماری نہ ہو سکو گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی دن ہم بھی ہوش صاحب کی طرح چل دیں گے (ہوش بلگرامی کے انتقال کا ان کو بہت صدمہ تھا) ابا کی آنکھوں میں پہلی بار مایوسی کے آنسو تھے۔ میں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پا لیا لیکن آواز نہ نکل سکی۔ چند منٹ ان کو دیکھتی رہی پھر خود ہی بولے " اچھا بیٹی خدا حافظ ٹرین کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اپنا فون نمبر دے دو شاید کوئی ضرورت آ پڑے " میں دلگیر حیدرآباد آ گئی۔ آئے ہوئے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا کہ ۱۷ جنوری ۷۵ء کی شام کو مجھے تار ملا کہ ابا رخصت ہو گئے۔ دوسرے ہی دن میں علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئی وہاں پہنچی تو ابا کی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی بس ابا نہ تھے کسی گوشے سے بھی ان کی آواز نہ آئی ہزار پکارنے پر بھی جواب نہ ملا۔ ورنہ ان کی تو جیسے عادت سی پڑ گئی تھی کہ جب میں حیدرآباد سے جاتی تو سلام نہ دعا دیکھتے ہی کہتے " آپ کیوں تشریف لائی ہیں کس نے بلایا ہے آپ کو؟ اپنے باپ کا گھر سمجھ لیا ہے کہ منہ اٹھائے چلی آتی ہیں" اور میں بھی بناوٹی غصے سے قریب رکھا آئینہ سامنے کر کے کہتی " دیکھا ہے میرے باپ کو؟ ہر بات میں میرے باپ کا نام نہ لیا کیجیے" لیکن اس دن میں نے سوچا کہ واقعی میں یہاں کیوں آ گئی۔ یہ تو میرے باپ کا گھر نہیں ہے۔ بغیر باپ کے گھر کیسے ہو سکتا ہے! لیجیے یہ چند لمحے بیت گئے اور بقول ابا کے۔۔

وہ دورِ بہاراں بیت گیا روداد جوانی ختم ہوئی
اگلوں کو زمانہ کیا دے گا اپنی تو کہانی ختم ہوئی

چشمِ عبرت سے تماشائے جہاں کرتا ہوں
سنگ در خاک ہے یہ انجمن گل در گل
سراج اورنگ آبادی


کیا آپ کسی سوچ میں گم ہیں؟
کافی
پیجیے
یہ رہی کافی جو آپ کے اندر زندگی کی سی نئی لہر دوڑا دیتی ہے... کوئی
چیز کافی سے بہتر نہیں ہوتی... یعنی گرم اور اچھی کافی ہے۔ اس کی زبردست خوشبو
ہی نہایت اطمینان بخش ہوتی ہے۔ ہمیشہ کافی ہی پیا کیجیے۔
کافی ہر حال میں
اطمینان بخشتی ہے
اچھی کافی بڑی آسانی سے بن جاتی ہے۔ اس کا مفت کتابچہ ہم سے طلب کیجیے۔
اس زبان کا نام بھی لکھیے جو آپ کو زیادہ پسند ہے۔
کافی بورڈ،
بنگلور

شاد عارفی

مئے سے "بھرپور" جام ہوتا ہے
ورنہ خالی... "تو"... نام ہوتا ہے

شام سے اہتمام ہوتا ہے
تب وہ بالائے بام ہوتا ہے

جس کے ہاں کچھ پیام ہوتا ہے
شاعرِ بزمِ عام ہوتا ہے

کرمِ خاص چاہتے ہیں ہم
مسکرا دو تو کام ہوتا ہے

ہاتھ سے یا زباں ہی سے نہیں
آنکھ سے بھی سلام ہوتا ہے

گل کے ایمائے ابتسام کے ساتھ
مجھکو اذنِ کلام ہوتا ہے

میں جو بدنام ہو رہا ہوں تو کیا
آپ کا بھی تو نام ہوتا ہے

شیخ صاحب وہاں ہمارا بھی
کچھ نہ کچھ احترام ہوتا ہے

بات اس سے نہو سکی۔ جس کا
سامنا صبح و شام ہوتا ہے

کسی محفل پہ اعتراض نہ کر
اپنا اپنا نظام ہوتا ہے

اس کی رنگت[1] نہ پوچھو شادؔ مرا
جس لفافے پہ نام ہوتا ہے

[1] سنسر ہونے کے بعد

مخدوم محی الدین

کچھ پھول سرِ صحنِ چمن کھل تو رہے ہیں
اک نور سرِ طورِ نظر آ تو رہا ہے

صدیوں سے صدف بند گہر بند، نظر بند
وہ جانِ صدف، جانِ گہر آ تو رہا ہے

لب سرد، نظر سرد، بدن سرد ہے دل سرد
وہ جانِ مسیحا نفساں آ تو رہا ہے

آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آ تو رہی ہے
آغوشِ سحر میں کوئی شرما تو رہا ہے

خورشید احمد جامی

صبحِ رخسارِ بہاراں ہے یہ دنیا جیسے
تیری آنکھوں سے کسی نے اسے دیکھا جیسے

آرزوؤں کے سفینے ہیں نہ غم کی موجیں
تھم گیا وقت کا بہتا ہوا دریا جیسے

چاندنی رات کا آنچل ہو کہ مے کا شعلہ
ہر حسیں چیز یہاں نام ہے تیرا جیسے

دل میں اس طرح ترا درد ابھر آیا ہے
نرم مٹی پہ کوئی نقشِ کفِ پا جیسے

لبِ افلاس پہ آتے ہی جو تھرا جائے
زندگانی ہے وہ اک حرفِ تمنا جیسے

یہی تخلیق کا شہکار رہے خالق کے لیے
روزِ اول سے کھٹکتا ہوا کانٹا جیسے

یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے
اور پھر بھی ہے ہر اک شخص اکیلا جیسے

کوئی تحریر کوئی نقش ابھی صاف نہیں
ساتھ چلتا ہے ابھی ایک دھندلکا جیسے

دور خوابوں کے چمکتے ہوئے میناروں پر
تیرہ بختوں نے ترے حسن کو دیکھا جیسے

ان دنوں گردشِ دوراں بھی ہے اس عالم میں
سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہو مسیحا جیسے

اپنے ماحول میں دیکھو تو ہر اک چہرہ ہے
وقت کی دھوپ میں جلتا ہوا صحرا جیسے

زندگی یاد بھی آتی ہے تو اب یوں جامیؔ
جاگ اٹھے کسی وحشی کی تمنا جیسے

نور محمد نور

حیات سر بہ گریباں تھی ظلمتِ شب سے
نظر کو نور ملا آگہی کے کوکب سے
وہ اہلِ شوق جو آگے نکل گئے سب سے
چلے تھے منزلِ جاناں کو راہ اقرب سے
نظر میں راستہ منزل کا آگیا جب سے
نگاہ پھر گئی دیر و حرم سے بس تب سے
خبر ہوئی کہ نہیں کچھ اُدھر نہیں معلوم
زمیں تو گونج اٹھی نعرہ ہائے یا رب سے
تو مستِ ناز ہے ساقی مگر خبر ہے تجھے
ہیں تشنہ لب تری محفل میں بادہ کش کب سے
وہ مے ترس گئے کتنے ہی جام جس کے لیے
چھلک رہی ہے کسی ساغرِ لبالب سے
جو اپنی پیاس بجھاتے ہی مطمئن ہو جائے
وہ مے گسار نہیں ہے ہمارے مشرب سے
غمِ حیات ہے سینہ میں اک متاعِ گراں
ہے زندہ دل اسی گوہر کی تاب و تب سے
بہت قریب ہے خورشیدِ روشن تو کا طلوع
ہراس ہم کو نہیں نورِ ظلمتِ شب سے

بشیر بدر

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے
اک ذہنِ پریشاں میں خوابِ غزلستاں ہے
پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے
ہم رنگِ دلِ پُرخوں، ہر لالۂ صحرائی
گیسو کی طرح مضطرب رات کی رانی ہے
غم وجہِ نگارِ دل، غم وجہِ قرارِ دل
آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے
اس حوصلۂ دل پر ہم نے بھی کفن پہنا
ہنس کر کوئی پوچھے گا کیا جان گنوانی ہے
جس سنگ پہ نظریں کیں خورشید حقیقت ہے
جس چاند سے منہ موڑا پتھر کی کہانی ہے
وہ مصرعۂ آوارہ دیوانوں پہ بھاری ہے
جس میں ترے گیسو کی بے ربط کہانی ہے
دن تلخ حقائق کے صحراؤں کا سورج ہے
شب گیسوئے افسانہ یادوں کی کہانی ہے
وہ حسن جسے ہم نے رسوا کیا دنیا میں
نادیدہ حقیقت ہے۔ ناگفتہ کہانی ہے
ہم خوشبوئے آوارہ، ہم نورِ پریشاں ہیں
اے بدر مقدر میں آشفتہ روانی ہے

جاوید کمال

ہم آگہی کو روتے ہیں اور آگہی ہمیں
وارفتگیٔ شوق کہاں لے چلی ہمیں

لیتی گئی تھی ہم سے صبا ذوقِ دلبری
دیتی گئی ہے لذتِ بے راہروی ہمیں

اُن کے غرور و غمزۂ و ناز و ادا کی خیر
راس آ چلی تھی رسم و رہِ عاشقی ہمیں

ہم ذرہ ذرہ ڈھونڈ چکے موجۂ سراب
قطرہ قطرہ ڈھونڈ چکی تشنگی ہمیں

آئی تھی چند گام اسی بے وفا کے ساتھ
پھر عمر بھر کو بھول گئی زندگی ہمیں

وحشت نے وہ بھی لوٹ لی دم بھر میں دوستو
بے دلیوں میں آئی تھی شائستگی ہمیں

فضیل جعفری

ہے عبارت جو غمِ دل سے وہ وحشت بھی نہ تھی
سچ ہے شاید کہ ہمیں اس سے محبت بھی نہ تھی

زندگی اور پُراسرار ہوئی جاتی ہے
عشق کا ساتھ نہ ہوتا تو شکایت بھی نہ تھی

تجھ سے چھٹ کر نہ کبھی پیار کسی سے کرتے
دل کے بہلانے کی لیکن کوئی صورت بھی نہ تھی

گھور اندھیروں میں خود اپنے کو صدا دے لیتے
راہ چلتے ہوئے لوگوں میں یہ جرأت بھی نہ تھی

ضد میں دنیا کی بہ ہر حال ملا کرتے تھے
ورنہ ہم دونوں میں ایسی کوئی الفت بھی نہ تھی

مرنے لوگ سپردِ گزرِ عشق فضیل
اپنے حصے میں یہ چھوٹی سی سعادت بھی نہ تھی

جوہر میر

سارے گھر والے مری حالت پہ جب رویا کیے
اک تم ہی پتھر بنے بیٹھے مجھے دیکھا کیے

ہم نے دیواروں میں چن رکھی ہیں دل کی حسرتیں
یوں بھی تسکینِ جنوں کے راستے پیدا کیے

آئینہ کس کو دکھائیں کون بینا ہے یہاں
مدتیں گزریں ہمیں زخموں کو آئینا کیے

لوگ کتنے مہرباں تھے کوئی ہم سے پوچھتا
چاک دامانی میں بھی جو تہمتیں باندھا کیے

آؤ اب ویرانۂ دل میں بسائیں بستیاں
شہر تو سارے کے سارے چھان کر صحرا کیے

ایک شعلہ بھی نہ خاشاکِ تمنا کا بجھا
ابر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے گو برسا کیے

نوچتے کس کس کے چہرے سے نقابِ مصلحت
شہر میں محشر بپا تھا اور وہ دیکھا کیے

کوئی دیوارِ شکستہ بھی گری ہم پر نہ میر
آندھیاں کتنی چلیں ہم نے جتن کیا کیا کیے

حسن یوسف زئی

اے غم ہجراں تیری کہانی اک اک راتوں رات گئی
تنہا تنہا دل دھڑکا اور محفل محفل بات گئی

جس دن سے تم دور ہوئے ہو موسم کا کیا حال کہوں
بن مہکے کلیاں مرجھائیں بن برسے برسات گئی

یہ دنیا اک رات کی محفل، محفل میں کچھ بات بھی کر
جھوٹی کہہ یا سچی سن لے رات گئی تو بات گئی

عشق کی فطرت راکھ کے ڈھیر میں ایک دبی سی چنگاری
حسن کی فطرت پھول کی خوشبو شہر گئی دیہات گئی

عہد خزاں بھی عہد خزاں تھا جس نے ہمارا ساتھ دیا
فصل بہاراں تھی کہ تمہارے ساتھ آئی اور ساتھ گئی

دور کی دعوت پیار کی نیوتی جس بہانا اب بھی
اس گھر کا کوئی پاس نہ آیا جس گھر تک ہم کے ہاتھ گئی

شدت غم کے بار میں بیٹھے دشمنوں کے رنج و ہوش صنم
بول اٹھے تو دل ٹوٹے اور چپ سادھیں تو بات گئی

خیرات ندیم

غم کے یہ تند و مضطرب لمحات
بڑھ گیا اور اعتبارِ حیات
حسن اور حسنِ التفات بجا
اب بھی ناسازگار ہیں حالات
یوں گزارا ہے ایک عالمِ شوق
ہر نظر میں ہزار سیفا است
دل میں اک مستقل خلش ہی سہی
زندگی کا یہی تو ہے اثبات
تیری آنکھوں کے خواب ہیں جن میں
آنے والے ہیں وہ نئے دن رات
برہمی سی ہے بزمِ انجم میں
شب پہ طاری ہے عالمِ سکرات
آج آنسو ہیں کل ہنسی ہوگی
زندگانی کے واسطے سوغات
جیسے اک صبح سی نکھر آئی
اُف تری یاد کے حسیں لمحات
یہ بھی کچھ وقت کی عنایت ہے
مل رہے ہیں لطیف احساسات
میرا اندازِ فکر آج ندیم
بن گیا ہے چراغِ راہِ حیات

امان ارشد

ہم کس لیے مایوس ہوں تاریکیٔ شب سے
ہر داغِ تمنا ہے سحر ساز ابھی تک

ہر نالۂ دل سوز ہے اس وہم گماں میں
شاید ہے کوئی گوش برآواز ابھی تک

بہلا نہ سکے دل کو کسی بزم میں جا کر
بھولی نہیں وہ انجمنِ ناز ابھی تک

انجامِ محبت کو نہ دیکھا کبھی ہم نے
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں آغاز ابھی تک

پُرکیف ابھی زمزمۂ زیست نہیں ہے
ہے تشنۂ مضراب کوئی ساز ابھی تک

کیا کم ہے کہ اس بے سروسامانی میں ارشد
ہے درد کی دولت پہ مجھے ناز ابھی تک

بانو طاہرہ سعید

مہلتِ حسن ہے کتنی گلِ تر سے پوچھو
زندگی رقص ہے کیا رقصِ شرر سے پوچھو

خارِ ہجراں کی کھٹک دردِ محبت کی کسک
کسی عاشق کسی شاعر کے جگر سے پوچھو

حسن میں ڈوبی ہے کس درجہ ستاروں بھری رات
چشمِ فنکار کی پروازِ نظر سے پوچھو

زیست کچھ کھیل نہیں کھیل نہیں کھیل نہیں
کس طرح رات کٹی شمعِ سحر سے پوچھو

خاک جھکی سی معطر ہے ہوا کے جھونکے
کون گزرا ہے مگر راہ گزر سے پوچھو

طاہرہ کیوں ہیں پسندیدہ تمھارے اشعار
اہلِ دل، اہلِ قلم، اہلِ نظر سے پوچھو

بیگم خورشید نذیر

بخشے نہ تجلی تجھے وہ دردِ جگر کیا
اے عالمِ مدہوش ترا ذوقِ نظر کیا

محرومِ شبِ غم جو ہوا اس کے لیے ہمدم
خورشید سحر کیا غمِ خورشیدِ سحر کیا

اے بادِ سحر گاہ چمن تجھکو ہوئی ہے
کلیوں کے دھڑکتے ہوئے سینوں کی خبر کیا

رنگینیٔ ارمان کے شعلوں سے نہ الجھا
ناواقفِ آدابِ نظر تیری نظر کیا

خورشیدِ سحر کی طرح ہے شعلہ بہ داماں
ہے اب بھی نذیرؔ آپ کی محتاجِ نظر کیا

ہوٹل ناز

آپ کی خدمت کے لیے تیار ہے

- کسی بھی وقت
- کسی بھی موسم میں
- کتنے بھی دن کے لیے

جب بھی آپ دہلی تشریف لائیں ہوٹل ناز میں قیام پذیر ہوں

ہوٹل ناز

جامع مسجد دہلی۔ فون (۲۲۲۵۲۵)



بوتل ہیں بند۔ توانائی اور صحت کا سرچشمہ

ماء اللحم خاص

(اصلی زعفرانی رنگ)

گوشت کے حیاتبخش اجزا، ہینینر سے بھرپور پھلوں کے رس

قیمتی جڑی بوٹیاں۔ مشک۔ عنبر اور زعفران کا بہترین مرکب

ماء اللحم خاص بے پناہ قوت اور توانائی۔ جوش و امنگ اور خون

پیدا کرتا ہے اس کا استعمال ہر عمر کے مرد اور عورت کیلئے بے حد مفید ہے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (یو پی)

ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جا رہی ہیں

وقار اعظمی

مرہم

"چاچی" اس نے پرانے شکستہ دروازے کو جو چوکھٹ کے سہارے کھڑا آخری سانس لے رہا تھا اپنی دو انگلیوں سے بجاتے ہوئے آواز دی۔ لیکن اس کی تھکی ہوئی آواز دروازے کی چرچراہٹ ہی میں ڈوب گئی تب اس نے اپنی مٹھی سے دروازے پر ضرب لگائی۔ رعب دعب کی آواز سے رات کا سکوت ٹوٹ گیا۔ اور اگر خود اس کے ہاتھ دروازے کو تھامنے کے لیے نہ بڑھتے تو شاید دروازہ اس کے اوپر گر جاتا۔ اور جب وہ کرخت آواز چاروں طرف پھیل گئی تو قریب کے کھیتوں اور پڑوس کی جھونپڑیوں سے آوارہ کتوں کے بھونکنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک مریل کتا اپنی نحیف آواز میں وقفہ وقفہ سے بھونک رہا تھا۔

"کون ہے بھائی؟" اس کی چاچی کی مضمحل آواز بڑی مشکل سے اس کے کانوں تک پہنچ سکی۔

"میں رحیم خاں ہوں چاچی، دروازہ کھولنا، کب سے باہر کھڑا ہوں" اس کے چہرے پر ناگوار اثرات پھیل گئے۔

"کھولتی ہوں کھولتی ہوں" آواز میں حیرت و مسرت دونوں کیفیتیں نمایاں تھیں۔

جیسے ہی دروازہ کھلا وہ چاچی کے قدموں پر جھک گیا۔

"ارے ارے ٹھیرنا" وہ قندیل کو ر کھتے ہوئے کہنے لگی "نہ خط، نہ چٹھی، ایسی ویسی کوئی بات تو نہیں ہے نا؟ . . . اچھا پہلے یہ بتا سلمیٰ کیسی ہے بہت دن ہو گئے بیٹا اسے دیکھے ہوئے" اس کا گلا رندھ گیا۔

"تو اندر چل" قندیل کو اٹھاتے ہوئے اس نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔

"سب بتا رہا ہوں چاچی۔ بھوسا بدنصیب شاید ہی کوئی ہو" بوسیدہ اور گرد آلود کوٹ کو اتار کر کھونٹی سے ٹانگتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا ہوا؟" اس کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں۔ قندیل کی روشنی اس کے چہرے کی ہلکی سی زردی کو نمایاں کر رہی تھی۔ وہ جواب طلب نگاہوں سے رحیم خاں کو تک رہی تھی "میں سمجھی نہیں۔ کچھ بھی نہ سمجھی کہ تو کیا بول رہا ہے۔ سلمیٰ تو اچھی ہے نا! اور۔ تو۔ تو اسے ساتھ کیوں نہ لایا" اس کی آواز میں انجانا خوف لرز رہا تھا۔

"دو قدم چلے تو لاؤں نا" رحیم خاں کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی "چاچی وہ تو بستر کا تکیہ ہو کر رہ گئی ہے، نہ اٹھتی

دیتی ہے۔ . . . میری سلمیٰ کو کیا ہو گیا ہے" اس کا گلا رندھ گیا ۔ "بس دن بھر تکیہ پر سر رکھے چھت کو گھورتی ہے اور کھانستی رہتی ہے . . . اور . . . اور اب تو دن اور رات میں ایک چھوٹا ڈبہ خون سے بھر جاتا ہے" اس کے کھردرے چہرے پر آنسوؤں کی دو لکیریں پھیل گئیں ۔ "اب تو ہی بتا" رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ پھر کہنے لگا "کیا کروں؟ ادھر ہاتھ تنگ ہے اور کہیں سے قرض بھی نہیں ملتا۔ دن بھر میں ایک بکرا مشکل سے ہی بکتا ہے ۔ اس گرانی میں دو چار روپے سے کیا ہوگا اور وہ ڈاکٹر ہے نا۔ خدا اس کا بھلا کرے بولتا ہے کہ پہاڑ پر لے جاؤ ۔ بچی کو دوا پلاؤ ۔ میوے کھلاؤ ۔ صحت جلد چاہتے ہو تو تازہ ہوا میں رکھو ۔ ارے چاچی اگر یہ سب ہوتا تو میں اس کے پاس کیوں جاتا۔ پہاڑ پر ہی نہ لے جاتا میری سلمیٰ کو ۔۔!" اس کی بھیگی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو نکل پڑے۔

"صبر کر رحیم خاں" چاچی کی غم آلود آواز نے فضا کے بوجھل پن کو ہلکا کیا۔ سفید ململ کی ساڑی کے پھٹے ہوئے کونے سے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہنے لگی "تجھ سے کیا بات چھپی ہے۔ جب سے تیرے چچا شیخ میں سو گئے ہیں بڑی مشکل سے گھر چلتا ہے۔ تولہ دو تولہ جو بھی تھا سب اس پیٹ کی آگ میں جل گیا بس یہ ایک گھر کا پرانا ٹھیکرا رہ گیا ہے ۔ اگر رہن کرتا ہے تو کر دے" اس کی آواز بھرا گئی۔

"نہ نہ چاچی" اس نے ہاتھ سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کیا کہہ رہی ہے اور کیا میں تجھ کو نہیں پہچانتا ۔۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں ۔۔؟ کہاں جاؤں ۔۔؟ کہیں سے کچھ بھی نہ ہو سکا تو تیرے ہی پاس چلا آیا اور اپنا ہی سمجھ کر آیا۔ پر چاچی میں بھی کتنا بے وقوف ہوں" اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے معلوم ہے رحیم خاں، پریشانی میں آدمی کو کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ اگر آدمی اس وقت سونا پکڑے تو مٹی ہو جائے اب تو بس اسی پروردگار کا سہارا ہے اور ہاں میں تو بھول ہی گئی؟ ابراہیم کیسا ہے ۔۔؟ اس پر تو مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایک ہی لڑکا اور اس طرح کی موت" وہ ایک لمحہ کو رک گئی اور اس کے دونوں تھرتھراتے ہوئے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے "خدا دشمن کو بھی ایسی موت نہ دے، غریب نہ کفن ہی پہن سکا اور نہ قبر میں ہی سو سکا"

"لاش ہی نہ مل سکی تو قبر کس طرح بنے گی چاچی ۔۔ نہ جانے کس نالی میں اٹک گئی حالاں کہ پورا دن ڈھونڈھتے رہے لیکن لاش نہ ملی" اس نے بیڑی جلاتے ہوئے کہا۔

"مگر بدنصیب وہاں گیا ہی کیوں تھا" چاچی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"اس کا بھی تو قصور نہیں تھا چاچی موت ہی اس کو وہاں لے گئی۔ آج کل برسات بہت زوروں پر ہے۔ اس دن خوب زور کی بارش ہو رہی تھی راستوں پر گھٹنوں گھٹنوں برابر پانی کھڑا تھا اور وہ بیچارہ بچہ اسکول سے گھر آتے ہوئے نہ جانے کس طرح کھلی موری میں چلا گیا بس وہی موری اس کے لیے قبر بن گئی" اس نے بیڑی کے جلتے سرے کو مسل کر پھینک دیا۔

"مگر موریوں پر ڈھکن ہوتے ہیں نا" اس کے لہجہ میں حیرت اور افسوس دونوں شامل تھے۔

"لیکن اس موری پر ڈھکن نہ تھا اور بھی کئی ایسی موریاں ہیں جو بغیر ڈھکن کے ہی چالو ہیں"

"تو یہ غلطی سرکار کی ہے" چاچی کی آواز میں غم و غصہ شامل تھا۔
"اسی لیے تو سرکار نے ابراہیم کو دو ہزار روپیہ دیا ہے"
"دو ہزار روپے ابراہیم کو ملے ہیں۔ اور تو ___ اور تو اس سے۔۔۔"
"میں سمجھا" اس نے چاچی کی بات کاٹتے ہوئے کہا" تو جو کچھ کہنا چاہتی ہے نا۔۔۔۔ میں سب سمجھ گیا ہوں، مگر چاچی یہ دنیا ہے ___ سمجھی یہ دنیا ہے۔ مجھ غریب فضا کا اس موٹے دار کے پاس کیا بھروسہ"
"مگر تو اس سے بولا ہوتا" اس نے دبے الفاظ میں مشورہ دیا
"اور تو۔۔۔ سمجھتی ہے کہ میں اس سے بولا نہیں ہوں" اس کی آواز میں ہلکی سی سختی تھی۔
"تو اس نے کیا کہا"
"سن کر کیا کرے گی" یاس انگیز انداز میں یہ کہہ کر اس نے جماہی لی اور اٹھتے ہوئے کہنے لگا" آدھی رات تو کٹ گئی ہے صبح جانا ہے۔ ذرا کمر سیدھی کر لوں گا"
"صبح ہی چلا جائے گا؟"
"ہاں چاچی پڑوس کی ایک بیوہ کو سلمی کے پاس چھوڑ آیا ہوں جانا ضروری ہے۔ معلوم نہیں رات کس طرح کٹی ہوگی؟ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"ادھر کوٹھری میں چل، سردار بھی وہیں سو رہا ہے اس کے بازو تیرا بستر ڈال دیتی ہوں"
"یہ فاروق کا بیٹا ہے نا"
"ہاں جب سے فاروق مرگیا ہے یہ بدنصیب لڑکا یہیں رہتا ہے۔ ماں تو پہلے ہی مر چکی تھی باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"کچھ کام بھی کرتا ہے یا نہیں؟"
"اس گاؤں میں کام کیا ملے گا رحیم میاں، سوچا تھا تیرے پاس ہی بھیج دوں گی مسلے میں کچھ کام بھی سیکھ لے گا اور چار پیسے بھی کما لے گا۔ پر وہاں تو۔۔۔" وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔
"دن اچھے ہوتے تو رکھ لیتا۔ لڑکا اپنا ہی تھا مگر کیا کریں دو پیٹ ہی مشکل سے بھرتے ہیں"
"ذرا سردار کو بازو کر دے"
"کون ہے خالہ" سردار نے آنکھیں ملتے ہوئے کروٹ بدلی۔
"اٹھ کر سلام کر رحیم چاچا آیا ہے" اس نے سردار پر سے کمبل کھینچتے ہوئے کہا۔
"سلام چاچا" اس کی ادھ کھلی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے وہ اٹھ کر کوٹھری سے باہر جانے لگا

"نیند میں تجھے کچھ سوجھتا بھی ہے آنگن میں گڑھا کھدا ہوا ہے دیکھ کے جا اگر گر گیا تو دو پیسے بھی کوئی نہ دے گا" اس کی آواز دور تک چلی گئی۔

"دو پیسے نہ دے گا تو نے ٹھیک ہی کہا چاچی ــ . . . . پر . . . . وہاں . . . . وہاں تو دو ہزار روپے مل جاتے ہیں" وہ زیر لب بڑبڑایا "دو ہزار روپے . . . . دو ہزار . . . میری سلمٰی . . . . میری سلمٰی اچھی ہو سکتی ہے" اور پھر وہ یک لخت خاموش ہو گیا اور خوف زدہ نظروں سے چاچی کو دیکھنے لگا جو بستر ڈالنے میں مصروف تھی۔

سردار آیا اور اس کے برابر سو گیا لیکن باوجود تھکن کے وہ باقی رات سو نہ سکا۔ اس کی نیند سے بوجھل پلکیں بند نہ ہو سکیں۔ وہ صرف سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ایسا کر سکے گا؟

مٹی کے فرش پر ادھ جلی بیڑیاں پھیلی ہوئی تھیں ان کا گل بجھ کر کوٹھری کے مختلف حصوں میں پھیلا ہوا تھا۔ کمرے کی فضا کثیف دھوئیں سے بھری ہوئی تھی وہ اٹھ بیٹھا اور آنگن میں چلا آیا۔ دو ہزار روپے اس کے سامنے پڑے ہوئے تھے جس پر سردار بیٹھا اونگھ رہا تھا . . . . . اس کی نظروں کے سامنے گڑھا تھا۔ کھلا ہوا گڑھا جس میں وہ سردار کو ڈھکیل سکتا تھا . . . . اور دور سلمٰی تکیے سے لپٹی ہوئی کھانس رہی تھی . . . . . اس کے ہاتھ بار بار مرجھائی ہوئی چھاتیوں کو دبا لیتے . . . . کھانسی کی شدت سے اس کا سینہ خشک ہو گیا تھا۔ زرد چہرے پر موت کا سایہ گہرا ہو رہا تھا اس کی اپنی اکلوتی بیٹی . . . . زندگی بھر کی کمائی . . . بھرپور جوانی . . . . جو خون کی شکل میں موت کے ڈبے میں جمع ہو رہی تھی اور اب تو اس کو موقع مل گیا ہے . . . اپنی سلمٰی کو وہ بچا سکتا ہے . . . . ایک بار پھر وہ مردہ جسم میں زندگی بھر سکتا ہے۔ سلمٰی جو اس کی بیٹی تھی . . . جو اس کی چہیتی بیوی کی ایک ہی نشانی تھی . . . مگر؟ یہ سوال اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے۔

"نیند نہیں آ رہی ہے رحیم خاں؟" چاچی بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں چاچی سلمٰی . . کا خیال کھائے جا رہا ہے"

"تو سچ بولتا ہے۔ اولاد تو ماں باوا کے جسم کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ تجھے نیند بھلا کیوں کر آئے گی؟ پر کچھ دیر تو لیٹ جا نا"

"اچھا آتا ہوں"

ایک بار پھر سردار سے جب اس کی نظر ٹکرائی تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ دو ہزار روپے ہو . . . . . اور یہ مگر تو چاچی کا ہے وہ خود مدد کرنا چاہتی ہے اسے کون روک سکتا ہے؟ اور سلمٰی اگر مر جائے تو . . . نہیں . . . نہیں اتنا بڑا غم وہ کیسے برداشت کر سکے گا . . . اور وہ مرنے کے قریب ہے . . . . میں اسے مرنے نہیں دوں گا . . . . اپنی زندگی قربان کر دوں گا . . . مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ اسے تو سردار کی زندگی چاہیئے . . . . ورنہ وہ مر جائے گی . . . . اور اب اس مردہ جسم میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں اس کے لیے سب کر سکتا ہوں سلمٰی کے لیے سب کچھ کروں گا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر اس نے سوچا دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا اور اسے وہ واقعہ یاد آیا جب کہ چند ہی دن پہلے کسی نے ایک تو لہ تو

کے لیے ایک نوجوان عورت کا گلا کاٹ دیا تھا ــــ اور سردار تو بچہ ہے اور پھر اس کے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وہ بیکار بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیکار تو بوجھ ہوتے ہیں بوجھ۔ ۔ ۔ میں بوجھ کو مار دوں گا۔

"چاچی" وہ کوٹھری سے چلایا ــــ اس کی سانس پھول رہی تھی ــــ ہونٹ خشک ہو گئے تھے ــ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ پیشانی پر پسینہ کی بوندیں جمع تھیں۔

"کیا ہے؟ کیا جانے کا وقت ہو گیا؟" اس نے چادر منہ پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اگر تو ذرا اٹھ نا" اس کی آواز میں ہلکا سا خوف تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس کی چاچی حیران تھی۔

"ارے تو کیوں پریشان ہے ــــ بات تو کچھ بھی نہیں ہے ــ بس ــ یونہی" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "مگر تو مجھے اس طرح کیوں گھور رہی ہے"

"میں کہاں گھور رہی ہوں" اس کی آواز میں تعجب تھا۔

"اچھا اچھا میں ہی گھور رہا تھا تجھے چاچی ــ مجھ کو ہو کیا گیا ہے؟ وہ پریشان تھا۔

"کچھ بھی تو نہیں" وہ اس کے قریب آ گئی "تو پریشان ہے نا! ذرا ٹھیر تجھے ایک گلاس پانی دیتی ہوں" وہ گھڑے کے پاس چلی گئی۔

اور اس نے سوچا ــ اگر یہی حال ہو تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ وہ تو ایک قصاب ہے جسے لوگ بے رحم کہتے ہیں ــ مگر چاچی سے وہ تھوڑی سی بات بھی نہ کر سکا۔ پانی کا ایک گلاس سوکھے ہوئے حلق سے اتار کر اس نے چاچی سے کہا۔

"چاچی! تجھے تو معلوم ہے نا۔ سوائے میرے سلی کی دیکھ بھال کون کر سکتا ہے اور میں تو دکان پر بیٹھتا ہوں اگر تو۔ ۔ ۔ ۔ تو"

"اگر تو بولتا ہے تو میں تیرے پاس آ جاتی ہوں"

"تو۔ ۔ ۔ ۔ تو کیا کرے گی؟ اگر سردار کو بھیج دے تو وہ کام سیکھتا بھی رہے گا اور کچھ میرا کام بھی ہلکا ہوتا جائےگا"

"میں کب منع کرتی ہوں۔ تجھ سے تو پہلے ہی بولی تھی" تب اس نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔

"مگر بیٹا! کچھ بھی کیوں نہ ہو سردار پرایا ہے۔ اس کی حفاظت اور دیکھ بھال تیرے ہی ذمہ ہے جب سے ابراہیم کے لڑکے کا حال سنی ہوں سردار کو تیرے پاس بھیجنے کا خیال جلا دیا تھا پر تیری بات اور ہے اور ہاں کبھی بھی اس کو اکیلا نہ چھوڑنا، اور اس کو جتلا دے کہ وہ موریوں سے دور ہٹ کر چلے"

"اری چاچی کیا تو مجھے دشمن سمجھتی ہے" اس کی آواز مضمحل تھی "تو فکر مت کر جا اور سردار کو میرے ساتھ کر دے۔ دیکھ کوے بھی کائیں کائیں کر رہے ہیں" اس نے بات کا رخ بدل دیا اور آخری بیڑی کو سلگا کر کوٹھے پہ پھینکتے ہوئے کہنے لگا "میں باہر ٹھیرتا ہوں۔

. . . .

سردار کو لے کر جب وہ واپس شہر آیا تو اس کی ایک فکر تو ختم ہو چکی تھی لیکن اب وہ سوچ اور تفکرات کے جال میں اس طرح بیتاب تھا جیسے بے بس مچھلی جالے میں تڑپتی ہو اور اسے باہر نکلنے کے لیے کوئی سوراخ نظر نہ آتا ہو۔

سب سے پہلے اس نے سردار کو قریب کے مدرسے کے پہلے درجے میں شریک کروا دیا۔ حالانکہ اسکول ہیڈ ماسٹر نے اسے بڑی عمر ہونے کے سبب داخلہ دینے سے انکار کر دیا تھا تب وہ اس کے قدموں پر جھکتے ہوئے کہنے لگا تھا کہ اگر اب بھی اسے داخلہ نہ ملے تو اس کی عمر اور بڑھ جائے گی۔ میں مائی باپ کا زندگی بھر احسان نہ بھولوں گا۔"

تین چار دن تک وہ روزانہ برابر اسے اسکول لاتا اور لے جاتا رہا۔ راستے میں اسے وہ گڑھا دوبارہ نظر آتا تھا۔ جہاں ابراہیم کا لڑکا گر گیا تھا۔ اب گڑھے کے منہ پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا گیا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس کی ہمت اکثر جواب دے دیتی تھی کہ شاید وہ اسے اٹھا نہ سکے گا۔

پھر ایک رات شدید بارش شروع ہو گئی ۔ تمام رات موسلادھار پانی برستا رہا۔ جب سلمٰی کے کمرے میں وہ آیا تو سلمٰی تکیے کے سہارے بیٹھی تھی کہنے لگی۔

"بابا، یہ منحوس بارش کب ختم ہو گی؟"

"کیا کہا؟" اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہوئے۔" بالکل پاگل ہے بالکل دیوانی ہے" اور جب اس نے دیکھا کہ سلمٰی کچھ سہم گئی ہے تو وہ اس کے قریب آیا۔

" بٹیا تجھے کیا معلوم کہ اگر بارش نہ ہو تو پینے کے لیے پانی کہاں سے ملے؟ کھیتوں میں اناج کہاں سے آئے؟ بیماریاں کیسے ختم ہوں؟ تو تو بالکل دیوانی ہے پر تجھے معلوم بھی کیا؟ تو سو جا۔ ڈاکٹر نے تجھے آرام لینے کے لیے کہا ہے اور تو ہے کہ جاگ رہی ہے۔" وہ سلمٰی کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا جہاں سردار کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ وہ دیر تک اس کو دیکھتا رہا اور جیسے ہی اس نے لیٹنا چاہا سلمٰی کے کمرے سے کھانسی کا مکروہ شور اٹھا . . . وہ کھانستی رہی اور جب وہ اس کے کمرے میں آیا تو سلمٰی کا زرد چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا وہ نڈھال ہو کر ایک طرف کو پڑی تھی۔ روکھے بال ہوا سے اڑ رہے تھے اور خون کی قے اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ کھلی اداس اور بے بس آنکھیں رحیم خاں کو دیکھ رہی تھیں . . . اور رحیم خاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے سلمٰی کو دوسری طرف لٹایا اور موسلادھار بارش میں مکان سے نکل گیا۔ نیم تاریک سڑک ایک نہر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ نیچے پانی اوپر پانی چاروں طرف پانی ہی پانی تھا، اور وہ تیز تیز بڑھتا ہی جا رہا تھا . . . راستے میں کئی بار اس کے قدم لڑکھڑائے کئی بار وہ ٹھوکریں کھایا لیکن آگے بڑھتا ہی رہا، اور جب موری کے قریب آیا تو اس نے جھپٹ کر بڑے پتھر کو پرے دھکیل دیا۔ ایک زبردست شور کے ساتھ پانی حلقہ کی صورت میں چکر کھاتا ہوا موری میں گرنے لگا . . . . نڈھال اور تھکے ہوئے قدموں سے جب وہ گھر واپس آیا تو بارش اور بڑھ چکی تھی۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور جب

اس نے قمیص کو اتارنے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی تین انگلیاں تھک کر نیچے کچل گئی ہیں جن کے ناخن گوشت سے علیحدہ ہو کر لٹک رہے تھے..... اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"بابا!" سلمیٰ کی کمزور آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔

"ابھی آیا" وہ جلد جلد کپڑے بدل کر کمرے میں آ گیا "تیری طبیعت تو اچھی ہے نا؟"

"تم کہاں گئے تھے؟" سلمیٰ نے اثبات میں سر ہلایا اور اشارہ سے پوچھا کہ کیا وقت ہے۔

ابھی ابھی گرجا کے گھنٹے نے پانچ بجائے ہیں میں اب سلخ جا رہا ہوں تو رات کی ڈبل روٹی کھا کر دوا پی لینا۔ اور ہاں میں سردار کو جاتے ہوئے اسکول چھوڑ دیتا ہوں بنا نیا ہے نا، ایسا نہ ہو کہ کسی موری میں گر جائے۔"

"مگر بابا، اتنی صبح وہ اسکول جا کر کیا کرے گا؟" اس نے کمزور آواز میں بمشکل کہا۔

"تو نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ تجھے کچھ نہیں معلوم تھوڑی دیر میں چھ بجتے ہیں کارخانے کے لوگ تو اپنے اپنے گھروں سے نکل گئے ہوں گے۔" اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں تھے۔

"اور بابا یہ..... یہ تمھاری انگلیوں کو کیا ہو گیا؟" وہ اٹھ بیٹھی — بابا..... یہ خون..... یہ تم نے دیکھا نہیں — یہ کیسے ہو گیا؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"ہتوڑا انگلیوں پر گر گیا اور یہ بالکل معمولی زخم ہے۔ تو فکر کیوں کرتی ہے؟" اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"اچھا بابا تم مرہم لگا لو۔ دیکھو وہاں رکھا ہے۔ اس نے اشارے سے بتایا۔

"مجھے سب معلوم ہے تو بس پڑی رہ۔" وہ کمرے سے نکل گیا۔ اور سردار کو اٹھانے لگا۔ "چل اٹھ" اس کی آواز میں تحکمانہ اثر تھا۔ "کب تک پڑا سوتا رہے گا۔ اٹھ مسلخ جاتے ہوئے تجھ کو اسکول چھوڑ دوں گا۔" اس نے کمبل کھینچ کر سردار کو کھڑا کر دیا۔

لیکن چاچا، اتنی صبح۔" آنکھیں ملتے ہوئے سردار کہہ رہا تھا۔ "رستہ بھی تو نہیں دکھتا، اور کتنا زور کی بارش ہے۔" وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ رحیم خاں کی بھوئیں تن گئیں، پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں اور جبڑے سخت ہو گئے۔ اس نے ایک گھونسہ سردار کی کمر میں جڑتے ہوئے کہا۔ "حرامزادے چلتا ہے کہ نہیں۔ اٹھ بڑی بڑی باتیں بنا رہا ہے۔ اسکول کا چور ہو گیا ہے تو چل آج ہی تیرے ماسٹر سے کہتا ہوں۔" اس کے دانت بج رہے تھے۔ سردار نے روتے ہوئے کر کرٹ لی تھی مگر جب اس نے رحیم خاں کی طرف دیکھا تو ایک دم اٹھ گیا اور طاق سے کتابیں نکال کر باہر چلا گیا۔

"یہ تھیلا اوڑھ لے۔" اس نے ایک بوسیدہ تھیلا سردار کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "دیکھ دن نکل گیا۔ ساری دنیا اٹھ کر کام پر جا رہی ہے اور تو ہے کہ منحوس سوتا پڑا ہے۔ اب تو بارش بھی کم ہو گئی ہے اور تجھے ڈر کس بات کا ہے" اس نے سردار کا ہاتھ پکڑا اور باہر آ گیا۔

سورج کی کرنیں بادلوں کی تہوں کو چیر کر دلدلی زمین پر پھیل گئی تھیں۔ سڑک پر اکا دکا لوگ ہاتھوں میں

ٹھن دبائے اپنے آپ کو سمیٹے تیز تیز جا رہے تھے۔ اور وہ سردار کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب وہ گر جائے گا اس کے پاؤں وزنی ہو گئے اور شکل سے اٹھ رہے تھے۔

"تیز مت چل سردار" وہ اب تک اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

"چاچا جلدی چلو دیکھو نا بارش تیز ہو رہی ہے۔ میری کتابیں بھیگ رہی ہیں" اس نے تھیلے سے اپنے چہرے کو نکالتے ہوئے کہا۔ "چاچا بازو سے چلو ــ یہاں تو موریاں ہیں"

"تو نے پھر ٹرّانا شروع کر دیا" اس کے چہرے پر کرختگی کے آثار پھیل گئے۔ وہ بڑی مضبوطی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سارے بدن میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں ـــــ دل اس کا بُری طرح دھڑک رہا تھا کہ بس اب باہر ہی نکل آئے گا۔ اتنی بارش میں اس کی زبان اور ہونٹ دونوں سوکھ گئے تھے اور وہ ایک عجیب قسم کی بےچینی محسوس کر رہا تھا اور جیسے ہی دوسرے اس کی نظریں کھلی موری پر پڑیں جہاں پانی بھنور کی شکل میں گر رہا تھا تو اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے تمام شہر چکر کھا رہا ہو۔

"کیا ہوا چاچا" سردار نے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں ـــ کچھ تو نہیں ــ تو چل نا" اس کا انداز شرابیوں جیسا تھا۔

"آگے مت جاؤ چاچا، دیکھو میرے گھٹنے تک پانی کے اندر ہیں"

"نہیں۔۔۔ آگے۔۔۔۔ آگے بڑھ وہاں تک" اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے موری کی طرف اشارہ کیا۔

"میری کتابیں بھیگ گئی ہیں دیکھو چاچا، بارش بھی بڑھ گئی ہے۔ ارے۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔ اب تو میری کمر بھی پانی کے اندر چلی گئی۔۔۔۔ چاچا۔۔۔ چاچا۔۔۔۔۔۔ ذرا ٹھیرو" اس نے رحیم خاں کا ہاتھ پکڑ لیا اور پانی کے اندر گر گیا۔

"کیا ہے رے سوّر کے بچ، بچ۔۔۔۔ بچے" وہ ہکلانے لگا۔ اور سردار سہم گیا۔

"کیا ہے؟" اس نے سردار کا ایک ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "موت سے پہلے مر رہا ہے کیا؟"

"نہیں۔۔۔۔ چاچا۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔ مجھے" اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ درد کے احساس نے اس کے چہرے پر معصومیت کے پورے آثار نمایاں کر دیئے۔ آنکھوں کو بھیگی ہوئی ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

"چاچا، مجھے ٹھوکر لگی ہے۔ چاچا بڑی تکلیف ہو رہی ہے"

"کہاں؟ پیر اٹھا نا" اس کے چہرے پر اب بھی سختی باقی تھی۔

"یہاں" اس نے بیٹھتے ہوئے رحیم خاں پر اپنا بوجھ ڈال کر سیدھا پیر اٹھایا۔ "دیکھو نا انگوٹھے کا

ناخن ہے" اور وہ رونے لگا۔ اور رحیم خاں نے اپنی زخمی انگلیوں کو بچا کر ہتھیلی پر اس کا پیر رکھ لیا۔ تازہ خون کی باریک دھار بہہ رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہتھیلی خون سے بھر گئی ۔ ۔

"ارے تجھے تو سخت چوٹ آئی ہے، اور ناخن بھی نکل گیا ہے" اس کی آواز کی کرختگی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس کی نظروں میں خون تھوکتی سلمیٰ کا چہرہ گھوم گیا، اور اس کی آواز اچانک نرمی اور ہمدردی سے لبریز ہو گئی۔

"نہ رو ۔ ۔ ۔ نہ رو ۔ ۔ ۔ سردار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے بیٹے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھر واپس چل میں تجھے مرہم لگا دوں"

اس نے سردار کو گود میں اٹھا لیا، اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

تبصرے

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں)

قطب شاہی سکّے

محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد کی مطبوعات عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔ اس سررشتہ کی سالانہ رپورٹوں کا بھی یہی عالم تھا۔ ان میں ہر قسم کا اثری مواد موجود ہوتا تھا۔ چنانچہ ترقی یافتہ ملکوں میں علم و فن کے شائقین ان کی اشاعت کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ ان رپورٹوں میں دکن کے قدیم سکّے بھی شائع ہوا کرتے تھے مگر کچھ عرصے سے رپورٹیں نہیں چھپیں اور یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا۔

حیدرآباد میوزیم میں قدیم سکوں کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ سررشتہ نے ان کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے، کچھ عرصہ ہوا پنچ مارک اور ستواہانا سکوں کی کیٹلاگ چھپی تھیں اور اب قطب شاہی سکوں کی کیٹلاگ "QUTUB SHAHI COINS IN THE ANDHRA PRADESH GOVT MUSEUM" شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب محمد عبدالولی خاں کی مرتبہ ہے اور اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

کتاب کے شروع میں مولف کا ایک مختصر دیباچہ ہے اس کے بعد شری این رمیش ایم اے، ای اے ایس ناظم آثار قدیمہ کا پیش لفظ ہے جس میں موصوف نے بتایا ہے کہ حیدرآباد میوزیم میں ... ۶۵ سکّے موجود ہیں۔ شری عبدالولی خاں حافظ سکہ جات نے بڑی محنت اور کاوش سے ان کا اصولی مطالعہ کیا اور تمام سکّوں کی تفصیلی فہرست مرتب کی۔ ان کو دکن کے قدیم خصوصاً سلامی سکّوں کی تعبیر میں بڑی مہارت ہے اور یہ کیٹلاگ ان کی آٹھ سال کی تحقیق اور دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے۔

ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں میں قطب شاہی تاجدار بہت مقبول ہوے ہیں، چنانچہ آندھرا پردیش میں آج تک ان کے گن گائے جاتے ہیں۔ اس خاندان کے بانی سلطان قلی کے مزاج میں مروت اور رواداری اس درجہ تھی کہ اس نے بہمنی سلاطین کی دل آزاری کی وجہ سے اپنے نام کا سکہ جاری نہیں کیا۔

محمود شاہ بہمنی کے کچھ سکّے ایسے ملے ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہمنی دارالضرب سے جاری نہیں ہوے بلکہ خود سلطان قلی نے اپنے دور میں اپنے پایہ تخت گولکنڈہ کے دارالضرب سے جاری کیے تھے۔ حیدرآباد میوزیم میں

جو سکوں کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے، اس میں سلطان قلی کے نام کا ایک سکہ بھی نہیں اس سلطان نے چالیس سال حکومت کی مگر سکہ اور خطبہ سے اپنے نام کو الگ رکھا۔ کسر نفسی کی ایسی مثال ملنی بہت مشکل ہے۔

جمشید قلی قطب شاہ اس خاندان کا پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اس کے عہد میں چار نایاب سکے دریافت کیے گئے جو پہلی بار اس کیٹلاگ میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ سکے محمد نگر گولکنڈہ دار الضرب سے جاری ہوئے ان پر بادشاہ کے نام کے شروع میں "سلطان"، اور آخر میں "شاہ" نقش ہیں۔

سبحان قلی کے حالات اس قدر تاریکی میں ہیں کہ اس کی شخصیت قطب شاہیوں کی تاریخ میں ایک معما بن گئی ہے۔ سررشتہ کی بڑی کامیابی ہے کہ اس نے اس نابالغ بادشاہ کا سکہ بھی شائع کر دیا۔

ابراہیم قلی قطب شاہ نے ۳۱ سال حکومت کی مگر اس فرمانروا کے سکے حیدرآباد میوزیم میں نہیں ہیں۔ اب تک اس کے چھ سکے دریافت ہوئے ہیں ان میں سے ایک سکہ ہرمز کاؤس جی نے شائع کیا ہے جس کے ایک رخ پر "فلوس جائز ابراہیم قلی" اور دوسرے پر "سعادت مند علی" نقش ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے سکے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم کے سکے جو گولکنڈہ دار الضرب سے جاری ہوئے شکل میں چوکور اور گول ہیں، ان پر ایک دلچسپ شعر بھی ہے۔

پیوستہ بہ لعنت الٰہی   تعبیر دہ فلوس شاہی

اس شعر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ لوگ شاہی سکوں کو گلادیا کرتے تھے۔

دوسری قسم کے سکے نئے شہر حیدرآباد کی دار الضرب سے جاری ہوئے۔ ان پر ایک طرف "ابوالمظفر محمد قلی قطب شاہ" اور دوسری طرف "ضرب دار السلطنت حیدرآباد" نقش ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے سات سکے جو نایاب تھے پہلی بار شائع ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس سے پہلے بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کے سکوں میں نئے دار السلطنت کا نام صرف حیدرآباد ہے اور محمد قطب شاہ کے سکوں پر "شہر حیدرآباد" نقش ہے۔ یہ بادشاہ مکہ مسجد کا بانی تھا، اس وقت حیدرآباد نے شاید شہر کی صورت اختیار کرلی تھی۔

عجائب خانہ میں سکوں کا جو ذخیرہ ہے اس میں زیادہ تر سکے عبداللہ قطب شاہ کے ہیں۔ یہ بھی دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم کے سکوں کی عبارت مغل شہنشاہوں کے سکوں سے ملتی جلتی ہے جن پر "سلطان عبداللہ بادشاہ غازی" لکھا ہوا ہے یعنی اور لقب قطب شاہ درج نہیں ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سکے اورنگ زیب کے حملہ کے بعد جاری ہوئے ہیں۔

دوسری قسم کے سکوں پر سلطان کا نام نہیں ہے بلکہ ایک دلچسپ عبارت "ختم بالخیر والسعادت" موجود ہے۔ یہ سکے ۱۰۶۸ھ کے ہیں اور یہی سن اورنگ زیب کی تخت نشینی کا ہے۔ اس کی تخت نشینی قطب شاہوں کے زوال کی ابتدا تھی۔ چنانچہ اس وقت سے قطب شاہی خاندان کا نام سکوں سے غائب ہوگیا۔

حیدرآباد میوزیم میں جو اتنا بڑا سکوں کا ذخیرہ موجود ہے اس میں سونے چاندی کا کوئی سکہ نہیں ہے سب تانبے کے ہیں

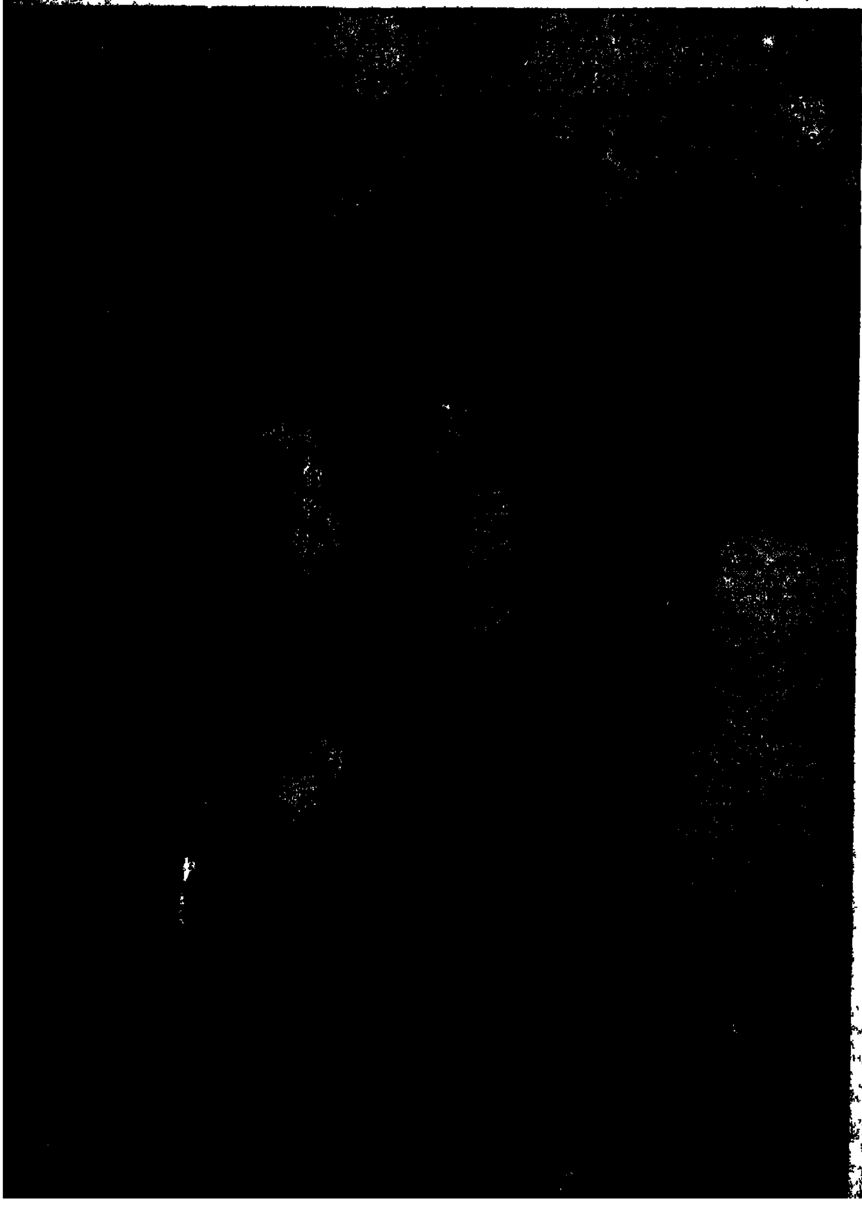
قطب شاہی حکومت اپنی دولت اور ثروت کے لیے مشہور تھی گولکنڈہ اس زمانہ میں ہیروں کا شہر کہلاتا تھا۔ ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں کے تاجر یہاں آتے تھے ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تجارت گاہ کا کاروبار محض تانبے کے سکوں سے نہیں چل سکتا تھا یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس زمانہ میں زر مبادلہ کی کیا سبیل تھی؟

قطب شاہی سلطنت میں ہُن بہت چلتا تھا چنانچہ عبداللہ قطب شاہ دو لاکھ ہُن شاہجہاں کو خراج کے طور پر بھیجا کرتا تھا۔ یہ سونے کا سکہ وجیانگر کے راجاؤں کا تھا۔ بہمنی سلاطین کے سونے چاندی کے سکے بھی جاری تھے۔ شاہجہاں کے آخری دور میں مغلوں کے سکے بھی رواج پا گئے تھے۔ پرتگیزوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں نے بھی گولکنڈہ منی کے نام سے گولکنڈہ پگوڈہ جاری کیے تھے۔ غرض یہ مسئلہ مسکوکات کے ماہرین کی توجہ کا محتاج ہے کہ بیرونی ممالک سے لین دین کے لیے کون سے سکے رائج تھے۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں زیادہ تر کاروبار اجناس کے مبادلہ کے ذریعہ ہوتا تھا۔ دکن اپنی صنعت کے لیے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ یہاں کے کپڑے یورپ میں بڑی قیمت پاتے تھے۔ چنانچہ یہاں کے کپڑے، منکے، جواہرات وغیرہ غیرملکی سوداگر بڑے شوق سے لے جاتے تھے۔

سررشتۂ آثار قدیمہ حیدرآباد کی کتابیں بڑے اہتمام سے چھپا کرتی تھیں۔ یہ اپنی نفاست اور پاکیزگی کے لیے مشہور تھیں یہاں تک کہ بعض کتابیں یورپ اور امریکہ کی نمائشوں میں عجائبات کے طور پر رکھی جاتی تھیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کیٹلاگ اچھی نہیں چھپی کاغذ معمولی ہے، ٹائپ کی غلطیاں بھی ہیں۔ چھپائی معمولی ہے۔ یہ سررشتہ ایک عالمگیر برادری رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام علمی ادارے ایک دوسرے کو اپنی مطبوعات مبادلہ کے طور پر بھیجتے ہیں۔ ہماری یہ کتاب یورپ اور امریکہ کی کتابوں کے پاس بیٹھے ہوئے شرمائے گی۔ مگر اس سے کتاب کی افادیت میں فرق نہیں آتا۔ بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے جس سے اس دور کے بہت سے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ جو حضرات آئندہ دکن کے عہد متوسط کی تاریخ لکھیں گے ان کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(غلام ربانی)

R. N 3461/57 SABA-MONTHLY Regd. No. A. 215



منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

زر سالانہ ہند و پاک سے ۱۰ روپے

ششماہی ۶ روپے

بیرون ہند سے ۲۰ شلنگ

(قومی یکجہتی نمبر)

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر :- سلیمان اریب

فون :- (۲۲۴۰۲)

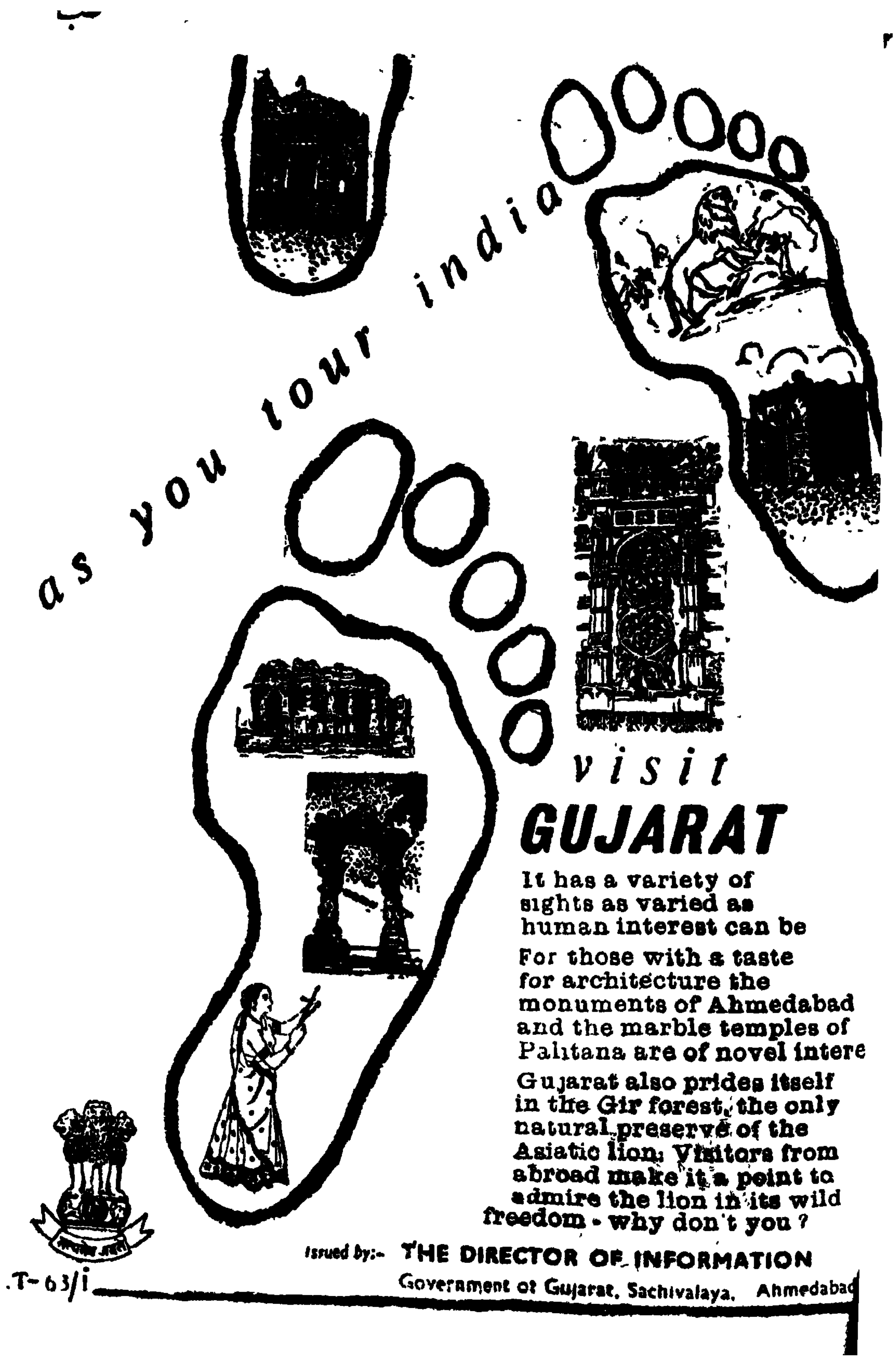
جلد	۹
شمارہ	۷، ۸
ماہ	جولائی، اگست
سنہ	۱۹۶۳ء
قیمت	ایک روپیہ

دہلی آفس :- ۱۵۰۷، ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۷۰۲) کراچی ۲

پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب ● ۷، اجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن ● مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان


as you tour india
visit
GUJARAT
It has a variety of sights as varied as human interest can be
For those with a taste for architecture the monuments of Ahmedabad and the marble temples of Palitana are of novel intere
Gujarat also prides itself in the Gir forest, the only natural preserve of the Asiatic lion. Visitors from abroad make it a point to admire the lion in its wild freedom - why don't you ?
Issued by:- THE DIRECTOR OF INFORMATION
Government of Gujarat, Sachivalaya, Ahmedabad
T-63/i

اس شمارے میں

سرورق:- تماشائے اہل کرم

عمل:- وی، مدھوسدن راؤ

پہلی بات

"صبا" کا قومی یکجہتی نمبر حاضر ہے۔ اس نمبر کی ادبی یا سیاسی اہمیت پر میں خواہ مخواہ کچھ لکھنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔ میں اداریہ میں جن باتوں کو مجملاً بیان کروں گا وہ باتیں بڑی تفصیل کے ساتھ اس نمبر کے مندرجات میں آگئی ہیں۔

یہ نمبر دراصل موتی لال نہرو نیشنل یونٹی سنٹر کے ڈائرکٹر جناب فضل الرحمٰن صاحب کی تجویز، اشتراک اور تعاون سے نکالا گیا ہے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر نیشنل یونٹی سنٹر کے اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرے گا جس کے تحت فضل الرحمٰن صاحب نے یہ تجویز رکھی تھی۔

میں ان تمام قلمی معاونین کا شکرگزار ہوں جنھوں نے میری فرمائش اور درخواست پر اس نمبر کے لیے بطور خاص مضامین لکھے اور ان کرم فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مضامین لکھنے کا حتمی وعدہ کیا، تاخیر کرائی اور بالآخر مایوس کیا۔

پیامات

"صبا" کے "قومی یکجہتی" نمبر کی کامیابی کا متمنی۔

آپ کا مخلص

ذاکر حسین

(ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند)

"صبا" کے خاص نمبر کے لیے جو ۱۵ اگست کو آپ نکال رہے ہیں میری نیک تمنائیں قبول کیجئے۔

آپ کی مخلص

پدمجا نائیڈو

(کماری پدمجا نائیڈو۔ گورنر مغربی بنگال)

میں یہ جان کر خوش ہوا کہ آپ "قومی یکجہتی" کے موضوع پر "صبا" کا خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے آپ کے خاص نمبر کے لیے فی الحال کوئی مضمون نہ لکھ سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

آپ کا مخلص

سمپورنانند

(ڈاکٹر سمپورنانند۔ گورنر راجستھان)

فضل الرحمن
(ڈائریکٹر موتی لال نہرو یونٹی سنٹر)

موتی لال نہرو نیشنل یونٹی سنٹر

(شاخ حیدرآباد)

تقریباً نو ماہ قبل موتی لال نہرو نیشنل یونٹی سنٹر کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس موقع پر شری سنجیوا ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش نے اپنی افتتاحی تقریر میں قومی اتحاد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس سنٹر کے مقاصد اور سرگرمیوں کو کھلے دل سے سراہا۔ نیز کمیٹی کے صدر شری پی وی جی راجو وزیر تعلیم ریاست آندھرا پردیش، ڈاکٹر جی ایس ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، بیرسٹر اکبر علی خاں رکن پارلیمان اور شری ایل این گپتا ریاستی معتمد تعلیم نے بھی بحیثیت اراکین عاملہ قومی اتحاد کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس پروگرام کی وضاحت کی جس میں نے بحیثیت ڈائرکٹر اپنی استقبالیہ تقریر میں پیش کیا تھا۔

پچھلے چند مہینوں میں ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ مختلف ذرائع سے قومی یک جہتی کا ملک میں پرچار کیا جائے، اور چونکہ ملک کا نوجوان طبقہ اس تحریک کے تعلق سے سب سے زیادہ اہم ہے اس لیے ہم نے اپنی توجہ سر دست طلبا کی طرف مرکوز کی ہے۔ چنانچہ اب تک حیدرآباد کے اٹھارہ کالجوں میں یونٹی فورم (UNITY FORUM) قائم کیے گئے ہیں اور آئندہ مزید فورم کھولے جائیں گے جن کے ذریعہ طلبا میں طبقاتی، لسانی اور فرقہ وارانہ یک جہتی کے جذبات کو ابھارنے میں بے حد مدد ملے گی۔

مختلف کالجوں کی انتظامی کمیٹیوں کے ارکان سے مفید تبادلۂ خیال کے علاوہ کالجوں کے طلبا کو "قومی یک جہتی" کے تعلق سے مخاطب کیا جاتا ہے اور اس امر کی کوشش کی جارہی ہے کہ کالجوں کو اس عنوان پر ہمارا تیار کردہ لٹریچر مہیا کیا جائے۔ چنانچہ پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب کی تصنیف کردہ انگریزی کتاب "CULTURAL UNDERSTANDING IN MEDIEVAL INDIA" جس کا پہلا ایڈیشن فاضل مصنف نے یونٹی سنٹر کو تحفتہً دے دیا تھا طلبا، اساتذہ اور اہل علم حضرات میں تقسیم کیا گیا اور اب یونٹی سنٹر کی طرف سے دو انگریزی کتابچے شائع کیے جارہے ہیں جو عنقریب ہدیۂ ناظرین کیے جائیں گے۔

علاوہ ازیں ہندوستانی قومیت کے بعض عظیم معماروں کے سوانح کے انتخابات اور آزادی وطنیت اور قومی اتحاد

سے متعلق منتخب افسانے تلگو اردو اور ہندی میں شائع کیے جا رہے ہیں جن کا مقصد طلبا میں حب وطن کے احساس کو قوی تر بنانا ہے۔

قومی یک جہتی پر تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لیے اس یونٹی سنٹر نے عثمانیہ یونیورسٹی کو ایک فیلوشپ کا پیش کش کیا ہے جسے ارباب اقتدار نے قبول کرلیا ہے۔ اس فیلوشپ کے تحت دو سال تک قومی یکجہتی پر ریسرچ کے لیے ماہانہ ڈیڑھ سو تا دو سو روپے وظیفہ دیا جائے گا تاکہ اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے مقالہ تیار کیا جاسکے۔ ان اہم سرگرمیوں سے قطع نظر ہمارا مرکز اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے شہر کی دوسری انجمنوں سے تعاون کا ہمیشہ خیر مقدم کرتا ہے چنانچہ ہم نے "یوم ظفر" کے موقع پر ادارۂ ادبیات اردو اور دیگر اداروں کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ نیز ریاستی ایجوکیشن کانفرنس میں ڈائرکٹر نے "قومی یک جہتی" پر مقالہ پڑھا، اور اب اسی جذبے کے تحت "صبا" کا یہ خاص نمبر یونٹی سنٹر کے اشتراک سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

قومی یک جہتی کا کام وسیع ذرائع اور بلند ہمت کا طالب ہے۔ یہ کام جس قدر اہم ہے اسی قدر اس کی تکمیل کے لیے مضبوط ارادہ اور دیرپا حوصلہ کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی کم مائگی کے باوصف کس حد تک اس ہفت خوان کو طے کرسکتے ہیں اس کا اندازہ کچھ دنوں کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ سر دست تو ہم حافظ کے اس شعر سے اپنی ڈھارس بندھاتے ہیں:—

تو دست گیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہاں سوارانند

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔ جن میں حیدرآباد کے کالجوں کے پرنسپل صاحبان کے نام سرفہرست ہیں۔ اس سلسلے میں خود میرے شرکائے کار بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انتظامی کمیٹی کے صدر شری پی وی جی راجو، ہمارے خازن راجہ پنالال پتی اور اراکین عاملہ ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی، شری بی کے ہنرو بیرسٹر اکبر علی خاں، شری ایل این گپتا، ڈاکٹر وامن راؤ، اور میرے پیش رو ڈاکٹر رام لال کی ہمدردی اور اعانت مجھے ہر قدم پر حاصل رہی ہے جس کے لیے میں ان احباب کا ممنون ہوں۔

فضل الرحمٰن

قومی یکجہتی

اہل ملک میں وطن پرستی کے جذبات کی کمی نہیں۔ قومی زندگی کی سطح پر چاہے کتنے ہی اختلافات ہوں دلوں کی گہرائیوں میں اتحاد و اتفاق کا احساس ہمیشہ جاگزیں رہا ہے جو ہر خطرے کے موقع پر نظروں کے سامنے ابھر آتا ہے حالیہ ہنگامی حالات میں اس کا کھلا ثبوت مل چکا ہے جب کہ آن کی آن میں آپس کے جھگڑے مٹ گئے، تمام جماعتی اختلافات کو مٹا دیا گیا اور اُتر سے دکن اور پورب سے پچھم تک ہر شہر و دیہات میں وطن کی مدافعت اور آزادی کی حفاظت کے عزم کا اثر آفرین مظاہرہ کیا گیا۔

اس قسم کے مظاہرے اس سے پہلے بھی کئی بار ہو چکے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا اتحاد تو ضرب المثل ہے جب کہ ہر مذہب اور ہر فرقے کے سرفروش قومی پرچم تلے جمع ہو گئے تھے اور سرزمین ہند کے گوشے گوشے سے آزادی کی فوجیں آگے بڑھی تھیں جب کہ امیر غریب، کسان و مزدور، کاریگر اور دانشور سب کے سب شمع وطن پر پروانہ وار قربان ہونے کے لیے بیتابانہ [illegible] جلوس نکالتے اور میدان جنگ کی طرف کوچ کرتے تھے۔ پھر یہی جوش اور یہی ولولہ ۱۹۲۰ء کے ترک موالات اور ۱۹۳۰ء کی سیول نافرمانی کی پرامن سیاسی تحریکوں میں جاری و ساری رہا، اور پھر آج کے دن جب کہ ہماری شمالی سرحدوں کو خطرہ لاحق ہے۔ قومی یکجہتی اور اتحاد کے وہی منظر دوبارہ دیکھنے میں آرہے ہیں۔

اس طلسمی تبدیلی سے متاثر ہو کر جذباتی ہم آہنگی کی تحریک کے بعض کارکنوں کا خیال ہے کہ اب اس ضمن میں کوئی کام باقی نہیں رہا لیکن یہ طریقہ فکر صحیح نہیں۔ خاموش بیٹھنے کے بجائے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اس جذبۂ اتحاد میں کمی نہ ہو اور ہنگامی حالات کے بعد بھی قومی زندگی میں اتحاد اسی طرح قائم رہے جیسا کہ اب ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ جو اختلافات دشمن کے مقابلے میں آج دفن ہو گئے ہیں کل خطرہ دور ہونے کے بعد دوستوں کے مقابلہ کے لیے نہ عود کر آئیں قومی اتحاد کے قیمتی اثاثے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں ان اختلافات کا جائزہ لینا چاہیئے جو بطور رواجات گزشتہ دور سے ورثہ میں ملے ہیں۔ اس سلسلے میں پچھلے سو سال کی تاریخ کے مطالعے سے موجودہ نزاعی مسائل کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد ملے گی گو آزاد ہندوستان کے بنیادی سیاسی مسائل بدل گئے ہیں اور اصولاً گزشتہ سیاست کو کئی سال پہلے دریا برد ہو جانا چاہئے تھا لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا۔ سولہ سال کی انقلابی تبدیلیوں کے باوجود ابھی خیالات کے سانچے وہی ہیں اور حالات کے

دھارے اسی طرف بہہ رہے ہیں جدھر انیسویں صدی میں ان کا رخ متعین ہوا تھا۔

ابھی میں نے ۱۸۵۷ء کے بے مثال اتحاد کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس اتحاد کو توڑنے کی جو کوشش کی گئی ان کی ایک طویل داستان ہے۔ سب سے پہلے ان والیانِ ریاست کو جنگِ آزادی کے محاذ سے الگ کر دیا گیا جو ذاتی مفاد کے لیے وطن کے مستقبل کو بھینٹ چڑھانے پر خوشی راضی تھے۔ بیرونی کارندوں نے اپنے ان خیر خواہوں کی مدد سے جب وطن کی تحریک کو ناکام بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تو پھر ان کی توجہ ملک کے دو بڑے فرقوں کی طرف مبذول ہوئی۔ بدیسی حکمران دیکھ چکے تھے کہ کس طرح ہندوستان کے عوام متحد ہو کر بآسانی سامراج کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس متحدہ محاذ میں کہاں کہاں رخنے ڈالے جا سکتے ہیں۔ کن تدبیروں سے صدیوں کے ساتھیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنایا جا سکتا ہے۔ زمینداریوں کی تقسیم، ملازمتوں میں تفریق، عدالتوں اور کچہریوں کی زبان کا سوال، اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کا نصاب قانون ساز جماعتوں کے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا گیا۔ اور اس طرح آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات، طبقہ واری نزاعات اور جماعتی اختلافات کے لیے راہ ہموار کی گئی۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ خود ہماری قومی تحریک میں چند ایسی کمزوریاں تھیں جن سے رخنہ اندازوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کے دانا دشمنوں اور نادان دوستوں کی کوششوں کے باوجود قومی اتحاد کی بنیادیں متزلزل نہ ہوتیں۔

یہ کمزوریاں محض جدید سیاست کی پیداوار نہیں تھیں بلکہ ان کی جڑیں دور دور تک تاریخی اسباب کے اندر پھیلی ہوئی تھیں مثلاً ذات پات کی تفریق ہزاروں سال سے چلی آ رہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ پہلے یہ معاشی تقسیم کار اور تخصیص پیشہ کی سہولت کے لیے وجود میں آئی تھی اور اب اسے اونچ نیچ کے طبقاتی فرق کی بنیاد بنا دیا گیا تھا۔ بیرونی قومیں صدیوں سے ملک میں داخل ہو کر پہلے فاتح اور بعد مفتوح کی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے یہیں آباد ہو گئی تھیں۔ ہر سلطنت کے زوال کے بعد ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے، اور طوائف الملوکی کے دور میں مختلف نسلیں اور مختلف ریاستیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئی تھیں۔ غرض نسل و قوم، فرقہ و طبقہ، زبان و مذہب کے یہ گوناگوں اختلافات بزم و رزم میں صدیوں سے نمایاں تھے۔ بزم میں رنگارنگی اور رزم میں خانہ جنگی کا ان ہی اختلافات پر دار و مدار تھا۔

انیسویں صدی سے پہلے ان اختلافات کی خلیج کو قرن ہا قرن کی ملی جلی زندگی نے بڑی حد تک پاٹ دیا تھا سیکڑوں سال کے تاریخی عمل سے ایک مشترکہ تہذیب نشوونما پا رہی تھی جس میں نسل و زبان و مذہب کے امتیازات جذب ہو کر ایک شاندار تمدن کا قیمتی ورثہ بن چکے تھے۔ اس تہذیب کی تعمیر میں ملک کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں، صوفیوں اور بھگتی تحریک کے حامیوں، عالموں اور گیانیوں کا بہت بڑا حصہ تھا جنھوں نے اس چمن میں ذہنی، ثقافتی اور روحانی وحدت کے راگ گائے تھے۔ بدقسمتی سے ہماری درسی کتابیں ان کے مایہ ناز کارناموں کے بارے میں بالکل خاموش ہیں اور صرف ان

بادشاہوں اور فاتحوں کے سوانح سے بھری پڑی ہیں جن کا کام امن قائم کرنا یا فساد پھیلانا رہا ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ بعض انگلو انڈین مورخین نے امن پسند حکمرانوں سے صرف نظر کر کے جنگجو اور لیٹرے بادشاہوں کے کارناموں کو اچھالا ہے اور ان پر بھی ایسا مذہبی رنگ چڑھایا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر کربستہ ہو کر آئے تھے حالانکہ ان لیٹروں نے اپنے بھائی بندوں کو بھی اسی طرح لوٹا تھا اور اپنے ہم مذہبوں پر بھی وہی ظلم و زیادتی کی تھی جو دوسروں کے لیے روا رکھی نیز آپس کی لڑائیوں کے بیان میں بھی بہت کچھ تصرف سے کام لیا گیا۔ اس کا کہیں ذکر نہیں آتا کہ حکمران مختلف مذاہب کے تھے بھی تو دونوں طرف کی فوجوں میں دونوں فرقوں کے سپاہی ہوا کرتے، اور یہ جاگیرداری خانہ جنگیاں خالص مذہبی لڑائیاں نہیں کہی جاسکتیں۔ لیکن مثل ہے۔ جھوٹے کے آگے سچا رو مرے۔ جھوٹ کے اس طومار نے آخر وہ گل کھلایا جس کا تلخ ثمر ہم آج تک چکھ رہے ہیں۔

تاریخ کے اس سرسری جائزے سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ ہمارا اتحاد اور ہمارے اختلافات خلا میں قائم نہیں ہیں بلکہ ان کے پس پردہ ٹھوس سماجی اور سیاسی حقیقتیں ہیں۔ آئندہ کئی سال تک ہمیں خرابیوں کا ازالہ اور خوبیوں میں اضافہ کرنا ہوگا تاکہ متحدہ قومی محاذ میں پھر کبھی شگاف نہ پڑیں۔

ہندوستان ایک جغرافی وحدت ہے۔ رسم و رواج، زبان و لباس، عقیدہ و مذہب اور نسل و قوم کے تنوع میں خالص ہندوستانی تہذیب کی منفرد حیثیت مسلم ہے۔ قومی یک جہتی کے یہ معنی نہیں کہ اس تنوع کو ملیامیٹ کر کے یکسانیت پیدا کی جائے۔ قومی یک جہتی سے مراد ایک ایسا اتحاد ہے جو اقلیتی مفادات کی پامالی پر نہیں بلکہ ان مفادات کی بحالی پر قائم رہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قومیت کا تصور دور جدید کی پیداوار ہے۔ پرانے زمانے میں قومیں تو تھیں لیکن قومیت یا نیشنلزم کا موجودہ تصور نہیں تھا۔ یونان و روما کی شہری ریاستیں ہوں یا قیصر و کسریٰ کی وسیع سلطنتیں۔ غیر مہذب قبائلی علاقے ہوں یا مہذب شہنشاہیتیں، حکومت الٰہی ہو یا امارت و شاہی کہیں بھی اس قسم کی قومی ریاستیں جیسی کہ آج اقوام متحدہ کی صفوں میں یا ان صفوں سے باہر نظر آتی ہیں صورت پذیر نہیں ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یورپ و ایشیا کے بعض علاقوں کی تاریخ بہت عظیم الشان رہی ہے اور ان علاقوں میں وسیع سلطنتیں بنی اور ٹوٹی ہیں۔ جغرافیائی حدود کی بنا پر مختلف ممالک کی تقسیم بھی صدیوں پرانی ہے گو ان ملکوں کے نام بعض صورتوں میں بدیشی فاتحوں کے دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن ان ملکوں کے باشندوں کا مذہب، زبان، نسل، رنگ اور تمدن کی بنا پر خود کو مختلف قومی وحدتوں میں تقسیم کرنا تاریخ انسانی کا نسبتاً حالیہ رجحان ہے۔

اس لحاظ سے ملک تو بھی پرانے ہیں مگر قومی ریاستیں اکثر و بیشتر نئی ہیں۔ یورپ میں یہ ریاستیں رومن کلیسا کے زوال کے بعد آہستہ آہستہ نشو و نما پانے لگیں۔ ایشیا میں ان کا سلسلہ انیسویں صدی سے شروع ہوا۔ ہر دو براعظموں میں تجارتی اور صنعتی ترقی پر قومی ریاست کی بنیاد رکھی گئی جس پر بعد میں جمہوریت کی حسین عمارت تعمیر ہوئی جس کی بالائی منزلیں کہیں سرمایہ داری اور کہیں سوشلزم کے نقشوں کے مطابق بنائی گئی۔

اس تفصیل سے میرا مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ قومیت کا تصور اور قومیت کا جذبہ ابتدائے آفرینش سے موجود نہیں تھا

یہ حال کی پیداوار ہے اور اس کی ترقی کے لیے جس قوم کو جتنا زیادہ وقت اور موافق ماحول ملا ہے اتنا ہی اس قوم میں یہ جذبہ زیادہ پختہ زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا ثابت ہوا ہے۔ مثلاً مغربی ممالک جہاں تجارتی اور صنعتی ترقی ہم سے بہت پہلے شروع ہوئی وہ نیشنلزم کے میدان میں بھی ہم سے بہت آگے ہیں بلکہ اس قدر آگے ہیں کہ بعض وقت یہ جذبات ان کے لیے بلائے جان ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دو بڑی جنگوں میں دنیا کو تجربہ ہوا ہے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ قومیت کے لیے ایک مذہب ایک زبان ایک نسل اور ایک تمدن ضروری ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان عناصر سے قومی اتحاد میں مدد ملتی ہے۔ دنیا کی کسی بڑی قوم میں بھی صرف ایک مذہب رکھنے والے یا ایک زبان بولنے والے نہیں رہتے بستے۔ روس، امریکہ، انگلستان، فرانس اور جرمنی کے باشندے دنیا کی عظیم قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کہیں بھی صرف ایک مذہب کی تخصیص نہیں۔ ہر ملک میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقے موجود ہیں ہر ملک میں یہودیوں کی اقلیت کا وجود باقی ہے۔ زبانوں کے لحاظ سے روس میں اتنا ہی تنوع پایا جاتا ہے جتنا کہ ہندوستان میں۔ خود انگلستان میں انگریزی کے علاوہ ویلش اور گیلک زبانیں ویلس اور شمالی اسکاٹ لینڈ میں اب بھی بولی جاتی ہیں۔ کینیڈا میں انگریزی اور فرنچ رائج ہے۔ سوئٹزرلینڈ جیسے چھوٹے ملک میں بھی فرنچ جرمن اور اطالوی زبانوں کے تین علیحدہ رقبے ہیں۔

یہ مثالیں میں اس لیے دے رہا ہوں کہ ان سے خود ہمارے موقف پر روشنی پڑتی ہے۔ اگر مختلف مذاہب جو کل تک یورپ میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے آج شیر و شکر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جلد یا دیر سے بدلتے ہوئے سماجی حالات کے زیر اثر ہماری سیاست سے بھی یہ اختلافات بالکل غائب نہ ہو جائیں جیسا کہ ایک سیکولر اسٹیٹ کے تصور کا تقاضا ہے۔

اگر مختلف زبانوں کے باوجود روس، کینیڈا اور سوئٹزرلینڈ کے قومی اتحاد پر اثر نہیں پڑتا تو پھر ہم کیوں یہ فرض کریں کہ ہماری قومی یک جہتی کی راہ میں ہماری مختلف قومی زبانیں روڑے اٹکائیں گی۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے ایک چھوٹا سا بر اعظم، اگر یہاں مختلف نسلیں آباد ہیں، بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں، قسم قسم کے رسم و رواج ہیں اور الگ الگ عقیدوں کے ماننے والے تو یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ اس وسعت و تنوع کے باوجود ہم ایک قوم ہیں، ایک دستور کے پابند، ایک تاریخ کے حامل، ایک منزل کی طرف گامزن۔ اس سفر میں بے شک کئی مشکلات ہیں۔ صدیوں کی سیاسی ہنگامہ آرائیاں، افلاس جہالت اور تعصب مذہبی فرقہ بندی، ذات پات کی تفریق۔ صوبائی اور علاقائی جذبات اور تاریخ کے وہ تمام باقیات صالحات جو ہمیں ورثہ میں ملے ہیں چند سال میں صفحۂ ہستی سے نہیں مٹ سکتے۔ خاص کر جب کہ تقریباً دو صدیوں تک بیرونی حکمرانوں نے پوری قوت کے ساتھ ان اختلافات کو ہوا دی ہے۔ اس لیے مایوس ہونے کی بجائے ہمیں ان مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے جو ہمارے قومی اتحاد میں کبھی کبھی رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمارا فرض ملک سے جہالت کا ازالہ ہے

جمہوریت اور جہالت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر جمہوریت جہالت کا خاتمہ نہ کرے تو جہالت جمہوریت کا خاتمہ کر دے گی۔ جہالت کا ازالہ محض عام جبری ابتدائی تعلیم سے نہیں ہو سکتا گو یہ لازمی شرط ہے جو بدقسمتی سے اب تک پوری نہ ہو سکی۔ مدارس کی تعلیم کے آگے شہریوں کے سیاسی اور سماجی شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ نشر و اشاعت کے موجودہ ذرائع سے بے شعور رائے دہندوں کو باشعور اہل الرائے بنایا جائے۔ سیاسی جماعتوں ایسے قواعد کا پابند کیا جائے کہ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اہل ملک کو گمراہ نہ کرنے پائیں۔ انتخابات میں عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض امیدوار ووٹ حاصل کرنے کی بے پناہ خواہش میں کبھی مذہب، کبھی فرقہ، کبھی ذات پات اور کبھی زبان وغیرہ کے اختلافات پر زور دے کر اپنے حریفوں کو شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر الکشن میں اور ہر الکشن کے بعد تلخیوں کا ایک طومار بندھ جاتا ہے۔ اگر رائے دہندے باشعور اور روشن خیال ہوں تو ایسی کوششیں بارآور نہیں ہو سکتیں۔ میں مانتا ہوں کہ نہ صرف مدرسہ کی معمولی پڑھائی بلکہ کالج کی اعلیٰ تعلیم بھی بعض اہل وطن کے دل و دماغ سے تعصب و تنگ نظری اور کدورت اور نفرت دور نہیں کر سکی، اور بظاہر ان میں اور جہلا میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ اس کے اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو ملک کے سارے نظام تعلیم کا تفصیلی جائزہ لینا پڑے گا جس کی یہاں گنجائش نہیں اور جس کے لیے میری ذاتی واقفیت بھی ناکافی ہے۔ یہاں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ عام طور پر پچھلے سو سال سے جس قسم کی درسی کتابیں پڑھائی گئی ہیں اور جس طرح ہماری تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اس سے بسا اوقات ذہنوں میں روشنی کے بجائے اندھیرا پھیلا ہے۔ سو سال سے یکے بعد دیگرے تعلیم پانے والی چند در چند نسلوں میں تاریخی واقعات کو مسخ کر کے باہمی نفرت کا جو زہر بھر اگیا ہے اس کو جسد قومی سے خارج کرنے کے لیے موثر نسخوں کی ضرورت ہے، اور سخت پرہیز کی بھی۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں جمہوریت کا تصور بہت ناقص قسم کا ہے۔ عوام ہی نہیں ان کے رہنما بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت کے معنی اکثریت کی مطلق العنانی کے ہیں۔ اسی لیے مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے دلوں میں اندیشے اور زبانوں پر گلے شکوے ہیں ادھر بعض علاقوں کی اقلیتیں بھی واجبی اور ناواجبی مطالبات کا فرق نظر انداز کر کے کچھ ایسی امیدیں لگائے بیٹھی ہیں جو شاید ہی پوری ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک کشمکش کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس میں ناحق ملک کی توانائیاں ضائع ہوتی ہیں۔

لسانی اقلیتوں سے قطع نظر جو ریاستوں کی تنظیم کے بعد ہر ریاست کا جز بن گئی ہیں خود ان ریاستوں کے مفادات کا سوال ہے۔ قدرتی طور پر ہر ریاست اپنے لیے قومی ذرائع اور قومی آمدنی کا معقول حصہ مانگتی ہے اور مرکز میں ریاستی نمائندے چاہے وہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں اپنے علاقے کے مفادات کو شد و مد سے آگے بڑھاتے ہیں۔ پارلیمنٹ اور اخبارات میں رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے، اور پھر دریاؤں کے پانی کی تقسیم اور سرحدی مواضعات کی منتقلی جیسے مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان صوبائی جذبات کو مزید بھڑکانے کا دوسرا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ مرکزی زبان کی حیثیت سے فوری طور پر ہندی کو رائج کیا جائے یا چند سال تک انگریزی کو برقرار رکھا جائے۔ یہ اور اس قسم کے کئی مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ کبھی جنوب اور شمال کے مفادات کا ذکر آتا ہے۔ کہیں آزاد تامل ناڈ کی دھمکی دی جاتی ہے۔

کہیں پنجابی زبان کے صوبے کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ کچھ دھیمے سُروں میں اردو کی کسمپرسی کے راگ سنائی دیتے ہیں جوابًا کچھ بیرونی وفاداریوں کے طعنے دیئے جاتے ہیں اور اس طرح ہماری سیاست کی گرم بازاری جاری رہتی ہے۔

جمہوریت میں سیاسی گرم بازاری زندگی کی نشانی ہے۔ بشرطیکہ گرمیٔ بازار کو آگ نہ لگا دے۔ اختلافات، مخالفت اور مخالفت منافرت کی شکل نہ اختیار کرے۔ یہیں پر معاشی خوشحالی کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ راحت و فراغت کے سامان خاص و عام کو میسّر ہوں تو بات بات پر لڑائیاں نہیں چھڑتیں۔ تعلیم و تربیت اعلیٰ قسم کی ہو تو ہر خانگی جھگڑا جس کے فریق مختلف مذہب کے ہوں فرقہ وارانہ فساد کی شکل نہیں اختیار کرتا۔ دماغ روشن اور دل آگاہ ہو تو وطن پرستی ہی نہیں اس سے آگے وسیع النظری اور انسان دوستی کی منزل بھی قریب آجاتی ہے۔ جہاں پہنچ کر ہر گوش شنوا غالب کے اس شعر کی صدائے بازگشت سن سکتا ہے:۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کھیت اور میدانِ جنگ

کھیت امن اور شانتی کی علامت ہے اور جنگ کا میدان اپنے نام سے ہی لڑائی اور خون خرابے کا تصوّر پیش کرتا ہے۔ ایسے کوئی الفاظ نہیں ہو سکتے جن کے معنی اور مفہوم میں اس قدر تضاد پایا جاتا ہو۔ اس لیے آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نعرے کا کوئی مفہوم نہیں ہو سکتا کہ دفاعی لڑائی ہمارے کھیتوں سے لڑی جائے گی۔ لیکن آج یہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہیں۔ کسان سپاہیوں کا نعرۂ جنگ اور سپاہی کسانوں کا ترانہ سن سکتا ہے۔

ملک میں ہنگامی حالات کے اعلان اور اس کے نتیجے میں غذائی پیداوار بڑھانے کی کوششوں کے پیش نظر آندھرا پردیش میں سنہ ۶۴—۱۹۶۳ء کے زرعی پروگراموں کا موازنہ (۵۰) فیصد تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اور اب فیصلہ کیا گیا ہے کہ تقریباً تمام بڑی فصلوں کے تعلق سے پیاکیج پروگرام کو روبہ عمل لایا جائے اور اسے وسعت دی جائے۔

منصوبہ بند ترقی ہماری دفاعی کوششوں کا لازمی جزو ہے

(جاری کردہ:۔ ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ، آندھرا پردیش)

پنڈت جواہر لعل نہرو

اُردو۔ قومی یکجہتی کی آئینہ دار

اُردو زبان ہندوستان کی یک جہتی کے رجحانات کی آئینہ دار ہے اور اس کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ نہ صرف زبان بلکہ انداز فکر، ادب اور تہذیب کی یک جہتی کی بھی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک خالصتاً ہندوستانی زبان ہے اور اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ترقی دی جانی چاہیئے۔

مجھے اردو زبان کی ترقی سے دلچسپی ہے۔ گزشتہ دس بارہ برس میں اردو نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اردو کے ۴۵۰ اخبار تھے۔ اب یہ تعداد تقریباً ۷۲۰ ہے۔ زیادہ تر زبانوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریر اور بول چال کی شکل میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا لیکن اردو میں یہ فرق بہت ہے۔ اگر اخبار والے یہ بھول جائیں کہ وہ کسی خاص طبقے کے لیے لکھتے ہیں تو اخباروں کی ترقی کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔ موجودہ دور عام پڑھنے والوں کا ہے جیسے جیسے تعلیم بڑھے گی پڑھنے والوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوتا جائے گا۔ انگلینڈ اور یورپ کے باقی سب ملکوں میں جب سے تعلیم پھیلی ہے اخباری دنیا میں ایک انقلاب آگیا ہے۔ کروڑوں پڑھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہاں کے اخباروں کا طرز، الفاظ کا طرز سب بدل گئے۔ یہ سب طرز آسان ہو گئے تاکہ عوام سمجھ سکیں۔ یہی کچھ تھوڑا بہت یہاں بھی ہو رہا ہے لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے مجھے یہ جان کر اطمینان ہوتا ہے کہ اچھی زبانوں میں یہ فرق بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر بنگالی زبان کو لیجئے رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت اور ان کی کتابیں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی مشہور ہیں کیوں کہ ان کی زبان اور گاؤں والوں کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر یہی بات اردو ہندی میں بھی آجائے تو دونوں کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جائے۔ ہندوستان میں آج کل یک جہتی اور باہمی میل جول کا بڑا چرچا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ مل جل کر رہنے کی کوشش کی۔ یہاں کی ہوا کی یہی خاصیت ہے کہ سب مل جل کر رہیں۔ اردو زبان اسی میل جول کا عظیم نمونہ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اردو میں دوسری زبانوں کا حصہ کس قدر ہے غالباً ستر پچھتر فی صد۔ . . . . حصہ ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کا ہے، اور بیس پچیس فیصد دوسری زبانوں کا حصہ ہے جو یہاں مروج ہوئیں خاص طور پر فارسی، ترکی، عربی دغیرہ وغیرہ۔ زبان کی ترقی پذیری کا یہی اصول ہے۔ اگر ایک زبان نے خود کو ایک چار دیواری میں بند کر دیا اور دوسری زبانوں کا داخلہ روک دیا تو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ دنیا کی تاریخ بھی یہی سبق دیتی ہے کہ جہاں قوموں نے خود کو علیحدہ رکھا وہاں نہ تو ان کے دماغ تازہ ہو سکے اور نہ جسم، میرے خیال میں اردو زبان کی ترقی

کرنے کا راز یہی ہے کہ اس نے دوسری زبانوں سے فائدہ اٹھانے کی ڈگر اختیار کی۔ آج کل بھی ہندی کے مقابلے میں اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ زیادہ مروج ہو گئے ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ ان الفاظ کو اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس کا حصہ بن چکے ہیں اردو ہندوستان کی یک جہتی کا ایک نمونہ ہے اور یہ نمونہ محض زبان کا ہی نہیں بلکہ طرز فکر کا، ادب کا اور تہذیب کا بھی ہے۔ اردو خالصتاً ہندوستانی زبان ہے اس لیے اسے اجنبی سمجھنا حماقت ہے۔ ہمیں حقیقت کو پہچاننا چاہیے اور اس زبان کو ترقی دینا چاہیے ایک طالب علم کو ہندی اور اردو میں کوئی فرق نظر نہیں آتا لیکن جب دونوں زبانوں کے ادبیات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو فرق نظر آنے لگتا ہے دونوں زبانوں کے ادبیات میں اپنی اپنی خوبیاں ہیں۔ بعض خوبیاں مشترک بھی ہیں۔ اس لیے دونوں زبانوں کی قربت دونوں کے لیے مفید ہو گی۔ اگر مجھے صرف ہندی کی فکر ہوتی تو بھی میں سمجھتا کہ ہندی کے لیے اردو کا ترقی کرنا اور اردو سے تعلق پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس سے ہندی مضبوط ہوتی ہے اور ترقی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی ہوا میں اردو کی ترقی کے لیے ہندی کا جاننا اور ہندی سے قریب رہنا بھی ضروری ہے۔ ایک دوسرے سے کچھ لیں لیکن ان کو محض زبردستی ملانا ایک غلط بات ہے۔ ہر زبان دوسری زبانوں کے اشتراک سے ہی ترقی کرتی ہے۔ سائنس کی ترقی کے موجودہ دور میں ہمیں نئی نئی اصطلاحات کی ضرورت ہے۔ فنی تعلیم اور علم کی اب اتنی ساری راہیں کھل گئی ہیں کہ پرانے الفاظ سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں لاکھوں نئے الفاظ سیکھنے اور سکھانے ہیں غرض دوسرے الفاظ کے ٹھونسنے سے زبان خراب ہوتی ہے۔ اکثر الفاظ محض تجربے سے چالو ہو جاتے ہیں۔ آپ کسی پیشہ ور آدمی کے پاس بیٹھیے اگر وہ میکانک ہے تو کیسی کیسی اصطلاحوں سے کام کرتا ہے تو آپ اس سے ایسے کئی الفاظ سنیں گے جو کسی بڑی ڈکشنری بنانے والے نے بھی نہ بنائے۔ سائنسی اور ٹیکنیکل اصطلاحات میں مختلف زبانوں میں جتنا کم فرق ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ اس لیے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں سائنسی اور ٹیکنیکل اصطلاحات ایک سی ہوں اور یورپین زبانوں کی اصطلاحات سے ملتی جلتی ہوں۔ یہ مشابہت اور یکسانیت بہت مفید ہوگی۔ تاہم میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ بالکل ہی ملتی جلتی ہوں کبھی کبھی کسی لفظ کو دوسری زبان میں سمونے کے لیے اس کی شکل ذرا بدلنا پڑتی ہے۔ سائنسی اصطلاحات کی یکسانیت سے لوگوں کے لیے دوسری زبانوں میں کتابیں پڑھنا اور سمجھنا آسان ہو سکتا ہے۔ یہ ایک غلط بات ہے کہ ان کا اردو یا ہندی میں ترجمہ کیا جائے کیا ہر سال جو ہزاروں کتابیں شائع ہو رہی ہیں ہم ان کا ترجمہ کریں گے ترجمہ تو ہونا چاہیے لیکن سب کا ترجمہ ہونا ناممکن سی بات ہے البتہ چنی ہوئی کتابوں کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم جو بھی زبان لکھیں یا بولیں اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو ایسے ڈھنگ سے لیں کہ وہ اس میں کھپ جائیں۔

انیسویں صدی میں کئی ایسے اخبار نکلتے تھے جو اردو اور ہندی یا اردو مراٹھی یا اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ اردو ہندی میں جو اصلی فرق پیدا ہوتا ہے وہ رسم الخط کا ہے ورنہ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کی مختلف زبانوں کا رسم الخط اتفاق سے ایک ہو جاتا ہے جیسا کہ یورپ کی زبانوں کا رسم الخط ایک ہے تو ان کے سمجھنے میں ایک بھاری رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ رسم الخط کا بدلنا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ کسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری کو رکھا جائے بلکہ ہم نے کہا کہ ساتھ ساتھ ناگری کو بھی رکھا جائے تو اچھا ہے۔ جو میں سمجھتا ہوں کہ ہونا چاہیے اور کچھ ہو بھی رہا ہے وہ یہ ہے کہ اردو کی بھی مشہور

کتابیں ناگری لپی میں چھپنی چاہئیں اور ہندی کی اردو لپی میں اس سے آپس میں ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔ پھر وقت آنے پر دیکھا جائے گا کہ کون سی بڑھے گی اور کون سی نہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آزادی کے بعد تیرہ چودہ سال کے عرصے میں اردو نے ترقی کی ہے۔ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیئے۔ کیوں کہ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اردو نے اس عرصے میں نہ صرف ترقی نہیں کی بلکہ پیچھے رہ گئی ہے۔ اردو ایک جاندار زبان ہے۔ واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس میں ایک اندرونی جان ہے جو اپنی طاقت سے بڑھتی ہے۔ سرکاری فرمان سے بھی کوئی زبان بڑھتی ہے لیکن تھوڑی بہت۔ اصل میں یہ تب ہی بڑھتی ہے جب اس میں جان ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو میں کافی جان ہے۔ یقیناً ہماری گورنمنٹ نے بھی اس کی مدد کی ہے لیکن پھر بھی جس قدر ہونی چاہیئے اتنی نہیں، اور زبانوں کی زیادہ مدد ہوئی ہے اس کے باوجود اردو کا ترقی کرنا اس کے کافی جاندار ہونے کا ثبوت ہے۔ اردو کی جان ہندوستان کی جان کا حصہ ہے۔ جاندار ملک ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ہماری زبانیں جاندار ہیں اور ترقی کر رہی ہیں اگر ہم غلط راستے پر چلے اور ہندی اور دوسری زبانوں کو ایک دوسرے سے اثر قبول نہ کرنے دیا تو ان کا تازہ پن ختم ہو جائے گا اور وہ سوکھتی جائیں گی۔ اگر ہمیں اپنی زبانوں کو مضبوط اور تازہ رکھنا ہے تو ہمیں اپنے دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھنی ہوں گی۔ نہ صرف ہندوستانی زبانوں کے لیے بلکہ دنیا کی زبانوں کے لیے بھی تاکہ ہم اپنا اثر ان پر ڈال سکیں اس طرح ہماری زبانیں ترقی کریں گی اور ہمارا ملک بھی ترقی کرے گا۔

ڈاکٹر وحید اختر

قومی وحدت اور اردو

ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے کہ "میں ہندوستان کے ان قدیم باشندوں کی تہذیبی روایات کا وارث ہوں جو آریوں سے قبل اس دیش میں رہتے تھے۔ میری رگوں میں آریوں کا بھی خون ہے اور مغلوں اور پٹھانوں کا لہو بھی میرے جسم کا جزو ہے۔" ان سطروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک ادیب اور شاعر، قومی اور تہذیبی مسائل پر کس انداز میں سوچ سکتا ہے۔ آج سے زیادہ کبھی اس قومی نقطہ نظر پر زور دینے کی ضرورت نہ تھی۔ برطانوی تسلط کے دور میں ہمارے ذہنوں کی اس طرح تربیت کی گئی کہ ہم نے اس نقطۂ نظر کا دامن ہی ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ آج ہمیں اپنے ملک میں اکثریت ایسے لوگوں کی ملے گی جو اپنے مذہب کو اہمیت دیتے ہیں — پھر صوبائی حد بندیوں کی اصطلاح میں سوچتے ہیں لیکن ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو اپنے کو اور کچھ سمجھنے سے پہلے ہندوستانی سمجھیں۔ ہندوستان میں سچے ہندوستانی سب سے چھوٹی اقلیت ہیں۔ اس لیے اس مسئلے پر آج سوچنے کی ضرورت ہے کہ قومی وحدت کے تصور کو کس طرح عام کیا جائے۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کے قائدین کے ذہن میں بھی قومی وحدت کا محض ایک مجرد تصور ہے۔ اور اکثر صورتوں میں اس تصور کا عمل عملی زندگی اور سیاست میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ابھی دلّی کی قومی وحدت کانفرنس کے اراکین، فرقہ پرستی کی مختلف صورتوں پر غور کر کے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پھیل گئی اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی سیاست میں ایسے گروہ اور افراد موجود ہیں جو قومی وحدت کے تصور کو بھی اپنے وقتی مفاد کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ دو قومی نظریہ کے تحت پاکستان بنوا دیا گیا۔ ہندوستان جو ایک تہذیبی وحدت تھا دو حصوں میں بٹ گیا۔ لیکن اب بھی آزاد، جمہوری اور غیر مذہبی ہندوستان میں تمام علاقوں، زبانوں اور فرقوں کے افراد اپنے آپ کو تہذیبی اور قومی وحدت کی اقدار سے ہم آہنگ نہیں کر پائے ہیں۔ حالانکہ یہ مسئلہ جس کی اہمیت کو اب محسوس کیا گیا ہے۔ پلاننگ کے تعمیری منصوبوں پر بھی فوقیت رکھتا تھا۔ جب تک ہندوستان کے تمام باشندے اپنے کو ایک وحدت نہ سمجھیں اس وقت تک پلاننگ کے نتائج سے پورے ملک کا بہرہ مند ہونا بھی دشوار ہے۔ جس زمین میں فرقہ پرستی کا زہر موجود ہے وہاں جو فصل اُگے گی اس کے ثمرات زہریلے ہی ہوں گے۔ پھر فرقہ پرستی کی ایک ہی شکل نہیں۔ نہ جانے کتنے ہی ایسے بت ہیں جن کو ہم اپنے دلوں میں جگہ دے کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ لسانی فرقہ پرستی، مذہبی فرقہ پرستی، ذات پات کی فرقہ بندی، سیاسی پارٹیوں کی فرقہ بندی۔ اگر آپ سوچیں تو فرقہ پرستی کی اور سینکڑوں صورتیں نظر آئیں گی۔ ان تمام تنگ نظریوں کو توڑ کر اور دل سے

نکال کر دلوں میں قومی تہذیبی یکجہتی کے منزّہ تصوّر کو اس کی جگہ دلانا ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے دلوں کی تسخیر کی ضرورت ہے صدیوں سے بنے ہوئے سوچنے کے سانچوں کو توڑ کر قلب و نظر کو نئی دنیا کے سائینٹفک تصوّر سے آگاہ کرنے کا کام آسان نہیں ہو سکتا جب تک کہ باشعور اور پڑھا لکھا طبقہ اس مقدس کام میں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو محسوس کر کے انھیں پورا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ہم کم سے کم منطقی لحاظ سے یہ مانتے ہی آئے ہیں کہ ادیب قوم و ملک کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے، وہ ان کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور ان کا پیغمبر اور مصلح بھی۔ ادب جذبات کی سطح پر دلوں کو مخاطب کرتا ہے اسی لیے اس کی اپیل سائنس اور فلسفے سے زیادہ ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ادب کی اس عام مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ قومی وحدت کے تصور کو عام کرنے میں جتنی ذمہ داری ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں پر ہے اتنی کسی اور گروہ پر نہیں۔ ارباب سیاست اپنا فرض جانیں مگر ادیب کا پیغام محبت ہے اور پیغام محبت اسی وقت اثر کر سکتا ہے جب نفرت، تعصب اور جہالت کا اثر دلوں سے نکال دیا جائے ہمارے یہاں تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی اکثریت ایسے ہی افراد کی ہے جو اب تک قرون وسطیٰ کی اصطلاحات میں سوچتے ہیں اور آج کے مسائل کو اسی روشنی میں سلجھاتے یا الجھاتے ہیں۔ سائنسی فکر و نظر اور رویّہ ان ملکوں میں بھی اب تک عام زندگی اور تہذیب کا اٹوٹ حصہ نہیں بن سکا ہے۔ جہاں سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت کو زبردست فروغ حاصل ہوا ہے۔ ایشیا کے پسماندہ ملکوں میں جو صدیوں بیرونی سامراج کے استحصال اور غلامی کا شکار رہے ہیں۔ اس نقطہ نظر اور رویہ کے عام ہونے میں تو اور دیر لگے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں اور یہ امید رکھیں کہ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کے مصداق کبھی نہ کبھی ایسا انقلاب خود بخود آ جائے گا۔ تہذیبی ترقی میں ایسے انقلابات خود بخود نہیں آتے ان کے لیے ذہن اور دل کو مسلسل بدلنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے اسی لیے آج ادیبوں پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اس مسئلہ پر نہ صرف سوچیں بلکہ لکھیں اور قومی یکجہتی پیدا کرنے میں اپنے فرائض کو محسوس کریں۔

خوش قسمتی سے اردو زبان و ادب میں ایسی تہذیبی روایات تاریخی تسلسل کے ساتھ ملتی ہیں جن کو سامنے رکھ کر ہم ان پرانے چراغوں سے آج کے ماحول کے لیے نئے چراغ روشن کر سکتے ہیں۔ امیر خسرو ہندی اور اردو کی اس مشترکہ بنیاد کے شاعر ہیں جس پر ان دونوں زبانوں کا ادب تعمیر ہوا۔ خسرو کی مقبولیت کو پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی DISCOVERY OF INDA میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا کی تاریخ ادب میں خسرو کے علاوہ کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی کہ ایک شاعر کے اشعار بغیر کاغذ اور قلم کی مدد کے صدیوں عوام کے دلوں میں محفوظ رہے ہوں۔ خسرو ہماری تہذیب کی تاریخ میں ہندی اور اردو کے امتزاج و وحدت ہی کی علامت نہیں بلکہ تصوف اور بھگتی کے مشترکہ عناصر کی بھی علامت ہیں اور فنون لطیفہ میں اسلام اور ہندوستانیت کے باہم دگر ربط و تعلق کے نمائندہ ہیں۔ وہ نظام الدین محبوب الٰہی کے مرید اور عاشق زار تھے۔ وہ نظام الدین جنھوں نے اپنے مخاطبوں کے اس مجمع سے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے یہ کہا تھا کہ تم لوگ میرے قریب آ جاؤ۔ دھوپ تم پر پڑ رہی ہے اور اس کی حدت کو میں اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں۔ اس طرح خسرو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی، انسان دوستی کی اس روایت سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں جو تصوف اور بھگتی کی مذہبی تحریک بن کر صدیوں ہمارے ملک کی مقبول ترین تحریک رہی ہے جس زمانے میں اردو بن رہی

تھی اسی زمانے میں ہندی ادب اور شاعری کو ملک محمد جائسی اور رحیم بھی تلسی اور سور داس کے ساتھ بنا سنوار رہے تھے۔ کبیر کے متعلق تو آج تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان، دونوں ان کو اپنا کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور عام روایت یہ ہے کہ جب ان کے آخری مراحل کی تکمیل پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں تکرار شروع ہوی تو اس مسئلے کو کبیر کی لاش نے یوں حل کیا کہ جب چادر ہٹائی گئی تو وہاں انسانیت کے اس بھگت کی لاش کی جگہ کچھ پھول ملے۔ آدھے پھول مسلمان لے گئے اور آدھے ہندوؤں کے حصے میں آئے۔ ہمارے ملک کی تہذیبی روایات آج بھی ان ہی پھولوں سے مہک رہی ہیں۔ ان روایات پر اردو کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہندی کا اسی روایت کا تسلسل ہے کہ جب مرزا مظہر جانِ جاناں سے جو اپنے دور کے عظیم ترین صوفی اور عالم دین سمجھے جاتے تھے۔ اس محضر پر دستخط لینے کی کوشش کی گئی جس میں یہ فتویٰ دیا گیا تھا کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ہندوؤں سے جہاد کریں تو مرزا جانِ جاناں نے اپنے مذہبی تقشف کے باوجود یہ جواب دیا تھا کہ "ہندو بھی موحد ہیں اور مسلمانوں کو ان سے جہاد نہیں کرنا چاہیئے" اور یہ بھی اردو ادب کی شرافت کی روایت ہے کہ ان ہی مرزا مظہر کو جب ایک شخص نے قتل کیا تو مرنے سے پہلے اس شاعر نے جو کہہ چکا تھا"

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

. . . . اپنے قاتل کو اپنا خون معاف کر دیا۔ مرزا مظہر جان جاناں شاعروں کے اسی سلسلے کی کڑی ہیں جس نے تصوف اور بھگتی تحریک کی انسان دوستی کی روایت کو اردو ادب کے خمیر میں شامل کیا۔

میں اس موقع پر اردو تہذیب کی اصطلاح استعمال نہیں کروں گا اس لیے کہ کچھ انتہا پسند ایسے بھی ہیں جو اس طرح کی اصطلاحات کو بھی لسانی فرقہ پرستی کا ہی شاخسانہ سمجھتے ہیں۔ پھر بھی اس بات پر اصرار کروں گا کہ جس مشترکہ تہذیب پر ہندوستان کو فخر ہے اور جو مختلف علاقوں اور زبانوں اور مذہبوں کے کلچر میں ربط پیدا کرتی اور اس کثرت کو قومی وحدت کے سانچے میں ڈھالتی ہے وہ اردو ہی کی دین ہے اور اردو اسی مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا بہترین ثمر ہے۔ جہاں آپ کو اردو کے ادیبوں کے یہاں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریک میں قوم کی اصطلاح مسلمانوں کے لیے ملے گی وہیں محمد حسین آزاد ایسے دور بین ادیب بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے دربار اکبری میں اکبر کی تمام سیکولر روایات کو سراہتے ہوئے یہ تک لکھا ہے کہ اگر اسلام عرب کی بجائے ہندوستان میں اترتا تو یقیناً اس کی شکل مختلف ہوتی۔ اس لیے کہ یہاں کی تہذیبی روایات اس مذہب پر اپنا اثر ضرور ڈالتیں۔ اکبر کے ساتھ دارا شکوہ نے بھی . . . . .

جو صحیح معنوں میں اکبر کا جانشین سمجھا جا سکتا ہے جو کام اکبر نے سیاسی اور عام زندگی کی سطح پر کیا تھا اسے . . . . ذہنی اور روحانی سطح پر اپنشد اور قرآن کے تصوف کو باہم آمیز کر کے کیا۔ اردو ادب کسی زمانے میں بھی وحدت اور تہذیبی اشتراک و امتزاج کی ان روایات سے خالی نہیں رہا۔ اس لیے اردو ادب میں جہاں اسلامی ہندوستان کی روایات ملیں گی وہیں وہ مہابھارت اور رامائن کی روایات کا بھی آئینہ دار رہا ہے۔ سیاست افرنگ نے ہندوستان کی قومی وحدت کو صوبوں، زبانوں اور مذہبوں کے گروہ بنا کر پارہ پارہ کر دیا تھا لیکن آزادی کی جنگ میں ایک بار پھر تمام مختلف الخیال گروہ اور افراد ایک محاذ پر متحد ہو گئے تھے۔ آزادی کا عظیم مقصد قومی وحدت کی بنیاد بنا رہا اور اردو نے بھی دوسری زبانوں کی طرح بلکہ بعض حیثیتوں سے زیادہ ہی اس جدوجہد کی خدمت انجام دی۔ آزادی کے ساتھ ہی تقسیم اور فسادات کے توام حادثات نے ایک بار قومی وحدت کے جذبات کو مجروح کیا اور انسانیت دوستی کی وہ روایات جو ہندوستان

کی ہزارہا سالہ تہذیب نے ہمارے ادب کو دی تھی خون میں ڈوب گئی لیکن اس فضا میں بھی اردو کے ادیبوں کی اکثریت نے تعصب اور نفرت سے بچتے ہوئے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آج پھر رجعت پسند اور فرقہ پرست سیاسی پارٹیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات نے ہندوستان کی قومی وحدت کو قتل کرنے کی سازش کی ہے۔ ترقی پسند جمہوری اور سیکولر سیاسی قائدین کے ساتھ ہی ادیبوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اپنے ادب اور تہذیب کی روشن اور صحت مند روایات کی روشنی میں فرقہ پرستی کا ہر محاذ پر مقابلہ کریں۔ ہمارا علم، ہمارا ادب، ہماری قومی ترقی کے منصوبے سوشلسٹ سماج کی تعمیر کے مراحل قومی وحدت کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر آزاد ہندوستان کے ادیب اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کی انسان دوستی کی روایات کو قتل ہوتا دیکھنے کے لیے تیار ہیں اس کام کو کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے۔ یہ افراد کی اپنی انفرادی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے۔ لیکن بنیادی کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے ادب کی سیکولر جمہوری اور انسانیت دوستی کی روایات کو زیادہ سے زیادہ پیش نظر رکھیں۔ ادیب کا مذہب انسانیت ہے اور یہی انسانیت تمام مذاہب کا مقصود اور مدعا ہے۔ اگر وہ اپنے مذہب انسانیت کے فرائض ادا نہیں کرتا تو وہ سماج اور ملک دونوں کا گناہ گار ہے۔ اس راہ میں دشواریاں ضرور ہیں لیکن دوسروں کو سمجھنے، اس سے قریب ہونے اور ان کے ادب کے تراجم کے ذریعے اس کی اچھی روایات کو اپنانے ہی سے ہم اپنے ادب کو قومی وحدت اور ہندوستانیت کے عناصر سے مالا مال کر سکتے ہیں۔ اگر دکنی ادب ہندی اور اردو کی مشترکہ میراث سمجھا جا سکتا ہے اور امیر خسرو کو دونوں زبانیں اپنانے کا دعوی کر سکتی ہیں تو آج کے سائنسی ترقی کے دور میں اردو ادب تمام ملک کی اچھی روایات کا شاندار ورثہ کیوں نہیں بن سکتا؟! ہم کو پہلے انسان اور ہندوستانی بننا ہے اس کے بعد ہی ہم کچھ اور ہو سکتے ہیں۔

لوگوں نے خدا بنا ڈالے تو ہم اردو ادیب انسان کو انسان کیوں نہیں بنا سکتے۔ ؎

خدا ساز تھا آذر بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں (میرؔ)

پروفیسر سید احتشام حسین

اردو ادب اور قومی یکجہتی

قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی اصطلاحیں ابھی دو تین سال سے عام ہوی ہیں لیکن عملاً اور واقعتاً ہندوستانی زندگی کے بعض پہلوان کی آئینہ داری سیکڑوں سال سے کر رہے ہیں۔ انتشار کے ان لمحوں میں جب حیات قومی میں شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہوے ہیں تو عہد قدیم میں کسی مذہبی یا نیم مذہبی تحریک نے اور عصر جدید میں کسی سماجی، سیاسی یا انقلابی تصور نے اس انتشار پر فتح حاصل کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ عہد قدیم میں انتشار اور زوال کے مسائل آج کے مسائل سے مختلف ہوا کرتے تھے، اس سے بھی زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کا احساس مختلف حیثیتوں سے ہوا کرتا تھا کیوں کہ فرد اور جماعت طبقہ اور سماج، قوم اور قوم کے روابط کی نوعیت اس وقت وہ نہ تھی جو آج ہے سماج کی پیچیدگیاں اور زندگی کے مطالبات وہ نہ تھے جن سے آج واسطہ پڑ رہا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ فکر و نظر کے جدید نظریات ایسے تخلیقی اور تنظیمی امکانات سے آشنا کر رہے ہیں پہلے جن کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تعمیر و تشکیل کے نئے ذرائع ہاتھ آجانے کی وجہ سے "جنونِ تعمیر" اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ زندگی کے ان شعبوں میں بھی "منصوبہ بندی" کا عمل جاری کر دیا گیا ہے جن کا تعلق انسان کی جذباتی اور روحانی زندگی سے ہے، اس لیے علوم جدیدہ کی موجودگی میں یہ سوال یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ادب سے شعوری طور پر کس حد تک قومی تنظیم و تعمیر کا کام لیا جا سکتا ہے؟ اس سے وابستہ وہ سوالات بھی ہیں جو نفسِ فنکاری سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ادیب کی آزادی کا مسئلہ، فن اور پروپگنڈا، ادب کا مقصد ادب میں نظریہ کا مقام وغیرہ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان سوالوں کے جواب معین اور مقرر نہیں بلکہ انتہا پسندی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہت سی شکلوں میں پیش ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر باقی رہ جاتی ہے کہ ادب کسی نہ کسی حیثیت سے ان قدروں کا ترجمان بن جاتا ہے جن سے وابستہ رہ کر انسان بہ حیثیت انسان کے جینا اور مرنا چاہتا ہے۔ اسی میں اس کے انفرادی جذبات اور تصورات، قومی اور سماجی افکار اور بین الاقوامی یا آفاقی خیالات جگہ پاتے ہیں۔ اپنے شعور فن کے مطابق وہ ان سب کو تخلیقات میں سمو لیتا اور اپنی ذات، اپنے فن اور اپنے افکار کو دوام بخشنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ عمل دنیا کے ہر ادب میں اور ہر اچھے ادیب کے کارناموں میں جاری رہتا ہے۔ لسانی مجبوریوں، ادبی روایتوں

اور عصری تقاضوں کی وجہ سے لباس اور سانچے بدلتے رہتے ہیں لیکن بنیادی طور سے فن زندگی کے اندر حسن اور قبح، خیر اور شر، حقیقت اور فریب کی کشاکش کا ترجمان بنا رہتا ہے۔ گویا فن کے پردے کے پیچھے زندگی کی حسین تر، قوی تر اور بہتر شکل کو وجود میں لانے کی جنگ جاری رہتی ہے۔ اعلیٰ ادب کا مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ سے یہ حقیقت کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ادب میں فنکار اپنے بہترین وجود کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ یہ صورت حال فطری بھی ہے اور صالح بھی۔ اس لیے ادب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہ تو محنتِ رائگاں کی حیثیت رکھتا ہے نہ جستجوئے ناکام کی۔

ہر زبان و ادب کی طرح اردو زبان و ادب بھی مخصوص تاریخی حالات اور ذہنی ماحول کے پروردہ ہیں، ان کی ساخت اور پرداخت میں مختلف سماجی، مذہبی، تاریخی، اقتصادی، ذہنی اور فلسفیانہ عناصر نے حصہ لیا ہے۔ ان عناصر نے الجھاؤ بھی پیدا کیے اور سلجھاؤ کی صورتیں بھی نکالیں۔ ہندوستان کے قدیم دراوڑی اور آریائی عناصر میں عربی، عجمی، ترکی، منگولی اور افغانی عناصر کی آمیزش بعض حیثیتوں سے پانی میں تیل ملانے کی صورت رکھتی تھی، اور بعض دوسری حیثیتوں سے شراب میں شراب یا دودھ میں شکر ملانے سے۔ تیل پانی سے ملنا نہیں چاہتا، شراب شراب سے مل کر نیا نشہ پیدا کرتی ہے اور دودھ شکر میں آمیز ہو کر کام و دہن کی لذت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہندوستان جو پہلے ہی سے مختلف قوموں اور عقیدوں کا سنگم تھا، کئی نئی قوموں، تہذیبوں، زبانوں اور مذہبوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اقتدار اور برتری کی جدوجہد کے ساتھ اختلاط اور آمیزش توافق اور توازن کی جدوجہد بھی جاری رہی۔ دونوں حالتوں سے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، تاریخ کا مطالعہ کرنے والا دونوں قسم کے نتائج نکال سکتا ہے۔ چونکہ سارے ملک میں ایک قوم نہ تھی، ایک نسل کے لوگ نہ تھے ایک زبان نہ تھی، ایک عقیدہ نہ تھا، ایک معاشرت نہ تھی، ایک برسر اقتدار جماعت نہ تھی، ایک معاشی نظام نہ تھا، ایک آب و ہوا نہ تھی، ایک طرح کے قدرتی وسائل نہ تھے، ایک رنگ روپ نہ تھا اس لیے ہر زمانہ میں اتحاد و اتفاق کے مقابلہ میں اختلاف و انتشار کا پلّہ بھاری رہا کبھی انھوں نے نمایاں اور خطرناک شکلیں اختیار کر لیں اور کبھی تہہ نشین ہو گئے۔ کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر ان کا مداوا بھی ہوا لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی پورے اعتماد سے یہ کہنا کہ اختلاف اور اشتراک کی حدیں کتنی سمٹی اور کتنی وسیع ہوئی ہیں ناممکن ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں جو جدوجہد ہوئی ہے اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

اردو ادب بھی اس جدوجہد کی ایک علامت ہے، زندہ اور پائندہ۔ اس کی تاریخ سارے مرکز گریز اور اختلافی عناصر کی شدت کو مٹانے کی تاریخ ہے۔ اسی وجہ سے اردو ادب کا مورخ بڑی آزادی اور قوت سے یہ کہتا ہے کہ اس ادب نے قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے دشوار گزار راستے کو جس حد تک ہموار کرنے کی کوشش کی ہے اتنا کسی اور ہندوستانی ادب نے نہیں کی کیوں کہ اردو جس کشمکش میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی اور جن موافق اور مخالف پہلوؤں سے اس کی ترکیب ہوئی، دوسری زبانوں اور ان کے ادب کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ ملک کی دوسری زبانوں یا اُن کے ادبی کارناموں کو اردو کے مقابلہ میں کمتر بنا کر پیش کیا جائے، نہیں بلکہ صرف اس تاریخی حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ قومی اتحاد اور یک جہتی کی راہ میں کام کرنے کا جتنا موقع اردو کو ملا دوسری زبانوں کو نہیں ملا

کیونکہ نہ تو ان زبانوں کی تشکیل میں متضاد عناصر نے حصہ لیا تھا اور نہ اُن کے فنکاروں کو "شیخ و برہمن" دونوں کو ایک مرکز پر لانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مذہبوں، فرقوں، طبقوں، عقیدوں اور تہذیبوں کے اختلافی نشتروں کی باڑھ کند کرنے میں اردو نے غیر معمولی وسیع النظری سے کام لیا کیوں کہ وہ تاریخی حیثیت سے تہذیبی اختلاط کی وہ علامت تھی جسے قوموں کے میل ملاپ نے جنم دیا تھا۔ یہ بات ہندی، پنجابی، مہاراشٹری، بنگالی، گجراتی، تامل اور تلگو کے صوفی اور سنت شعراء کے یہاں بھی پائی جاتی ہے لیکن اردو میں اس کا اظہار مخصوص وسعتوں اور معنویتوں کا حامل ہے۔

اردو کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود بازار، دربار اور خانقاہ کا مرہونِ منت ہے۔ بعض دلچسپ اور غور طلب حقائق کی طرح یہ حقیقت بھی فکر انگیز ہے۔ بازار وہ عوامی ادارہ تھا جہاں انسانوں کی عام ضرورتیں پوری ہوتی تھیں خانقاہ کا دائرہ مسجد اور مندر سے دور وہ روحانی میکدہ تھا جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب ایک سطح پر ملتے تھے اور رگو دربار سے اس کا واسطہ اس وقت ہوا جب عوامی دباؤ کی وجہ سے امراء بھی اسے قبول کرنے پر مجبور ہوئے لیکن یہ بھی ایک بڑا ادارہ تھا جس سے جاگیردارانہ اور شاہی دور میں رابطہ رکھنا ناگزیر تھا۔ اس طرح اس وقت کے بندھے ٹکے نظامِ حیات کے سبھی اہم پہلو اردو کے دائرے میں آجاتے تھے۔ اس لیے جہاں ایک طرف اس میں تصوف بھگتی اور مذہبی مساوات کے جذبات کی فراوانی ہے، وہاں دوسری طرف وہ عوام کی ترجمانی کر رہا ہے اور تیسری طرف ان خیالات کی مظہر ہے جو جاگیردارانہ تہذیب کے زیرِ اثر وجود میں آسکتے تھے۔ اردو ادب میں یہ عجیب و غریب اختلاط برابر نظر آتا ہے اور ایک ایسی مخلوط تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جو نہ خالص عوامی تھی اور نہ درباری۔ امیر خسرو کی ساری عمر میں دربار میں کٹ گئی لیکن ان کا مزاج عوامی تھا، اگر وہ دربار کے لیے قرآن السعدین، نہ سپہر، ہشت بہشت فارسی میں لکھتے تھے تو پہیلیاں، دوہے، دو سخنے، انمل اور کہہ مکرنیاں ہندوستانی میں تصنیف کرتے تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دل کا ایک ٹکڑا گولکنڈہ کے تخت پر تھا دوسرا چنچل کی حسینہ بھاگ متی کے قدموں کے نیچے جو اس کے محل میں عوام کی نمائندگی کرتا تھا۔ نصرتی کو علی نامہ اس لیے لکھا تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کا حق نمک ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا تو منوہر مد مالتی کا قصہ زندگی میں محبت کی قوت کا اظہار کرنے کے لیے تصنیف کرتا تھا اردو کے بادشاہ شاعر ابراہیم عادل شاہ نے نورس کے گیتوں میں سرسوتی دیوی سے لو لگائی کہ اسے فن پر قدرت حاصل ہو تو دیا شنکر نسیم نے اپنے قلم کو حمدِ باری کے لیے وقف کیا اور اپنی انگلیوں کو مطلعِ پنجتن بنا لیا۔ ایسی جذباتی ہم آہنگی کی مثال دوسری زبانوں میں اس لیے نہیں مل سکتی کہ وہاں شیخ و برہمن، دیر و حرم کفر و اسلام، توحید اور شرک کے مسائل ہر وقت سنگِ راہ نہیں بنتے تھے اردو کا شاعر جب ان مسائل سے الجھن محسوس کرتا ہے تو ان کا حل عالمگیر انسانیت میں ڈھونڈھ نکالتا ہے جہاں مذاہب کے فرق مصنوعی معلوم ہونے لگتے ہیں اور انسان راہِ حقیقت کا ایک ابدی مسافر نظر آتا ہے۔ گھوم پھر کر اس کی نگاہ انسان ہی پر جاتی ہے

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو اُن نے تو ۔۔۔ قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کعبہ و دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں ۔۔۔ گردش کا فرو دیندار لیے پھرتی ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ۔۔۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا ٭ واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں
وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے ٭ مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں ٭ اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا اس مشت خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی اہل نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

یہ تو قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے حاصل کرنے کا بنیادی پہلو ہے ورنہ ظاہری طور پر تو اردو شعراء نے قومی زندگی کے ام پہلوؤں کو موسموں، تیوہاروں، میلوں، پھولوں، رسموں، تہذیبی طور طریقوں، دیومالائی کرداروں اور تلمیحوں کو اپنی شاعری ں جگہ دی اور وہ فضا پیدا کی جو بنتی ہوئی مخلوط تہذیب کی ترجمان تھی اردو شاعری کے بنیادی موضوعات انسانی ہیں کبھی اس ںمی رنگ چڑھ جاتا ہے کبھی ہندوستانی، کبھی مذہبی استعاروں میں گفتگو ہوتی ہے کبھی انسانی، لیکن گہری نظر سے دیکھنے لے کو یہ محسوس ہوگا کہ یہاں شعوری طور پر اشتراک کے مراکز تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دکنی مثنویوں سے لے کر لکھنو ے کی مثنویوں میں اگر کردار مسلمان ہیں تو اُن کے عادات و اطوار، خیالات اور جذبات ہندوستانی سانچے میں ڈھلے ہوئے یا، مرثیوں تک میں جن کا موضوع ہندوستانی نہیں ہے، فضا اکثر ہندوستانی ہوگئی ہے جسے بعض نقاد اس کے عیوب میں شمار رتے ہیں۔ داستانوں میں ذکر فرضی اور خیالی اسلامی ممالک کا ہے لیکن عموی طور پر ہندوستان ہی کی مصوری ہوتی ہے انت کی اندرسبھا کا گلفام ہندوستانی لباس میں مغل یا ایرانی شہزادہ ہے۔

یہاں جدید شاعری کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے کیوں کہ اس زمانے میں وطنی اور قومی تحریکات نے قومی یکجہتی کے ساس کو شعوری بنا دیا ہے۔ نئے معاشی، سیاسی اور فلسفیانہ تصورات نے انسانی مساوات اور باہمی تعاون کا سبق دیا ہے۔ عہد قدیم میں یہ سہارے نہ تھے پھر بھی اردو کے شاعر اور ادیب ایک ایسی دنیا کے لیے بے قرار تھے جو "فلک کینہ پرور" ستم سے آزاد اور محفوظ ہو، ظلم و ستم سے پاک اور محبت سے آسودہ حال ہو۔ آج کی اصطلاحات اور آج کے عمرانی تصورات ں قومی یکجہتی کا مطلب ہوگا ایک قومی نصب العین کی خواہش، نفسیاتی ہم آہنگی، احساس یگانگت، باہمی اشتراک، تعمیریات ں عملی مشارکت، مساوات کی بنیاد پر مختلف عناصر کا تعاون ــــ عہد قدیم میں اس کا مفہوم تھا مذہبی تنگ نظری سے پرہیز بت اور اخوت کی بنیاد "جیو اور جینے دو" کی خواہش محبت کا احترام اور دوسروں کی خوشی اور غم میں شرکت۔ حقیقتوں ے لباس مختلف ہیں۔ معنویت وہی ہے اور ضرورت وہی ہے، اردو ادب عمومی انداز میں پہلے بھی انھیں جذبات اور تصورات ی آبیاری کرتا تھا اور آج بھی کر رہا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا مطلب یہ ہیں ہے کہ ایک عقیدہ دوسرے عقیدے پر، ایک خیال دوسرے خیال پر، سماج کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ پر، ایک زبان دوسری زبان پر، ایک علاقہ دوسرے علاقہ پر غلبہ اور تسلّط حاصل کر لے اور دوسرے کی انفرادیت کو اپنے اندر ضم کر لے تو اس کی روح کے منافی ہوگا اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان اختلافات کے باوجود قومی نصب العین اور نفسیاتی فضا

ایک ہو، اور یہ بات مکمل آزادی اور سماجی انصاف کے بغیر ممکن نہیں ہے اور ادب کے ایک بڑے حصے نے اسی نصب العین کے لیے جد و جہد کی ہے، اور اس لیے نہیں کی ہے کہ اسے اس کے لیے مجبور کیا گیا بلکہ اسے یہی راستہ صحیح اور مناسب معلوم ہوا۔

بعض انفرادیت پسند ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ قومی یک جہتی کے متعلق لکھنا پروپگنڈے کے حدود میں آتا ہے، فن کو فن باقی نہیں رکھتا اور ادیب کی آزادی کو مجروح کرتا ہے۔ یقیناً یہ مسائل غور طلب ہیں لیکن اس میں جبر اور مجبوری کا کوئی سوال نہیں ہے۔ احساس اور ضمیر کی آزادی انتخاب کا سوال ہے، اپنے دور کی حقیقتوں کی طرف ایک مثبت اور صحت مند رویہ کا سوال ہے۔ مجبوری کسی قسم کی نہیں ہے۔ یہ دنیا کے اعلیٰ ادب کی روایات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کا مسئلہ ہے جن کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترجمانی، شر پر خیر کی فتح اور ظلم و جبر کے مقابلہ میں عدل و انصاف کی جیت پر ہے، وہ سارے شاعر و ادیب جن کے دل و دماغ صحت مند اور انسانیت دوست جذبات و خیالات کے حامل ہیں، اپنی خوشی اور آزادی سے اسی راستہ کا انتخاب کریں گے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

اردو ادب اور قومی یکجہتی

اس سے قبل کہ قومی یک جہتی کے سلسلے میں اردو زبان و ادب کا جو حصہ رہا ہے یا ہو سکتا ہے اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔ ہندوستانی قومیت کے اس نئے تقاضے اور اردو صحیفہ نگاری کی اس جدید اصطلاح کا واضح تصور ذہن میں قائم کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قومی یک جہتی کا چرچا، حال میں اس قدر عام کس لیے ہوا؟ یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ہماری قومی زندگی میں بعض تخریبی عناصر موجود ہیں۔ کچھ ایسی طاقتیں کام کر رہی ہیں جو اس ملک کی وحدت کو پارہ پارہ کر دینا چاہتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں قومی وحدت پر زور دینے کی ضرورت اس وجہ سے اور زیادہ محسوس ہوئی کہ بعض فرقہ وارانہ لسانی اور ذات پات کے جذبات آزادی کے بعد شدت سے ابھر آئے ہیں اور ہماری قومی قیادت نے اس بات کا پورا اندازہ کر لیا ہے کہ اگر آستین کے ان سانپوں کا سر بروقت نہ کچل دیا گیا تو یہ ملک دوسرا البقان بن جائے گا۔

قومی یک جہتی کے بارے میں مختلف نظریے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایک نقطہ نظر "یک رنگی" کا بھی ہے۔ آج کثرت سے ایسے رجعت پسند موجود ہیں جو تاریخ کے پہیے کو دو ڈھائی ہزار برس پیچھے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ کثرت کو مٹا کر وحدت قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن جو لوگ اپنی تہذیبی تاریخ کا ایک غیر جانبدارانہ اور متوازن نقطہ نظر رکھتے ہیں وہ "یک رنگی" پر "جلوۂ صد رنگ" کو ترجیح دیتے ہوئے "ہر رنگ میں بہار کا اثبات" چاہتے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہماری قومی یک جہتی کی اعلیٰ کونسل نے پنڈت نہرو کی قیادت میں "کثرت میں وحدت" کو قومی یک جہتی کی اساس قرار دیا ہے۔ چنانچہ اردو زبان کی بقا اور ارتقا کا جواز اسی نقطہ نظر سے تلاش کیا جائے گا۔

اردو زبان و ادب ازقدیم تا حال کثرت میں وحدت پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ رہا ہے۔ اس زبان کی پیدائش ایک غیر شعوری لسانی سمجھوتے سے ہوتی ہے۔ یہ سمجھوتہ اسلامی ایرانی اور ہند آریائی زبان کی ایک نمائندہ بولی کے درمیان صدیوں کے تاریخی عمل کے زیر اثر ظہور پذیر ہوتا رہا ہے اور پھر اس مکمل طریقے پر کہ صوتیات کی سطح سے لے کر صرف و نحو بلکہ اسالیب بیان تک ہر جگہ باہمی لین دین کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس ریختہ و آمیختہ زبان نے بہت جلد بدیسی فارسی کو سرکار دربار سے خارج کر دیا، اور تقریباً ڈیڑھ سو برس تک (۱۷۵۰ء تا ۱۹۰۰ء) بلا استثنائے مذہب و ملت یہ لاہور تا پٹنہ اور دہلی تا حیدرآباد علمی و تعلیمی و ادبی زبان کی حیثیت سے رائج رہی۔

اردو نے کافی عرصے تک نہ صرف قومی یک جہتی کی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ بلکہ یہ کسی حد تک عالمی یک جہتی کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ قومی یک جہتی کے ذکر میں ہمیں یہ نہیں بھول جانا چاہیے کہ اردو ہندی نژاد ہوتے ہوئے مشرق وسطیٰ کی تہذیبی و لسانی اثرات کی آئینہ دار بھی ہے عربی زبان اور اسلامی تہذیب جن کی مشرق میں توسیع کا سلسلہ آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے ثقافتی عروج پر عہد مغلیہ میں پہنچتی ہے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی ہندوستان کو سلطنت مغلیہ کی سب سے بڑی دین تاج محل، غالب اور اردو زبان ہیں۔ اردو نہ صرف ہندوستانی قومیت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے بلکہ اس ملک کی دوسری زبانوں پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایشیائی یک جہتی کی نمائندہ زبان ہے۔

اردو زبان کی اس قومی اور بین قومی حیثیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر اس کے قدیم و جدید ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس پر یہ الزام بے بنیاد ہو جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی "سنسکرتی" سے تہی اور اس ملک کی بو باس سے عاری ہے۔ اردو بنیادی طور پر ہندوستانی تہذیب کے ازمنۂ وسطیٰ کی ترجمان ہے۔ حسن و محبت کے جو انداز، گل و گلاب و بلبل کے جو چرچے، ہجر وصال کے جو لطیفے، چاؤ اور بھاؤ کے لبھاؤ اس وقت عام تھے اردو ادب ان سب کا ترجمان رہا ہے، اِن جو لوگ ازمنۂ وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب کے منکر ہیں اور اس ملک کی تاریخ کو خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ انھیں اردو ادب کے کرداروں میں بہت سے اجنبی چہرے اس کے چمن میں بہت سے بدیسی پھول اور اس کے نگار خانے میں بہت سی نئی تصویریں نظر آئیں گی اور اس کے برعکس وہ لوگ جو تاریخ کے تسلسل پر نظر رکھتے ہیں مظاہر کی کثرت میں ہندوستانی روح کی وحدت کی پرکھ جانتے ہیں انھیں سو رنگوں میں ایک ہی مضمون نظر آئے گا۔

اردو ادب کا آغاز شمالی ہند سے بہت دور دکن میں ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کا اردو ادب ہندوستان اور ہندوستانیت سے یکسر مملو ہے۔ اس کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا دیوان اٹھا کر دیکھ لیجئے، دکن کے رنگ اور بو باس سے بھرا پڑا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ بسنت کا بھی رسیا ہے اور شب برات کا بھی۔ اس کے حسن کے سوالوں میں گوری بھی ہے اور سانولی بھی۔ اس کی شاعرانہ تشبیہات کا ماخذ ارد گرد کا ماحول ہے۔ ہندی زبان کے البیلے پن کا کیا با کمال استعمال کیا ہے۔

ہندی چھوری کا سراپا ان الفاظ میں کھینچتا ہے،

رنگیلی سائیں تھے نور رنگ بھری ہے　　　سگڑ سندر سہیلی گن بھری ہے
لٹکنا بجلی نینے اَسس سہاوے　　　وو ہندی چھوری بھو چند سُہری ہے

اردو شاعری تا حال زمین سے قریب تر تھی۔ میدان شعر میں ولی کے داخلے سے ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوتا ہے یعنی فارسی کی نقل میں یا یہ پہلی بار "فلک رفتار" بنتی ہے اور تصوف کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے تصوف کو بعض نقادوں نے نہایت مشتبہ نگاہوں سے دیکھا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عربی اسلام اسی کی پُر پیچ راہوں سے گزر کر ایک نیا انسانی مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے بحث نہیں۔ عقیدۂ روحانی کی سطح پر یہ عربی تصورات کا غیر عربی تصورات سے سمجھوتہ تھا

جس کا پہلا خاکہ عجم کے لالہ زاروں میں تیار ہو چکا تھا۔ سرزمین ہند میں ویدانتی فلسفہ سے اس کو تائید ملتی ہے اور پھر اس سرزمین میں یہ توسیع واشاعت کا زبردست ذریعہ بن جاتا ہے۔ وحدت الوجود، مابعد الطبیعات پر ہو یا سیاسی سطح پر، ہندوستانی تہذیب کی اساس رہا ہے۔ مظاہر کی رنگا رنگی میں وحدت کا راسخ رہنا، ہندوستان کی نسل انسانی اور مذہبی صد رنگی کا واحد حل تھا۔ چنانچہ ولی جو شاعر ہونے کے علاوہ بلند پایہ صوفی بھی تھے، شیخ و برہمن اور دیر و حرم کے جھگڑوں سے گزر کر اردو شاعری کو ایک ایسی ابدی صداقت عطا کر گئے، جو جزمیں کل اور قطرے میں دجلہ کا منظر آنے والی تمام نسلوں کو دکھاتی رہی۔

مجھ لکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری اے بت کی پجن ہاری اس بت کو پجاتی جا

شیخ و برہمن اور دیر و حرم کا جو تلازمہ ولی نے اردو غزل کو عطا کیا وہ ہندوستانی تہذیب کی آزاد روح کے عین مطابق تھا۔ دراصل یہ ازمنہ وسطیٰ کی تہذیب کا محور رہا ہے۔

ناسخ کی تحریک اصلاح زبان اور غالب کے منفرد اسالیب شعری کی وجہ سے اردو زبان و شعر کے اجزائے ترکیبی میں خاصا رد و بدل ہوا لیکن اس زمانے میں بھی ہندوستانیت کی ایک زریں لہر ہمارے ادب میں قائم رہی جس کی بہترین مثال نظیر اکبرآبادی کی شاعری ہے۔ نظیر صحیح معنوں میں عامی اور عوامی شاعر تھے۔ ان کی سماجی شاعری اپنی "سدھکڑی" زبان کے باوجود ہندوستانی تہذیب کی یکسنہجتی کے عناصر کو حسن و خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ تہذیبی لحاظ سے وہ اس مقام پر تھے جہاں جوگی اور صوفی کی آواز ایک ہو جاتی ہے۔ میلوں ٹھیلوں اور بازار کی گہما گہمی میں وہ نہ ہندو تھے اور نہ مسلمان بلکہ آگرہ کے ایک آزاد منش سیلانی جس کے لیے بسنت اور عید دونوں میں کشش تھی، جس کے تہذیبی کمالات کا محور تل کے لڈو، نارنگی، گورا برتن، آگرہ کی ککڑی، تربوز اور پیراکی کے میلے تھے جو حیات کے بنجارہ پن پر ہر لحظہ نظر رکھتے ہوئے بھی اپنی "دنیامیت" سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔

جدید اردو ادب میں قومی یکجہتی کا سب سے اہم عنصر ترکیبی حب وطن کا جذبہ ہے جو مختلف تصویروں کی شکل میں کبھی کبھی قدیم اردو ادب ملتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو ادب ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ ہندوستانی قومیت کی تحریک کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے ربع آخر سے اردو میں حب وطن کے ترانے گائے جانے لگے تھے۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ غالب نے قفس کے استعارے میں قید فرنگ کی شدت کو کس حد تک محسوس کیا تھا لیکن یہ امر یقینی ہے کہ حالی کی نظم "حب وطن" کا ہر مصرع اس گہری محبت کا غماز ہے جو اردو کے شاعر کو اپنے وطن سے رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر خراج تحسین خاک وطن کو اور کیا دیا جا سکتا ہے۔

تیری اک مشت خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی کے اس جذبہ حب وطن کے پس منظر میں قائد عصر سر سید احمد خاں کا وہ وسیع المشربی کا تصور تھا جو اس ملک کو ایک دلہن تصور کرتا تھا جس کی ایک آنکھ ہندو تھی تو دوسری مسلمان ہر صورت میں ایک کا زیاں اس دلہن کو

کانا اور دوسری کا اس کو سبھینگا بناتا ہے۔ سر سید کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا محور یقیناً مسلم اقلیت تھی لیکن ان کی کوشش اور کاوش تمام تر قومی یک جہتی کے اس خاکہ کے اندر تھی جس کا ذکر ابھی استعارہ کی زبان میں کیا جا چکا ہے۔

سر سید و حالی کی اس روایت حب وطن کو اقبال نے اپنی وطنی اور قومی شاعری کے دور میں شد و مد کے ساتھ جاری رکھا۔ چوں کہ ان کی نظر زیادہ فلسفیانہ تھی اس لیے وہ ہندی قومیت کے اجزائے ترکیبی یعنی مشترک جغرافیائی حدود، مشترکہ تاریخ اور مشترک تہذیبی آثار کا ذکر اس دور کی شاعری میں زیادہ تفصیل سے کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر وطن کی آزادی کا مسئلہ بھی تھا اور ہندو مسلم اتحاد بھی۔ ان موضوعات پر ان کی نظمیں "ترانہ ہندی"، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ہمالہ، نانک اور رام قابل ذکر ہیں لیکن جو دل سوزی "نیا شوالہ" کے ان اشعار سے جھلکتی ہے وہ اقبال کے عظیم وطنی و قومی شاعر ہونے کی سچی دلیل ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

جس کا منتہا اس شعر پر پہنچتا ہے:

پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آخری شعر کی زبان اور استعارے میں شاعر اسلام کی برہمن نسبی جس طرح ابھر آئی ہے وہ لائق توجہ ہے۔ سر سید، حالی اور اقبال کی تحریروں میں قومیت اور وطنیت کا جذبہ انسانیت کی آواز بن کر ابھرا، اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں اسے نوشیں گوارا میں تبدیل کر لیا اس طرح کہ گائے اور زبان کا مسئلہ ان کے یہاں گاؤ زبان کا نسخہ بن جاتا ہے:

جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی کبھی بحث ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زبان

اکبر کے یہاں نہ صرف اسلامیت بلکہ ہندوستانیت مغربیت کے علی الرغم اپنے تمام سماجی مظاہر میں شدت کے ساتھ نمودار ہوتی ہے اسی لیے ان کی شاعری کے کرداروں میں شیخ و برہمن بھی ہیں اور سید و پنڈت بھی، لیکن ان میں سے ہر ایک "برق کلیسا" کے مقابلہ میں "ہند کی پریوں" کے ناز و ادا پر جان دیتا ہے۔ دیر و حرم، مسجد و مندر کا اختلاف مسلم لیکن یہ بھاپ اور انجن، ڈارون اور انجیل کے خلاف پشت دیوار بن جاتے ہیں۔ تہذیبی سطح پر قومی یک جہتی کی جو مثال اور اور مغربی تہذیب کو جو چیلنج اکبر کے یہاں ملتا ہے اس کی مثال ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے ادب میں بمشکل ملے گی اکبر کی آواز آج سر سید کے اصلاحی نقار خانوں میں طوطی کی آواز سمجھی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اکبر ناکام اور سر سید کامیاب رہے، بلکہ جدید ہندوستان کے تہذیبی ارتقاء کی سمت راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں کے افکار ہی سے متعین ہوتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اکبر ہوں یا سوامی دیانند سرسوتی ان کی منفی و اصلاحی تحریکات نے ہمارے تہذیبی ارتقا کی رفتار کو ایک مخصوص توازن بخشا ہے ورنہ شاید آج ہم بھی ایشیا کی ایک اور قوم یعنی ترکی کی طرح مغرب کے ایک ایسے نقال بن کر رہ جاتے جسے نہ مشرق قبول کرتا ہے نہ مغرب اور جو آج توازن

کی تلاش میں دار و رسن کے حلقوں سے بے تحاشہ گزر رہی ہے۔

اکبر کی مشرق پسند شاعری میں قومی یک جہتی کے ایک سے زائد پہلو پائے جاتے ہیں:۔

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

"آزادی ہند" اس صدی کے آغاز میں ہماری قومی شاعری کا سب سے اہم موضوع رہا ہے جس طرح حب وطن کے سلسلے میں حالی اور اقبال کے ساتھ سرور جہاں آبادی کا نام بھلایا نہیں جاسکتا جن کی شاعری میں حب وطن "ماتر بھومی" کے مذہبی تصور کی شکل میں ابھرتا ہے۔ چکبست کا سیاسی شعور اگرچہ "ہوم رول" سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن قومی یک جہتی کے تخریبی عناصر کا حل وہ آج سے بہت پہلے ڈھونڈ چکے تھے۔

اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شان مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں
بلائے جاں ہے یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

علی برادران اور رہنما گاندھی کی قیادت میں ۲۱-۱۹۲۰ء کی تحریک ترک موالات ہماری قومی یک جہتی کا نقطۂ عروج رہا ہے۔ اس کے آس پاس کا اردو ادب جو ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، پریم چند اور رومانی شعرا بالخصوص اختر شیرانی، حفیظ جالندھری کے کلام پر مشتمل ہے۔ کئی لحاظ سے ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب سے ممتاز ہے۔ اس دور میں اردو ہندی کی حریفانہ چشمک بھی شروع ہو گئی تھی لیکن اردو پر ابھی تک فرقہ واریت کا الزام عائد نہیں ہوا تھا۔

اس زمانے میں پریم چند کی ذات عرصے تک دو لسانی خلیج کے درمیان رشتے کا کام کرتی رہی اب تک اردو کا منظوم و نثری افسانوی ادب شہر اور شبستان تک محدود تھا۔ پریم چند نے اسے ہندوستان کی اس وسیع زندگی سے روشناس کرایا جس کی کوئی تصویر ہمارے ادب کے مرقع خانے میں نہیں ملتی تھی۔ لسانی سطح پر افسانوی ادب کے لیے ایک ایسے اسلوب کی داغ بیل ڈالی جسے بلا تکلف اردو کا بنیادی اسلوب کہا جاسکتا ہے۔

سیاسی تصورات سے قطع نظر اگر اس دور کی فکری سطح کا جائزہ لیا جائے تو اقبال کی شاعری اردو زبان کا عظیم ترین نقش بن کر سامنے آتی ہے۔ اقبال کے کلام کو بعض حضرات دو خانوں میں تقسیم کر کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کی قومی اور وطنی شاعری اور دوسری جانب ملی و اسلامی کلام۔ اقبال کی ملی شاعری کو کسی مخصوص فرقے سے مخصوص کر دینا ان کے حق میں سخت ناانصافی ہے۔ فکر اقبال دراصل اسلام کی ایک انسانی مطمح نظر سے ترجمانی کر کے اسلام اور انسانیت کو ہمدگر کرنے کی ایک زبردست ذہنی کاوش ہے جس کے محور پر ایک عالمی یک جہتی کا پروگرام تیار کیا جاسکتا ہے

اقبال یقیناً اس بات پر مجبور تھے کہ وہ اپنی شاعری کے استعارے اور علائم ایک مخصوص تہذیب سے اخذ کریں لیکن اس سے ان کی فکر کی انسانیت دوستی پر کہیں حرف نہیں آتا۔ اقلیت کی زبان و تہذیب کے تحفظ کا دم بھرتے ہوئے اور "دین از وطن است" کی بوالعجبی کا تذکرہ کرتے ہوئے وطن کی محبت سے مرتے دم تک سرشار رہے۔

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحر پُر آشوب ہے پایاب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

حسرت عشرت نے تمام عمر اپنے اشکوں سے خاک ہند کی آبیاری کی ہو اس کو غلط سمجھ کر دوسروں کے حوالے کر دینا اس کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہو کر آزاد ہوا تو ہندوستان کی سیاست نئے محوروں پر رقص کرنے لگی۔ "ہندوستانی" کا جو خواب ایک مہاتما، ایک پنڈت، ایک مولانا نے برسوں تک دکھایا، وہ دیکھتے دیکھتے خواب پریشاں میں تبدیل ہو گیا۔ ادب کا تو ذکر کیا خود زبان ایک نئی زد میں آ گئی۔ اس ملک میں اردو کی نئی حیثیت کا تعین کیا گیا۔ اس کی حالت دراصل بدل گئی۔ اس کا دستوری اعزاز قائم رہا لیکن اسے وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو آئین کی رو سے تیرہ اور علاقائی زبانوں کو حاصل ہے۔ جو زبان کئی صدیوں تک قومی یکجہتی کا نشان بنی رہی اس کے مقام میں ایک نمایاں تغیر واقع ہوا۔ کیا عجب اگر اس کے سخنور اس تلخ نوائی کا شکار ہو گئے۔

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا   بہار میرے لیے اور میں تہی دامن

لسانی اقلیت کی یہ تہی دامنی کہ اس احساس سے قومی یکجہتی کے جذبہ کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے اردو ادیبوں کی سوئی ہوئی انسانیت کو بے طرح جھنجھوڑا تھا جس کے بہترین آئینہ دار اس دور کے تیر و نشتر افسانے ہیں جو کرشن چندر کے قلم سے برآمد ہوئے۔ وہ ایک بات جس کا ان تمام فسانوں میں تفصیل سے ذکر ملتا ہے غزل کے ایک شعر میں مجمل طور پر یوں نمودار ہوئی ہے:-

کسے بتائیں کہ دیر و حرم کی راہوں میں   تمہاری زلف پہ اور اپنے سر پہ کیا گزری

رفتہ رفتہ حالات معمول کے مطابق ہوتے گئے لیکن ماضی کے چھوڑے ہوئے کچھ مسائل اور معاصر حالات کے منفی عوامل نے لسانی اقلیتوں میں ایک ذہنی گھٹن کو جنم دیا۔ ذہن کی تلخی دل تک پہنچنے لگی۔ موجودہ اردو ادب اس کا مکمل طور پر ترجمان ہے۔ اس دور کے تقریباً ہر ادیب اور شاعر نے اس بے بسی کو محسوس کیا۔

اس دور میں زندگی بشر کی   بیمار کی رات ہو گئی ہے

اردو ادب کے سامنے فی الحال قومی یکجہتی کے پہلو بہ پہلو ایشیائی بلکہ عالمی یکجہتی کے جو کینڈے میں مشکل ہوگا

یہ عالمی یک جہتی یقیناً جلوۂ صد رنگ سے عبارت ہوگی لیکن مخصوص تاریخی عوامل کے ذریعہ ایسے عناصر پر زور روز بروز بڑھتا جائے گا جو عالمی وحدت کی جانب رہبری کرتے ہیں. قومی یک جہتی تاریخ کی ایک اشد ضرورت ہے لیکن اس کا ناعاقبت اندیش اشخاص یا جماعت نے اپنے محدود و تنگ مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہا تو اس کا حشر وہی ہوگا جو یو این او کے باوجود عالمی یک جہتی کا ہو رہا ہے.

اردو کے موجودہ ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ ان کی نظر اس پر بھی رہے اور اُس پر بھی۔ دراصل معاشرہ کے تمام دائرے پرکارِ وقت انفرادیت کے نقطہ سے کھینچتا ہے. اس لیے ذات، خاندان اور فرقہ کے محدود دائروں سے لے کر اخوت کے عالمگیر محیط تک ہر ایک اپنے اپنے مقام پر ایک مثبت حقیقت کا حکم رکھتا ہے. ان کا امتزاج و اتصال داخلی ضرورت کے تقاضوں کی بنا پر ہونا چاہیئے نہ کہ خارجی سیاسی دباؤ اور جبریت سے. ہندوستان میں اردو زبان و ادب ایک ترکیبی تہذیب کے بہترین ترجمان رہے ہیں. اس کے شاعروں نے فتنہ و فساد کے پُرآشوب دور میں بھی یہ شہادت دی ہے.

قتلِ آدم کا میں الزام صنم کس کو دوں
تیرے ابرو پہ بھی ہے بر سرِ محراب بھی ہے

مغنی تبسم

اُردو شاعری اور قومی یکجہتی

ہمارا ملک ہندوستان بھانت بھانت کی نسلوں، تہذیبوں اور زبانوں کا وطن ہے۔ اس دیس کے باسی مختلف مذہبوں کے پیرو اور جدا جدا مکاتیب کے حامی ہیں لیکن جلوؤں کی یہ فراوانی انتشار و افتراق کی مظہر نہیں ہے۔ ان الوپ روپوں میں ایک ہی حسن جھلکتا ہے۔ اس رنگا رنگی میں خاص کیفیت ہے جو بے اختیار زبان سے کہلوا دیتی ہے کہ

ع ۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

صاحب نظروں نے اس دولت بیدار کو دیکھا اور دکھایا۔ نقاشوں اور مصوّروں نے اس کے مرقعے کھینچے، شاعروں نے اس کی مدح سرائی کی اور مغنیوں نے اس کے گیت گائے۔

اردو زبان کے شاعر اس قدر شناسی میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انھیں اپنے وطن کے چپہ چپہ سے محبت تھی اور رہے انھوں نے یہاں کے دریاؤں، پہاڑوں، درختوں، پھلوں، پھولوں اور موسموں کی کیفیات کو اپنی منظریہ اور بیانیہ شاعری کا موضوع بنایا۔ اس ملک کے رسم و رواج، تیوہاروں، میلوں ٹھیلوں پر نظمیں لکھیں۔ دھرتی کے اس حصے سے اپنے اٹوٹ رشتے کو پہچانا اور حبِّ وطن کے گانے گائے۔ انھوں نے ہر دور میں قومی وحدت کے نظریے کا پرچار کیا جس کی زندہ یادگار خود ہماری اردو زبان ہے۔

جب عالمگیر کے نااہل جانشینوں کی ناعاقبت اندیشیوں اور خود غرض امرا کی ریشہ دوانیوں کے سبب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر گیا، اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں نے دہلی کو تاراج کر دیا۔ لوگ بے خانماں ہو گئے، بھوک اور بیروزگاری نے خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا، نظم و نسق کی ابتری کی وجہ سے جان و مال کی حفاظت غیر یقینی ہو گئی، ہر طرف لوٹ اور غارتگری کا بازار گرم ہو گیا تو ایسے وقت اردو کے شاعر دور کے تماشائی نہیں بنے رہے۔ انھوں نے اس وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور اپنی شاعری کو اس دور کے مسائل کا ترجمان بنا دیا۔ غزل گو شاعروں نے بھی اپنے عہد کی کشمکش کا اظہار رمز و ایما کے پیرایہ میں کیا ہے اور جب غزل کی ایمائیت مافی الضمیر کے اظہار میں مارج ہوئی تو انھیں شاعروں نے شہر آشوب اور ہجویں لکھیں۔

انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی نے فرقہ وارانہ عصبیت اور جماعت بندی کو ہوا دی لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے قومی یکجہتی کی شمع کو گل ہونے سے بچا لیا۔ انگریز اس کے بعد بھی اپنی [illegible]

میں پھوٹ اور نفاق پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انھوں نے رجعت پسند تحریکات کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔ اس کے باوجود قومی رہنماؤں نے حریت اور آزادی کی جو مشعل جلائی تھی وہ بجھ نہ سکی۔ اس دور میں اردو شاعروں نے بھی قومی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ انھوں نے وطن دوستی کے جذبات کو ابھارا اور اتحاد و یگانگت کی ترغیب دلائی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادیٔ وطن کی تحریک ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گئی اور بالآخر وہ یادگار دن آپہنچا جب سامراج کی غلامی کا جوا ہندوستانیوں کے کندھوں سے اتر گیا۔ یہ ہماری زندگی کا سب سے طربناک لمحہ تھا لیکن سامراج کی گہری سازش اور غداران قوم کی مفاد پرستی نے اس مسرت کو زخمی کر دیا۔ درندوں نے معصوموں کے خون سے ہولی کھیلی اور عصمتوں کو سر بازار نیلام کیا۔ آخر ملک و قوم کے سب سے بڑے محسن گاندھی جی نے قومی اتحاد کی خاطر اپنی جان عزیز کو قربان کر دیا۔ مہاتما کی شہادت نے سارے ملک کو سوگوار بنا دیا۔ اس زمانے میں اردو شاعری نے قوم کا مسیحا بن کر ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا اور مایوس نگاہوں کو امید کی روشنی دکھائی۔

اس سیل بلا کے گزر جانے کے بعد جب حالات اعتدال پر آگئے تو اہل ہند نے محسوس کیا کہ آزادی کی حفاظت کا کام آزادی حاصل کرنے سے کہیں زیادہ کٹھن ہے۔ سیاسی آزادی کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ ملک کو اقتصادی اعتبار سے خود کفیل بنایا جائے — اپنے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی ہوشمندانہ قیادت میں ہم نے اپنے دو قومی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس قلیل مدت میں بھارت نے زرعی اور صنعتی اعتبار سے جو ترقی کی ہے وہ دوسرے نو آزاد ملکوں کے لیے باعث رشک ہے۔ جہاں ایک طرف ہم نے اپنے مختلف داخلی مسائل کو خوشگوار فضا میں حل کیا وہیں اپنی غیر جانبدارانہ پر امن بقائے باہم کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ممالک عالم میں ذی عزت مقام حاصل کر لیا۔

شاید ان آزمائشوں میں کچھ کسر باقی رہ گئی تھی کہ ستم ظریفیٔ دوراں کو پھر ایک بار ہماری وطن دوستی، جانبازی اور سرفروشی کا امتحان لینا منظور ہوا۔ ہمارے ملک پر چین کا جارحانہ اقدام دوررس مضمرات رکھتا ہے۔ یہ محض سرحدی تنازعہ نہیں ہے بلکہ امن عالم کے خلاف ایک گہری سازش ہے، ایک بے مہار قوم کی غیر ارادی لغزش نہیں ہے بلکہ عالمی میزان قوت کے پلڑوں میں اپنے کیف و کم کو تول کر غاصبانہ جبر کے ذریعہ توسیع پسندی اور ملک گیری کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ چین کے اس اقدام نے ہماری قومی حمیت کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا ہے اور ہندوستانی عوام آخری لمحۂ زیست تک مقاومت اور مجادلت کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔

اس سیاسی بیداری کے پیدا کرنے میں قومی رہنماؤں کی مدبرانہ حکمت عملی کے ساتھ ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کا بھی قابل لحاظ حصہ رہا ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات کا بھرپور اظہار کیا۔ اردو میں آج سے پہلے کسی موقعہ پر اتنی بڑی تعداد میں رجز نہیں لکھے گئے تھے۔

اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ چینی حملے کے فوری بعد قومی اتحاد کے جو دل خوش کن مناظر دیکھنے میں آئے وقت کے ساتھ ان کی تابانی کم ہو گئی۔ شخصی اور جماعتی مفادات کی تکمیل کے لیے غرض مندانہ اختلافات نمایاں

ہونے لگے۔ اس دور میں سرمایہ دار طبقہ، رہبر نما قوم فروشوں اور بیوروکریسی کا غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل رہا ہے وہ قابلِ مذمت ہے۔ اس کے تدارک کے لیے جلد از جلد کوئی قدم اٹھانا فروری ہے تاکہ قومی یک جہتی کی عمارت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جا سکے۔ ورنہ حالات کے بدلنے پر یہ جذبہ حب الوطنی بھی سرد پڑ جائے گا۔

اس موقع پر ہم اپنے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اس بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ آج کے حالات میں ان کا کام صرف ڈھول پیٹنا اور نعرہ بازی نہیں ہے۔ انھیں چاہیے کہ جذباتیت کی سطح سے بلند ہوں، اپنے فن کو فکر، تجربہ اور مشاہدہ کی آنچ میں تپا کر کندن بنا دیں اور طبع کاری کے الزام سے بچیں، وقتی مسائل پر بھی دیر پا ادب کی تخلیق ممکن ہے۔ اس کی مثال ہمارے اسلاف کے وہ ادبی اور شعری کارنامے ہیں جن میں آج بھی تازگی جھلکتی ہے۔

اگلے صفحات میں قومی اور وطنی نظموں کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے جو نمائندہ تو ہو سکتا ہے لیکن مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ ہمیں "صبا" کی تنگ دامانی کا افسوس ہے۔

نظمیں

قومی ترانے

قومی رہنما

قومی اتحاد

حبِ وطن

بہادر شاہ ظفر

دکھی کی پکار

(بہادر شاہ ظفر کی وہ غزل جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کا قومی ترانہ بن گئی)

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

یہ رعایا ے ہند تبہ ہوئی کہوں کیسی ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے

نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن جہاں سب طرح کی تھی انجمن
اسے جا کے دیکھو تو اب ذرا فقط ایک اجڑا دیار ہے

. . . . . ہوئے قتل لاکھوں ہی بے گنہ
ولے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی دل میں ان کے غبار ہے

تجھے اے ظفر بھلا کس کا ڈر تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر
تجھے ہے وسیلہ رسول کا، وہی تیرا حامیٔ کار ہے

بنکم چٹرجی

ترجمہ:۔ وقار انبالوی

بندے ماترم

بندۂ ماترم بندۂ ماترم

میری نظر کا نور ہے صورتِ مادرِ وطن
دل کا مرے سرور ہے عظمتِ مادرِ وطن

بندۂ مادرم بندۂ مادرم

اس کی ہوا میں تازگی اس کے چمن بہشت ہیں
اس کی فضا میں زندگی دشت و دمن بہشت ہیں

بندۂ مادرم بندۂ مادرم

دامنِ کوہسار کے چشمے حیات بخش ہیں
نزہتِ لالہ زار کے جلوے حیات بخش ہیں

بندۂ مادرم بندۂ مادرم

مادرِ ہند کا جمال رشکِ حوریاں رہا
مادرِ ہند کا جلال مرجعِ نوریاں رہا

بندۂ مادرم بندۂ مادرم

قلب میں اس کے لاکلام شفقتِ مادری بھی ہے
چہرے پہ ہاں پُرسلام عظمتِ مادری بھی ہے

بندۂ مادرم بندۂ مادرم

اس کی عزیز خاک سے پیکرِ باصفا اٹھے
یعنی اس ارضِ پاک سے خلق کے رہنما اٹھے

بندۂ مادرم بندۂ مادرم

اس کے جوان تند خو ثابت و صف شکن رہے
اس کے یلان جنگ جو گرد فلک شکن رہے

بندۂ مادرم بندۂ مادرم

ٹیگور

جن گن من . . .

ترجمہ:۔ محمد اجمل خاں

(آزاد ہند فوج کا قومی ترانہ جواب آزاد ہندوستان کا قومی ترانہ ہے)

صبح سکھ چین کی بارش برسا اے ہندستاں کے داتا
ہندستاں کی قسمت چمکا راجاؤں کے راجا
پنجاب سندھ گجرات مراٹھا دراوڑ، اتکل، بنگا
چنچل ساگر، وہندھ ہمالہ جمنا ہو کر گنگا
سب تیرے گن گاتے ہیں
تجھ سے رحمت پاتے ہیں
جے ہو جے ہو تیری فتح ہو ___ اے ہندستاں کے داتا
ہندو بدھ سکھ جین پارسی مسلم اور عیسائی
تیرے تخت کے آگے جھک کر ماں جائے ہیں بھائی
سب کے دل میں پریت بسا کر تیری میٹھی بانی
پریم کی لڑیاں گوندھ رہی ہے آزادی کی رانی
اندھیر مٹانے والے
فریادیں سننے والے
جے ہو جے ہو تیری فتح ہو ___ اے ہندستاں کے داتا
لو صبح ہوی اور پنکھ پکھیرو تیرے گن گاتے ہیں
ہلکے جھونکے نئی زندگی کا من میں رس لاتے ہیں
سورج بن کر جگ پر چمکے ہندستان ہمارا
سب مل کر جے ہند پکاریں ہند آزاد کا نعرا
جے ہو جے ہو تیری فتح ہو کل دنیا کے آقا
قسمت کو جگانے والے
یہ بیڑا پار لگا دے
جے ہو جے ہو تیری فتح ہو اے ہندستاں کے داتا

علامہ اقبال

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد ہے تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

حسرت موہانی

تلک *

اے تلک اے افتخار جذبۂ حبِ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن

تجھ سے قائم ہے بنا آزادیٔ بے باک کی
تجھ سے روشن اہل اخلاص و صفا کی انجمن

سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند
خدمت ہندوستاں میں کلفتِ قیدِ محن

ذات تیری رہنمائے راہ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن

تو نے خودداری سکھا پھونکا تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن

ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِ ذوالمنن

اقبال احمد سہیل

مہاتما گاندھی

وہ حدیثِ روحِ پیامِ جاں جسے ہم نے سن کے بھلا دیا
وہ حریمِ غیب کا ارمغاں جسے پا کے ہم نے گنوا دیا

اسے اتباعِ مسیح نے وہ عجیب دستِ شفا دیا
جو گرے تھے ان کو اٹھا دیا جو مرے تھے ان کو جلا دیا

وہ خمیدہ قد خمِ ماہِ نو وہ نظر فریب خنک سی ضو
وہ نگاہِ برقِ عمل کی رو کہ دلوں کو جس نے ہلا دیا

وہ کتابِ صلح کا سرِ ورق کہ مٹائی کشمکشِ فرق
وہ قتیلِ خنجرِ صبر و حق کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

وہ بودھ اور کرشن کا جانشیں ہمہ تن عمل ہمہ تن یقیں
وہ تبسمِ سحر آفریں کہ چمن لبوں سے کھلا دیا

وہ برنگِ آئینہ صاف دل وہ فروغِ فطرتِ آب و گِل
کہ جہادِ نفس نے مستقل اسے اور حسن جلا دیا

وہ جلالِ شیوۂ سادگی، وہ جمالِ صورتِ زندگی
وہ زلالِ چشمۂ آگہی کہ زمانہ بھر کو جگا دیا

تری شان کون گھٹا سکے، اُسے خود خدا نے بڑھا دیا
کہ تجھے بقائے دوام دی، تجھے منصبِ شہدا دیا
تری خامشی و زبان تھی کہ دلوں کو جوشِ نوا دیا
تنِ فاقہ کش میں وہ جان تھی کہ حصارِ کبر ہلا دیا
وطنِ عزیز کو شان دی، اسے قیدِ غم سے چھڑا دیا
رہِ اتحاد میں جان دی، جو کہا وہ کر کے دکھا دیا
جنھیں زیر کر نہ سکا ستم، ہوئے صیدِ سلسلۂ کرم
تری نیکیوں نے تری قسم سرِ خودسری کو جھکا دیا
یہ عروسِ کشورِ ہند تھی، ہمہ بیکسی ہمہ بددلی
اسے تو نے غازہ خرمی، ترے خون نے رنگِ حنا دیا
تجھے مندروں نے صدائیں دیں کہ ترے کرم سے اماں ملی
تجھے مسجدوں نے دعائیں دیں کہ تباہیوں سے بچا دیا
یہ کمالِ پیروئ علی یہ فراخ حوصلگی تری
کہ خود اپنے دشمنِ جاں کو بھی وہی ارمغانِ دعا دیا
تجھے بیکسی نے سپاہ دی، تجھے مشکلات نے راہ دی
تجھے بجلیوں نے پناہ دی، تجھے تلخیوں نے مزا دیا
یہی دھرم ہے یہی اصل دیں کہ ہو قولِ سچ تو عمل حسیں
حق و اہلِ حق پہ رہے یقیں، یہ پیام سب کو سنا دیا
ہمہ روشنی تری ذات تھی، ہمہ سوز تری حیات تھی
تری روح شمع تھی گل ہوئی، ترے تن کو پھول بنا دیا
ترا فیض دہر میں عام ہو، یہ غبار اٹھ کے غمام ہو
تری خاک تیرا پیام ہو، یہ سمجھ کے اس کو بہا دیا

آنند نرائن ملا

موتی لال نہرو

موجزن ہونے لگا تھا جب ذرا دریائے قوم
کچھ اثر جب کر چلا تھا نشۂ صہبائے قوم
جب نظر آنے لگی تھی منزلِ فردائے قوم
اٹھ گیا دنیا سے اپنا رہنمائے قوم
پھول جب کھلنے کو تھے صحنِ چمن ویراں ہوا
مہر اپنا جب سحر ہونے کو تھی پنہاں ہوا

اپنے خوں سے لکھ گیا تو سرخیٔ عنوانِ قوم
دھو گیا اپنے عمل سے دفترِ عصیانِ قوم
آفریں صد آفریں ہمت پہ تیری جانِ قوم
مٹ کے راہِ قوم میں پورا کیا پیمانِ قوم
جان دینی ملک پر مر کر ہمیں سکھلا گیا
موت میں بھی ایک شانِ زندگی دکھلا گیا

اپنے زخموں کے لیے تو طالبِ مرہم نہ تھا
جز خیالِ قوم تیرے دل میں کوئی غم نہ تھا
بے خبر فکرِ وطن سے تو کبھی اک دم نہ تھا
ہم کو ایک ایک دم ترا اک زندگی سے کم نہ تھا
تیرے خم میں چار قطروں سے سوا باقی نہ تھا
ہاں مگر ان کا بدل محفل میں اے ساقی نہ تھا

جب مرتب ہوگا افسانہ ترا ہندوستاں
نام "نہرو" سرخ حرفوں میں رقم ہوگا وہاں
عہدِ آزادی کی دو جلدوں میں ہوگی داستاں
یعنی تیری اور جواہر کی سوانح عمریاں
کچھ تری باتیں ہیں کچھ تیرے پسر کا ذکر ہے
قوم کی تاریخ بھی تیرے ہی گھر کا ذکر ہے

ماؤں سے پوچھیں گے جب بچے وطن کے ہونہار
ہندِ نو کا کون تھا پہلا مدبر باوقار
نقش کس کا اپنے سینوں میں بنائیں پائدار
یک زباں ہو کر وہ تیرا نام لیں گے بار بار
مے رہے گی سب کے پیمانوں میں تیرے جام کی
مہر ہوگی سکۂ قومی پہ تیرے نام کی

سکندر علی وجد

جواہر لال نہرو

چراغِ محفلِ علم و عمل ہے نام ترا
بہارِ گلشنِ ہندوستاں پیام ترا
ملول کر نہ سکا زہرِ قید و بند تجھے
تلاشِ حسن و صداقت رہی پسند تجھے
نئی حیات ملی سوزِ سعیِ پیہم سے
دھڑک رہا ہے دلِ ایشیا ترے دم سے
ثمر فشاں ہے مسلسل فروتنی تیری
مسافروں کے لیے چھاؤں ہے گھنی تیری
ہر ایک بے کس و بے زر تری پناہ میں ہے
دلوں کے زخم کا مرہم تری نگاہ میں ہے
مثالِ صبح اندھیرے کی زد سے دور ہے تو
شبِ سیاہ میں تنہا منارِ نور ہے تو
ترا جلال نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
وطن میں امن کا ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مولانا حالیؔ

دعا

اے کہ تری ذات ہے عالم پناہ
اسود و احمر کا ہے تو بادشاہ

جوڑنا ٹوٹوں کا ترے ہاتھ ہے
تیری صنعت جامع اشتات ہے

منتج ادبار ہے جب تک نفاق
مثمر اقبال ہے جب تک وفاق

تلخ ہے جب تک ثمر اختلاف
ہے تر و تازہ شجر ائتلاف

بھیجیو نکبت نہ کسی قوم پر
رکھیو ہر اک قوم کو شیر و شکر

ٹوٹے نہ آفاق میں سنگت کوئی
ہو نہ پراگندہ جماعت کوئی

بند سے ہو بند نہ کوئی جدا
بکھرے نہ شیرازہ کسی قوم کا

پھوٹ کسی قوم میں بڑھ جائے جب
ایک سے ایک ان میں بچھڑ جائے جب

رکھنی ہے باقی تجھے گر ان کی نسل
تفرقہ گر ان کا مبدل بہ وصل

ورنہ ہوا گر نہ ملاپ ان کو راس
اور نہ ہو سر جوڑنے کو ان کے آس

وہ جئے تو کیا جئے بے آبرو
جلد اٹھا لے انھیں دنیا سے تو

پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا
حق میں ہے اس قوم کے بہتر فنا

اسمٰعیل میرٹھی

اچھّا زمانہ

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ — بجے گا محبت کا نقّار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ — کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن — چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن
رکے گا نہ عالم ترقی کیے بن — کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا — مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکا بجے گا
اسی کو بڑا سب مانے گی دنیا — کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

عقیدوں کی مٹ جائیگی جب قباحت — مذاہب کو ہوگی تعصب سے فرصت
مگر ان کی بڑھ جائے گی اور طاقت — کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر
یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپر
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

وحیدالدین سلیم پانی پتی

ہنگامۂ اتحاد

عقل کی دیکھی ہے ہم نے فتنہ سامانی بہت
عشق کا ہنگامہ اب کوئی اٹھانا چاہیئے

ذہن کی فکر آزمائی سے ہے افسردہ بشر
دل کے ارمانوں کا اب جلوہ دکھانا چاہیئے

جذبۂ نسل و وطن کی دیکھ لیں خوں ریزیاں
خاک میں ان خنجروں کو اب دبانا چاہیئے

ہے بپا دیر و کلیسا کے پرستاروں میں جنگ
حبِّ انسانی کا اب معبد بنانا چاہیئے

ظفر علی خاں

اتحادِ باہمی

قوم کی بندھنے کو ہے ٹوٹی ہوئی آس ایک دن
ہم میں ہونے کو ہیں پیدا خضر و الیاس ایک دن

ہو چلا ہے ملک کو اپنی ترقی کا خیال
بامِ عزت پر چڑھا دے گا یہ احساس ایک دن

تشنہ کامانِ وطن کرتے ہیں شورش العطش
علم کے پانی سے بجھ جائے گی یہ پیاس ایک دن

دولتِ حکمت سے مالا مال ہو جائے گا ملک
اپنے گھر کی راہ لے گا جہل و افلاس ایک دن

پیٹ میں خود پروری کا جن کے اٹھتا ہے مروڑ
ان کو خود داری کا دے گا ہند املتاس ایک دن

خود فروشی سے ہے کھل جانے کو خودداری کا فرق
فربہی سے قطع ہو جائے گا آماس ایک دن

ہر چرن داس ایک دن ہونے کو ہے عبدالقوی
اس ہرن کے پیٹھ پر لد جائے گی گھاس ایک دن

تیرے ظلِ عاطفت میں دولتِ ہندوستاں
ایک ہو جانے کو ہیں لاہور و مدراس ایک دن

دیکھنا شیر و شکر ہو جائیں گے اہلِ وطن
رہ چکے ہیں دور دور آنے کو ہیں پاس ایک دن

حبِ قومی کے کھلیں گے ہند کے گلشن میں پھول
پھیل جائے گی جہاں میں ان کی بو باس ایک دن

چل رہی ہے جو ہوائے اتحادِ باہمی
ہندو و مسلم کو وہ آ جائے گی راس ایک دن

یعنی دامن اور وہ چولی یہ ہیں ناخن اور وہ گوشت
مظہر الحق سے ملیں گے سرگرو داس ایک دن

اور اگر پھر بھی رہے دست و گریباں یہ بزرگ
ملک کا ہو کر رہے گا ستیا ناس ایک دن

علامہ اقبال

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کی تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

صب

مہاراجہ بہادر برق دہلوی

اچھوتوں سے نفرت

سب کے لیے ہے یکساں قدرت کا فیض جاری   مفلس ہو یا تونگر، راجہ ہو یا بھکاری
ٹوٹی سی جھونپڑی ہو یا قصرِ کامگاری   دونوں پہ مہرِ انور کرتا ہے جلوہ باری
ہیں خاک بوس کرنیں مہتابِ ضوفشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیلِ آسماں کی

سیراب سب کو یکسر کرتا ہے آبِ باراں   تختہ ہو زعفراں کا یا کشتِ خشکِ دہقاں
جوشِ بہار کا ہے یکساں اثر نمایاں   ہو گلبنِ گلستاں یا لالۂ بیاباں
تاثیرِ فصل سے ہے سود و زیاں برابر
ہیں نخلِ دشت گلشن وقفِ خزاں برابر

پست و بلند کا ہے پھر امتیاز کیسا   ادنیٰ کا رمز کیا ہے اعلیٰ کا راز کیسا
سائے سے بیکسوں کے ہے احتراز کیسا   پتلوں کو خاک کے ہے ہستی پہ ناز کیسا
کیفِ مئے خودی سے ہے وہمِ برتری کا
حاصل ہے ورنہ سب کو رتبہ برابری کا

مثلِ حباب کیا ہے لازم ہوا میں بھرنا   بحرِ جہاں میں سب کو اک گھاٹ ہے اترنا
زیبا نہیں کسی سے بے جا سلوک کرنا   منہ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا
تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی
اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی

جو اُن کا مستقر ہے وہ ہے وطن ہمارا   ہے وجہِ ناز ان کو دورِ کہن ہمارا
تہذیب ایک سی ہے یکساں چلن ہمارا   بیگانہ ان کو سمجھیں دیوانہ پن ہمارا
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

عابد حسین فریدی

اہلِ ہند کے کام

ہندوستانیوں کو یہی رہ گئے ہیں کام
تفریح کھیل کود ہنسی دل لگی مذاق

ہے سب کو استحاد نہ رکھنے سے اتحاد
ہے سب کو اتفاق نہ کرنے میں اتفاق

مجلس میں قوم کی نہیں ہوتے کبھی شریک
جاتے ہیں ناٹکوں میں بصد شوق و اشتیاق

بیکار کام میں تو لٹاتے ہیں خوب مال
ہوتا ہے کار قوم میں دینا بہت ہی شاق

آتی ہے موت خدمتِ قومی کے نام سے
لیکن ہیں کھیل کود کے کاموں میں چست چاق

ہیں کاہلی و سستی و غفلت کے فن میں فرد
ہیں جہل اور خود غرضی کے ہنر میں طاق

عرصے سے وصل علم سے ان کا نہیں ہوا
مدت سے ان میں اور حکومت میں ہے فراق

جاپان اور فرنگ ہیں دولت سے بہرہ ور
ہیں روشنیٔ علم سے روشن عرب عراق

لیکن ہمارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے پھوٹ
ہے فرد فردِ ہند کے دل میں حسد نفاق

لیتے نہیں ہیں اپنی خبر اہلِ ہند کیوں
کیا ہو گیا سبھی کو ہے سودا، جنوں مراق

کوشش کریں تو دولت و حشمت آئیں ملے
موجود ہوں وہی من و سلوا کے پھر طباق

دولت بھی ان کے قبضہ میں ہو اور علم بھی
دشمن جو بن رہے ہیں وہ بن جائیں سب رفاق

ورنہ زمانہ ان کو مٹا دے گا ایک دن
کر دے گی ان کو مادرِ گیتی ضرور عاق

جگر مرادآبادی

محبت آج بھی مشعل فروزِ منزل ہے

خدا کرے کہ یہ دستور سازگار آئے
جو بے قرار ہیں اب تک انھیں قرار آئے

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے
کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

وہ سرخوشی ہو کہ خود سرخوشی بھی رقص کرے
وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے

کھلے جو پھول تو دے جسمِ ناز کی خوشبو
کلی اگر کوئی چٹکے، صدائے یار آئے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

یہ میکدے کی یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے

خلوص و ہمتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخِ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

جنونِ عشق ہو صالح اگر تو ممکن ہو
کہ پھر سے اجڑے گلستاں میں بھی بہار آئے

مذاقِ عشق بدل دے مزاجِ کون و فساد
دلوں تک آئے جو غم بھی تو خوشگوار آئے

نظامِ خلق و مروت کبھی جو برہم ہو
نگاہِ لطف و محبت بڑھے سنوار آئے

دلوں پہ نقش نہ رہ جائے کوئی نفرت کا
یہ فتنہ بن کے نہ آشوبِ روزگار آئے

برائی کرنے سے پہلے کاش انساں کو
نظر ہر ایک بدی کا مآل کار آئے

وہ حادثاتِ زمانہ سے محو ہو جائیں
کہ جن کے ذکر سے انسانیت کو عار آئے

نمائشی ہی نہ ہو، یہ نظامِ جمہوری
حقیقتاً بھی زمانے کو سازگار آئے

خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر لیں
نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

ضمیر صاف ہو اپنا تو غیر ممکن ہے
کسی کے آئینۂ قلب پر غبار آئے

محبت آج بھی مشعل فروزِ منزل ہے
اگر نہ کور نگاہی بردئے کار آئے

دلوں کی کھوٹ ہو جس کے ضمیر میں شامل
نہ آئی ہے وہ سیاست نہ سازگار آئے

زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا
کہ جو زبان کہے، دل کو اعتبار آئے

بنا دیا ہے محبت نے آگ کو گلزار
مگر جو آج کے انساں کو اعتبار آئے

نہ ہو جو جامِ مسرت محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

اختر شیرانی

نوائے صبح گاہی

برہمن میں نہ پیرانِ کراماتی میں ہے باقی
صداقت ہے تو رندانِ خراباتی میں ہے باقی

خلوصِ اعتقاد و حسنِ نیت جس کو کہتے ہیں
بسنتی لال میں باقی نہ شبراتی میں ہے باقی

دلیروں کی جو جنگ آزمائیں آج کل تاجر
بس اتنا جوش اب ذوقِ ہتماتی میں ہے باقی

عقیدے کی صفائی ہو کہ جذبِ باوفائی ہو
نہ بنگالی میں ہے باقی نہ گجراتی میں ہے باقی

حقِ ہمسایہ کا پاس اگلے وقتوں کا جز یور تھا
نہ اب بدھ سنگھ میں ہے باقی نہ جمعراتی میں ہے باقی

اولوالعزمی و ہمت ایک دن ہم جس کو کہتے ہیں
نہ میسوری میں ہے باقی نہ میواتی میں ہے باقی

جنونِ تکفیر کا ہوش جہالت کبر و خود بینی
یہی زاہد کی تعلیم روایاتی میں ہے باقی

بتوں کی تنگ نظری لکشمی بن کر چمکتی ہے
یہی دو دیا ہے جو لے دے کے اب جاتی میں ہے باقی

وفاداری کا جذبہ جس پہ کٹ مرتے تھے غیرت مند
نہ پنجابی میں ہے باقی نہ فلاتی میں ہے باقی

لرز اٹھتے ہیں جس سے عرش اب بھی وہ اثر اختر
نوائے صبح گاہی و مناجاتی میں ہے باقی

فضل الرحمٰن

تفرقے

جادۂ راہِ محبت میں رفیقو کچھ نہیں
فرقِ مذہب کی خلیجیں اختلافِ کیش و دیں

ہے وہی موجِ ہوا آوازِ ناقوس و اذاں
سبحہ و زنّار میں رشتہ وہی سلکِ نہاں

ایک ہے نسلِ آدمی کی ایک ہے اصلِ انام
مختلف قومیں ہیں گرچہ مختلف لوگوں کے نام

لذتِ ہستی ہے اک کربِ اجل بھی ایک ہے
ارثِ فطرت ورثۂ علم و عمل بھی ایک ہے

جنگ چھڑتی ہے تو زد میں آتے ہیں ما و شما
کال پڑتا ہے تو دشمن دوست کی تفریق کیا

قحط بیماری وبائیں حادثے رکتے نہیں
بر بنائے ملک و ملّت زلزلے رکتے نہیں

درمیانِ اہلِ دنیا سخت دیواریں ہیں یہ
واسطے مردم کشی کے تیز تلواریں ہیں یہ

یہ نہ ہوں تو خلق کی بیداد بڑھ سکتی نہیں
ظلم کی کھیتی کبھی پروان چڑھ سکتی نہیں

ہیں ہلاکت خیز انساں کے لیے یہ تفرقے
زہرِ قاتل طفلِ ناداں کے لیے یہ تفرقے

زندگانی کی نفی ہیں موت کے پیغام ہیں
چشمۂ آبِ بقا پر یہ فنا کے جام ہیں

داستانِ عشق کو خونیں بنا دیتے ہیں یہ
جرمِ الفت کو بہت سنگیں بنا دیتے ہیں یہ

زندگی کا خوف ان سے موت کا ڈر ان سے ہے
دو دلوں کے بیچ میں سدِّ سکندر ان سے ہے

اسرار الحق مجاز

خوابِ سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر

عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا

اک نہ اک مذہب کی سعیٔ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی

آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے

ابن مریم بھی اٹھے موسیٰ عمراں بھی اٹھے
رام وگوتم بھی اٹھے، فرعون وہاماں بھی اٹھے

اہلِ سیف اٹھتے رہے، اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب آتے رہے اورآں جناب آتے رہے

حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی

مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی

اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سایے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

کیفی اعظمی

نئی جنت

نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے
تڑپ دے کر خس و خاشاک کو بجلی بنائیں گے
کوئی آواز دے دے آتش افشاں چاند تاروں کو
کہ اب خاکِ وطن کے چلبلے ذرے جگمگائیں گے
اداسی مسکرائے گی بیاباں لہلہائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے
اٹھا کر اپنی پستی کو سرِ معراج رکھ دیں گے
وہ اک گل کی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا سارا
ہم اب کی غنچے غنچے کی جبیں پر تاج رکھ دیں گے
ہم اب کے تنکے تنکے کو چمن بندی سکھائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

وفورِ جستجو میں کیسے کیسے اپنے بیگانے
گھٹے رہتے ہیں باہم شمع آزادی کے پروانے
گرہ لگنے سے اکثر رشتۂ دل ٹوٹ جاتا ہے
الگ رہ کر رہیں گے متحد تسبیح کے دانے
شکنجے توڑ دو متوالے ہنس کر مل ہی جائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

اٹھایا زندگی نے گنگنا کر وہ رباب اپنا
حقیقت سے گلے ملنے کو ہے رنگین خواب اپنا
یہ زنگ آلود مہریں جلد اے پیرِ مغاں لے جا
خم اپنے ہوں گے، ساغر اپنے ذوقِ انتخاب اپنا
جنھیں چاہیں گے ان کو پیرِ میخانہ بنائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

محمد حسین آزاد

آفتابِ حبّ وطن

اے آفتاب حب وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظام دل زبر و زیر ہو رہا
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے
کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے
حب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانے کا الٹا چلن یہاں
حب الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینے میں داغ ہیں
کب تک شب سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں ہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں ہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

برج نرائن چکبست

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن   محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن، دل سے پیارا وطن
وہ اس کے درختوں کی تیاریاں   وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں
ہمارا وطن، دل سے پیارا وطن
ہوا میں درختوں کا وہ جھومنا   وہ پتوں کا پھولوں کا منہ چومنا
ہمارا وطن، دل سے پیارا وطن
وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار   وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوار
ہمارا وطن، دل سے پیارا وطن
وہ باغوں میں کوئل وہ جنگل میں مور   وہ گنگا کی لہریں وہ جمن کا زور
ہمارا وطن، دل سے پیارا وطن
اسی سے ہے اس زندگی کی بہار   وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن، دل سے پیارا وطن

اس کنجِ دلنشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا … جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا
بلبل کو ہو چمن میں صیاد کا نہ کھٹکا … خوش خوش ہو شاخِ گل پر غم ہو نہ آشیاں کا
ہر سو ہو آتشِ گل بھڑکی ہوئی چمن میں … شعلہ نہ مشتعل ہو سوزِ غمِ نہاں کا
حبِ وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں … لہجہ جدا ہو گرچہ مرغانِ نغمہ خواں کا
نغموں کی دھن سریلی اور ہو صدا رسیلی … طرزِ بیاں ہو دلکش ہر مرغِ خوش بیاں کا
ایک ایک لفظ میں ہو تاثیرِ بوئے الفت … انداز دلنشیں ہو ایک ایک داستاں کا
مرغانِ باغ کا ہو اس شاخ پر نشیمن … پہنچے نہ ہاتھ جس تک صیادِ آسماں کا
ایک ایک غنچہ میں ہو دلبستگی کا عالم … ایک ایک گل مرقع ہو عیشِ جاوداں کا
موسم ہو جوشِ گل کا اور دن بہار کے ہوں … عالم عجیب دلکش ہو اپنے گلستاں کا
ہم محوِ دیدِ گل ہوں اس کنجِ دلنشیں میں … کیسے جہاں کے جھگڑے دنیا کا غم کہاں کا

مل مل کے ہم ترانے حبِ وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

حسرت موہانی

وطن ہے میرے لیے اور میں وطن کے لیے

چمن ہے گل کے لیے اور گل چمن کے لیے
وطن ہے میرے لیے اور میں وطن کے لیے

کہاں وہ عہد گزشتہ کہاں وہ لطفِ چمن
تڑپ رہا ہوں اسی لذتِ کہن کے لیے

ہم آؤ رشتۂ الفت کو استوار کریں
یہ تفرقے ہیں فقط شیخ و برہمن کے لیے

یہی ہے ایک مرے دل کی آرزو حسرتؔ
جیوں وطن کے لیے اور مروں وطن کے لیے

سیماب اکبرآبادی

ہندوستان

وہ پرستش گاہِ فطرت سجدہ گاہِ آفتاب
گردگارِ صبحِ مشرق، شامِ گیتی کا ثبات
تھا صنم زارِ عرب جس کے صنم خانوں کی دھوپ
آتشِ بزمِ عجم تھی جس کے ایوانوں کی دھوپ
بتکدوں میں جس کے زندہ تھے بتانِ آذری
عشق کی پروردگاری حسن کی پیغمبری
سرخ صندل سی جبینیں ان پہ قشقوں کے چراغ
برگ سے نازک طبیعت پھول سے نازک دماغ

جس کے دریا آئینے، پگھلے ہوئے بہتے ہوئے
جس کے پربت کائناتِ ابر کو گھیرے ہوئے
جس کی ندیاں موجِ مے کی طرح لہراتی ہوئی
گھومتی، گرتی، گزرتی، گونجتی گاتی ہوئی
شام مستی آفریں، رنگِ سحر جلوہ پناہ
عشق کی پہلی جماہی، حسن کی پہلی نگاہ
لہلہاتے سبزہ زاروں میں بہار آئی ہوئی
اک گھٹا برسی ہوئی اور اک گھٹا چھائی ہوئی

جیسے رقصاں ہو فضا میں حسن کا رنگیں خدنگ
مختلف رنگوں کا جیسے اڑ رہا ہو اک پتنگ

دیکھ کر افغانیوں نے اس کی پروازِ جمیل
لے لیا آغوشِ قوت میں بہ اندازِ جمیل
مل گئی شمعِ حرم بت خانے کے فانوس سے
ابنِ آذر نے اذاں دی پردۂ ناقوس سے
مسلکِ بدھ کو تحفظ کا اشارہ مل گیا
کرشن کے مندر کو مسجد کا سہارا مل گیا
ذرہ ذرہ محفلِ زہرہ نظر آنے لگا
خون سا قشقۂ ثریا بن کے اترانے لگا

ہند علم و فضل و رعنائی کا گہوارہ بنا
یہ پتنگ اتنا ہوا اونچا کہ سیارہ بنا

شامِ مغرب یہ ستارہ دیکھ کے للچا گئی — سادہ و بے نور آنکھوں میں چکاچوند آ گئی
فلسفی بھی دام لے لے کر بڑھے تجار بھی — اپنا پھندا لے کے اٹھا دیوِ استعمار بھی
عرشِ سطوت پر تھی موجِ عشرتِ افغانیاں — جلوۂ ساغر سے تھیں چمکی ہوئی جہتا بیاں
تھی یہی دو چار باتیں گرمیٔ بزمِ شباب — نغمۂ مطرب کنارِ شاہد و جامِ شراب
کارواں غافل ہوا رعبِ شبِ منزل گیا — پاسبانِ وقت کو شب خوں کا موقع مل گیا
شامِ مغرب صبحِ مشرق پر یکایک چھا گئی — سرخ اک بدلی زمیں سے آسماں تک چھا گئی

اب وہ سیارہ جو رفعت پر سبک پرواز تھا
پستیٔ حالات سے پھر نقشِ پا انداز تھا

آہ اے ہندوستاں! یہ تیری پستی و شباب! — کچھ تیری تقدیر ہی میں فطرتاً ہے انقلاب
گو بظاہر تو نشاطِ ندرتِ ایام ہے — فی الحقیقت بے سکوں بے چین بے آرام ہے
وہ بہاریں وہ چمن وہ گلشنِ ایجادی کہاں — اے غلام آباد اب وہ تیری آزادی کہاں
بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار — ایک ذرے ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار
اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساطِ ماہتاب — تیری موجِ خاک سے اب بھی برستے ہیں گلاب
روح سے خالی ہے لیکن پیکرِ مردہ ترا — جلوہ پژمردہ ہے ترا، باطن افسردہ ترا
جیسے شمعِ صبحِ محفل جیسے چھپتا آفتاب — جیسے شاعر کا بڑھاپا اور بیوہ کا شباب

پستیوں کو ارتقا پھر جلوۂ آغاز دے
کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

افسر میرٹھی

وطن کا راگ

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رت ہر موسم اس کا کیسا کیسا پیارا پیارا ہے

کیسا سہانا کیسا سندر پیارا دیش ہمارا ہے   دکھ میں سکھ میں ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے   پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکشا کرتا ہے بھارت کا رکھوالا ہے   لاکھوں چشمے بہتے ہیں یہ لاکھوں ندیوں والا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سناتی جاتی ہیں   صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں   کھیتوں کو ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

کرشن کی بنسی نے پھونکی روح ہماری جانوں میں   گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتی نے جو مے دی تھی وہ اب تک ہے پیمانوں میں   نانک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کانوں میں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں   ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں   بھارت نام کے عاشق ہیں ہم بھارت کے شیدائی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

عظمت اللہ خاں

وطن

مری جان ہو کہ مرا بدن ترا جلوہ گاہ ہے اے وطن
تری خاک ان کا خمیر ہے
مرے خون میں یہ جھلک تری مری نبض میں یہ چمک تری
مری سانس تیری صفیر ہے

تری خاک جگ کا خلاصہ ہے ترا حسن ایک تماشا ہے
تری پھیلی گود کہ باغ ہے
تری خاک پاک ذلیل ہے تو غلامیوں کی دلیل ہے
تری پود شرم کا داغ ہے

تجھے ماسوا سے گرا دیا ہمیں ماسوا نے مٹا دیا
ہوئے تفرقوں سے تمام ہم
تجھے جب تلک کہ بھلا رکھا ہمیں وقت نے بھی مٹا رکھا
بنے گھر میں اپنے غلام ہم

ترے خون ہیں یہ چھٹے چھٹے ترے پوت ہیں یہ بٹے بٹے
ترے دل جگر ہیں یہ بے وفا
ترا کچھ لہو ہی سفید ہے کہ عجب طرح کا یہ بھید ہے
نہیں بھائی بھائی کا آشنا

نہیں غیر کا ہمیں کچھ گلا — کہ غلامیوں کا یہ پھل ملا
ہمیں تفرقے کے جنون سے
ترے دودھ میں مری پیاری ماں — نہیں درد کی کوئی بجلیاں
کہ ملا دے خون کو خون سے

ہمیں بھائیوں سے غرور ہیں — ترے جہل ہم میں چور ہیں
کہ جو کام ہیں سو خطا کے ہیں
کہیں ذات پات کی لاگ ہے — کہیں دین دھرم کی آگ ہے
کہیں بیر مفت خدا کے ہیں

جنھیں پیت ہے انھیں جیت ہے — یہی جگ میں جیت کی ریت ہے
ترے پوت اپنوں سے غیر ہیں
ہمیں غیریت یہ مٹانی ہے — ہمیں جیت آپ پہ پانی ہے
اسی گھر کے غیر سے غیر ہیں

ترے پوت بھائی ہیں بھائی ہوں — ترے دل سے سب ہی فدائی ہوں
کہ تو آپ اپنی مثال ہو
ترے زور کی یہی دھاک ہو — کہ جہاں برائی سے پاک ہو
ترا علم حق کا کمال ہو

مخدوم محی الدین

آزادیٔ وطن

کہو ہندوستاں کی جے

کہو ہندوستاں کی جے، کہو ہندوستاں کی جے
قسم ہے خون سے سینچے ہوے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمعِ آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی
وطن کے پاسباں وہ تیغ جوہردارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ براندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی
کہو ہندوستاں کی جے، کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

علی سردار جعفری

آزادی

پوچھتا ہے تو کہ کب اور کس طرح آتی ہوں میں
گود میں ناکامیوں کے پرورش پاتی ہوں میں
صرف وہ مخصوص سینے ہیں مری آرام گاہ
آرزو کی طرح رہ جاتی ہے جن میں گھٹ کے آہ
اہلِ غم کے ساتھ ان کا درد و غم سہتی ہوں میں
کانپتے ہونٹوں پہ بن کر بددعا رہتی ہوں میں
رقص کرتی ہیں اشاروں پر مرے موت و حیات
دیکھتی رہتی ہوں میں ہر وقت نبضِ کائنات
خود فریبی بڑھ کے جب بنتی ہے احساسِ شعور
جب جواں ہوتا ہے اہلِ زر کے تیور میں غرور

مفلسی سے کرتے ہیں جب آدمیت کو جدا
جب لہو پیتے ہیں تہذیب و تمدن کے خدا
بھوت بن کے ناچتا ہے سر پہ جب قومی وقار
لے کے مذہب کی سپر آتا ہے جب سرمایہ دار
راستے جب بند ہوتے ہیں دعاؤں کے لیے
آدمی لڑتا ہے جب جھوٹے خداؤں کے لیے
زندگی انساں کی کر دیتا ہے جب انساں حرام
جب اسے قانونِ فطرت کا عطا ہوتا ہے نام
اہرمن پھرتا ہے جب اپنا دہن کھولے ہوئے
آسماں سے موت جب آتی ہے پر تولے ہوئے

جب کسانوں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے ہراس
پھوٹنے لگتی ہے جب مزدور کے زخموں سے یاس
صبرِ ایوبی کا جب لبریز ہوتا ہے سبو!
سوزِ غم سے کھولتا ہے جب غلاموں کا لہو
غاصبوں سے بڑھ کے جب کرتا ہے حق اپنا سوال
جب نظر آتا ہے مظلوں کے چہروں پر جلال

تفرقہ پڑتا ہے جب دنیا میں نسل و رنگ کا
لے کے میں آتی ہوں پرچم انقلاب و جنگ کا

ہاں مگر جب ٹوٹ جاتی ہے حوادث کی کمند
جب کچل دیتا ہے ہر شئے کو بغاوت کا سمند
جب نگل لیتا ہے طوفاں بڑھ کے کشتی نوح کی
گھٹ کے جب انساں میں رہ جاتی ہے ظلمت روح کی
دور ہو جاتی ہے جب مزدوروں کے دل کی جلن
جب تبسم بن کے ہونٹوں پر سمٹتی ہے تھکن
جب ابھرتا ہے افق سے زندگی کا آفتاب
جب نکھرتا ہے لہو کی آگ میں تپ کر شباب
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
روند چکتی ہے جب ان سب کو جوانی کی امنگ

صبح کے زرّیں تبسم میں عیاں ہوتی ہوں میں
رفعتِ عرشِ بریں سے پُرفشاں ہوتی ہوں میں

زبیر رضوی

یہ ہے میرا ہندوستان

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہاں
اس سے پیار مجھ کو

ہنستا گاتا جیون اس کا دھوم مچاتے موسم
گنگا جمنا کی لہروں میں سات سروں کے سرگم
تاج ایلورہ جیسے سندر تصویروں کے البم

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہاں
اس سے پیار مجھ کو

دن البیلے راتیں اس کی مستی کی سوداگر
دھرتی جیسے چھوٹ بہی ہو دودھ کی کچی گاگر
اونچے اونچے پربت اس کے نیلے نیلے ساگر

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہاں
اس سے پیار مجھ کو

بادل جھومے برکھا برسے پون جھکولے کھائے
دھرتی کے پھیلے آنگن میں یوں کھیتی لہرائے
جیسے بچہ ماں کی گود میں رہ رہ کے مسکائے

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہاں
اس سے پیار مجھ کو

رادھا، سیتا، چندر گائے، گائے اندو بال
نینوں میں کاجل کے ڈورے سرخ گلابی گال
زلفوں کی وہ چھایا جیسے شملہ، نینی تال

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

ڈھولک جاگی، مہندی لاگی رنگ رنگیلا ساون
سکھیاں مل مل ہولی کھیلیں سانوریا کے آنگن
گھونگھٹ میں گوری شرمائے پیا ملن کے کارن

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

راجہ رانی گڈا گڈی اور پریوں کی کہانی
بچوں کے جھرمٹ میں سنائے بیٹھ کے بوڑھی نانی
لوری گائے ماتھا چومے ممتا کی دیوانی

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

غالب اور ٹیگور یہیں کے میرا، تلسی داس
یہیں ہوا تھا سچائی کا گوتم کو احساس
یہیں لیا تھا ساتھ رام کے سیتا نے بن باس

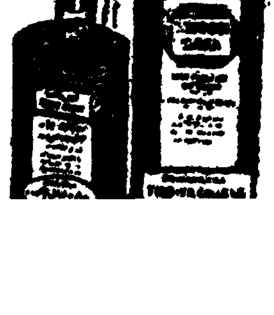
یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

مسجد مندر ہیں تو کہیں ہیں گرجا اور شوالے
ملا، پنڈت گیتا اور قرآن کے ہیں متوالے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی دیش کے سب رکھوالے

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو


COAL





رضیہ سجاد ظہیر

راکھی والے پنڈت جی

مجھے ان پنڈت جی کا نام یاد نہیں اور یاد ہونے کا تو جب سوال ہوتا جب کبھی مجھے ان کا نام معلوم ہوا ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ابا اماں کو بھی ان کا نام نہیں معلوم تھا، دادا کو شاید معلوم رہا ہو۔ ہم لوگ تو ان کو بس راکھی والے پنڈت جی کہتے تھے ــــ وہ سال میں دو بار آیا کرتے تھے، ایک دفعہ رکشا بندھن کے موقع پر اور ایک بار جنم اشٹمی پر۔

پنڈت جی کا قد بہت لمبا تھا، جسم بہت دُبلا، رنگ بہت گورا، اور عمر بہت زیادہ ــــ نتیجے کے طور پر وہ کسی قدر جھک گئے تھے اور شاید جھکنے ہی کی وجہ سے ان کے اندر دھنسے ہوئے چپاتی پیٹ پر بہت سی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں ــــ مجھے یاد ہے کہ جب وہ کھڑے ہوتے تو میں ہمیشہ ان سلوٹوں کو گننے کی کوشش کیا کرتی تھی، مگر وہ اتنی جلدی یا تو بیٹھ جاتے یا اپنی ٹیری سی بے حد پرانی ریشمی چادر لپیٹ لیتے کہ میں ہر بار تلملا کے رہ جاتی اور کبھی نہ گن پاتی ــــ وہ کمر میں دھوتی باندھتے تھے، جسم پر گیروے رنگ کی بے حد پرانی، گھسی ہوئی مگر صاف ستھری ریشمی چادر لپیٹے رہتے تھے، پاؤں میں نواڑ لگی کھڑاویں پہنتے تھے جو بے حد کھٹ پٹ کرتی تھی۔ ان کی ناک لمبی سی تھی، نوک پر سے ذرا سا نیچے کو جھکی ہوئی، منہ میں تین دانت تھے جن میں سے ایک سامنے والا بہت بڑا تھا، اور بات کرتے وقت کٹاکٹ بولتا تھا، کبھی کبھی سیٹی بج جاتی تھی البتہ ان کی آنکھیں بڑھاپے میں بھی، چھوٹی چھوٹی ہونے کے باوجود غضب کی چمک دار تھیں ــــ اور ہنستے وقت بالکل مچ کر چہرے کی جھریوں میں دھنس جاتی تھیں!

ان کے ہاتھ میں بھورے رنگ کے منکوں کی ایک لمبی سی مالا ہوتی تھی جس کو وہ مستقل جپتے رہتے تھے۔ مالا کے علاوہ ان کی بغل میں ایک پوتھی ہوتی تھی جس کو وہ کبھی نکال لیتے تھے، کبھی نہیں نکالتے تھے۔ رکشا بندھن والے دن ان کے مالا والے ہاتھ کی کلائی میں سے راکھیوں کا بھی ایک گچھا لٹکتا رہتا تھا۔

واضح رہے کہ پنڈت جی ہمیشہ گھٹیا قسم کی راکھی لاتے تھے ــــ یعنی روئی کی بس اتنی بڑی گولی ہوتی تھی کہ وہ مزے میں عطر لگا کے پھریری کی طرح کان میں رکھی جا سکتی تھی، پیوڑی کے کچے رنگ میں رنگی ہوئی، اس کے دونوں طرف نہایت سستے قسم کا بٹا ہوا سوت لگا رہتا تھا۔ میرے خیال میں اس زمانہ میں تو دیسی سو راکھیاں ایک دو آنے میں بن جاتی ہوں گی۔ ویسے پنڈت جی کی تھیوری یہ تھی کہ راکھی جتنی ہی سستی ہوتی ہے اس کے ساتھ دیا جانے والا پریم اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

لگے ہاتھوں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میرے ابا کی صرف ایک بہن تھیں جو جوانی ہی میں مرگئی تھیں اس لیے ابا کو بہنیں بنانے کا

بے حد چاؤ ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی دو عدد ہندو بہنیں بھی تھیں جو راکھی کے دن خاص کر آتی تھیں، لہٰذا ہمارے گھر میں اس دن خوب جشن ہوتا تھا صبح ہی سے بہنوں کو دیئے جانے والے تھال سجائے جانے لگتے۔ جن میں مٹھائیاں، ناریل، ریشمی اور بنارسی کپڑے، چوڑیاں، مہندی پان، سیندور اور نہ جانے کیا کیا رکھا جاتا تھا۔

پھر ہماری ہندو پھوپیاں، اپنے اپنے بچوں کی پلٹنیں لیے رکھاوں کپڑے پہنے، پیروں میں مہاور رچائے، مانگ میں سیندور بھرے آپہنچتیں ـــــ خوب اودھم مچتا! لطف کی بات یہ تھی کہ اتنی محبت کے باوجود وہ ہمارے ہاتھ کا چھوا کوئی کیلا کھانا یا ہمارے یہاں کا پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتی تھیں۔ اس لیے ان کی خاطر کے واسطے ڈھیروں پھل اور سوکھا میوہ وغیرہ منگوایا جاتا۔
جاتے وقت وہ ہم میں سے ہر ایک سے گلے مل کر زور زور سے روتیں، ہم لوگ بھی روتے۔

پنڈت جی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بہنیں کس وقت آتی ہیں اور مٹھائی میوہ کس وقت تھال میں رکھا جائے گا لہٰذا وہ عین اسی وقت آتے ـــ باہر پھاٹک کے پاس سے ہی آواز دیتے "بی بی جی ـــ باہمن آیا ہے" ہمارے یہاں اس زمانے میں سخت پردہ ہوتا تھا، آواز تک کا پردہ! مگر اس آواز کا جواب اماں اندر سے ضرور دیتی تھیں "آداب پنڈت جی، ہاتھ جوڑ کے آداب بیٹھیے۔"

اور ان دونوں آوازوں کے دو نتیجے ہوتے تھے: ایک تو یہ کہ ہماری دادی اماں اپنی جگہ سے اٹھنا شروع کرتیں دوسرا یہ کہ ہم سب بچے باہر پنڈت جی کے پاس بھاگتے۔

دادی اماں کا اپنی جگہ سے اٹھنا ہمارے گھر کی خاص چیز تھی کیوں کہ عام طور پر تو وہ بہو کو ہر کام کے لیے حکم دیتی تھیں مگر اس موقعہ پر وہ اسٹور روم میں جاکر خود پنڈت جی کے لیے سیدھا نکلواتیں ـــــ سیدھے کے معنی سوکھی چیزیں، آٹا، چاول، دال شکر مصالحے آلو وغیرہ۔

اس درمیان پنڈت جی باہر والے برآمدے میں زمین پر آلتی پالتی مار کے گوتم بدھ والے پوز میں بیٹھ جاتے۔ سیدھا لینے کے لیے وہ اس دن ایک چادر الگ سے لاتے تھے، اس کو گز کرکے ایک گھٹنے کے نیچے دبا لیتے، پھر ہمارا اچھوت چپراسی... سورج بلی ان کے آگے وہ تھال لا کے رکھتا جس میں کپڑے، میوے اور دوسری چیزیں ہماری دادی اماں نے پہلے سے رکھ دی ہوتی تھیں ـــــ پھر وہ مٹھائیوں کی ٹوکریاں لاتا جو وہ ہی خرید کے لاتا تھا، اور پنڈت جی کے آنے تک اپنے پاس محفوظ رکھتا ـــــ پنڈت جی ٹوکریوں کے دھاگے پٹاپٹ توڑتے جاتے اور تھال میں مٹھائی سجاتے جاتے ـــــ اور ہمیشہ ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ ہر ٹوکری میں دو چار ڈلیاں ضرور بچ جاتیں جو پنڈت جی کے خیال میں حساب سے اوپر ہوتی تھیں۔ ان سب ڈلیوں کو وہ ایک ٹوکری میں کر دیتے اور پھاٹک کے پاس تک بڑھ کر ہماری اماں سے کہتے "بی بی جی ـــ کوئی آدھ سیر نہیں کوئی ڈیڑھ پاؤ بلکہ کوئی پاؤ بھر مٹھائی بچ رہی ہے۔"

اماں اندر سے کہتیں "وہ آپ رکھئے پنڈت جی" تھال اندر سے چلے جاتے اور پنڈت جی مٹھائی کی ٹوکری چادر کے ایک کونے میں باندھ کے رانو تلے دبا لیتے ـــ پھر مالا گلے میں ڈال لیتے اور راکھیوں کا الجھا ہوا لچھا سلجھانے کے لیے گوتم بدھ کے

پوزمیں بیٹھ جاتے!

مجھے پنڈت جی کی لائی ہوئی راکھیوں کا الجھا ہوا رنگ برنگا لچھا بہت پیارا لگتا تھا اور اس میں سے ننھی ننھی راکھیاں ڈھونڈ کر نکالنے کو جی مچل جاتا تھا مگر پنڈت جی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بے حد تیز تھیں، جہاں میرا ہاتھ چپکے چپکے بڑھتا ——— آواز آتی "ہوں ہوں، ہوں ـــ دیکھ رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں!"

کٹ سے دانت بولتا!

یہ آپ لوگوں نے غور کیا ہوگا کہ رکشا بندھن کے دن دو چار چھینٹے ضرور پڑتے ہیں ـــ کبھی کبھی زور کی بارش بھی ہو جاتی ہے لیکن پانی برسے یا آگ برسے پنڈت جی ہمیشہ پہنچ جاتے تھے۔ بوندیں پڑتی ہوتیں تو وہ اپنے کندھے کی ریشمی چادر اتار کر بغل میں دبا لیتے اور ان کے گورے چٹے جسم پر پانی کی بوندیں یوں دمکتی ہوئی پھسلتیں جیسے سنگ مرمر پر شبنم گر رہی ہو۔

راکھیاں الگ الگ ہو جاتیں تو پھر بندھائی شروع ہوتی۔ سب سے پہلے اماں پردے سے ایک ہاتھ باہر نکالتیں ـــ اس میں پنڈت جی ہمیشہ پیلے رنگ کی راکھی باندھتے۔ جب اماں کا راکھی بندھا ہوا ہاتھ اندر چلا جاتا تو دوسرا ہاتھ باہر نکلتا، اس میں ایک روپیہ ہوتا تھا ——— چاندی کا چھن سے بولنے والا روپیہ، آج کل کا سا نہیں کہ پھینک دو تو بھٹا بھٹ بولے!

پھر ہم لوگوں کو راکھیاں بندھتیں، میں ہمیشہ پیلی راکھی کی ضد کرتی تھی مگر وہ مجھ کو ہمیشہ گلابی راکھی باندھتے اور ڈانٹتے جاتے "جب بیاہ ہوگا تب باندھنا پیلا کنگنا، ابھی یہ باندھ گلابی ——— کنواری کنیا میں نہیں باندھتیں پیلا ـــ الٹی گنگا بہا رہی ہے ـــ ہری رام، ہری رام"

اگلا والا ٹوٹا دانت کٹا کٹ بولتا جاتا، شوشو سیٹی بجتی جاتی!

جنم اشٹمی والے دن ہم لوگ دو کہانیاں سنتے تھے۔

صبح ہی صبح ہمارے دادا ہم سب بچوں کو جمع کر کے حضرت موسیٰ کی کہانی سناتے ـــ موسیٰ اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ فرعون نے حکم دیا۔ اس سال سب لڑکے پیدا ہوتے ہی مار ڈالے جائیں کیوں کہ اس کے دربار کے نجومیوں نے بتایا تھا کہ سال کے اندر ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے گا ——— پھر ان کے پیدا ہوتے ہی ممتا کی ماری ماں کا ان کو ٹوکری میں ڈال کر دریائے نیل میں بہا دینا پھر ان کا اپنے دشمن کے ہی گھر میں پرورش پانا اور وقت آنے پر اس کی قوت کو ختم کر دینا ـــ

کہانی ختم کر کے وہ اٹھتے اور کہتے "اب ہم وظیفہ پڑھنے جا رہے ہیں، دس بجے تک پنڈت جی آئیں گے تو ان سے کنھیا جی کی کہانی سننا"

پھر پنڈت جی آ جاتے، اس دن ان کے ماتھے پر دو بڑے بڑے اور نہایت شاندار تلک لگے ہوتے تھے، ہلدی اور صندل کے اور ان تلکوں کے بیچ بیچ میں چاول کے دانے چپکے نظر آتے تھے ـــ ان کے ایک ہاتھ میں ایک پیاری

سی محدتی ہوتی تھی جس میں کنہیا اور رادھے ساتھ ساتھ لگے بیٹھے ہوتے تھے — میں فوراً دوڑ کر اندر جاتی تھی اور اپنی گڑیا کی جھمکتی ہوئی رانگے کی کرسی اٹھا لاتی تھی، وہ اس مورتی کو کرسی پر جاتے اور گوتم بدھ کے پوز میں بیٹھ کر کنہیا جی کی کہانی سنانا شروع کرتے — قیدخانے میں ان کا جنم لینا، بارہ بجے رات کا وقت تالوں کا ٹوٹنا، دروازوں کا کھلا جانا زبردست باڑھ اور اس میں سے واسودیو کا اس ننھے سے بچے کو ٹوکری میں اٹھائے ہوئے گزرنا، جمنا کا کنہیا جی کے قدم چومنا اور پھر اس ابلتے امڈتے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کا جھاگ کی طرح بیٹھ جانا — بیان کرتے کرتے پنڈت جی کی آنکھوں سے آنسو گرتے جاتے، بیچ بیچ میں وہ ایک پل کو رک جاتے، اپنی گھسی ہوئی صاف ستھری گیروا ریشمی چادر سے آنسو خشک کرتے، آہستہ سے کہتے "ہری اوم، ہری اوم، رادھے شیام، رادھے شیام" — اور پھر کہانی آگے بڑھنے لگتی —!

میرے دادا بھی پاس بیٹھے، کعبہ شریف کے ریشمی عطر میں بسے ہوئے چارخانہ دار رومال سے آنکھوں کی نمی پونچھتے اور تلاوت کرنے کے انداز میں ہل ہل کے کہتے جاتے "سبحان اللہ، سبحان اللہ، تعریف ہے اس بچانے والے کی! جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ سبحان اللہ، سبحان تیری قدرت"

میری آنکھوں کے آگے بھی ایک چلمن سی آجاتی، پنڈت جی کا شاندار تلک، ان کے گورے چٹے کندھے، دادا کا ہلتا ہوا سر کرسی پر جمی ہوئی رادھے اور شیام کی پیاری صورتیں مجھے دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگتیں۔

اس دن پنڈت جی کو ہمارے یہاں سے شکر اور تل اور چاول ملا کرتے تھے — اندر سے بنانے کے لیے اگھی کے لیے پانچ آنے الگ سے! پنڈت جی مٹھائی یا شکر یا تل وغیرہ چادر میں باندھتے وقت ہم بچوں کو قریب پھٹکنے نہیں دیتے تھے "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ، بگاڑو گے فضول کے واسطے — ہاں ہاں ہاں — شکر نہیں کھاتے بچے — ارے بھاگو الو اپیٹ میں کیڑے ہو جائیں گے تو ناچتے پھرو گے"

میں ہمیشہ ان کی شکر میں سے ایک مٹھی لے کر بھاگ جاتی تھی اور دور کھڑی ہو کے پھانکتی اور چاٹتی اور وہ پہلے تو بگڑتے پھر ہنستے۔ کٹاکٹ دانت بجا کر کہتے "ارے تو، تو بالک بھی ہے، تریا بھی اور رادھا بھی — تیری ہٹ سے کیا کوئی پار پا سکے گا۔ بھگوان کرے تجھے ایسا ہی ملے جو ڈنڈوں سے سیدھا کرے۔

میں دور کھڑی ہنستی رہتی!

وہ ایک ایک چیز، چادر کے کونوں میں الگ الگ سنبھال سنبھال کے باندھتے پھر ہم لوگوں میں سے ہر ایک کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پھر اپنا بوڑھا جسم لچکاتے، دانت کٹ کٹ کرتے، کھڑاؤں بجاتے ہاتھ میں لٹکی مالا کے دانے گراتے، پھاٹک کی طرف چلتے ہوئے بڑبڑاتے جاتے — "ہری اوم، رادھے شیام، بھگوان کا نام، سب کا بھلا، سب کا بھلا کرے — رادھے شیام"

اقبال متین

سرحدِ دل

پرشاد کاکا پچاس کے پیٹے میں دوہری ہڈی، چوڑے چہرے اور چکلے سینے کے آدمی ہیں۔ دوسروں کا غم بانٹ لینا اور اپنی مصیبتوں میں مسکرانا کوئی ان سے سیکھے۔ دفتر میں ہم سارے نوجوان ان کے گرویدہ تھے۔ خود ان کی اپنی عمر کے ساتھیوں میں بھی وہ کچھ کم مقبول نہ تھے — اوصاف ہوں تو آدمی دوسروں کے دل دیکھتے کے دیکھتے جیت لیتا ہے۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تلوار کی کاٹ زبان کی کاٹ سے کم ہوتی ہے اور بات کی مٹھاس مصری کی مٹھاس سے زیادہ — پرشاد کاکا اسی مصری کے سوداگر تھے۔ بوریوں کی بوریاں باتوں میں لٹاتے پھرتے — انٹرول ہوتا۔ کھانے کے کمرے میں چند ایک ساتھی جمع ہو جاتے۔ توشے کھلتے اور دس گھروں کی حسب مقدور نعمتیں ایک ہی میز پر چن دی جاتیں۔ پرشاد کاکا کے ساتھ توشہ ہوتا سو الگ لطیفوں کی چورن ہوتی سو جدا۔

پرشاد کاکا کا سب سے بڑا وصف ان کی یہی زندہ دلی اور ان کی ستھرائی اور سادگی تھی بس اجلے اجلے کپڑے پہنے رہتے یہ اجلے کپڑے ملنے جلنے والوں کو اتنا تو بتلا ہی دیتے کہ کاکا کے ہاتھوں کے لمس سے وہ آشنا نہیں ہیں۔ کاکا نے خود انھیں گدگدا، گدگدا کر دھویا ہے۔ الگنی پر سکھایا ہے، کسی وزنی شے کو نیچے استری کرنے کے بہانے رکھ چھوڑا ہے اور پھر ذرا سا جھٹک کر زیب تن کیا ہے اور جو عطر حنا کی بھینی بھینی خوشبو ہے اس کے بغیر تو کاکا کی شخصیت مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

کاکا کے پاس مشکل سے دو تین جوڑے تھے — یہ بات میں جانتا تھا اور اس بات کے علم کی بنیاد کاکا سے وہ میرا تعلق خاطر تھا جو ان کے قرب کا باعث بنا۔ انھوں نے خود میرے آگے اعتراف کیا تھا۔ ورنہ ان کی پوشاک سے ان کی کم مائیگی کا اندازہ لگانا کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ جب دیکھو بگلا بھگت بنے رہتے — ہاں کوئی عید ہو تو کلف دار استری ضرور ہوتی۔

ان کا یہ وصف تو مثالی تھا۔ ہر عید ان کی عید تھی۔ دیوالی ہو کہ عید رمضاں، دسہرہ ہو کہ بقرعید، سبھی کا اہتمام کرتے شک و شبہ کی اگر کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ان کی ذات پات اور بھائی برادری کے لوگ تیوریوں میں بل ڈال کر انھیں نہ گھورتے تو پرشاد کاکا رمضان اور بقرعید میں کسی مسجد میں دو سجدے کر دینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ سچ پوچھئے تو ان کا دل واقعی ان کے اجلے کپڑوں سے زیادہ صاف تھا — کہتے تھے جوانو — میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر ہندوستانی ہوں، پھر ہندوستانی — اس کے بعد پرشاد کاکا ہوں جو جلایا جاؤں گا علی چاچا ہوتا تو دفنایا جاتا۔

دیوالی اور دسہرہ تو کاکا کی عیدیں اس لیے تھیں کہ وہ کاکا تھے، چاچا نہ تھے لیکن رمضان اور بقرعید میں بھی چھٹیوں کے دوسرے دن جب وہ دفتر آتے تو عطر کی شیشی حضوران کے ساتھ ہوتی، اور بلا تخصیص ہم سب سے جب وہ ملتے تو ہر ایک خاص معطر ہو جاتا۔ یہ تو ہوئی عام تواضع لیکن چار چھ اُن کے چہیتے ایسے بھی تھے جن کے لیے کاکا اپنے گھر پر کچھ اہتمام کیا کرتے ان ہی چہیتوں میں میں بھی شامل تھا۔ ہم گھر پہنچتے تو شیر قورمہ سے نوازا جاتا اور تاش کی بازی جلتی۔ پھر کچھ دیر بعد تھکن دور کرنے کے لیے چائے کا دور ہوتا۔

بقرعید میں کاکا بڑی مشکل میں پڑ جاتے۔ عطر تو سب کا حصہ تھا۔ خوشبو تقسیم کرنے میں جس طرح پھول کوئی تخصیص نہیں برتتا اسی طرح کاکا بھی جس سے ملتے اسے معطر کر دیتے ـــــ لیکن وہی اپنے چار چھ چہیتوں کی تواضع بریانی یا قورمہ سے اپنے گھر پر کرنا کاکا کے لیے قریب قریب ناممکن ہوتا ـــ ترکاری کی بریانی یا آلو کا قورمہ سامنے رکھ کر بھی کاکا اس جذبۂ اخلاص و محبت کی تشفی کر سکتے تھے۔ اور ہم تو ان کے اتنے معتقدین میں سے تھے کہ ان کی اس "بگھاری محبت" کو بھی سینے میں چھپا کر خوش ہو لیتے لیکن کاکا ہمیں بقرعید میں گوشت کھلائے بغیر کہاں رہ سکتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ گھر میں گوشت کی پرچھائیں بھی پڑ سکتی تھی۔ چھپے چوری ان مرحلوں سے گزرنا بھی ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ کاکی ان عورتوں میں تھیں جو گھر کا سارا کام کاج انجام دے کر بھی گھڑی دو گھڑی چین سے نہ بیٹھتیں۔ جب کام سے آدمی کو پیار ہو تو کام کہیں سرتا ہے ـــــ وہ اگر گھر کے کسی گوشے میں رام نام کی مالا جپتی پڑی رہتیں تو پھر کاکا اور ہم بھتیجوں کے وارے نیارے ہو جاتے۔ کاکا خود اپنے ہی ہاتھوں دو گوشتہ بریانی دم دینے سے نہ چوکتے۔ لیکن کاکی تو پون جھکولا تھی۔ گھر کے کسی بھی کونے میں چپکے سے جھانک کر چلی آتی ـــ اب کاکا اپنے چہیتوں کو لے کر کسی اچھے سے ہوٹل کا رخ کرتے اور کھلا پلا کر ٹرا آنند پاتے۔

دیوالی اور دسہرہ میں تو ہم لوگوں کی واقعی عید ہوتی۔ دن دن بھر کاکا کے گھر گزر جاتا۔ مٹھائیاں کھاتے طبیعت چھکتی تو کھارے سے منہ کا مزہ بدل لیتے ـــــ منٹ دو منٹ ہمیں چھوڑ کر دوسرے آنے والوں سے کاکا ملتے بھی اور پھر ہماری محفل میں شامل بھی ہو جاتے۔

عیدوں تہواروں میں اپنی جمع پونجی اس فراخ دلی سے لٹانے والا کسی نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کاکا ان دنوں کی ٹوہ میں زندگی بھر لگا رہتا ہے اور جیسے ہی جب یہ نیک ساعت آتی ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور جتنی خوشیاں زندگی سے بٹور کر اپنے دامن میں بھر سکتا ہے، بھر دیتا ہے ـــــ کاکا کی اسی پھول جیسی صفت نے مجھے اس حد تک متاثر کیا تھا کہ میں دیوالی میں اپنے گھر پر چراغاں کر کے سکون پاتا۔ ایسے میں بھی کاکا میرے گھر آ کر بچوں میں مٹھائی تقسیم کر جاتا۔ میری بیوی کے لیے اس کی پسندیدہ سوہن پپڑی الگ ہوتی۔

۱۵ راگست کا سنہرا دن تھا۔ صبح ہی سے چہل پہل زیادہ تھی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دن زیادہ روشن ہو یا پھر چہروں کی تابانی اس دن کو زیادہ منور کیے ہوئے ہے۔ اسکولوں میں، دفتروں میں، کارخانوں میں، بنکوں میں ہر طرف زندگی کی رنگا رنگی پھیل رہی تھی۔ ہری بھری کائیں، سرسراتی جھنڈیاں، لہلہاتے ترنگے، جلسے، نغمے، تقریریں اور ان ساری خوشیوں

کو اپنے جلو میں لیے سرفراز و سربلند ہماری قومی آزادی کا امتیاز ہمارا ترنگا جوق در جوق بچے اسکولوں کی جانب رواں تھے مزدور کارخانوں کی جانب رواں تھے، نرسیں بھی اپنی بگلے جیسی قطاروں میں ہاسپٹلس کی طرف مائل پرواز رہی تھیں۔

میں اپنے دفتر پہنچا تو وہی سماں تھا جو برسوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ وہی بچھی ہوئی کرسیاں، وہی سجا ہوا ہال، وہی ساتھیوں کے چہرے جن پر خوشی کی تازگی سے زیادہ تکمیل فرض کا احساس نمایاں تھا۔ بعضوں کے چہرے تو اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ احکام کی تعمیل میں چلے آئے ہیں ——— نہ ان کا اپنا کوئی جذبہ تھا نہ ان کا اپنا کوئی احساس چابی کے پتلے جیسے سجے ہوئے ہال کی طرف بڑھ رہے تھے افسروں کا یہ حال تھا جیسے ایک جہاں سا نار نیلام کے لیے لائے گئے ہوں اور ہم سب بولی لگانے کے لیے جمع ہوئے ہوں لیکن، ہمارے دلوں میں جو دبی دبی خوشیاں تھیں وہ انہیں خریدنے کے لیے کم تھیں ——— مجھے ہنسی آئی کہ وہ لوگ جن کے پیروں تلے آزادی سے پہلے زمین بھی نہ تھی اب آسمان پر چلنے لگے ہیں ——— شاید عہدہ اس مقدس دن سے زیادہ کوئی اہم چیز ہے ——— یہ بات یوں تو میں ہر سال سوچتا ہوں لیکن آج کاکا نے میرے تشنہ سوالوں کے سارے جوابات مجھے دے دیئے۔

آج کاکا مجھے نئے روپ میں ملا۔ ایسے روپ میں کہ پہلے پہل تو مجھے اس کی شخصیت پر شبہ ہوا۔ خاموش خاموش سا، اداس اداس جیسے آج کے دن ہم نے کچھ پایا نہیں کھو دیا ہے ——— مجھے کاکا کی اس اداسی سے دکھ سا ہوا۔ ہمیشہ بتیسی کو سورج کی کرنوں میں نہلانے والا یہ شخص آج اس طرح لب سئے ہوئے ہے۔

جلسہ شروع ہوا، گھسی پٹی تقریریں ہوئیں ـــ خالی خالی ذہنوں سے کچھ لوگ سامنے دھری ہوئی میموں کو تکتے رہے ـــ اور پھر جلسہ برخواست ہو گیا۔

"کاکا آج کیا بات ہے، اداس ہو" ـــ میں نے ان کا ہاتھ دبا کر پوچھا۔

"ہاں ـــ ہوں تو" وہ کہنے لگے ——— دیکھو نوجوان ——— اور اپنے مخصوص انداز سے میرے کندھے دبا کر انہوں نے کہنا شروع کیا۔

میں سوچ رہا ہوں کہ میں تو عیدوں کا رسیا ہوں۔ بقول تمہارے کاکا تو بس سال بھر عیدوں کا اس طرح منتظر رہتا جیسے اس پر ترس کھا کر عید وقت سے پہلے آ جائے گی ـــ اور جو سب سے بڑی عید ہے ـــ سال کا سب سے محترم اور مقدس دن ہے اس کی پذیرائی کے لیے تمہارے کاکا نے آج تک کچھ بھی نہیں کیا۔ دیکھو، جب میرے دل کو یہی بات مسوسنے لگی تو میں نے شیشی نہیں عطر کا سارا کنستر اپنے ساتھ رکھ لیا کہ آج کی تاریخ سے سب سے زیادہ اس دن کا مان کروں گا۔

"پھر؟" ـــ میں نے اس جذبے کو گرفت میں لاتے ہوئے پوچھا جو میرے اندر بھی پرورش پا رہا تھا۔

پھر کیا ——— دیکھو نا ——— اتنے سارے لوگ جو یہاں جمع ہوئے ہیں ان میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو بادل ناخواستہ سرکاری احکام کی تعمیل کے لیے آج بھی دفتر کی چار دیواری میں داخل ہوئے ہیں ان کے چہرے آزادی کی اس جوت سے قطعی ناآشنا ہیں جو یہ ترنگا ہم پر پھینک رہا ہے ـــ میں سوچ رہا ہوں ہم اس لہراتے ہوئے ترنگے کی جانب نظریں اٹھا کر بھی اگر اپنی رگوں میں خون کی روانی کو تیز محسوس نہیں کرتے ہیں تو پھر ہمارے احساسات کو کیا ہو گیا

ہم یہاں کسی سرکار کے احکام کی تعمیل کے لیے نہیں آئے ہیں — ہم تو اپنے جیتے جاگتے جذبوں کی پونجی دل میں چھپائے اپنی مسرتوں اور خوشیوں کے خزانے اپنے وجود میں سمیٹے یہاں اس لیے آئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے پر نچھاور کریں، خوشیاں دیں، خوشیاں لیں ——— ناچیں، کودیں، موج منائیں۔ لیکن یہاں تو دور دور تک اسٹیچو بکھرے ہوئے ہیں۔ میاں دھرمی لال۔ تم ہی بتاؤ، اس ہوکے عالم میں اس کنستر میں بھرا ہوا یہ عطر میں تابوتوں پر چھڑکنے سے تو رہا۔

مجھے کاکا کے ایک ایک لفظ سے اتفاق تھا۔ خود میں کتنی ہی بار یہ سوچ کر دل مسوس کر رہ گیا تھا کہ ہماری قومی آزادی کا یہ سب سے زیادہ حسین ترین دن، دفتروں، مدرسوں، کالجوں، ملوں اور کارخانوں میں خوشی کا ایک اجتماعی مظاہرہ تو بن گیا ہے لیکن اس خوبصورت دن کی نرم اور ٹھنڈی روشنی سے گوشے گوشے کو منور کر لینے کے لیے میرے ہم وطنوں نے اپنے گھروں کی کھڑکیاں ابھی نہیں کھولی ہیں۔ دریچے ابھی نہیں کھولے ہیں۔ اور اجالا آج تک دروازوں پر کھڑا دستک دے رہا ہے۔

"پرشاد کاکا" میں نے گرمجوشی سے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "مجھے دیکھو میرا چہرہ کیسا گلنار ہو رہا ہے۔"

کاکا نے مجھے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ دنیا بھر کے اجالے اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں۔

"میں یہی تو چاہتا ہوں ——— مجھے صرف یہی تو چاہیے" اس نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے فرط مسرت سے گلوگیر ہو کر کہا۔

ہمارے ساتھی ہمیں اس طرح بغل گیر ہوتا ہوا دیکھ کر ہماری جانب بڑھے۔

ہم کیوں محروم رہیں کاکا — اور کاکا پھول بن کر مہکنے لگا — اس کا عطر حنا کا کنستر بدن کی خوشبو بن کر احساس کی خوشبو بن کر جذبے کی خوشبو بن کر، قلب و نظر کی خوشبو بن کر سارے میں جیسے پھیل گیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ اُجالا جو ہمارے دروازوں پر کھڑا دستک دے رہا تھا اسے آج ہم نے اپنے سینوں میں بھر لیا ہے اور اس کی جوت ہمارے چہروں پر نمایاں ہو گئی ہے۔ اب ہم اپنے چہروں کی اسی جوت سے اپنے گھروں کے کونے کونے کو منور کر لیں گے۔

آؤ — میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا — ہم کاکا سے عہد و پیمان کریں۔ ایک دوسرے سے عہد و پیمان کریں۔ خود سے اپنے آپ سے عہد و پیمان کریں کہ یہ جوت جو صدیوں کے اندھیروں کا سینہ چیر کر پھوٹی ہے۔ صدیوں کی غلامی کو تاریک غاروں میں دھکیل کر ابھری ہے، ہم اسی کو مشعل راہ بنائیں گے۔

ہم نے بہ آواز بلند عہد کیا — اپنی سب سے بڑی عید۔ اپنے سب سے مقدس دن کی عظمت کے اعتراف میں یہ عہد آنکھوں آنکھوں ہی میں ہوا — لیکن آنکھوں کی یہ زبان بڑی صاف تھی، بڑی واضح، اتنی کہ اس کی گونج ہمیں آس پاس سنائی دے رہی تھی جیسے ہم بہ آواز بلند یہ پیمان کر رہے ہوں۔

کاکا نے اپنے حنا کے خالی کنستر کا منہ شیشے کے ڈاٹ سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"خوشبو کی بھی سرحد ہے، نغمے کی بھی سرحد ہے، اجالے کی بھی سرحد ہے لیکن جذبے کی کوئی سرحد

نہیں۔ محبت کی کوئی سرحد نہیں۔"

"اور محبت کا گھر دل ہے نا کاکا —" ساتھیوں میں سے کسی نے کہا۔

"بالکل سچ — بل — کل — سچ" کاکا نے زور دے کر کہا۔

اور آج سے ہم نے اپنے دیس کا پیار اپنے دلوں میں بسا لیا ہے — کسی نے اضافہ کیا۔

آج کی ہنگامہ خیز مصروفیتوں کے پروگرام بناتے ہوئے جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ایک ایسا مسرور کن احساس ہمارے ساتھ تھا جس کا شاید کوئی نام نہیں ہے۔

میں اپنے گھر پہنچا تو میری بیوی مصلیٰ بچھائے نماز پڑھ کر کچھ دعا مانگ رہی تھی۔

بچے اسکولوں سے لوٹ گئے تھے — سرخ، نیلی عینکیں، رنگیلے بیلون — ٹافیوں اور چاکلیٹ میں سب کے سب مگن تھے۔

میرا بچہ کہہ رہا تھا — ڈیڈی آج ابا سے عیدی لیں گے۔

میری بیوی نے اپنا مصلیٰ تہہ کیا تو میں نے اس کو چھیڑا "آج بہت دن بعد اللہ میاں یاد آئے ہیں۔"

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا — ہماری سرحدوں پر جب چینی حملہ آور ہوئے تھے تو میں نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنے ناپاک ارادوں میں ناکام ہوں تو شکرانے کی نماز ادا کروں گی — روز سوچتی رہی لیکن گھر کے کام کاج سے فرصت ہی نہ ملے — آج کے مبارک دن میں نے سوچا کہ یہ فرض پورا کرلوں۔

مجھے اس پر پیار آیا — میں نے اس کے چہرے پر چھپی ہوئی مسرت کی چمک دی۔

اس نے شیر قورمے سے بھرے ہوئے جگ پر سے کپڑا اٹھا کر بچوں کو آواز دی تو سیرے نتھنے خوشبو سے پھڑک اٹھے۔

میں نے کہا، "اچھا جی — یہ اہتمام بھی ہے۔" وہ مسکرانے لگی۔

میں سوچنے لگا کہ مابین لائین کوئی لائین ہی نہیں ہے۔ اگر وہ ہمارے دلوں سے ہوکر نہیں گزرتی ہے — اور اگر ہوکر گزرتی ہے تو پھر کسی ملک کا کوئی "ٹینک" کوئی "لائی" ہمارے دلوں کی اس سرحد کو کبھی بھی عبور نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ

ثقافتی اتحاد اور حیدرآباد

ہندوستان کو اس کے وسعت، رقبہ اور آبادی اور تہذیب و تمدن کے تنوع کے لحاظ سے ایک ذیلی براعظم کہنا بجا ہے۔ لیکن اگر اس کے تمدنی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی جائے اور اس کی تاریخ کا مطالعہ اختلاف کے اندر اتحاد کی تلاش کے نقطۂ نظر سے کیا جائے تو اس کا آسانی سے پتہ لگ جائے گا کہ متحدہ ہندوستان کی جڑیں اور بنیادیں کس قدر مستحکم اور مضبوط ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ محض سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہندوستان کی تاریخ میں آج کے سارے بھارت کو ایک پرچم اور ایک حکومت کے تحت متحد کرنے کا سہرا انگریزوں کے سر بندھے گا۔ قدیم ہندوستان کے چکرورتی شہنشاہوں نے تھوڑی سی مدت تک ہندوستان کے بہت بڑے حصوں کو اپنے سیاسی تسلط کے تحت متحد کیا لیکن کل ہندوستان کو متحد کرنے کا موقع انھیں نہیں ملا۔ اشوک کو بھی اگرچہ ان کی فتوحات کی بنیاد بڑی حد تک گوتم بدھ کے مذہب کی اشاعت تھا۔ سارے ہندوستان کو اپنی حکومت کے تحت متحد کرنے کی کوشش سے باز آنا پڑا، اور کالنگا کی فتح کے بعد جنگ کے فلسفہ سے دستبردار کرنا پڑا۔

اسی طرح اکبر کو بھی ناکامی ہوئی۔ یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزوں سے اہنسا کے ذریعہ چھینی ہوئی آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا جغرافیائی اور سیاسی اتحاد بھی بنا بنایا اس کے ہاتھ آیا۔ میں ہمیشہ شدت سے یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ آزادیٔ ہند کے اس پہلو کو شاید ہم کافی اہمیت نہیں دیتے، اس کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کرتے ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک روشن ترین واقعہ ہے کہ ثقافتی اتحاد کے علاوہ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک اور کٹک سے لے کر اٹک تک سارے ہندوستان کو ایک پرچم اور ایک آئین اور ایک حکومت کے تحت متحد ہونے کا زرین موقع اسی زمانے میں ملا ہے۔ اگر اس تاریخی واقعہ کی اہمیت کو ہر ہندوستانی پوری طرح محسوس کرے تو جشن آزادی ہند کے صحیح معنی سمجھ میں آسکتے ہیں اور ہماری راہ عمل بھی اس کی روشنی میں متعین کی جاسکتی ہے۔

ہندوستان کا ثقافتی اتحاد بھی دنیا کی تاریخ میں عدیم المثال ہے۔ گو سیاسی اغراض کے تحت اپنی حکومت کو برقرار رکھنے کی خاطر انگریز محققین نے اکثر ہندوستان کی زبانوں، مذاہب اور تہذیبوں کے تنوع اور اختلافات ہی پر زور دیا۔ اسی بنا پر ہندوستان کے سیاسی اتحاد اور حصول آزادی کی کوششوں کی ناکامیابی کی پیشین گوئیاں کیں۔ لیکن ان میں سے

جن لوگوں نے غیر جانبدارانہ طریقہ سے تاریخ مسیحی کو پیش نظر رکھتے ہوئے رائے زنی کی ہے ان سے ہندوستان کے ثقافتی اتحاد کی بنیادیں چھپ نہ سکیں اور کھلے بندوں ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان میں مختلف تہذیبوں کے میل جول کا جو منظر نظر آتا ہے اس کی مثال دنیا میں نظر نہیں آتی۔

قدیم ہندوستان کے مختلف ادوار میں لسانی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی ارتباط اور میل جول کی کئی تحریکات وجود میں آئیں اور ذات پات کی کڑی جکڑ بندیوں کے باوجود کثرت سے نسلی اختلاط بھی ہوا۔ اسی طرح علوم وفنون اور ثقافت (CULTURE) کے مختلف شعبوں میں بھی لین دین کے ذریعہ اتحاد کی طرف قدم بڑھائے گئے۔ جو ایک لمبی کہانی ہے اور اس مضمون کی بساط سے باہر ہے۔

میں مختصراً اس مضمون میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ حیدرآباد نے یا اس ثقافتی اتحاد (CULTURAL UNITY) کی مسلسل تحریک میں کیا حصہ لیا۔ اور اس میدان میں حیدرآباد کا کیا مقام ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ دکن کو جغرافیائی حیثیت سے ہمیشہ سارے ہندوستان میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔ اجودھیا اتر پردیش میں واقع ہونے کے باوجود رامائن کی کہانی کا بہت بڑا حصہ سرزمین دکن پر وقوع پذیر ہوا۔ ساتاواہن، چالوکیہ، راشٹر کوٹہ کاکاتیہ وغیرہ سلطنتیں یہاں قائم ہوئیں اور ایک عرصہ تک یہ سرزمین ہندو تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنی رہی۔ ان سلطنتوں کی وسعت یا ان کے زمانے کی فتوحات یا اس زمانہ کی تجارت یا ان کی قائم کردہ نوآبادیات کسی طرح شمالی ہند کے سلطنتوں کے کارناموں کے مقابلہ میں کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قبل مسیح میں بھی روما اور سمندر پار دور دراز ممالک سے دکن کی راجدھانیوں کا تجارتی تعلق رہا۔ لنکا، جاوا، ملایا اور جنوب مشرقی ایشیا کے دیگر ممالک سے براہ راست تجارتی و ثقافتی میل جول رہا۔ ان ممالک پر ہندوستان کے مذاہب رسم ورواج اور خاص کر مہابھارت اور رامائن کا جو قدیم ہندو سنسکرتی یا ثقافت کے آئینہ ہیں بے انتہا اثر پڑا ہے۔ دکشن یا جنوب کی چار اہم زبانوں یعنے تلگو، تامل، کنڑی اور ملیالم کا نسلی تعلق دراوڑی خاندان سے ہونا مسلمہ ہے لیکن صرف ایک تامل زبان ہی نے اپنے ابتدائی نسلی امتیازات کو بڑی حد تک باقی رکھا۔ باقی تینوں زبانوں اور ان کے ادب پر سنسکرت نے اپنی پوری چھاپ لگائی۔ اس طرح آرین تہذیب وتمدن کو جس کی نشوونما ہزاروں برس تک وسط ایشیا اور شمالی ہند میں سات ندیوں کے منبعوں پر ہوئی تھی۔ وسط ہند اور جنوبی ہند میں پھیلانے اور اس کو پروان چڑھانے میں دکن کا بڑا حصہ رہا۔ اس کا جغرافیائی مقام خود اس کا متقاضی تھا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کا پہلا تعلق ملابار کے ساحل پر پیدا ہوا اور اس کے بعد اس کے مغربی ساحل پر۔ سندھ کو انھوں نے ۷۱۱ء میں فتح کیا۔ لیکن اس وقت ہندوؤں کو مسلمانوں کی صرف ایک جھلک سی ملی گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی ہی میں ان دونوں میں قریبی تعلقات پیدا ہوئے حملہ آور قوم کے خلاف فطرتاً جو مخالفانہ جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ دھیرے دھیرے نرم پڑتا گیا، اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ البیرونی نے ۱۲ برس تک سنسکرت پڑھی اور ہندوؤں کے سارے علوم وفنون پر اور ان کے ویدانت اور مذاہب پر اس نے جو تبصرہ کیا ہے

وہ نہایت مبسوط اور محققانہ ہے ابتدائی مخالفت کے کم ہونے کے بعد دونوں اقوام میں کچھ اختلاط بڑھا اور ایک دوسرے کے محاسن اور عیوب کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو حیرت انگیز تبدیلی ملک کے معاشرہ میں نمودار ہوئی، مذہبی تعصب کم ہوتا ہوگیا۔ ایک طرف بھگتی کا مذہب اور دوسری طرف صوفیائے کرام کا راستہ یہ دونوں اتنے قریب آ گئے کہ اس پر "من تو شدم تو من شدی" کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ہندو ویدانت کا اثر مسلم صوفیوں پر بے انتہا اور اسی طرح اسلام کی بنیادی تعلیم "وحدہٗ لاشریک لہٗ" سے ہندو سنت اور سادھو جن کی تعلیم پر دراصل آج بھی ہندو عوام الناس چلتے ہیں اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ہندوؤں کے مسلمہ اصولوں سے بے باکانہ انحراف کیا ویدانت کے اصولوں کو اسلامی وحدانیت کے اتنا قریب لے آئے کہ بنظر غائر دیکھنے والوں کو ان میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں معلوم ہوتا۔

شمالی ہندوستان کی تاریخ میں سنہ ۱۲۰۶ء ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قطب الدین ایبک نے سلاطین غوری کی اطاعت سے منہ موڑ کر اپنی نئی سلطنت کی بنیاد دہلی میں ڈالی۔ ایبک نے ہی پہلی مرتبہ ہندوستان کو اپنا وطن تسلیم کیا اور اسی وقت ہندو مسلم ثقافتی میل جول کی صحیح بنیاد پڑی۔ جنوبی ہند میں اس تحریک کی ابتدا بہت بعد یعنی علاؤ الدین خلجی کے فتح دکن کے بعد سے . . . . ہوئی۔ اگرچہ سلطنت بہمنی کی مختلف شاخوں کے قیام کے بعد سے دہلی اور دکن میں ذہنی حیثیت سے فاصلہ بڑھ گیا اور ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی۔ لیکن عربوں اور ایرانیوں کی آمد کا سلسلہ بہت زور سے جاری رہا۔ اس کے باوجود سرزمین دکن میں ایک ملی جلی تہذیب کی بنیاد پڑی جو شمالی ہند کے تمدن سے ایک حد تک جداگانہ اور اپنی وطنی خصوصیات کے مدنظر خاص اہمیت کی حامل تھی۔ بہمنی خاندان کے حکمرانوں کی طرز حکومت نہ صرف ملک کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش سے متحرک تھی بلکہ ان حکمرانوں نے سرزمین دکن کی مٹی سے خاص انس اور رغبت اپنے اندر پیدا کرلی تھی۔ اس یگانگت کا عکس ان کی حکومت کی ہر پالیسی کے اندر دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ ان کی طرز زندگی اور ان کے ماحول پر اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔ سلاطین مغلیہ نے بھی خاص طور پر اکبر نے بہت بڑے پیمانے پر ایک نئی تحریک کی سرکردگی کی لیکن اس کا اثر محض ان کے دربار اور متوسلین کی حد تک محدود رہا۔ داراشکوہ نے اس کی تقلید کی۔ لیکن ردعمل زور کا ہوا اور اکبر کی ساری کوششیں بیکار گئیں۔ برخلاف اس کے سلاطین بہمنیہ نے اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔

ہندو مسلم ثقافتی اتحاد کے پیدا کرنے کی تحریک باوجود جنگ وجدال کے اور مختلف ریاستوں اور علاقوں کے سیاسی مخالفتوں کے برابر جاری رہی۔ اس تحریک کو جہاں حکمرانوں کی سرپرستی حاصل ہوئی وہاں نمایاں نتائج برآمد ہوئے لیکن جہاں اس کی نشوونما غیر سرکاری یا عوام کی کوششوں پر مبنی تھی وہاں بھی اس کو کچھ کم کامیابی نہیں ہوئی۔ مذہبی اور معاشرتی میدان میں رامانند، تلسی داس اور کبیر داس وغیرہ نے شمالی ہند میں جو کام کیا . . خود سلاطین بہمنی اور حضرت خواجہ بندہ نواز وغیرہ صوفیائے دکن نے جنوب میں وہی کام کیا۔ سنہ ۱۳۰۰ء سے سنہ ۱۶۰۰ء کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں اس ثقافتی میل جول کا نمایاں دور کہا جاسکتا ہے۔ بنگال، گجرات اور دکن میں مسلمان حکمرانوں نے ہندو پیشروان مذہب اور

علماء شعراء ان رسوم و رواج کی قدر دانی اور عملاً سرپرستی کی اور دیسی زبانوں کی ترقی میں مدد کی۔ بنگالی زبان بڑی حد تک نامر شاہ جیسے فیاض بادشاہ کی مرہونِ منت ہے۔ اسی کی سرپرستی میں ودیاپتی نے بنگالی زبان میں مہابھارت کا ترجمہ کیا۔ اولین بنگالی شعراء میں ابوالحسن جیسے ممتاز عظیم شاعر گزرے ہیں۔ گجرات میں اردو و فارسی کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں نے سنسکرت کی بھی سرپرستی کی۔ دکن میں قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں نہ صرف ایک نئی زبان، دکنی اردو کی نشوونما ہوئی جو ایک حیرت انگیز لسانی اختلاط کا نمونہ ہے بلکہ تلگو ادب کی بڑی بھاری سرپرستی کی گئی۔ اگرچہ فارسی زبان سرکاری حیثیت رکھتی تھی لیکن علاقائی زبانوں کو اپنے ابتدائی مدارج ترقی پر حکومت کی سرپرستی حاصل رہی جس کی وجہ سے وہ ترقی کر سکیں۔ تلگو زبان اور ادب کی نشوونما سے پیشتر چالوکیہ، کاکتیہ، وجیانگر ریڈی، ولما ناک وغیرہ راجاؤں کے درباروں میں ہوئی لیکن سلاطین گولکنڈہ نے اس کی بڑی قابل قدر سرپرستی کی۔

> سلسلۂ قطب شاہی کے چوتھے سلطان ابراہیم نے، برس تک اپنی زندگی بمقام وجیانگر جلاوطنی میں گزاری تھی۔ وجیانگر تلگو ادب کا بڑا مرکز تھا۔ ابراہیم کو اس سے رس ملا اور جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے دل کھول کر تلگو ادباء و شعراء کی سرپرستی کی اونکی گنگادھرا۔ کندکوری اورنا، پوناکنٹی تلگانا ریہ وغیرہ تلگو شعرا تھے۔ ملک ابراھم کے نام کو ان تلگو شعراء و ادباء نے "ملک ابھارام" کے نام سے بدل دیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے اس کی تقلید کی اس نے پٹوبٹہ سومیائی کوس اور گنیش کو قطب شاہی سلسلہ نشان کا درباری پنڈت مقرر کیا۔ شیوادھرموترم اور پدماپران جیسے اہم سنسکرت گرنتھوں کا ترجمہ ہوا۔ برہمنوں اور دیگر ہندوؤں کو کافی تعداد میں ملازم رکھا اور اہم ذمہ داریاں ان کو سونپی گئیں۔ عادل شاہیوں نے بھی اسی رویہ کی تقلید کی۔ اکثر بہمنی سلاطین نے دکھنی اردو میں شعر کہے اور کتابیں لکھیں۔ یہ ایک ایسی زبان تھی جو بنیادی طور پر اردو تھی لیکن اپنی ترکیب میں علاقائی زبانوں اور ہندی سے اس قدر مخلوط ہو گئی تھی کہ وہی اس کی جان و روح سمجھی جاسکتی ہے۔ قطب شاہی خاندان کے باقی حکمرانوں نے بھی تلگو کی کافی سرپرستی کی، کہا جاتا ہے کہ ایک حکمران نے تو خود بھی تلگو زبان میں اشعار کہے گو کہ کہیں وہ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ اسی زمانے کی چند دستاویزات سرکاری و اسناد عطاء فارسی اور تلگو دونوں زبانوں میں دستیاب ہوتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کے کاروبار میں سرکاری زبان فارسی اور دیسی زبان تلگو دونوں رائج تھیں۔ قطب شاہی اور آصفیہ عطایائے معاش کا دارومدار معطی لہٗ کے مذہب پر نہیں تھا بلکہ ذاتی خدمات یا خاندانی وقار یا خدمات وفاداری پر تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں گہرے سماجی تعلقات پیدا ہوئے ایک دوسرے کے تہواروں اور عیدوں میں شریک ہونے سے عید ملاقاتوں کی رسم کا سلسلہ شروع ہوا۔ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کے معاشرہ میں بلا تفریق مذہب یکسانیت پیدا ہونے لگی، حکومت کی زبان کا کچھ اس قدر اثر پڑا کہ تعلیم یافتہ ہندو ایک دوسرے سے اردو ہی میں گفتگو کرنے لگے۔ اب بھی شہر حیدرآباد کی حد تک حیدرآبادی ہندو اور مسلمانوں کے آپس کی بول چال کی زبان اردو ہے۔

دکن میں بھی شمالی ہند کی طرح ہندوستانی سادھوؤں اور مسلم صوفیوں کی تعلیمات کا اثر عوام الناس پر پڑا. بھگتی مارگ اور . . . وحدۃ الوجود کا فلسفہ اس قدر جزو مذہب بن گیا کہ اختلافات کے بجائے بنیادی یکسانیت پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ محرم میں ہندو بکثرت شریک ہونے لگے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کے عرس شریف کا آغاز ایک مقامی ہندو فقیر کی سمادھی پر لوبید لگانے کے بعد وہاں سے تحفۃً جو تیل اور گڑ آتا ہے اس کو درگاہ میں چڑھانے کے بعد ہوتا ہے۔ عادات و اطوار رہن سہن اور لباس کی بھی یکسانیت پیدا ہو گئی۔ غرض زندگی کے کئی امور میں میل جول اور اتحاد پیدا ہوا.

حیدرآباد کو اکثر میں پنچ وینی سنگم یا پانچ زبانوں کا سنگم کہتا ہوں۔ یہاں کبھی زبان کے تعلق سے کوئی قابل ذکر اختلاف پیدا نہیں ہوا سوائے اس کے کہ عثمانیہ یونیورسٹی اور سررشتۂ تعلیمات میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خلاف احتجاج ہوا اور کوئی تحریک زبان کے تعلق سے یہاں نشوونما نہیں پا سکی۔ بلکہ تلگو، اردو، ہندی، مرہٹی اور کنڑی ان پانچوں زبانوں کے ساتھ پوری رواداری برتی گئی اور اب بھی برتی جارہی ہے۔ غرض ان تمام واقعات کی بناء پر ملک کے ثقافتی اتحاد (CULTURAL UNITY) کے میدان میں حیدرآباد کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ مجھے امید ہے اور میری دعا ہے کہ حیدرآباد کی یہ خصوصیت ہمیشہ قائم و برقرار رہے .

ڈی رامانج راؤ

قومی یکجہتی اور تلگو ادب

ہندوستان کی چودہ اہم زبانوں میں جنھیں ہمارا دستور قومی زبانوں کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے تلگو کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ تلگو زبان و ادب کی گراں قدر تخلیقات دس بارہ صدیوں سے ہماری تمدنی دولت میں اضافہ کرتی رہی ہیں اور آج بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ بیش بہا سرمایہ آندھرا ہی کا نہیں سارے ہندوستان کا قابلِ فخر ورثہ ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ تلگو بولنے والوں کا علاقہ اور آبادی نہ صرف اطالوی زبان کے بولنے والوں کے علاقہ اور آبادی کے لگ بھگ ہے بلکہ صوتی اعتبار سے تلگو بھی اطالوی زبان کی طرح ایک شیریں زبان ہے جس کے الفاظ کا ترنم بیا اوقات کانوں میں شکر گھولتا ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ تلگو نے اطالوی ادب کی طرح کوئی دانتے کوئی پٹرارک (PETRARCH) اور کوئی بوکاچیو (BOCCACHIO) جیسا عالمی شہرت کا حامل ادیب و شاعر پیدا کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ گزشتہ بارہ سو سال میں تلگو ادیبوں اور شاعروں نے بلند پایہ تصانیف و تالیفات کے ذریعہ نہ صرف حسن و عشق کی رنگا رنگی اور فن و فکر کی ہمہ گیری کے جوہر دکھائے ہیں بلکہ حیات و کائنات کی ان ابدی اقدار سے بھی اپنے کلام کو مالامال کیا ہے جن کا ہماری قومی تہذیب کی نشو و نما میں شاندار حصہ ہے۔

تلگو ادیبوں نے ہندوستان کی تہذیب کو اور ہندوستان کے قدیم تمدن کے خد و خال کو اپنی تخلیقات میں کچھ اس دلنشین انداز میں نمایاں کیا ہے کہ ان کا نقش پڑھنے والوں کے ذہنوں سے کبھی محو نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں رفتار زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے انھوں نے حسب ضرورت ملک کے بدلتے ہوئے حالات قومی اور ملکی مسائل کو نظم و نثر میں کما حقہ اہمیت دی ہے۔ ادبی مضامین افسانوں اور منظومات میں ان مسائل کو جگہ دے کر اہل ملک کے اتحاد کو قائم رکھنے میں ان ادیبوں نے جو رول ادا کیا ہے اور ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ جو کوششیں کی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ گزشتہ دس بارہ صدیوں میں تلگو زبان کے ادیبوں نے جس ادب کی آبیاری کی ہے وہ اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ تلگو زبان کے ادیب ہمیشہ قومی روایات کی حفاظت اور قوم کی فلاح اور بہبود کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

یہ بات تو اکثر لوگ جانتے ہی ہیں کہ رامائن اور مہابھارت دنیا کے لافانی ادب میں شامل ہیں، اور یہ کتابیں ہندوستان

کی دوسری زبانوں پر کافی اثر انداز ہوئیں۔ رامائن اور مہابھارت جیسی کتابوں سے دوسری زبانوں کے ادیبوں نے کئی چیزیں حاصل کیں۔ سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثر قدیم زبانوں کے شعرا نے ویاس والمیکی اور کالیداس جیسے عظیم المرتبت شعرا سے استفادۂ سخن کیا اور تلگو زبان کے ادیبوں نے بھی ان سے اکثر و بیشتر فیض حاصل کیا ہے۔

سنسکرت چونکہ زمانۂ قدیم کی ادبی زبان تھی اس کو تلگو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنایا اور اس پر عبور حاصل کیا اور ان سنسکرت کی کتابوں کو نظر میں رکھ کر تلگو میں کتابیں بھی لکھیں۔ سنسکرت ہندوستان کی ایسی زبان ہے جس کا ادب بے حد وسیع ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سنسکرت کی ترقی اور سدھار میں تلگو کے شعرا نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ تلگو زبان کے کئی ایسے عالم ہیں جو تلگو اور سنسکرت دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور ایسے تلگو عالموں کی تعداد کافی ہے۔ اسی طرح سنسکرت ادب کی ترقی میں آندھراؤں نے جو حصہ لیا ہے وہ سنسکرت ادب کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔

زمانۂ وسطیٰ میں تلگو ادیب سنسکرت کے ساتھ فارسی کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ بعض شعرا اور اہل علم جیسے جگناتھ جو شاہجہاں اور دارا شکوہ کا مصاحب تھا فارسی کا جید عالم تھا اس امر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تلگو کے ادیب ہمیشہ زبانوں کے اتحاد کے لیے اور مختلف زبانوں کی ترقی کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مختلف زبانوں کا اتحاد تقریباً ہر دور میں برقرار رہا ہے۔ ایک زبان کے ادیب دوسری زبان کو سیکھتے اور اس پر حاوی ہوجاتے تھے ملک میں ادبی اتحاد کا یہ ایک بہترین ثبوت ہے۔

سنسکرت اور فارسی کے ماہروں کے علاوہ تلگو ادیبوں کی ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جو کنڑ اور دوسری زبانوں کے عالم تھے۔ پمپا تلگو بولنے والا اور تلگو زبان کا شاعر تھا، اور اسی پمپا نے مہابھارت کو کنڑ زبان میں منتقل کیا۔ اسی طرح تلگو زبان کے کئی ایسے ادیبوں کے نام گنائے جاسکتے ہیں جنھوں نے دیش کی مختلف زبانوں کو سیکھ کر ان میں مہارت ... حاصل کی اور اس طرح ملک کی زبان کے اتحاد اور یگانگت کو پروان چڑھایا۔

تلگو زبان کے ادیبوں کا یہ اصول رہا ہے کہ انھوں نے ہر دور اور ہر زمانے میں دوسری زبانوں سے ربط پیدا کیا انھیں نہ صرف سیکھا بلکہ ان پر عبور حاصل کرلیا اور پھر اس زبان میں تصانیف بھی کیے، اور اس بات سے کوئی انکار ہی نہیں کرسکتا کہ ملک کی تہذیبی ترقی اور سیاسی یک جہتی کے لیے مختلف زبانوں کا اتحاد اور ان کا میل بڑی حد تک ناگزیر ہے۔

اس طرح یہ دیکھا جاتا ہے کہ تلگو زبان کے ادیبوں نے اپنے آپ کو قومی زندگی کے مدوجزر سے کبھی علیحدہ نہیں رکھا۔ اس کی مثالیں ہمیں ہر زمانہ میں ملتی ہیں۔ پرانے زمانے کی مثالوں کے ساتھ ساتھ ... آزادی کے چند سال پہلے اور آزادی کے چند سال بعد کے ادب سے اس امر کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ تلگو زبان کے ادیب ہمیشہ ملک کے مسائل کو سمجھتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں انھیں اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس رہا ہے۔ اپنی زبان کے ادب کا

اشاعت کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے اد . کی ترقی میں بھی انھوں نے ہاتھ بٹایا۔

سنسکرت کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب سے بھی تلگو زبان کے ادیبوں نے کافی استفادہ کیا اور کافی چیزیں سیکھ لیں۔ ان کے بارے میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے زمانۂ قدیم میں فارسی زبان سے اور موجودہ زمانے میں فرانسیسی، پرتگالی اور انگریزی زبانوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ زمانہ جدید کے تلگو ادب پر انگریزی اور فرانسیسی زبان کا اثر ہمیں کچھ حد تک ضرور دکھائی دیتا ہے۔ تلگو زبان میں نثر کی تخلیق کو انگریزی زبان کی نثر سے گہرا تعلق ہے۔ ناول اور کہانی پر تو ہمیں دوسری زبانوں کا اثر جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ غرض کہ ان ادیبوں نے دوسری زبانوں کے ادب کی اچھائیوں کو اپنانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اور لازمی بات ہے کہ زبانوں کا ایسا ملاپ اور اتحاد یقیناً قومی یکجہتی اور سیاسی اتحاد کی بنیاد کو مضبوط بنائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ معیاری ادب کی تخلیق بھی ہو سکے گی۔

ہندوستان کا قومی نظریہ اور ہندوستان کی قومی یکجہتی کا خیال ہم تلگو شعرا کی تصانیف میں جا بجا دیکھ سکتے ہیں۔ تلگو زبان کے ادیب کوہ ہمالیہ سے لے کر کنیا کماری تک پورے ہندوستان کو بھارت کے نام سے پکارا کرتے تھے اور آج بھی یہی روایت برقرار ہے۔ تلگو ادب کی تاریخ کے ہر دور میں ملک اور قوم کے تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔ بھارت کے نام سے دیش ـــــ ادیبوں کے ادب پر شاعروں کی شاعری پر نقاشوں کے نقش و نگار پر مصوروں کی مصوری پر اور موسیقاروں کے موسیقی پر ایک خاص قسم کا جذبہ لیے ہوئے چھایا ہوا تھا۔ اور اس سلسلہ میں ایسی بھی کئی مثالیں مل سکتی ہیں جب کہ ادیبوں اور شاعروں نے میدان سخن سے گزر کر میدانِ عمل میں قدم رکھا اور ملک کی آزادی اور حفاظت کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دی اور اس طرح وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی جانیں قربان کر دیں۔

تلگو شعرا نے اپنی تصانیف میں ہمالیہ، وندھیاچل، گنگا جمنا، کرشنا گوداوری، اور کاویری کو کچھ اس فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے کہ ہمارے ادب عالیہ میں ان پر بقائے دوام کی مہر لگ گئی ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ تمام مقامات مقدسہ جیسے بدری ناتھ، کاشی، پریاگ پوری اور رامیشوری بھی ان کی تخلیقات کی وجہ سے لافانی ہو گئے ہیں۔

آزادی کے پہلے کا دور اور آزادی کے بعد کا زمانہ یہ دو ایسے دور ہیں جب کہ ملک کی تمام زبانوں کے ادیب حرکت میں آئے ہیں، اور لافانی ادب کی تخلیق کر چکے ہیں۔ آزادی سے پہلے بھی تلگو زبان کے ادیب دوسری تمام زبانوں کے ادیبوں کی طرح انگریزوں کی حکومت کے خلاف آواز اٹھا چکے ہیں۔

آزادی کے بعد ملک کی ترقی کے جتنے بھی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ان کی تشہیر میں تلگو زبان کے ادیب کافی حد تک حصہ لے رہے ہیں۔ منصوبوں کے عمل کی ضرورت۔ اور ان کے فوائد پر مضامین نظمیں، کہانیاں، افسانے وغیرہ معتدبہ تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔

اب جب کہ ملک کے سامنے قومی یکجہتی کا مسئلہ آگیا ہے ادیبوں کو یہ چاہیئے کہ اس مسئلے کو لے کر آگے بڑھیں

عوام کو اپنی تصانیف کے ذریعہ قومی یک جہتی کی ضرورت کو سمجھائیں۔ تقریباً سب ہی زبان کے ادیب اس جذبہ کی ضرورت کو سمجھ گئے ہیں، اور تلگو زبان کے ادیب بھی اس سلسلہ میں پیچھے نہیں رہے۔ تلگو زبان کے ادب میں تو قومی یک جہتی کا جذبہ اور اور اس کی ضرورت کا احساس ایک عرصہ پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے جب کہ اس زبان کے مشہور شاعر شری گرزا اڑا اپا راؤ نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا "دیش بھگتی" نظم لکھتے ہوئے ایک خاص جگہ پر اپا راؤ لکھتے ہیں۔

"اگر سب لوگ اپنے دلوں کو ایک کریں تو قوم جاگ اٹھے گی
اور ترقی کرے گی اور پورے ملک پر چھا جائے گی"

ان سطور سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ قومی یک جہتی کی اہمیت کو بہت دن پہلے ہی انھوں نے محسوس کر لیا اور لوگوں کو بتایا کہ ملک اور قوم میں یک جہتی کی ضرورت ہے۔

ملک و قوم کی یک جہتی کا تعلق عوام سے بہت زیادہ ہے اور عوام کے تعلق سے قومی یک جہتی کا دار و مدار زبانوں کی یکجہتی اور ان زبانوں کے ادب کی یک جہتی پر ہے۔

آزادی کے بعد قومی یک جہتی اور تحفظ و ترقی کے جذبات نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کو بلحاظ تحریر و زبان یکجا کیا اور ایک ہی خاندان کے افراد میں تبدیل کر دیا ہے۔

سری نواس لاہوٹی

قومی یکجہتی اور ٹیگور

ٹیگور کا ترانہ "جن گن من" جو آج ہندوستان کا قومی ترانہ اور ہماری عظمت اور قومی یکجہتی کا نشان بن چکا ہے۔ شاعر اعظم کے خیالات کی حقیقی ترجمانی اور صحیح عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح سے شکسپیر کے ڈراموں کا ماخذ انگلستان، . . . . اور روم کی قدیم تاریخیں ہیں اسی طرح سے ٹیگور نے اس ترانے میں ویدوں، پرانوں اور اپنشدوں سے اکتساب نور کر کے قومی یکجہتی کے شعور کو جو ضیا بخشی ہے اور روشنی کا جو چراغ جلایا ہے وہ پورے ہندوستانی ادب کے لیے مشعل راہ کا کام دے رہا ہے۔ ٹیگور کے پورے ادب کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مقدس ویدوں کی چھاؤں میں ملکر امن و آشتی کے گیت گائے ہیں اور دنیا کو مدبرانہ سندیش دیا ہے جس میں آفاقیت بھی ہے اور روحانیت بھی ہے۔ مگر ٹیگور کی یہ آفاقیت اور روحانیت ماضی کے دھندلکوں میں انسانیت کے دامن کو نہیں چھوڑ دیتی بلکہ انسان کے تابناک مستقبل کا پیام دیتی ہے۔

اس وقت ہم تاریخ انسانی کے ایک بہت بڑے تخلیقی دور سے گزر رہے ہیں دنیا کے مختلف حصوں میں رائج الوقت معاشی نظام اس کہ جدید مذہبی، سیاسی اور معاشرتی غور و فکر پر بہت گہرے اثرات ڈال رہے ہیں اس لیے کہ سیاسیات میں کوئی بھی صاف اور سادہ سیٹ سے کام کا آغاز نہیں کرتا بلکہ کام کا آغاز ان واقعات کی بنیاد پر کرنا پڑتا ہے جو تاریخ انسانی سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ٹھیک یہی حال اس وقت کا تھا جب کہ ٹیگور کا سیاسی شعور پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور ۱۸۵۷ء کے واقعات نے قومی اتحاد کی نیو کو ہلا دیا تھا اور ہندوستان کی وحدت چکنا چور ہو گئی تھی اور قومی یکجہتی کا شعور نئی منزل کی تلاش میں تھا تاکہ وہ قومی بیداری کی نئی راہ پر گامزن ہو سکے۔ میں اس بات پر اس لیے بھی زور دے رہا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات ہندوستان میں تغیر و تبدل کا ایک زبردست منظر پیش کرتے ہیں اور ان اقدار کو جنم دیتے ہیں جو ماضی سے رشتہ رکھنے کے باوجود تقریباً نئے ہیں۔

ٹیگور کے تخلیقی ذہن کے لیے ان واقعات نے ایک پس منظر کا کام دیا اور ایک نئی سوجھ بوجھ عطا کی۔ . . . .

. . . جب کہ دلی لٹ چکی تھی اور شعر و شاعری کی محفلوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور ادب کے قدردان برائے نام باقی رہ گئے تھے اسی لیے انھوں نے اپنے آپ کو زمانے کے ہاتھوں نہیں بیچا جہاں انھوں نے خواص سے بھی رسمی تعلق رکھا وہاں

عوام سے بھی رشتہ جوڑے رکھا اور ویدانتک فلاسفی کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا کر صلح و آشتی کا پیام دیا جس میں ایک طرف روحانیت ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی بھائی چارے کا جذبہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی ادب میں قومی یکجہتی کے شعور کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اس لیے کہ "شاعری ہی سب سے زیادہ مرکب ترقی یافتہ اور نازک ترین فن ہے"، اور ٹیگور کی مکمل شخصیت کا پرتو ہمیں ان کی شاعری ہی میں ملتا ہے جو اس زمانے کے داخلی اور خارجی حالات و واقعات کے اقدار کا سنگم بن جاتی ہے جس میں رقص و وجد بھی ہے فن تعمیر کا حسن بھی اور موسیقی اور مصوری کے جلوے بھی۔ اس لیے کہ شاعری کو کامل فنی نمونہ بنانا فن کار کی شخصیت و انفرادیت، اس کے جذبات کے گداز، اس کے تخیل کی پرواز، اس کے ادراک کے توازن، اس کے نفیس و اعلیٰ ذوق، اس کی سچی موجی قوت انتخاب، اس کی صلاحیت، ترکیب و تعمیر اور اس کی ہنرمند پیشکش پر منحصر ہے۔ اور ان تمام باتوں میں ٹیگور کو ماہرانہ چابک دستی حاصل تھی۔ اسی بنا پر ہم ٹیگور کے فن شاعری کی جانچ صرف عروض کے اوزان اور پیمانوں سے نہیں کر سکتے" بلکہ اس کے لیے پختہ سیاسی اور سماجی شعور درکار ہے جس کے بغیر ہم اس شاعرانہ لذت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ جو ٹیگور کی شاعری کا حصہ ہے۔

ادبیات میں جب قومی یکجہتی اور وحدت کا ذکر آتا ہے تو اس کی نوعیت بھی فلسفیانہ ہو جاتی ہے کیوں کہ ہر ادیب ایسے اہم تصورات کا ذکر کرتے وقت کسی نہ کسی فلسفہ کی پناہ لیتا ہے اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ ادیب کا تعلق جس طبقہ زمانے اور ماحول سے ہوتا ہے اس کی صدائے بازگشت اس کی تخلیقات میں گونجتی رہتی ہے۔

بیسویں صدی کے ہندوستان میں اس کی دو بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ ایک طرف گرودیو ٹیگور ہیں تو دوسری طرف علامہ اقبال۔ اور یہ دونوں ہندوستان کی ادبی تاریخ کے اتنے بڑے ستون ہیں کہ ان کے بعد آنے والے ادیب اور شاعر ان دونوں عظیم شاعروں کے مختلف النوع فلسفیانہ خیالات سے دامن نہیں بچا سکے۔ بظاہر یہ دونوں شاعر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں لیکن گہری نظر سے ان دونوں کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کی شاعری کے ڈانڈے روحانیت سے جا ملتے ہیں۔

اقبال جمہوریت، اجتماعیت اور نجات کے حصول کا وسیلہ مرد مومن کو قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف بھگوت گیتا کے انسان کامل کی جلوہ آرائی کا بھی نمونہ ہمیں ٹیگور کی شاعری میں ملتا ہے مگر اس کے علاوہ ٹیگور کے ادب میں قومی یکجہتی کا جو الوہی تصور پایا جاتا ہے وہ اقبال کے سیاسی عقائد سے میل نہیں کھاتا۔ اسی لیے ٹیگور کے ادب میں قومی یکجہتی کے تصور کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے ذہن اور نفسیات کا بھی جائزہ لیں اور اس ماحول کو بھی اپنے پیش نظر رکھیں جس میں ٹیگور نے پرورش پائی تھی۔ جن صوفیانہ روایات اور ماحول نے ٹیگور کے ذہن کو سہارا دے کر پروان چڑھایا تھا اس میں اس انفرادیت کا کوئی مقام نہیں ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوتی ہے جس میں شخصی آزادی کا تصور عقائد اور مسابقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر ہم ٹیگور اور ان کے فلسفیانہ خیالات کو نہیں سمجھ سکتے۔ ٹیگور کی ہمہ گیر شخصیت ایک پورے دور پر حاوی ہے جو ماضی کے عقائد سے رشتہ توڑے بغیر

نے رجحانات کو اپناتی ہے اور قوموں کی وحدت کا ایک ایسا تصور پیش کرتی ہے جو زرعی نظام کے پیدا کردہ مشترکہ خاندان کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح کوئی عہد لوٹ کر نہیں آ سکتا اسی طرح سے کوئی ادبی دور بھی دوبارہ جنم نہیں لے سکتا۔ اس لیے آج کے صنعتی دور میں کوئی ادیب یا شاعر پورے طور پر ٹیگور کی پیروی کرنے کی کوشش کرے تو وہ کامیاب ہو سکے گا۔ کیوں کہ ٹیگور کے زمانے کا ماحول آج کے ماحول سے بالکل جدا ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے مقابل آتا ہے، ایک جماعت دوسری جماعت سے ٹکر لیتی ہے اور کبھی کبھی یہ ٹکراؤ مقاصد اور مذاہب کے تصادم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس کی تہہ میں معاشی غلامی اور معاشی استحصال کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور جب تک اس تضاد کو دور نہ کیا جائے قومی یکجہتی کا تصور بہت ہی دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم اس پس منظر میں ٹیگور کے ادب اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کا جائزہ لیں تو پھر ان کے فلسفیانہ خیالات کی ایک واضح تصویر سامنے ابھر کر آتی ہے اور اس میں قومی یکجہتی کا جو پیام ان کی بین الاقوامیت کی روح میں پوشیدہ ہے اس کو سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جہاں تک گاندھی کی قیادت میں ہندوستانی عوام نے عدم تشدد اور اپنے مخالف کو اپنا ہم نوا بنا لینے کی جس بات پر زور دیا تھا اس کی تہ میں بھی ٹیگور کی وطن دوستی اور ان کی بین الاقوامیت کا بڑا دخل ہے۔ اس نظریہ کے مابعد الطبیعاتی پہلو سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تب بھی اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد اور ٹیگور کی بین الاقوامیت کے تصورات نے ملک میں ایک قومی جذبہ اندرونی خانہ جنگیوں کے خلاف اور ہندوستان کے مختلف گروہوں میں یگانگت کی ایک فضا پیدا کر دی تھی یہی وہ عناصر ہیں جو ہندوستان کی قومی یکجہتی کو باقی رکھتے ہیں۔ میں نے اس بات کا ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری سمجھا ہے کہ جب ترک موالات کی تحریک نے عدم تشدد کے مسلک سے ہٹ کر تشدد کا روپ دھار لیا تھا تب ٹیگور نے اس کو پسند نہیں کیا تھا اور گاندھی جی کو خط لکھ کر اس جانب توجہ دلائی تھی کہ ان کی تحریک اپنے مسلک سے ہٹ رہی ہے جس کی وجہ سے بین الاقوامیت کو دھکا پہنچنے کا احتمال ہے جس کے ساتھ ہندوستان کی قومی یکجہتی اور وحدت کا دامن بندھا ہوا ہے۔ ٹیگور نے اس موقع پر اس بات کی بھی نصیحت کی تھی کہ ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے سینہ کو عقل کی دولت سے ہمیشہ مالامال رکھیں تاکہ ایک نئے عہد اور شاندار مستقبل کی تعمیر میں مدد مل سکے۔

ان خیالات سے ٹیگور کی شاعرانہ عظمت انسان دوستی اور بلند کرداری کا پتہ چلتا ہے اور ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب سیاسی اعتبار سے ہمارا ملک غلام تھا تو اس فضا میں بھی شاعر اعظم نے نہ صرف یہ کہ اپنے پاکیزہ اور حسین تخیل کے چراغ کو منور رکھا بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانیوں کو ایک حیرت انگیز جذبۂ حب الوطنی عطا کیا جس میں روحانی عظمتوں کو حاصل کرنے اور متحرک اجتماعی زندگی کی تعمیر اور حق کی جستجو اور دیدار کا درس بھی ملتا ہے۔

مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو　　　وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

اعجاز قریشی

قومی یکجہتی میں فلموں کا حصہ

آج ہمارے ملک میں ہر ایک زبان پر قومی اتحاد اور یک جہتی کا نعرہ ہے صدر جمہوریۂ ہند سے لے کر کسی پنچایت سمیتی کے صدر تک ہر کوئی اس نعرہ کا پرچار کرتا ہوا ملے گا۔ فلموں کا تعلق ہماری زندگی سے اتنا قریبی اور اور اس قدر گہرا ہے کہ قومی ایکتا اور جذباتی ہم آہنگی اور یک جہتی میں فلموں کے حصہ اور رول کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں ہندوستانی فلم کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے محسوس اور غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ لیکن تیزی سے اور مسلسل قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لیے بہت اہم رول انجام دیا ہے۔ فلم کے اس رول کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوگا کہ ہمارے ملک میں فلم کی آمد سے قبل کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کا جائزہ لیا جائے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب کے بعد جب پرانے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی جگہ لینے کے لیے نئی صنعتی اور مشینی تہذیب نمودار ہوئی، ریلوں اور چھاپہ خانہ کے رواج نے مختلف حصوں میں رہنے والوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہونے اور اپنے اتحاد اور یک جہتی کو زیادہ مضبوط بنانے کے مواقع فراہم کیے تو گزشتہ تیس پینتیس سال کے دوران میں فلم نے بھی وہی رول انجام دیا جو ماضی میں صدہا سال ہمارے فنون لطیفہ انجام دیتے رہے ہیں ——— اس کا کریڈٹ جہاں فلم کو جاتا ہے وہیں یہ بات بھی ذہن میں رکھی جانی چاہیے کہ یہ کام بھی دراصل ہمارے فنون لطیفہ نے ——— جن کی یا جن کے امتزاج کی کسی نہ کسی شکل ہی فلم ہے کے ذریعہ اشاعت ہوتی رہی انجام دیا۔

فلموں کے ذریعہ ہر روز بے شمار لوگ مختلف علاقوں کے تہذیبی رہن سہن کے طریقوں، گیتوں، اور کسی حد تک شعری اور ادبی سرمایہ سے واقف ہوتے رہتے ہیں ——— خاص طور پر ہندوستانی زبان کی وہ فلمیں جو سارے ملک میں نمائش کے لیے تیار کی جاتی ہیں یہ کام زیادہ سرعت کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آزادی کے بعد لسانی جھگڑے کھڑے ہو گئے، ہندی کو راشٹر بھاشا قرار دیا جا چکا ہے لیکن اس راشٹر بھاشا کا روپ غیر واضح ہے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہندی اور اردو کی ملی جلی شکل "ہندوستانی زبان" دیوناگری اور فارسی رسم الخط کے ساتھ قومی اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرے جسے سارے ملک میں بولا اور سمجھا جاتا ہے ——— بدقسمتی سے ہمارے قومی نیتاؤں نے گاندھی جی کے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا لیکن فلمسازوں نے اپنی فلموں کے ذریعہ اسی ہندوستانی زبان کو عام کیا جن

فلموں کو ہندی کے سرٹیفکیٹ دیئے جاتے ہیں ان کی زبان آل انڈیا ریڈیو کی ہندی زبان سے مختلف ہے۔ یہ زبان اُردو سے زیادہ قریب ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فلموں میں اردو کے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی زیادہ مانگ رہی ہے اسے فلمسازوں کی حقیقت پسندی کہیئے یا تجارتی مصلحت یا فلم بین طبقہ کے مطالبات کی تکمیل بہرحال فلمسازوں کے اس رجحان کا یقیناً خیرمقدم کیا جانا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی آسان، سہل اور سیدھی سادھی زبان کو اپنی فلموں میں پیش کر رہے ہیں جو ملک کے بہت بڑے حصہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے —— اس حقیقت سے ہمارے ارباب حکومت اور قومی نیتا ناواقف نہیں ہیں. جب بھی بڑے پیمانے پر عوام سے ربط پیدا کرنا ہوتا ہے یا انتخابی مہم زور و شور سے چلائی جاتی ہے تو ادق اور مصنوعی ہندی کے بجائے عام فہم زبان کا سہارا لیا جاتا ہے، سنسکرت، عربی اور فارسی کے مشکل اور ناقابلِ فہم الفاظ کی بجائے عام طور پر سمجھے جانے والے الفاظ "مشکل کشا" بن جاتے ہیں. جہاں تک فلمسازوں کا تعلق ہے وہ اس حقیقت پسندی کو اختیار کرنے کے لیے مجبور ہیں اور فلم ساز کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا فلم باکس آفس پر کامیاب ہو۔ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں —— اگر فلم کی زبان ہی فلم دیکھنے والوں کے پلّے نہ پڑے تو فلم کیوں کر کامیاب ہوگی. چنانچہ فلمسازوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مکالمے لکھنے والے ادیب اور فلمی گانے لکھنے والے شاعر ادبی اور شعری ضرورتوں کی تکمیل پر کوئی توجہ دیں یا نہ دیں لیکن سیدھے سادے اور چلتے ہوئے مکالمے اور گیت لکھیں۔

سارے ملک کے لیے تیار کی جانے والی ان فلموں میں ظاہر ہے کہ علاقہ پرستی، صوبہ پرستی اور لسانی عصبیت کے رجحانات کو کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ بلکہ ایک حد تک یہ فلمیں ملی جلی تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں ملک اور وطن سے محبت ایثار، قربانی اور سرفروشی کا درس دیتی ہیں اونچ نیچ اور چھوت چھات کی لعنتوں کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔

ہم جب اپنی فلموں میں ہمالہ کی سربلند اور برف پوش چوٹیوں کو دیکھتے ہیں کشمیر کے حسین نظاروں اور اپنے ملک کے صحراؤں، دریاؤں، ساحلوں اور سمندروں کا نظارہ کرتے ہیں، جھرنوں اور آبشاروں کا سنگیت سنتے ہیں اور بمبئی، کلکتہ، دہلی لکھنؤ، مدراس، حیدرآباد اور دوسرے جیتے جاگتے شہروں کے دل کی دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں تو ہم یقیناً غیر ارادی طور پر یہ سوچتے ہیں کہ اپنے آپ کو کسی چھوٹے سے علاقہ یا ریاست میں مقید کیوں کرلیں، ہمالہ کی بلندیوں کو کیوں نہ چھوئیں. کشمیر، نینی تال، دارجلنگ اور اوٹی کے خوبصورت مناظر میں کیوں نہ کھو جائیں۔ ان تمام جھرنوں، آبشاروں، صحراؤں اور دریاؤں پر اپنا حق کیوں نہ جتائیں، کنوئیں کے مینڈک کیوں بنے رہیں، اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کے وشال ساگر کی ایک لہر کیوں نہ بن جائیں۔ اس مضمون میں فلموں کے خطرناک اور مضر اثرات پر بحث نہیں کی جا رہی ہے، یہ صحیح ہے کہ فلمسازوں کی ایک بڑی تعداد آرٹ اور تفریح کے نام پر لوٹ کھسوٹ میں مبتلا ہے اور گندہ فلموں سے نوجوانوں کے اخلاق اور ذہنوں پر خطرناک اثرات مرتب ہو رہے ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ محض روپیہ بٹورنے کے لیے بنائی گئی فلموں میں بھی ایسی کچھ باتیں مل جاتی ہیں جو قومی اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کو تقویت پہنچاتی ہیں. فلم کے اثرات فوری گہرے اور دور رس ہونے کی وجہ سے فلم پر کڑا سنسرشپ ہے جب کہ ہمارے ملک میں اظہارِ خیال کے دوسرے ذریعوں پر اس طرح کی پابندیاں عائد

نہیں کی گئی ہیں اس لیے اگر کوئی چاہے بھی تو فلم کو علاقائی رجحانات پھیلانے اور قومی اتحاد کو کمزور بنانے کے ذریعہ کے طور پر استعمال نہیں کر سکتا۔ فلموں کے ذریعہ زہر کی یہ تجارت، تجارتی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب نہیں ہو سکتی اس لیے ہمارے باشعور فلم ساز اس سے دور ہی رہیں۔

ہماری فلمی سوسائٹی بھی مختلف علاقوں کے لوگوں کے میل جول اور اتحاد کی ایک اچھی مثال ہے۔ کسی فلم، کسی فنکار کے انتخاب کے لیے عام طور پر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس کا مذہب کیا ہے وہ کس علاقہ کا رہنے والا ہے اور اس کی مادری زبان کیا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا وہ لاکھوں فلم بینوں کا پسندیدہ فنکار ہے یا نہیں ـــ ہمارے ملک میں مسلمان اور اردو بولنے والے شاکی ہیں کہ مختلف شعبوں کی نمائندگی کے لیے انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے کہ وہ مستحق ہیں، ان کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، انھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے ـــ وغیرہ وغیرہ لیکن فلموں میں آپ چوٹی کے اداکاروں، دوسرے فن کاروں، کہانی، منظرنامہ اور مکالمے لکھنے والوں اور گیت کاروں میں مسلمانوں اور اردو لکھنے والوں کا اچھا تناسب پائیں گے۔ اداکاروں میں یقیناً ایسے اداکاروں کو ترجیح دی جاتی ہے جو روانی کے ساتھ ہندوستانی زبان کے مکالمے ادا کر سکیں جن کا لہجہ صاف اور واضح ہو ـــ ظاہر ہے کہ تامل، تلگو، ملیالم اور ایسی ہی دوسری زبانیں بولنے والوں کے مقابلے میں اردو بولنے والے اداکار قابل ترجیح سمجھے جاتے ہیں۔ تامل، تلگو، ملیالم اور مرٹھی اور بنگالی بولنے والے اداکاروں کو اپنے اپنے علاقہ کی زبان کی فلموں میں زیادہ آسانی کے ساتھ کام مل جاتا ہے اور سارے ملک کے لیے تیار کی جانے والی ہندوستانی زبان کی فلموں کے لیے اردو اور ہندی بولنے والے فنکاروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

جنوبی ہند اور بنگال میں بھی ہندوستانی زبان کی فلمیں بنتی ہیں اور بنگال اور جنوبی ہند کے فنکار مذکورہ بالا دشواریوں پر قابو پانے کے بعد بمبئی میں آکر کام کرتے ہیں۔ اس طرح مختلف علاقوں کے فنکار ایک دوسرے سے قریب ہو گئے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں لوگوں پر فلموں کے اثرات کا ایک اچھا اور قابل قدر پہلو یہ ہے کہ عام طور پر عوام کی پسند کسی بے اختیار جذبے کے تحت ہوتی ہے ـــ نرگس، مینا کماری، نوتن، سائرہ بانو، وحیدہ رحمٰن، وجینتی مالا، اشوک کمار، دیوانند، دلیپ کمار، راج کپور بلراج ساہنی اور دوسرے مقبول عام اور پسندیدہ فنکاروں کے مداح اور پرستار لاکھوں ہیں جو مختلف زبانوں، علاقوں مذاہب اور مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں ـــ اگر زبان، مذہب اور علاقہ کا لحاظ کر کے ہی فنکاروں کو پسند کیا جائے تو بھر سندھی ہندوؤں کی مختصر تعداد ہی سادھنا کی تعریف کرے گی ـــ پٹھانوں کی معمولی اقلیت ہی پرتھوی راج دلیپ کمار، راج کپور، ششی کپور، جینت اور دوسرے پٹھان اداکاروں کو پسند کرے گی۔ محمد رفیع ہندوستانی فلموں کا سدا بہار اور کامیاب گلوکار اس لیے نہیں کہ وہ پنجابی ہے یا مسلمان ہے بلکہ اس لیے ہے کہ لاکھوں لوگ اس کی آواز پر سر دھنتے ہیں ـــ اسی طرح ہدایت کاروں، گیت کہانی اور مکالمے لکھنے والوں اور دوسرے کئی شعبوں میں کام کرنے والے فنکاروں کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ وہ فلم دیکھنے والوں کو کس حد تک متاثر کرتے ہیں اور ان کے پسندیدہ فنکار کہلاتے ہیں ـــ فلمی صنعت اور فلمی سوسائٹی میں بھی گروپ بندی کی لعنت ہے۔ مستحق فنکاروں کی جگہ خوشامدی اور

سفارشی فنکاروں کو کام دیا جاتا ہے، اور ایسی ہی کئی دوسری کمزوریاں اور قابل اعتراض باتیں موجود ہیں لیکن تجارتی مفاد اور لاکھوں کروڑوں فلم دیکھنے والوں کی خواہش اور مانگ کے آگے سر جھکا دینے کی مجبوری ان لعنتوں کو جیتا جاگتا شکل اختیار کرنے کا موقع نہیں دیتی ـــــــــ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر فلم کے منفی اثرات کے مقابلے میں مثبت اثرات قومی ایکتا اور یک جہتی کو مضبوط بنانے میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔

اس مضمون میں اگر ان فلموں کا بھی سرسری ذکر کیا جائے جو وطن سے محبت اور دیش بھگتی کے لیے بنائی گئی ہیں جو صوبائی اور لسانی تعصب کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں اور جو پیار محبت ہندو مسلم اتحاد اور قومی ایکتا کے مقصد کا پرچار کرتی ہیں تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا ـــــــــ اس مضمون کی ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ فلمیں عام طور پر حتیٰ کہ ایسی فلمیں بھی جو محض تفریحی نقطۂ نظر سے بنائی جاتی ہیں اور جن کا مقصد زیادہ سے زیادہ روپیہ جوڑنا ہوتا ہے۔ مختلف طریقوں سے مختلف علاقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے نزدیک لانے اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں حصہ ادا کر رہی ہیں ـــــــــ فلم کے میڈیم کو آئندہ بھی قومی یک جہتی اور ایکتا کو اٹوٹ بنانے اور ہماری تہذیبی ترقی اور خوشی کے لیے ایک اہم ترین ہتھیار اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس اہم ذریعہ اور ہتھیار سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

R. N. 3461/57 SABA-MONTHLY REGD. NO. A 215

انجمن کی نئی مطبوعات

مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں

۱ **فرانسیسی ادب** اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ اس میں فرانسیسی ادب کی ابتدا اس کی خصوصیات کا جائزہ اور اس کے ہر دور کے نامور مصنفین کی تخلیقات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے کتاب خوبصورت ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھپی ہے۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۵۰۵، قیمت تیرہ روپے

مصنف محمد اسحاق صدیقی

۲ **فن تحریر کی تاریخ** اس کتاب میں فن تحریر کی تاریخ اور اس کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب آسان اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے۔ تحریر سے متعلق نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۲۸۰۔ قیمت سات روپے ۵۰ نئے پیسے

مصنف حکیم احمد

۳ **سیر افلاک** یہ کتاب ستاروں سے متعلق ہے۔ مولف نے اصطلاحوں کی تشریح عام فہم زبان میں کی ہے۔ کتاب سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اس میں چالیس تصاویر اور چھ نقشے بھی شامل ہیں۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۲۱۶۔ قیمت پانچ روپے

مصنف مولوی احتشام الدین احمد شاغل

۴ **صحیفۂ خوش نویساں** اس صحیفہ میں ساڑھے پانچ سو سے زیادہ خوش نویسوں کے حالات درج ہیں نیز اس میں خوش نویسی کے متعلق تفصیلی معلومات اور اساتذہ کی وصلیاں اور فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔ سائز ۳۰×۲۰ قیمت چھ روپے

مرتب محمد عتیق صدیقی

۵ **صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات** یہ ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء کے اخبارات و مطبوعات سے متعلق ہے اس میں ۲۶، اخبارات و مطبوعات کے فوٹو بھی شامل ہیں کاغذ بہت اچھا ہے۔ سائز ۳۰×۲۰ صفحات ۴۴۸۔ قیمت نو روپے۔

مصنف بیگم صالحہ عابد حسین

۶ **یادگار حالی** (تیسرا ایڈیشن) اس کتاب میں مولانا حالی کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں حالی کو بحیثیت انسان، شاعر و ادیب اور سوانح نگار پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ کتاب میں مولانا حالی کی تصویر اور ان کی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۲۷۱۔ قیمت چار روپے ۵۰ نئے پیسے

شعراء کے نئے انتخابات

(ہر انتخاب کی قیمت ۵۰ نئے پیسے)

شفیق جون پوری، نشور واحدی، شمیم کرہانی، جوہر نظامی، الم مظفر نگری

کیفی چریاکوٹی، یگانہ چنگیزی اور اصغر گونڈوی

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ



منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ماہنامہ — فون (۲۲۴۰۲)

صبا

حیدرآباد دکن

جلد ۹
شمارہ ۱۰ — ایڈیٹر: سلیمان اریب
ماہ اکتوبر
سنہ ۱۹۶۳ء
قیمت ایک روپیہ

زرِ سالانہ ہندوپاک سے ۱۰ روپے
ششماہی ۶ روپے
بیرونِ ہند سے ۲۰ شلنگ

دہلی آفس:۔
۱۹۵۷، ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ:۔
ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۳۷۰۲) کراچی ۳

پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب ۔ ۵، اجرگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن ۔ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان

خود زیور بنانے والے

سُنار!

اگر آپ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۳ء کے ایک برس یا پیشتر سے زیورات بنانے کا خود اپنا کام کر رہے ہیں۔

اور اگر آپ پہلے ہی لائسنس یافتہ بیوپاری نہیں ہیں یا لائسنس یافتہ بیوپاریوں کے لیے اپنے گھر پر سونے کے زیورات بنانے کا کام نہیں کرتے ہیں۔

تو اب آپ گولڈ کنٹرول رولز کے تحت کچھ شرائط پر سرٹیفکیٹ لے سکتے ہیں۔

اس سرٹیفکیٹ کی بدولت آپ ۱۴ قراط سے زیادہ خالص طلائی زیورات کو اتنی ہی مقدار تک کے مساوی خالص پن والے زیورات میں منتقل کر سکیں گے۔

یہ سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لیے درخواستوں کے فارم سبھی ڈاک گھروں یا مقامی حکام مالیات سے عنقریب حاصل ہو سکیں گے۔

آپ اپنی درخواست ایک روپیہ کا سنٹرل اکسائز ریونیو اسٹامپ لگا کر جلد بھیج دیں۔

سرٹیفکیٹ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء سے پہلے

لینے ضروری ہیں

اس اثناء میں درخواستوں کی جانچ پڑتال اور سرٹیفکیٹوں کے اجراء تک آپ اپنا کام دھندہ جاری رکھ سکتے ہیں۔

گولڈ کنٹرول ایڈمنسٹریشن

بھارت سرکار

اس شمارے میں

سرورق	. . . .	وہ راست
عمل	. . . .	ڈی، جے، دریو



پہلی بات

ایک صاحب نے ہمیں خط لکھا ہے اور پوچھا ہے کہ "پاکستان سے درجنوں اردو رسائل کامیابی سے نکلتے ہیں اور خود ہمارے ملک میں "شمع" لاکھ سوا لاکھ کی تعداد میں اور "بیسویں صدی" اور "آستانہ" بھی ہزاروں کی تعداد میں چھپتے ہیں لیکن ان سے ہٹ کر جو رسالے نکلتے ہیں ــ میری مراد ہے ادبی رسالوں سے ــ ان کی تعداد اشاعت کیوں نہیں بڑھتی اور وہ پابندی اور باقاعدگی سے کیوں نہیں نکلتے؟ ...."

اس سوال کا جواب ہم "صبا" کے ذریعہ اس لیے دینا چاہتے ہیں کہ یہ سوال واقعی سب کو دعوتِ فکر دیتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے تین اجزا ہیں۔

۱۔ پاکستان میں اردو رسائل کی کثرت اور ان کا کامیابی سے نکلنا۔

۲۔ "شمع"، "بیسویں صدی" اور "آستانہ" وغیرہ قسم کے رسائل کی زیادہ اشاعت کے اسباب اور

۳۔ اردو کے ادبی رسائل کی زبوں حالی۔

ہے یوں کہ پاکستان میں اردو کی جو حیثیت ہے وہ ہمارے ملک میں نہیں۔ گو یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کی جنم بھومی اور وطن پاکستان نہیں بلکہ ہندوستان ہے اور ہندوستان میں اب بھی کروڑوں آدمیوں کی مادری زبان جن میں ہندو مسلمان اور سکھ بھی شامل ہیں اردو ہے لیکن اگر اردو پورے پاکستان کی سرکاری زبان ہے تو بدقسمتی سے ہندوستان میں اردو سوائے کشمیر کے کسی ریاست کی سرکاری زبان نہیں ہے۔ ہاں کشمیر سے ہٹ کر آندھرا پردیش میں بھی تلگو کے بعد اردو ہی کو دوسری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم اگر سچ پوچھئے تو اردو کا آج کوئی وطن نہیں، اس کی کوئی ریاست نہیں۔ سارے ہندوستان میں اس کے نام کا سکہ تو چلتا ہے لیکن اس کی حکومت از دلی تا پالم بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی حکومت کی پشت پناہی، مربیانہ رویہ اور منصفانہ پالیسی کے باوجود اردو کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی بھی اخبار یا رسالے کے لیے اشتہارات کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ جہاں تک مرکزی حکومت کا تعلق ہے وہ تو اردو کے تقریباً تمام اخبارات و رسائل کو اشتہار دینا اپنا فرض سمجھتی ہے اور چھوٹے اخبارات و رسائل کی زیادہ سے

زیادہ سرپرستی کرتی ہے لیکن جہاں تک ریاستی حکومتوں اور صنعت کاروں کا تعلق ہے وہ آزادی کے بعد بھی انگریزی اخباروں ہی کو زیادہ نوازتے ہیں اور اس کے بعد اپنی ریاست کی سرکاری زبان کے اخباروں کو (اور یہ ہونا بھی چاہیئے) اور پھر کہیں جاکر اردو کا نمبر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے انھیں اخبارات یا رسائل میں زیادہ اشتہارات دیئے جائیں گے جن کی اشاعت زیادہ ہو لیکن قومی یکجہتی اور اردو کے اثر و نفوذ کے لحاظ سے اردو اخبارات و رسائل بھی اتنے گئے گزرے نہیں کہ انھیں سرے ہی سے نظر انداز کر دیا جائے یا ان کے ساتھ تعصب برتا جائے لیکن یہ بات ریاستی حکومتوں کے سربراہوں اور صنعت کاروں کو کون سمجھائے؟ نتیجۃً اردو کے بڑے اخبارات و رسائل جو بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں وہ تو خوب چلتے ہیں لیکن کم سرمایہ سے نکلنے والے پرچے اور ان میں بھی "ادب کے خادم" یا تو گھٹتے ہوئے زندہ رہتے ہیں یا پھر پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ "شمع" ادبی رسالہ کم فلمی رسالہ زیادہ ہے پھر اس میں "معمہ" کی مار ہے۔ "بیسویں صدی" محض ہلکا پھلکا ادب پیش کرتا ہے اور "آستانہ" ایک مذہبی ماہنامہ ہے اس لیے ان رسالوں کی اشاعت ہندوستان گیر ہے۔ اسباب خواہ کچھ ہوں لیکن ہمیں تو ان رسالوں کی مقبولیت سے ہی خوشی ہوتی ہے کہ یہ رسالے ادب کی خدمت نہ سہی اردو کی خدمت تو کر رہے ہیں۔

ادبی رسائل کی زبوں حالی میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما ہیں ان کے پڑھنے والوں کی "مجرمانہ بے نیازی" کو بھی بڑا دخل ہے۔ اردو کے ادبی رسالوں کو اگر ایک ہزار مستقل خریدار ہی مل جائیں تو آج بیسیوں رسالے باقاعدگی سے جاری رہ سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے لکھے پڑھے صاحب استطاعت لوگوں کا بھی یہ حال ہو کر وہ فیشن کے طور پر شاعروں، ادیبوں کے تعزیتی جلسوں میں شریک ہو کر اردو کی کسمپرسی پر لمبی لمبی تقریریں کرتے اور مرنے والوں کے ساتھ خود بھی مرجانا چاہتے ہیں مشاعروں اور قوالی کے پروگراموں میں دس دس بیس بیس روپے کے ٹکٹ خرید کر دادِ سخن و دادِ لحن دیتے اور شاعروں ادیبوں کی بڑی بڑی پرتکلف ضیافتیں تو کرتے ہیں لیکن کسی پرچے کا چھ روپے، آٹھ روپے یا دس روپے سالانہ چندہ نہیں دینا چاہتے۔

ظاہر ہے کہ جس زبان کا کسی ملک میں کوئی مضبوط "سیاسی موقف" اور مستقبل نہ ہو، اور جس زبان کے بولنے والے بے حسی کے طاعون میں مبتلا ہوں اس زبان کا زندہ رہنا، اس زبان کی کتابوں کا شائع ہونا اور اس زبان کے اخبارات رسائل کا نکلنا معجزہ سے کم نہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

فضل الرحمٰن

سرودِ وقت

(فضل الرحمٰن صاحب اردو کے ایک ایسے نظم نگار شاعر ہیں جو بہت اچھے ڈراما نگار بھی ہیں اور چونکہ ان کو نثر نگاری سے فطری لگاؤ ہے اس لیے شروع ہی سے ان کی شاعری کا انداز اردو کے عام شعراء سے مختلف رہا ہے۔ ایسا انداز جو روایتی بھی نہیں ہے، نثر سے قریب بھی ہے اور غیر شاعرانہ بھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک فضل الرحمٰن صاحب اپنی طرز کے منفرد شاعر ہیں جن کے تجربات کی بڑی اہمیت ہے ان کے شعری انتخاب "سرودِ وقت" کا دیباچہ کتاب کی اشاعت سے پہلے صبا میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اریب)

پچھلے بیس برس میں میں نے اردو شاعری میں جو تجربے کیے تھے وہ سب مختلف موقعوں پر شائع کیے جا چکے ہیں۔ مجموعوں کی اشاعت سے قبل ان میں سے اکثر نظمیں ریڈیو سے نشر کی گئیں۔ بعض مقامی اخباروں اور رسائل میں طبع ہوئیں یا مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ میری نظموں کا پہلا انتخاب "دھوپ چھاؤں" کے نام سے ۱۹۴۵ء اور دوسرا انتخاب "نقشِ حیات" ۱۹۴۸ء میں چھپا۔ اس کے بعد "گوتم بدھ" (منظوم سوانح) ۱۹۵۳ء میں، "ہلینا" گوئٹے کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ ۱۹۵۵ء میں "نیا انسان" طبع زاد ڈرامائی نظم ۱۹۶۰ء اور "انگریزی اردو نظمیں" جو منتخب انگریزی غنائیہ نظموں کے شعری ترجموں کا مجموعہ ہے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔

ان میں اول الذکر دو مجموعے بازار میں تقریباً نایاب ہیں۔ اس لیے اب ان کا مزید مختصر انتخاب اپنی غیر مطبوعہ نظموں کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ جنھیں یہ نظمیں پسند آئیں وہ میری شاعری کے دوسرے نمونے بہ آسانی مذکورہ بالا مطبوعات میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس انتخاب میں ان ڈراموں، اور ترجموں کو اسی لیے شامل نہیں کیا گیا۔

ان نظموں کو پڑھنے کے بعد قارئین محسوس فرمائیں گے کہ تکنک کی حد تک ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہی پرانے سانچے جو صدیوں سے مستعمل ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں وہی بحریں، وہی قافیوں کی پابندی اور وہی اسلوب بیان ہے۔ لیکن وہ صنائع بدائع وہ رنگین بیانی اور معنی آفرینی، اور وہ حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں اس مجموعے میں نہیں ملیں گی۔ یہاں رنگینی کلام کی جگہ سادگیٔ بیان اور رومانی محبت کے عوض انسان دوستی کے مضامین ہیں۔ قدیم تصوف کے بدلے جدید حکمت کے مسائل ہیں۔ علاوہ ازیں

چند خالص سائنسی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے مگر وہ بہت ہی کم ہیں۔ زیادہ تر مناظر فطرت، مسائل حکمت اور مراحل کے عنوانات کے سلسلے میں انسان کی ذہنی ترقیوں کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ ان عنوانات کا تقاضا تھا کہ جو بات کہی جائے سیدھے سادے انداز میں کہی جائے۔ نزاکت بیان اور رنگینی خیال یوں بھی غزل کے مقابلے میں نظم کے لیے چنداں ضروری نہیں اور پھر میرے لیے تو یہ اور بھی مشکل امر ہے۔ اس لیے کہ میری ادبی کاوشوں کا بیشتر حصہ نثر کے لیے وقف رہا ہے۔ میری ذہنی توانائیاں جب کبھی فرصت نصیب ہوئی ڈراما نویسی پر صرف ہوئی ہیں۔ بہر حال کچھ تو نثر نگاری کا اثر کچھ مغربی ادب کی پرستاری کا نتیجہ ہے کہ سادگی اور صاف گوئی میرے اشعار میں رچ گئی ہے، اور پھر میں ہر چیز زیر لب کہتا ہوں اور تحت اللفظ سناتا ہوں۔ محفل آرائیوں سے الگ، جماعت بندیوں سے دور، گوشۂ تنہائی میں فکر سخن کرنے کا عادی ہوں۔ جب ڈراموں کے مکالموں سے تشفی نہیں ہوتی تو اشعار گنگناتا ہوں۔ کیوں کہ ڈرامے کی نسبت شاعری میں اپنے جذبات اور خیالات کے راست اظہار کا بہتر موقع حاصل ہے۔ شاید اظہار خیال کا یہی شوق مجھے اس میدان میں لے آیا ہے۔

بعض خیالات اور جذبات صرف شاعری ہی میں موزوں طریقے پر ظاہر کیے جاسکتے ہیں۔ نظم و نثر ہی پر کیا موقوف ہے ہر قسم کے علم و ادب میں ہر عنوان مشترک ہے۔ محبت پر غزل لکھی جائے یا نظم یا ادبی مضمون یا نفسیاتی مقالہ کا انحصار لکھنے والے کے نقطۂ نظر، ذوق اور رجحان پر ہے جس قسم کے خیالات اور جذبات اس موضوع کے بارے میں ایک شاعر کے دل و دماغ میں پیدا ہوں گے وہ ایک نثر نگار کے جذبات سے کسی قدر مختلف ہوں گے۔ اور ایک نثر نگار ادیب کے خیالات اور جذبات نفسیات محبت پر مضمون لکھنے والے عالم کے افکار سے جداگانہ نوعیت کے ہوں گے۔ لہٰذا موضوع سخن کچھ ہو اگر پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ جس طریقہ پر نظم و نثر میں پیش کیا گیا ہے اس کے لیے موزوں نہیں تو پھر وہ شاعر اور وہ ادیب ناکام کہلائے گا۔

مغربی شاعروں کی طرح جدید اردو شاعر زندگی کے تمام مسائل پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نہ صرف حسن و عشق کی معاملہ بندیاں بلکہ سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسائل کی پیچیدگیاں بھی ہماری شاعری میں داخل ہو گئی ہیں۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں موضوع شعر و سخن کے لیے موزوں نہیں صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ فلاں نظم میں شعریت نہیں ہے۔

اس کسوٹی پر میں چاہتا ہوں کہ اس انتخاب کو پرکھا جائے۔ اگر یہ محسوس ہو کہ جن موضوعات پر جس طرح ان نظموں میں اظہار خیال کیا گیا ہے نثر میں بہتر طریقہ پر انھیں پیش کیا جا سکتا تھا، تو پھر میں تسلیم کروں گا کہ یہ ساری کوشش رائیگاں ہوئی ہے، اور بہتر ہوتا کہ ان مسائل نظموں کی جگہ علمی یا ادبی مضامین لکھے جاتے۔ لیکن شاید اس نکتہ چینی کی نوبت نہ آئے اور جو اثر نظموں کے سننے والوں نے لیا ہے پڑھنے والے بھی کچھ اس کا اندازہ لگا سکیں، اور گل کاغذ کا یہ گلدستہ باغ کے تر و تازہ پھولوں کی طرح رنگ ہی نہیں مہک بھی دے۔ صرف دلوں ہی کو نہ لبھائے دماغوں کو بھی معطر کر دے۔

اردو شاعری کے بیش بہا سرمایہ میں کسی جنس کی کمی نہیں۔ تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ نظم، گیت، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رزم و بزم کی داستانیں، پند و وعظ کی باتیں، فلسفہ و تصوف کے مضامین، مذہب و اخلاق کے مسائل

غرض ضیافت طبع کے سارے سامان مہیا ہیں۔ آزادیٔ وطن کی تحریک کے دوش بدوش ہمارے ادبی خزانوں میں قومی شاعری کا بھی گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ آزادی امن اتحاد اور مساوات پر اثر انگیز نظمیں کہی گئی ہیں۔

میری شاعری کی بنیاد اردو ادب کی ان ہی جدید روایات پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ زیر نظر انتخاب میں چند سائنسی موضوعات سے قطع نظر جیسے "کرشمۂ وجود" "ذروں کا ناچ" "جاندار تنکے" اور "جوہری بم" وغیرہ کئی نظمیں مناظر قدرت سے متعلق ہیں جیسے "چاند"، "بزم گلشن"، "کارگاہ حیات"، "ابر نیساں"، "حیات نو" یا وطنی آزادی، قومی اتحاد امن اور ترقی پر کہی گئی ہیں۔ متعدد ایسی نظمیں بھی ملیں گی جن سے اس ہنگامہ خیز زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے جس کے عہد آفریں نتائج آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں، عالمی امن کی تحریک اور اٹمی دور کی انقلابی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر جو نظمیں کہی گئی ہیں ان کی اشاعت آپ اپنا جواز ہے۔ ان ہر دو قسم کی نظموں میں "جگ بیتی" "طلسم تخلیق" "چالیس کروڑ" "پریم پجاری"، "انتظار" "آزمائش"، "تاریخ کا سبق"، "وقت کا تقاضا"، "جنت نشان" "شاعر قوم" اور "جشن آزادی" اور "لڑائی کے بعد" قابل ذکر ہیں۔

تیسرے حصے کی ساری نظمیں پہلی دفعہ مستقل طور پر طبع کی جا رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر یا تو ہم یادگاری اتفاقیہ موقعوں پر لکھی گئی ہیں یا بیرون ملک سیاحت کے دوران بعض نظمیں عالمی ہنگامہ آرائیوں کی آواز بازگشت ہیں۔ ان سب کا نام بنام تذکرہ غیر ضروری ہے۔ نظم کے عنوان سے قارئین خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صرف دو نظموں کی طرف مختصر اشارہ کافی ہے ایک "شہید محبت" جو منظوم افسانہ ہے اور دوسری نظم "خرابات" جس میں خرابہ کی عکاسی کی گئی ہے۔

فضل الرحمٰن

خرابات

(١)

شب گزرتی ہے پلا آبِ عنب اے ساقی   تشنہ رہ جائیں نہ ہم ہائے غضب اے ساقی
خوف کس کا ہے ہمیں کس کا خطر ہے ہم کو   ہے خدا اپنا خداوندِ طرب اے ساقی

(٢)

قطرہ قطرہ ہی پینے دو قدح خواروں کو   لمحہ لمحہ ہی جینے دو دل افگاروں کو
دخترِ رز کی مسیحا نفسی کیا کہنا   منہ لگاتے ہی شفا ہوتی ہے بیماروں کو

(٣)

صبح کے ہاتھوں میں خورشیدِ سحر کا ساغر   رات کی بزم میں تابندہ قمر کا ساغر
روز و شب رنگت و تنویر کے اس طوفاں میں   کفِ خاک اپنی ہوا اور آتشِ تر کا ساغر

(٤)

پوچھ مت وجہ نموئے گل و لالہ کیا ہے   ماہیت مے کی ہے کیا اور یہ پیالہ کیا ہے
خوتری جرعہ کشی، نکتہ رسی سے کیا بحث   فلسفے کا دم خوش وقتی، حوالہ کیا ہے

(٥)

ایسا ہنگامہ بپا ہے کہ نہ دیکھا نہ سُنا   شور و غل ایسا مچا ہے کہ نہ دیکھا نہ سُنا
نفسی نفسی سے نہیں ایک کو یاں ایک کا ہوش   رستخیز ایسا ہوا ہے کہ نہ دیکھا نہ سُنا

(٦)

شب فرخندہ ہے یہ دوستو ہے روز سعید   موسم گل ہے بہاروں کی ہے دنیا کو نوید
حیف اس پیر مغاں پر ہے جو ایسی ساعت   کھو دے غفلت سے طرب گاہِ مسرت کی کلید

(۷)

بزم یہ کیسی ہے، ہے منع جہاں کیف و سرور — بیخودی عیب و گنہ، خودکشی سعیٔ مشکور
کیا قیامت ہے یہ مذہب میں ریاکاروں کے — تشنگی نیکی ہے، عصیاں ہے مگر الفتِ حور

(۸)

آب وہ جس کو بھڑکتی ہوئی آتش کہیے — آتش و برق، مچلتی ہوئی خواہش کہیے
خواہشِ زیست کہ مٹی میں اگر ہو پیدا — رگِ جاں کی بدنِ خاک میں لرزش کہیے

(۹)

دے کفِ دست میں اے ساقیِ دوراں وہ ایاغ — جان و دل زندہ ہوں تابندہ ہوں جس سے کہ دماغ
ذرّے یوں خاک کے مستوں کی نگہ میں چمکیں — جیسے افلاک پہ روشن ہیں ستاروں کے چراغ

(۱۰)

ہم سے پہلے بھی یہاں اہلِ طلب آئے ہیں — اوّلِ شام کئی آخرِ شب آئے ہیں
لفظِ انکار سے آگاہ نہ تھی تیری زباں — مست ہو کر گئے جو آئے ہیں جب آئے ہیں

(۱۱)

درجہ حاصل ہے سرِ بزم نمایاں تجھ کو — درکشائی میں یہ حجت نہیں شایاں تجھ کو
اس طرف بھی ہو کبھی چشمِ کرم دیر سویر — دے گی پھر دل سے دعا محفلِ یاراں تجھ کو

(۱۲)

ان گنت صدیوں سے آباد ہے میخانہ ترا — دورِ گردوں کی طرح دور میں پیمانہ ترا
قصۂ عہدِ کہن قصۂ عہدِ حاضر — طرب انگیز ہر اک عہد میں افسانہ ترا

(۱۳)

خطر و بیم کی ہیں تیرگیاں گر دل میں — ہر امید چمکتا ہے کبھی منزل میں
آگے بڑھنے کا ہے رستہ نہ ٹھہرنے کی جگہ — رہروِ راہِ تمنّا ہیں عجب مشکل میں

(۱۴)

مئے عشرت سے علاجِ غمِ دوراں کر دے — مشکلِ زیست بہر مرحلہ آساں کر دے
کوزۂ خاک ہو اس جوہرِ نایاب سے پُر — جو ہر اک ذرہ کو مہر و مہِ تاباں کر دے

(۱۵)

نہیں تکرار یہ کم یا کہ زیادہ بھر دے — نسبتِ ظرف سے پیمانوں میں بادہ بھر دے

مطلب اس سے ہے کہ خالی نہ رہے کوئی سبو　آگے جو کچھ بھی ہو رندوں کا ارادہ بھر دے

(۱۶)

زندگانی کا سفر ہے سفرِ دور و دراز　جس کو طے کرتے ہیں ہم راہ روانِ جانباز
زادِ رحلت نہیں جز روئے حسیں جرعۂ مئے　ساز و ساماں نہیں جز سوزِ نوا نغمۂ ساز

(۱۷)

موجۂ مئے کا ہر اک قطرہ ہے دریائے رواں　بادہ نوشی کا ہر ایک لمحہ ہے اک دورِ زماں
طول و عرض اس کا جدا وسعتیں اس کی ہیں جدا　جاگزینِ کنجِ خرابات میں ہے کون و مکاں

(۱۸)

زر فشاں باغ میں گلہائے حسیں ہوتے ہیں　افسر و تاج و سمن زیبِ جبیں ہوتے ہیں
مژدہ اے دل درِ میخانہ کھلا بالآخر　سر نشینِ بزم کے پھر راہ نشیں ہوتے ہیں

(۱۹)

ابدی جلوے ہیں آنکھوں میں بہ فیضِ جاناں　سرمدی نغمے ہیں کانوں میں زہے بربطِ جاں
سجدۂ شکر بجا لاؤ کہ آج آئی ہے　کائنات اپنے تصرف میں بفرمانِ مغاں

(۲۰)

مئے سے طے ہوتے ہیں سب مذہب و ملت کے سوال　مسئلے دین کے دنیا کی معیشت کے سوال
جامۂ زہد مئے سرخ سے آلودہ کرو　تا نہ باقی رہیں پھر دوزخ و جنت کے سوال

(۲۱)

زمرۂ اہلِ صفا میں ہیں نصاریٰ و یہود　کعبہ و دیر سے برگشتہ مسلماں و ہنود
پاک مشرب لبِ کوثر بھی کرے جن کی ثنا　راست مسلک وہ فرشتے بھی پڑھیں جن پہ درود

(۲۲)

مکتب و مدرسہ میں نظریہ ہشیاری کا　مسجد و صومعہ میں پردہ ریاکاری کا
میکدے کا ہے ہمیشہ سے مگر عام اصول　باہمی الفت و اخلاص و وفاداری کا

(۲۳)

دخترِ رز نظر و دل کو جگا دیتی ہے　تفرقے سارے من و تو کے مٹا دیتی ہے
یعنی محبوبۂ عالم یہ بیک نیم نگاہ　امتیازات کا ہر پردہ اٹھا دیتی ہے

(۲۴)

ماحصل روز و شبِ رفتہ و آئندہ کا مقصدِ اول و آخر ہے دلِ زندہ کا
روزِ روشن میں ضیا مہرِ درخشندہ کی شبِ تاریک میں پرتو مہِ تابندہ کا

(۲۵)

تلخیٔ دہر کا ہو تلخیٔ صہبا سے علاج زہر سے زہر کے ماروں کا سنبھلتا ہے مزاج
ہو گا خشتِ خُمِ صہبا سے بالآخر تعمیر وہ جہاں جس کو حوادث نے کیا ہے تاراج

(۲۶)

شبِ آلام کو نورِ روزِ مسرت سمجھو سمِ غم کو بھی شکرِ قندِ حلاوت سمجھو
بیش و کم کی نہیں تکرار مناسب اس دم خُم میں تلچھٹ ابھی باقی ہے غنیمت سمجھو

(۲۷)

بزمِ عالم کا نمونہ روشِ بزمِ نشاط دورِ گردوں کا خلاصہ مئے ساغر کی بساط
شب تازہ ہے ہر اک شب سحرِ نو ہر صبح نت نئی شان سے آراستہ ہے کہنہ رباط

(۲۸)

ہے درِ میکدہ وا بند ہیں آلام کے در مدت العمر کی نومیدیاں ہیں خانہ بدر
لبِ جاں بخش ہے اور تشنہ لبوں کی نظریں پائے دلدار ہے اور ناصیۂ خاک بسر

(۲۹)

پیالہ برداروں کے ہاتھوں میں قدح خواروں کے ہاتھ گردنِ دلبر مہوش میں ہیں سرشاروں کے ہاتھ
اک طرف ساغرِ مُل ایک طرف پیکرِ گُل دولتِ حسن و شباب آئی ہے ناداروں کے ہاتھ

(۳۰)

غمِ دنیا کے گلے شکوے فراموش ہوئے سازِ فریاد و فغاں جتنے تھے خاموش ہوئے
خاکسارانِ جہاں کو ہے ابد تک فرصت سب تہی دستِ ازل میکدہ بردوش ہوئے

احتشام بن حسن

مصر کا افسانوی ادب

مختصر افسانہ نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں زندگی کے سماجی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جس کا مطالعہ کرنے سے ان محرکات اور عوامل کا پتہ چلتا ہے جو مقتضائے فطرت ہوتے ہیں اور جن کے جانے بغیر کوئی شخص زندگی کے حقائق سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ ادب کا یہ گوشہ انسانی نفسیات فلسفہ، سماجیات اور کلچر کے ایسے پہلو سامنے لاتا ہے جو زندگی میں عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں انگریزی ادب کی طرح جدید عربی ادب میں FICTION کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور مصری ادیبوں اور انشا پردازوں نے اس زمانہ میں اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔

انقلاب سے پہلے مصر میں افسانہ عوامی احساسات اور سطحی تصورات کا آئینہ دار رہا ہے۔ رجعت پسند ذہنیت کے ادیبوں اور انشا پردازوں نے اب تک ان مسائل کی جانب توجہ نہیں کی تھی جن کا تعلق براہ راست عام سماجی زندگی سے ہوتا ہے۔ قصہ گوئی یا داستان طرازی کو فنی حیثیت سے پیش کرنے کی عام روش رہی ہے لیکن جب سے وہاں کی عام زندگی میں حرکت اور انقلاب پیدا ہوا ہے وہاں کے ادیبوں نے شعوری طور پر انقلابی تحریک کو پروان چڑھانے اور اپنی تخلیقات سے نئی سماجی ضرورتوں اور احساسات کو ابھارنے کی پوری کوشش کی ہے ذہنی طور پر مصر میں ایک خاص قسم کا جذبۂ حریت بیدار ہوا ہے جس سے نئے لکھنے والوں نے استفادہ کیا ہے۔

اس انقلابی رجحان سے پہلے افسانوی ادب میں محمود تیمور، یحیٰ حقی، یوسف السباعی، احسان عبدالقدوس، محمود البدوی ابراہیم المصری، عبدالحلیم عبداللہ اور سعد مکوی کے نام بہت ممتاز رہے ہیں۔ انقلاب کے بعد ملک کے سماجی و تہذیبی حالات اور رجحانات بڑی تیزی سے بدلے ہیں مصر سے شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور مصر کے عوام اپنی قسمت کے خود مالک بن گئے اور انھیں اپنے داخلی و خارجی مسائل میں پوری آزادی نصیب ہوئی۔ "نہر سوئز" کو قومی ملکیت بنایا گیا اگرچہ اس وقت ملک کو سہ طرفہ بیرونی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اقتصادی ادارے اور بنک قومی ملکیت قرار دیئے گئے۔ عوام کی خوشحالی کے اعلیٰ ترین منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ عربوں کی تاریخ میں مصر کا یہ انقلاب ایک نیا موڑ لے کر سامنے آیا جس سے

مستقبل میں خوش آیند امیدیں وابستہ ہیں۔

ادیبوں اور انشاپردازوں پر لازمی طور سے اس انقلاب کا گہرا اثر پڑا اور وہ زندگی کے عصری مطالبات پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی ایک نئی جماعت تیار ہوئی جس میں یوسف ادریس، یوسف الشرونی سعد الدین وہاب، صالح مورسی، عبداللہ الطوخی، عبدالمنعم سلیم، محمود السودانی، فاروق منیب اور ایڈورڈ الخراط وغیرہ شامل ہیں۔

ان ادیبوں نے موضوع اور اسلوب میں تنوع پیدا کیا تاکہ عصر حاضر کے تمام افکار و رجحانات کی پوری طرح عکاسی کی جاسکے۔ انقلاب سے پہلے کے افسانہ نگار عام طور پر ملکی اور سماجی مسائل سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور صرف اپنے جذبات کی ترجمانی کرنا ادب کی حقیقی خدمت تصور کرتے تھے۔ یہی ذہنی فضا تمام ادیبوں اور انشاپردازوں اور قائدین پر طاری تھی البتہ شعرا کی صنف میں حافظ محمد ابراہیم اور احمد شوقی نے ابتدا ہی سے ملکی مسائل کو اپنا موضوع شاعری بنالیا تھا مگر افسانہ، انشائیہ اور مقالات کی دنیا میں وہی محدود تصورات اور داخلی احساسات کے اظہار کا چلن تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی نہ تھی اور انھیں جلد اپنی تنگ نظری اور کوتاہ دامانی کا احساس ہونے لگا۔ اپنے گرد وپیش کے بدلے ہوئے حالات اور عالمی سیاست . . . . . . نے ان کے نظریۂ فکر کو چونکا دیا بالخصوص ملک میں پھیلی ہوئی سراسیمگی، سرکشی اور رعونت آمیز آمریت کے دباؤ نے ان کے جذبات کو بیدار کردیا۔ انھوں نے اپنے ماحول میں فاقہ کش مزدوروں، مفلوک الحال اور پراگندہ فکر انسانوں، بیمار و لاچار کسانوں کی سسکتی ہوئی آہیں اور ان کی بے ہنگم اور بے کس زندگی کی پردرد فریادیں سنیں۔ ان کے دلوں میں ان حالات نے ایک نئی راہ اختیار کرنے کی لگن پیدا کی۔ اس طرح قدیم ذہنیت کے قصر مسمار ہوگئے اور ترقی کی نئی شاہراہ تعمیر ہوئی۔ اس نئی تحریک نے ادیبوں اور مصنفوں میں زندگی کی حرارت اور قوت عمل کا احساس عام کردیا۔ ان میں انقلابی روح بیدار ہوئی اور ملک کی آزادی کے خواب نظر آنے لگے۔ آزادی وخود مختاری کی تمنا نے ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی سامراجیت کو کچلنے کا حوصلہ بخشا یہی جذبات آہستہ آہستہ ادیبوں کے ذہنوں میں پنپتے رہے اور ادیب انسانی زندگی اور ماحول کے قریب آکر ان کے مسائل سے دلچسپی لینے لگے اور ان میں انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

عربی ادب میں افسانہ نگاری کے موجودہ رجحانات کو مختصر الفاظ میں یہ سمجھنا چاہیے کہ ۱۹۵۲ء کے قومی انقلاب کے بعد لوگوں کی عام دلچسپی قومی مسائل اور ملکی استحکام کی جانب پیدا ہوئی اور سینکڑوں افسانے اس موضوع پر تخلیق ہوئے جن میں گزشتہ دور کی شاندار تاریخ اور روایتی فسوں کاری کے علاوہ انقلاب سے پہلے کی آزادی کی جدوجہد کی داستانیں بھی شامل ہیں اور جن کے سہارے اس آنے والے انقلاب میں بڑی مدد ملی۔ یہ انقلاب سماجی استحکام، سیاسی بیداری اور اقتصادی خوشحالی کا پیغام لایا جس کی بنیاد بہت عرصہ پہلے پڑ چکی تھی اور جو معاشرہ عرصے سے منتشر و پامال تھا اس کی شیرازہ بندی ہوگئی۔ ڈرامہ نویسوں نے "نہر سویز" کے قومیانے کی مہم میں پورٹ سعید میں جو تباہی آئی اس کی عکاسی کی

کرشنا پال

جوگندر پال: فن اور شخصیت

"یہ ہے وہ لڑکا!"

۱۹۴۷ء میں جب میں اپنی ماں کے ساتھ انبالہ کے بازار تندوراں میں تانگے سے اتری تو جوگندر پال بیڈ شیٹ کی سی دھوتی پہنے چپل گھسیٹتا ہوا اپنے باپ کی نو بھارت ڈیری میں داخل ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ یہ شخص دودھ بیچنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتا، یا شاید دودھ بیچنا بھی نہیں جانتا۔

میری ماں نے مجھے بتایا کہ دیش کے بٹوارے سے پہلے جوگندر پال سیالکوٹ میں ایم اے میں پڑھتا تھا اور اب یہاں دکان میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔

ان کے گھر ایک نحیف سی چارپائی پر بیٹھی میں شاید منہ بنا بنا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ وہ مسکراتا ہوا دودھ سے بھرے ہوئے دو بڑے بڑے گلاس لیے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"یہ دودھ کہیں اس ٹب سے تو نہیں لائے؟" میری ماں نے ہنس کر دودھ کے ایک بڑے ٹب کی طرف اشارہ کیا، جس پر بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

"لایا تو وہیں سے ہوں" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "پر آپ تو افریقہ سے سب بیماریوں کے انجکشن لگوا کر چلی ہوں گی ـــــ" (بدتمیز! لیکن میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا) ـــــ "یہاں آج کل ایمرجنسی کے دن ہیں، انسان اور دوسرے سب کیڑے مکوڑے خلاف عادت مل جل کر ہی کھاتے پیتے ہیں۔"

دو چار روز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ جس انہماک سے سارا سارا دن دودھ بیچتا رہتا ہے اسی انہماک سے رات کو گھنٹوں لالٹین کی روشنی میں اپنے محبوب مصنفین کے مطالعہ میں کھویا رہتا ہے۔

جوگندر پال ایک بڑے غریب، سفید پوش گھرانے کا فرد ہے اور یہ افراد ہمیشہ اپنے آنسو پونچھ کر ہنستے ہیں۔ شادی سے پہلے میرا یہی خیال رہا کہ وہ بڑا ہنس مکھ اور محنتی انسان ہے مگر اس کے ذہن تک پہنچ کر، اس کے دکھوں کی آہٹ پر میں چونک پڑی؛ انسان کا تمدن اپنے نقطۂ عروج کی جانب سفر کرتے ہوئے بھوک، بربریت اور بے چارگی

کی پوٹلی کیوں چھپائے پھرتا ہے؟ قسمت بانٹنے والا اتنا غافل کیوں ہے؟ دنیا کے انگنت لوگ اپنی بے مزہ سی خواہشات سے انجان کیوں بنے رہتے ہیں؟ ــــ میں ان امور کو کیا سمجھتی لیکن مجھے اپنی برٹش ٹیچر مسز لکھی یاد آنے لگی تھیں "کرشنا، ہندستان میں شادی کرنے تو جا رہی ہو، کسی الٹے سیدھے کاموئنسٹ نوجوان کی باتوں میں نہ آجانا، جن لوگوں کا کوئی دین نہیں ہوتا وہ ــــ"

مگر جوگندر پال اس معنی میں کاموئنسٹ نہیں۔

"دکھوں میں اگر آدمی کو کسی مقدس، قادر مطلق ذات کی موجودگی کا دشواس نہ ہو" وہ کہا کرتا ہے۔ "تو اس کی جیدہ جواس ہو کر اوچھا پن اختیار کر لیتی ہے۔"

شادی کے بعد عورت اپنے مرد سے پیار کے دو بول سننے کے لیے بے تاب ہوتی ہے، جوگندر پال کا لہجہ بھی بڑا بے اختیار تھا لیکن وہ کہہ یہ رہا تھا۔ "میری زندگی کا واحد مقصد یہی ہے کہ چند اچھی کہانیاں لکھ جاؤں، اور پھر ــــ بے شک مر جاؤں۔"

پہلی بار کسی ادیب سے واسطہ پڑا تھا، میں سوچنے لگی شاید سارے دن کی مصروفیت سے ان کا ذہن بے ربط ہو گیا ہے۔

جوگندر پال نے چند ایک کہانیاں پہلے بھی لکھی تھیں لیکن ایک عرصے تک اسے دوزخ کے اس دریا میں باقاعدہ پیر تیرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کہانیاں نہ بھی لکھتا تو کہانی کار ہی کا کوئی اور روپ ہوتا۔ مثلاً اگر وہ سیلزمین ہوتا تو اپنا مال بیچنے کی بجائے گاہکوں کی طبیعتوں کا تجزیہ کرتا رہتا، ڈاکٹر ہوتا تو اپنے مریضوں کا علاج کرنے کی بجائے ان کے آلام کو محسوس کرتا رہتا، ہندوستانی فلموں کا پروڈیوسر ہوتا تو کوئی اچھی کہانی میسر نہ ہونے کے سبب سے متواتر کئی کئی ماہ اپنا کام بند رکھتا۔ وہ کئی برس سے کینیا میں درس و تدریس سے متعلق ہے لیکن اپنے پیشے کے باوجود فن کو اخلاقیات کا آلہ کار بنانے کے سخت خلاف ہے۔ اسے تسلیم ہے کہ غیر افادی ادب کے امکانات سکڑ جاتے ہیں تاہم اس کا یقین یہ بھی ہے کہ جب تک افادیت ادب میں رچ بس نہ جائے، ادبی امکانات سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوتے۔

احساس اور ادراک گویا آپس میں سازش کر کے اسے اکثر بے چین رکھتے ہیں اور اس بے چینی میں سگریٹ سلگاتے بڑبڑاتے، سر کھجاتے وہ گھر کے کمروں کے سینکڑوں چکر کاٹ لیتا ہے۔ چھٹی کے دن تقریباً لنچ ٹائم پر ناشتہ کے لیے بیٹھتے ہوئے اپنی کسی کہانی کے ساتھ ساتھ کہیں بہت دور نکل جاتا ہے اور اس وقت تک گم سم رہتا ہے جب تک کہانی کی ساری کڑیوں کو جوڑ نہیں لیتا۔

"اگر فن واقعی تخلیقی عمل ہے" وہ کہا کرتا ہے "تو اسے نیچر کی مانند ثابت و سالم ہونا چاہیئے۔"

اور ظاہر ہے کہ کسی ثابت و سالم شے پر معمولی خراش بھی آ جائے تو بڑی معیوب لگتی ہے، اس لیے جوگندر پال اپنے زاویہ نگاہ کو کرداروں کی فطرت کا خاصہ بنا کر فن کو زندگی کی سالم شکل میں پیش کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے

صب

یہی وجہ ہے کہ بقول اقبال متین "اُس کی کہانیوں میں بہت کم جھول ملتے ہیں بلکہ فن کے اور اسلوب کے اعتبار سے اس کے افسانے بڑے مکمل اور جامع ہوتے ہیں"

دلی میں ہمارے گھر ایک دفعہ جب دیویندر ستیارتھی نے اس سے بڑی معصومیت سے کہا کہ افسانہ نگاری اس کی ہابی ہے تو وہ تلملا اٹھا "ہابی ؟ ارے بھئی میں فرصت میں اسٹامپ اکٹھے نہیں کرتا، رات کا بیشتر حصہ کہانی لکھ لکھ کر بقیہ وقت اس کے سپنوں میں گزار دیتا ہوں اور دن کو مجھے کام پر جانا ہوتا ہے"

ہمارا ماحول تو ایسا ہی ہے کہ ادب کو محض ایک ہابی سمجھ کر اس سے ذرا فلرٹ کر لیا جائے اور بس ——— ؟ کیوں کہ ہماری پبلک ابھی تک مصنف کو کسی پروفیشنل کی حیثیت سے قبول کرنے کی عادی نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادیب ہوتے ہوتے ادیب کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے اور وہ نرا ادیب بن کر رہ جاتا ہے اور ان حالات میں سماج اگر اسے معاشی مشکلات سے نجات نہ دلوائے تو یہ رویہ اس کی ذہنی خودکشی کے مترادف ہوگا۔

جوگندر پال فطرتاً بڑا گمبھیر ہے۔ اُسے اپنی سوچ اسی طرح مرغوب ہے جیسے بھوکے کو روٹی مل جائے، تاہم ہنسی کی آوازیں سن کر بھی وہ بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ ہنسی بھی خدا کی دھوپ ہوا اور پانی کی طرح ایک بڑی پیاری نعمت ہے۔ اسے تعجب ہوتا ہے کہ ہماری قوم سنجیدگی کی مصنوعی قدروں کے لگاتار ذکر سے بور کیوں نہیں ہوتی یا تو ہم پرلے درجے کے ریاکار ہیں اور یا بزدل، جو اس لیے بے باکی سے نہیں ہنستے کہ دوسرے لوگ ہمیں ہنستا دیکھ کر ہم پر ہنسیں گے۔ افریقہ میں رہتے ہوئے اسے افریقی لوگ اس لیے بھی اچھے لگتے ہیں کہ وہ بھوکے پیٹ کھل کر ہنستے رہتے ہیں اس کی یہ باتیں سننے والوں کو بڑی الٹی لگتی ہیں، مگر اسے ان کی ریاکارانہ متانت۔

جوگندر پال نے اپنے کالج کے دنوں ایک بڑی کچی کچی کہانی لکھی تھی: "خواہش پرستی"۔ اس کہانی میں اس نے گویا بار بار اپنی اس خواہش کو دہرایا ہے "ورنہ میں بھی ڈاکٹر ٹیگور نہ بن جاتا" لیکن یہ بہتر ہی رہا کہ حالات نے اسے ٹیگور نہ بننے دیا۔ اس نے بحیثیت فنکار اپنی راہیں گر گر کر، سنبھل سنبھل کر خود ہی دریافت کی ہیں اور دریافت کر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ذہین آرٹسٹ دنیا بھر کے ادبی ورثے سے بہت کچھ سیکھتا ہے، لیکن ادیب بننے کے لیے یہی تقاضا کافی ہوتا تو ادب کا ہر شارح اعلیٰ پایہ کا ادیب بھی ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں۔ بات کہنے کے اتنے ہی طریقے ہیں جتنے جہان کے کل لوگ۔ عام زندگی میں بھی وہی گفتگو دلچسپ لگتی ہے جو آدمی اپنے ڈھنگ سے کرے، اپنے دل پسند اداکاروں کے لب و لہجہ کی نقل اتارنے والے تو چند ہی لمحات میں ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح معیاری ادبا بھی اپنی اپنی ادبی تعلیم کے بعد جب تک اپنی باتیں بہر صورت اپنے طور پر پیش نہ کریں معیاری نہیں بن جاتے۔

جوگندر پال کئی سال سے لکھ رہا ہے لیکن ۱۹۵۵ء سے پہلے اس نے بہت تھوڑا لکھا ہے اور وہ اپنی ان تخلیقات سے بجا طور پر خوش نہیں۔ یوں ہوا کہ ۱۹۴۰ء میں کینیا میں آنے کے بعد کئی سال تک وہ بھی مقامی ایشیائی ڈپٹی سول سرونٹ تھا

تاجروں کی طرح اندھا اندھا سا رہا، دور دور تک دیکھا تو دکنار وہ اپنے آس پاس سے بھی بے خبر رہا،"
اس سیاق میں اس کی کہانی "پرش او پرشو" کی یہ سطور ملاحظہ فرمائیں "شاید روشنی اور تاریکی بذات خود کچھ بھی نہیں، انسانی بینائی کی محض دو عادتیں ہیں"

مصنوعی زندگی کی پرچھائیں، مطمئن، احمق لوگوں سے واسطہ اور اس کا اپنا احمقانہ اطمینان ان حالات میں جوگندر پال کا سلوٹ کا شکار ہو جانا عین فطری تھا — اور پھر جیسے ایکایکی وہ اپنے آپ سے جھلا اٹھا، اس کی بصارت یک لخت ملنے لگی۔ یوں کہہ لیجئے کہ اندھے کو آنکھیں ملیں تو اسے اپنی بینائی دوسروں سے دوچند معلوم ہونے لگی۔ اس دوران میں جوگندر پال نے کئی اچھی کہانیاں لکھیں۔ ایک ہی روپ میں وہ بھولے اندھوں کی محبت کا یہ تصور پیش کرتا ہے:۔

"پیار شکلوں کا محتاج نہیں ہوتا کیوں کہ پیار کی ہر شکل پیاری ہوتی ہے" اسی کہانی میں اس کے بے باک طرز فکر پر غور فرمائیے:۔ "انسانی تعلقات کو خوشگوار بنانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ہمارے رشتوں کی اساس عمروں اور خاندانی تجربوں کی بجائے ان ہی جذبات پر ہو جو ہم ایک دوسرے کے لیے محسوس کرتے ہیں" اور پھر ایک باحیا، کنواری لڑکی کی شادمانی کا یہ اظہار:۔ "دو جیمو کی ایک سلائی کسی کنواری کی طرح سرخ اون میں منہ چھپا کر بے اختیار ہنسنے لگی"

صبح امید کے تبصرہ نگار نے اس کی کہانیوں کے مجموعے "دھرتی کا کال" پر اپنی یہ رائے لکھی تھی۔ "جب کہانی ختم ہو رہی ہوتی ہے تو وہ ایک شوشہ یا ایک جملہ ایسا چھوڑ دیتا ہے جو افریقہ کے دھڑکتے دل کی ایک ہلکی سی صدا ہوتی ہے ایسی صدا جو خفیف ہونے کے باوجود اپنے اندر چھپی ہوئی زبردست گونج کا اظہار کرتی ہے" کرشن چندر نے اس کے اس اسلوب کی تفسیر یوں کی ہے کہ وہ SUSPENCE پیدا کرنے کے بعد آخر میں جھٹکا سا دے جاتا ہے اور اقبال متین نے اس کی ایک کہانی 'معجزہ' پر یہ رائے تحریر کی ہے کہ:۔ "کہانی نہ صرف یہ کہ اپنے نقطۂ اختتام پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے بلکہ قاری کے ذہن میں اس کے اور کئی پہلو روشن ہو جاتے ہیں اور وہ اس طرح اپنا سفر دل و دماغ میں جاری رکھتی ہے"

ان اقتباسات سے یہ نکتہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جوگندر پال موپساں کی مانند کہانی میں کلائمکس کو بہت اہمیت دیتا ہے لیکن موپساں اور جوگندر پال میں ایک بنیادی فرق ہے۔ موپساں کا مغربی ذہن کہانی میں نقطۂ عروج کی طرف بڑھتے بڑھتے سائنسی حقیقت نگاری سے کام لیتا ہے لیکن جوگندر پال کی مشرقی طبیعت کلائمکس بنتے بنتے اپنے کرداروں اور واقعات کے جذباتی عمل کو نظر انداز نہیں کرتی۔ اس کی ایک خوبصورت کہانی "واپسی" کے اختتامیہ لمحے سے قاری کو شدید جھٹکا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کا کلائمکس سے پہلے واقعات کا جذباتی عمل بھی قابل مطالعہ ہے۔

جوگندر پال کا ضمیر ایک آرٹسٹ کا ضمیر ہے اور ظاہر ہے کہ آرٹسٹ کی وفاداری کسی ایک انسان، ایک جماعت یا ایک قوم سے وابستہ نہیں ہوتی، وہ اپنوں، بیگانوں کے لیے یکساں ...... محسوس کرتا ہے۔ آفاقیت کے ایک بھرپور تاثر کے لیے، "رنگ سپید" کے ان آخری الفاظ کی شدت کو محسوس کیجئے:۔

"فادر دو چار ساعت سمندر کی طرف دیکھتا رہا اور پیال اور میں مسحور رہے اس کی طرف۔

اور اپنے کرداروں میں اس کے واقعات کو دُہرایا جس سے قومی زندگی میں یک گونہ حرارت اور جوش پیدا ہوا۔ حقیقت میں یہ واقعات ایسے تھے جنھوں نے نہ صرف عرب دنیا ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ عالمی سیاست میں بھی ایک ہل چل پیدا کر دی۔

قومی بنیاد پر اتحاد قائم کرنے کا یہ جذبہ محدود نہیں بلکہ اس میں عالم انسانیت کی فلاح اور بین الاقوامی اتحاد کی بھی شکل پیدا ہوی۔ سینکڑوں افسانہ نگاروں نے الجیریا اور فلسطین کے واقعات کو انسانیت کش اور غیر شریفانہ برتاؤ کا مظہر ثابت کیا۔

اب تک عام افسانوں کے کرداروں میں سماج کے اعلیٰ طبقہ اور اعلیٰ افسران کے اونچے خاندان کے ماحول کی عکاسی ہوتی تھی لیکن اس عظیم انقلاب کے بعد یہ طرز بھی بدلا اور اب عام انسانی سطح پر مزدوروں، تجارت پیشہ لوگوں کاروباری لوگوں کسانوں اور دیہاتیوں کی زندگی کے عام سماجی پہلوؤں کو بھی افسانہ نویسوں نے اپنا موضوع بنایا اور اس طبقہ کے ساتھ جو یقیناً سب سے زیادہ اصلاح اور ترقی کا مستحق تھا اور جس کے وجود سے اب تک چشم پوشی کی جاتی رہی تھی۔ عوامی زندگی کے خدوخال کو واضح طور پر فکری و علمی سطح پر لے آنے کی جدوجہد شروع ہوی۔

اس موقعہ پر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ آخر ادیبوں کو نئے تکنیک اختیار کرنے اور جذبات و احساسات کو اس جانب منعطف کرنے میں کس قدر دشواریاں پیش آ رہی ہوں گی! ناول کا قدیم ڈھچر اس تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے جس کا کبھی عام زندگی میں خیال بھی نہ تھا۔ افسانہ میں عام سماجی کرداروں اور روزمرہ کی زندگی سے متعلق واقعات و حادثات کا اس طرح پیش کیا جانا حقیقتاً ادیبوں میں ایک نئے دور کا آغاز کر رہا ہے۔

نئی ضرورتوں کا احساس اور بدلے ہوے صبح و شام ادیبوں کو اس طرف مائل کر رہے ہیں کہ وہ اس قدامت پرستانہ روش سے ہٹ کر معمولی اور غیر معمولی نکتہ کو جس کا رشتہ انسانی زندگی کے کسی شعبے سے بھی ہو پوری آب و تاب کے ساتھ پیش کریں۔ . . . .

. . . انداز بیان اور اسلوب بھی قدیم روش سے ہٹ کر موضوع اور واقعہ کی مناسبت سے اختیار کیا جائے۔ سادہ اور موثر اسلوب نگارش کو اب عام مقبولیت حاصل ہو رہی ہے جس سے ہیئت اور ترکیبوں میں تنوع پیدا ہو گیا ہے صرف صنائع و بدائع یا فصاحت و بلاغت یا زبان آفرینی کا طریقہ متروک ہوتا جا رہا ہے۔

اگر اس اسلوب کا جائزہ لیا جائے جو افسانوی ادب میں مستعار لیا گیا ہے تو موجودہ رسائل و جرائد میں شائع شدہ افسانے اس پر پورے اتریں گے اور جن کو افسانے کے بجائے مقالہ کہنا زیادہ درست ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ افسانہ کا اسلوب ابھی تجربے کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ طرز افسانے کے مستقبل کے لیے خوش آئند ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ رجحان بھی عام ہو رہا ہے کہ حالات اور کوائف کو بلاواسطہ اس طور پر پیش کیا جائے کہ پڑھنے والے کا ذہن اصل مسئلہ پر خود بھی غور کرنے کا عادی بن جائے اس کا ذہن واقعہ کی واردات سے اباء نہ کرے بلکہ ذہن میں واقعہ کی تمام مادی فضا اور اس کے خواص وضاحت کے ساتھ ایسے نقش ابھاریں جو

مسئلہ کے حقیقی حل کے تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔

ڈاکٹر یوسف ادریس نے "زخم" میں ایسے شخص کی زندگی کا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ہیرو کا کردار ایک معمہ بن گیا ہے ایک ہی وقت میں وہ ایک دلیر مرد میدان ہے اور اسی وقت میں ایک شکست خوردہ سپاہی بھی۔ چار نوجوان ایک آبی کشتی میں سوار مقبوضہ پورٹ سعید کو عبور کرنے کے انتظار میں ہیں اور بڑی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں کہ وہ منزل مقصود تک پہنچیں اور اپنے دوسرے درماندہ اور بیکس ساتھیوں کی مدد کریں۔ کپتان ان کو اس وقت تک رکنے پر مجبور کرتا ہے جب تک کہ وہ عورت جو اپنے زخمی لڑکے کی تیمارداری کرنے کی غرض سے اس راستہ کو طے کر رہی ہے پاس نہ پہنچ جائے یہ نوجوان اس بات پر برہم ہو جاتے ہیں اور بالآخر مشتعل ہو کر علی کو دپٹتا ہے اور اپنے سردار کو وہاں ہی پر مرعوب زدوکوب کرتا ہے۔

جیسے جیسے پورٹ سعید پر رات کی تاریکیاں چھاتی جاتی ہیں ہر ایک اپنے تصورات میں گم ہو جاتا ہے۔ علی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ کپتان بھی اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور وہ عورت اپنے زخمی بچے کے غم میں نڈھال اور نوجوان آنے والی مصیبتوں سے گھبرائے ہوئے ہیں کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے کنارے کے قریب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جہاز سے اتر جائیں۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے "ماں" بورڈ پر کود پڑتی ہے اور بغیر کسی آہٹ کے غائب ہو جاتی ہے لیکن یہ لوگ اسی تذبذب میں کھڑے رہتے ہیں علی ان کو مشورہ دیتا ہے کہ جب تک دن نمودار نہ ہو اس وقت تک ٹھہرے رہیں لیکن وہ تینوں کود پڑتے ہیں اور وہ بھی ان کے پیچھے کود پڑتا ہے اس طرح وہ سب پورٹ سعید پہنچتے ہیں۔

سعید الدین وہاب نے "ارضنا" میں اشتراکیت کا طرز اختیار کیا ہے اس کا موضوع سرمایہ داری کا خاتمہ اور محنت کش عوام کو ان کی قربانیوں کے صلے میں وہ ساری متاع دلانے کی مہم ہے جس پر ان کا جائز حق ہے وہ زمینیں جنہیں وہ اپنے خون سے سینچتے رہے ہیں۔ ان پر ان کی ملکیت قائم کراتا ہے۔ وہ اس ایک کسان کی دیہاتی زندگی کو تمثیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور تمام واقعہ کی عکاسی ان ہی امور کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔

صالح مورش نے "انسان عظیم" میں انقلاب مصر کے محرکات کی ترجمانی کی ہے۔ ابراہیم آفندی ایک معمولی سرکاری ملازم ہے اس کا ایک بچہ جو اب سیانا ہو چکا ہے۔ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے لیکن اس کا باپ اس کے بارے میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ اب باشعور ہے اس کے نزدیک وہ ابھی ایک ناسمجھ بچہ ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابراہیم آفندی بہت شریف آدمی ہے اور اس نے اپنے لڑکے کی تربیت و پرورش پر ہر طرح نگہداشت کی ہے اس کی ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے کہ وہ اپنی معاش پرسکون طور پر حاصل کرتا رہے۔ اس کو نہ اپنے پڑوسی سے کوئی غرض اور نہ ملکی معاملات سے کوئی لگاؤ۔ وہ روایتی رسم و راہ کا بے حد پابند ہے اپنے لڑکے کو سگریٹ پیتے دیکھ کر اس کو بہت غصہ آتا اور کبھی کبھی اس کی خفگی یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اس کو گھر سے باہر نکال دیتا لیکن اس کی بیوی رو دھو کر اس کو ایسا کرنے سے روک دیتی لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لڑکا قومی ہنگاموں میں حصہ لے رہا ہے تو پھر آفندی آپے سے باہر ہو جاتا ہے تاہم لڑکے پر اپنے تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیتا۔ آخر ایک دن اس کا لڑکا گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ جس سے اب وہ ایک ذہنی ہیجان میں مبتلا ہو جاتا ہے ایک طرف

اس کو لڑکے کی اس حرکت اور دوسری طرف اس کی ماں کی چاہت دونوں اس کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔ آخر کار وہ اپنے لڑکے کی حفاظت و مدافعت اور اس کو رہا کرانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ عدالت اس کے لڑکے کو باعزت طور پر رہا کرتی ہے اس سے اس کو فوراً خیال آتا ہے کہ میرا لڑکا اب ایک بڑا آدمی بن گیا ہے جس پر مجھے بجا طور پر فخر کرنا چاہیے اس کی قربانی یقیناً حق و صداقت کے لیے تھی۔ عدالتی فیصلے کے فوراً بعد وہ اپنے لڑکے کے پاس جاتا ہے اور اس کو سگریٹ کا ایک پیکٹ پیش کرتا ہے۔ یہ وہی باپ ہے جو سگریٹ پینے کو باعث تحقیر و رسوائی سمجھتا تھا اور ہمیشہ اس کو اس پر غصہ آتا تھا لیکن آج وہ اپنے پڑوسیوں سے پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ "یہی میرا قابل فخر لڑکا ہے۔ میں ایمانداری سے کہتا ہوں یہ میرا ہی لڑکا ہے اور میں اس کا باپ ہوں . . . !"

اس افسانے میں الرحیم آفندی کا کردار بڑی دانشمندی اور موزونیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس کو عین الاحالات میں رکھ کر دکھایا ہے جو زندگی کے روزمرہ میں پیش آتے ہیں اور قومی آزادی کی جدوجہد میں رونما ہوتے ہیں انداز بیان نہایت ستھرا ہے۔ اسلوب کی سادگی نے واقعہ میں جان پیدا کر دی ہے۔

اسی طرح کی مثال محمد نجیب کے شاہکار "دوسرے لوگ" میں بھی ملتی ہے اس میں بھی خاص کردار سماجی ضرورتوں کے لحاظ سے پیش کیے گئے ہیں ان کی انفرادی شخصیت کے تمام پہلو سماجی زندگی ہی کی عکاسی کرتے ہیں، اور خاتمہ بھی اسی انداز سے ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہیرو کی شخصیت ایک عظیم حادثہ کا باعث بنی ہے تاہم اس کے پیش نظر افسانے میں محمد نجیب نے ایک ایسی کہانی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ ساری خوبیاں نہیں ہیں جو صالح مورث کے کردار میں ملتی ہیں وہ اپنے ہیرو کے کردار کو ڈرامہ کے خطوط پر ابھار کر پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ہیرو ایک خودغرض، بزدل انانیت پسند انسان ہے اس کا یہ کردار ایک سین کی طرح سامنے آجاتا اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

ابو نجا کے افسانے میں محمود ۱۹۵۱ء میں خفیہ قومی خبررساں بنا کر اسماعیلیہ بھیجا جاتا ہے تاکہ وہاں مصری محاذ جنگ کی اطلاعات فراہم کرے اس کا دل خبررسانی کے لیے بالکل مطمئن ہے لیکن اس کو معاً یہ خیال آتا ہے کہ آخر لوگ کیوں اپنی زندگیاں قربان کرنے کے لیے پاگل بنے ہوئے ہیں؟ آخر کس لیے؟ اپنی مادر وطن کی خاطر یا دوسروں کے لیے؟ لیکن وہ ان سوالات سے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔

محمود حسین نامی شخص سے ملاقات کرتا ہے جو کہ ابھی ابھی اپنے باپ کے کارخانہ سے بھاگ کر آیا ہے تاکہ محاذ نہر سوئز پر جنگ میں شرکت کر سکے اس کا عقیدہ ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے، شہادت سیدھا جنت میں لے جاتی ہے۔ ابھی یہ لوگ ٹرٹی روڈ پر محو گفتگو ہی ہیں کہ انگریزوں کی ایک جیپ آجاتی ہے اور ان پر حملہ ہوتا ہے اور وہ بری طرح زخمی ہو جاتے ہیں۔ محمود اپنی حفاظت کرنے لگتا ہے لیکن اس حال میں اس کو دوسروں کی ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔ مصری مدد آنے میں دیر ہو جاتی ہے اور وہ زخمی حالت میں کیمپ کی

طرف چلتا ہے ـــــــ وہاں پہنچ کر اس کی تیارداری ہوتی ہے اور اب وہ پہلے سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ خبر رسانی کا کام انجام دیتا ہے۔ . . . . قومی خدمت کا احساس اور عرب قوم کی بلندی کے لیے جس قدر احساس پیدا کیا جاسکتا ہے افسانہ نگار نے بھرپور انداز سے اس افسانے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ کا پلاٹ اس طرح تیار کیا ہے کہ قاری میں خود ایک قومی جوش پیدا ہوتا ہے۔ افسانہ نگار فن کے رموز سے بھی آشنا ہے تکنیک سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔

مصری افسانہ نگاری کے موجودہ رجحانات کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عربی ادب کا یہ گوشہ بھی کس تیز رفتاری سے ترقی پذیر ہے۔

لیکن یہ ساگر دیکھو۔ اس کے فاصلے لا انتہا ہیں اور اس کے کنارے دنیا کے دیشوں کو ملا رہے ہیں۔ اس کنارے پر انگلینڈ ہے، وہاں ہندوستان اور یہاں افریقہ۔ ہم ساگر بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ؟!

فادر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے لگا کہ وہاں دنیا بھر کی اجنبی بندرگاہوں کے لائٹ ہاؤس ٹمٹما رہے ہیں!"

کالے گورے کا بھرم مٹتا دیکھنا ہو تو اس کی ایک تازہ طویل مختصر کہانی "رنگوں کا بھرم" پڑھیے۔

"نہیں بابو! یہ کوا ہندوستان کا نہیں، ہمارے افریقہ کا ہے۔" نیرو نے مجھے ٹوک کر کہا۔ "اور ہم کالے لوگوں میں کوے کے بارے میں ایک اور ہی روایت مشہور ہے۔ ہمارے کوے صرف سفید اجنبیوں کی دیواروں پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتے ہیں، ان سے یہ کہنے کے لیے کہ اپنا اپنا رفیق (یار) اب یہیں ڈھونڈ لو۔"

طویل مختصر اور مختصر افسانوں کے علاوہ جوگندر پال نے کئی ننھی منی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ایک دفعہ وہ کہنے لگا کہ اس ایٹمی دور میں ہم پر روشن ہو گیا ہے کہ نہایت باریک ایٹم میں بھی کتنی بے پناہ قوت چھپی ہوتی ہے۔ اگر وکٹورین ناولسٹ ہمارے عہد میں پیدا ہوتے تو اپنے ایک ایک ہزار صفحات کے ناول ایک ہزار الفاظ میں نمٹا جاتے۔"

اور جب میں نے اسے ٹوکنا چاہا تو وہ مجھے روک کر کہنے لگا "تم عورتیں نہیں سمجھ سکتیں کہ کئی کیفیات میں صرف اختصار ہی پرگوئی ثابت ہوتا ہے۔ مجھے تو لکھتے لکھتے بعض اوقات اس ضرورت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ صرف خاموش رہ کر ہی اپنے مطلب کی وضاحت کر جاؤں۔ آئندہ شاید فنکار کوئی ایسا اسلوب ڈھونڈ لیں جس سے خاموش رہ کر بھی قلبی واردات کا بھرپور اظہار ہو سکے۔"

میں کرشن چندر سے متفق ہوں کہ ضرورت سے زائد وہ ایک فقرہ بھی نہیں لکھتا۔ اس کی اسی احتیاط کا نتیجہ ہے کہ اس کا فنی استعداد اتنی قد آور نکل آئی ہے۔

لیکن اس اختصار پسندی کے باوجود اس نے ان ہی دنوں ہمیں اپنا ایک اہم ناول دیا ہے "ایک بوند لہو کی"۔ میں نے اسے اپنے اس ناول کی تخلیق میں کئی ماہ دن رات گھلتے دیکھا، گویا وہ اپنے خون کی بوند بوند دے کر اپنے کرداروں میں روح پھونکنا چاہتا ہو۔ ایک نقاد نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے میرے دل کی بات تحریر کی ہے "اور بعض کرداروں کی اٹھان تو اس قدر شاندار ہے کہ وہ زندہ ہو کر ناول کے صفحات سے ابھر آتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں۔"

جوگندر پال اپنی روزمرہ کی زندگی میں بڑا جلد باز اور ضدی ہے اور فوری اور اکثر اوقات غلط فیصلے کر کے بلا وجہ اُن پر اَڑ جاتا ہے اور اسی لیے کئی تلخیاں سہن کر چکا ہے۔ تاہم ادبی لحاظ سے اس کے کردار کی یہ کمزوری شاید اس کی سعادت ثابت ہوئی ہے۔ نامساعد ماحول کے باوجود وہ گزشتہ پانچ برس سے بڑی ضد سے اپنی تخلیقات میں جُٹا ہوا ہے اور جب کوئی کہانی مکمل ہو جاتی ہے تو ـــــ

سلہ ٹیلی سکوپ میں اس نے عورت کے محسوسات اتنی ہمدردانہ فہم سے قلمبند کیے ہیں کہ یہ بیہودگی بھی ہضم کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

"آخر تمھیں اس مغز کھپائی سے ملتا ہی کیا ہے؟" میرا ایک متمول بھائی حیران ہو کر اکثر اس سے پوچھتا ہے۔

"نشہ!"

"خاک نشہ! اتنی محنت کے بعد ایک کوارٹر شراب کے پیسے تو نصیب نہیں ہوتے۔"

"سالے! کبھی کبھی تو لاجواب کر دیتے ہو۔" جوگندر پال گویا آنکھوں سے خاموش اعتراف کر کے پھیکی سی ہنسی ہنس دیتا ہے۔

یہ تو ہوا مگر ان ادیبوں کی ایک ادا میری سمجھ سے باہر ہے:۔ سچائی تو یہ ہے کہ ادب زندگی کی تفسیر ہے لیکن ہمارے یہ محبوب مصنفین ایسا طرزِ زندگی اختیار کر لیتے ہیں جیسے زندگی ہی ادب کی تفسیر ہو، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیچارے جینے کا سلیقہ کھو بیٹھتے ہیں۔

اس لحاظ سے کیا ایک عام سیدھا سادہ آدمی جسے ادب سے قطعاً کوئی وابستگی نہیں ادباء سے بہتر فنکار نہیں؟

ذرا سوچو جوگندر پال، اور جواب دو!

مخدوم محی الدین

وصال

دھنک ٹوٹ کر سیج بنی
جھومر چمکا
سناٹے چونکے
آدھی رات کی آنکھ کھلی
برہ کی آنچ کی نیلی لو
نے بنتی ہے
لے بنتی ہے
تنہائی جلتی روتی تھی
اب سر نیوڑھائے
لال پپوٹے بند کیے بیٹھی ہے
نرم گرم ہاتھوں کی مہندی
ایک نیا سنگیت سناتی
دل کے کواڑ پہ رک رک کر کوئی راتوں میں دستک دیتا تھا
دل کے کواڑ پہ رک کر وہ دستک دیتا ہے

پٹ کھلتے ہیں
آنکھ سے آنکھ، دلوں سے
دل ملتے ہیں
گھونگٹ میں جھومر چھپتا ہے
گھونگٹ میں مکھڑے چھپتے ہیں
دولت خاں کی ڈیوڑھی کے کھنڈروں میں
بڈھا ناگ کھڑا روتا ہے
گونگے سناٹے بول اٹھے
گھونگٹ، مکھڑے، جھومر، پائل
چمک، دمک، جھنکار امر ہے
پیار امر ہے
پیار امر ہے
پیار کی رات کی آنکھ امڈ آتی ہے
اور دو پھول
تنور بدن
شبنم پی کر سو جاتے ہیں

سحر انصاری

پُل

یہ پُل جس کی رگ رگ میں فولاد کی سخت کیلیں گڑی ہیں
اب ہواؤں کے بوجھل تھپیڑوں کو سہنے لگا ہے
خامشی ان دنوں اپنی کھوئی ہوئی ساعتوں کی زباں بن گئی
اور میں ان فضاؤں کے خاموش پندار سے ڈر رہا ہوں

زنگ آلود پُل سے الجھتے ہوئے نرم پانی کے چھینٹے
مری خامشی کی نگاہوں پہ ہنسنے لگے ہیں
اس خموشی کی دشمن یہ اک ریل گاڑی
اپنے پہیوں سے ساکت فضاؤں کے دل چیرتی جا رہی ہے

پُل کے اوپر گزرتی ہوئی ریل گاڑی کے روشن دریچے
سرِ شام تاریک پانی کی موجوں میں بکھرتے ہوئے ہیں
اور تاریک پانی میں پنہاں نباتات کے سارے سرکش ارادے
کائی بن کر گزرتی ہوئی نرم لہروں کی زد میں بہے جا رہے ہیں

اب اندھیرے کی چادر کے چاروں طرف روشنی آنکھ ملنے لگی ہے
کہر میں آسماں کا پگھلتا ہوا نیل بھی گھل چکا ہے
ریل گاڑی سے بچھڑی ہوئی اک دھوئیں کی لکیر
اپنی پلکوں کی چنگاریاں جھاڑتی جا رہی ہے
کشتیاں اپنے لپٹے ہوئے بادبانوں کی آغوش میں سو چکی ہیں
سارا ماحول اک خواب کی ریت میں دھنس رہا ہے
میری تنہائیاں کہر میں ڈوبتی جا رہی ہیں

میرے گھر کی طرف جانے والی سڑک
اپنے بھیگے ہوئے سرد زخموں کی ٹیسیں چھپائے
میرے قدموں سے کچھ دور اک موڑ پر جا کے گم ہو گئی ہے
میری آنکھوں کی مصروفیت کھو گئی ہے

قمر ہاشمی

لہو سے اپنے زمانے کی مانگ بھرتے ہیں

ہمیں سے زہرہ جبینوں کے حسن میں ہے کشش
ہمیں سے عارض و لب میں ہے رنگ و تابانی
سحر کے نور میں کجلاہٹوں میں شاموں کی
ہماری لذتِ احساس کی فراوانی
ہمیں نے سوز و گدازِ حیات بخشا ہے
ہمیں نے کیفِ دوام و ثبات بخشا ہے

ہمارے دم سے ہے قائم تری لطافت بھی
جو ہم نہ ہوں تو نہ ہو تیری یہ حلاوت بھی
جو بوالہوس ترے خلوت کدوں کو رکھتے ہیں
چراغِ سیم سے روشن بس ایک شب کے لیے
گریز پا ہیں وہ کیوں تلخیٔ حوادث سے
کہ ایک یہ بھی ہے تیری ادائے نیم شبی
ہمیں قتیل ہیں اس کے ہمیں امین بھی ہیں
کہ اس ادا کو ہمیں تھپکیاں بھی دیتے ہیں
خود اپنے دل کے لہو کی کشید سے اکثر
چراغ ہم نے جلائے ہیں تیری محفل میں

ہمارے دم سے ترے نقش سب ابھرتے ہیں
ہمارے خون سے گلشن ترے نکھرتے ہیں
ہمیں نے فکر کو آواز کا دیا ہے روپ
ہمیں نے چھاؤں میں بدلی ہے چلچلاتی دھوپ
ہمیں نے سختیٔ باراں و سنگ و آہن کو
ردائے شعلہ و شبنم میں کر دیا تبدیل
ہمارے دل کی حرارت سے اب بھی روشن ہے
ترے جلال کی تیرے جمال کی قندیل
ہماری فکر کی معجز نمائیوں کی قسم
ہمیں نے تجھ کو سکھائی ہے کج کلاہی بھی
ہمیں نے تجھ کو ثبات دوام بخشا ہے
ہمیں نے تجھ کو صلابت کا جام بخشا ہے
مگر حسینۂ دوراں یہ تیرے دیوانے
ہیں تیرے پیار کی گرماہٹوں سے بیگانے

حکیم یوسف حسین خاں

قید

قید ہے چشم
ایک آبِ رواں کا بتِ مرمریں
کالی کالی سلاخوں کے زیرِ نگیں
حلقۂ سرمگیں میں صنم قید ہے!

قید ہے فہم
نرم جوہر کی سیماب فطرت زمیں
ٹھوس دیواریں پا بہ جولاں مکیں
گنبد استخواں میں حرم قید ہے

قید ہے جام جسم
بھاپ کا سرخ سیارۂ آتشیں
جادۂ واپسیں میں ارم قید ہے!

قید ہے آنکھ۔ خونِ رواں قید ہے
اک خرد ہی نہیں۔ کل جہاں قید ہے!

سوچتا ہوں کہ اس قید کو توڑ دوں
جسم مجبور لیکن اگر چھوڑ دوں
پھل ملے گا یہ اک عمر کے صبر کا
موت اعلان بن جائے گی جبر کا
دیدہ ور! موت بھی تو یہاں قید ہے!

قید ہے قید ہے جسم و جاں قید ہے
منزلیں قید ہیں، کارواں قید ہے
ہر یقیں قید ہے، ہر گماں قید ہے
ہائے! کیا بے کراں، بے زماں قید ہے!

رضیہ فصیح احمد

فن کی نمائش

میں نے ایک خیالی پیکر رنگ کے روپ میں ڈھالا ہے
کوئی کہے ہے یہ مٹکا ہے، کوئی کہے ہے پیالا ہے
ایک چھبیلی سُندر ناری غور سے اس کو تکتی ہے
منہ ہی منہ میں کچھ کہہ کہہ کے دھیرے دھیرے ہنستی ہے
سوچ رہی ہے اس فنکار کے رنگ بھی کتنے گدلے ہیں
یہ تک دھیان نہیں ہے اس کو رنگ یہ کس نے بدلے ہیں
دل میں ہے یہ اسی سے پوچھوں آپ جو چشمہ لگائے ہیں
اس کے تو اپنے ہی رنگ ہیں اور اپنے ہی سائے ہیں
نیلے پردوں کے پیچھے سے فن کو پرکھنے آتی ہو
یا ملنا ہے اور کسی سے یوں ہی وقت بتاتی ہو؟"

کچھ کالج کے لڑکے بالے ہنستے ہنستے آئے ہیں
پیروں میں لمبے لمبے جوتے سر پر ہیٹ لگائے ہیں
ایک کہے ہے "یہ تو دیکھو یہ تصویر خیالی ہے"
دوجا بولا "سچ سچ بھیا، یہ تو کان کی بالی ہے"

اس پر ایک یہ بولا "تم نے یار یہ خوب ہی ہانکی ہے
غور سے دیکھو یہ تو کسی نے لے کر الٹی ٹانگی ہے"
یہ کہہ کر وہ سب نیلے چشمے کے پیچھے دوڑ گئے
فن کو اور فنکار کو اپنے اپنے حال پہ چھوڑ گئے

میں کونے میں چپکا بیٹھا یہ سب طعنے سنتا ہوں
جتنا دوجے ہنستے ہیں، میں اتنا ہی سر دھنتا ہوں
میرا ایک خیالی پیکر سب کی نظر سے بالا ہے
اتنے مجمع میں بس اس کو ایک سمجھنے والا ہے
ایک سمجھنے والا وہ ہے جس نے اس کو ڈھالا ہے
باقی کی نظروں میں یا یہ مٹکا ہے یا پیالا ہے

(مولانا) ہندی

اٹھو نہ بزم سے عہدِ شباب باقی ہے
بچی ہوی ابھی تھوڑی شراب باقی ہے

بساطِ عیش نہ الٹو چلے شراب کا دور
فلک پہ انجمن ماہتاب باقی ہے

نفس کی آمد و شد ہے گلوئے مینا میں
ذرا سی مے پہ نمودِ حباب باقی ہے

لبوں پہ نے کے ابھی تک چھڑی ہوی ہے غزل
ہمارے ہاتھوں میں اب تک رباب باقی ہے

جہاں میں اشک کے قطروں نے آبرو رکھ لی
ان آبگینوں میں کچھ آب و تاب باقی ہے

نگاہِ نرگسِ شہلا نے بات کیا کہہ دی
دلِ چمن میں ابھی اضطراب باقی ہے

گیا نہ سر سے وہ سودائے خام اے ہندی
دلِ حزیں میں ابھی اضطراب باقی ہے

خورشید احمد جامی

آگ جب ہجر کے لمحات اگلتے ہوں گے
تیری سوچوں کے در و بام بھی جلتے ہوں گے
شاخِ نازک پہ لرزتے ہوئے پتوں کی طرح
ذہنِ فردا میں نئے گیت مچلتے ہوں گے
کچھ سوالات مری روح سے ٹکراتے ہیں
کچھ خیالات ترے ساتھ بھی چلتے ہوں گے
دستِ خونیں ترے لیے گردشِ دوراں اب بھی
کتنی کھلتی ہوی کلیوں کو مسلتے ہوں گے
راکھ بجھتے ہوئے تاروں کی اڑانے کے لیے
شب کی وادی سے کئی خواب نکلتے ہوں گے
جس جگہ رات کے سینے سے لہو ٹپکا تھا
اس جگہ نور کے چشمے تو ابلتے ہوں گے
لالہ و گل کی نگاہوں کا سہارا لے کر
لڑکھڑاتے ہوئے ارمان سنبھلتے ہوں گے
آج بھی شہرِ نگاراں میں پہنچ کر جب بھی
زخمِ دل پیار کی آواز میں ڈھلتے ہوں گے

ریورنڈ ہینسن ریحانی

جب امتیازِ جادہ و منزل نہیں رہا
پھر کوئی راہِ عشق میں حائل نہیں رہا

عکسِ جمالِ دوست کے قابل نہیں رہا
جو دل تھا رشکِ آئینہ وہ دل نہیں رہا

لذت سے اضطراب کی جب آشنا نہیں
انساں کے مرنے جینے کا حاصل نہیں رہا

ہر آدمی کے واسطے جس دل میں ہو جگہ
اب آدمی کے سینے میں وہ دل نہیں رہا

پہنچا ہوں اس مقام پہ حق کی تلاش میں
باطل مری نگاہ میں باطل نہیں رہا

گم گشتہ کارواں کو نہ الزام دے کوئی
رہبر کو خود تصورِ منزل نہیں رہا

دل سا گواہ ٹوٹ کے اس سے جو مل گیا
وہ مجھ کو قتل کر کے بھی قاتل نہیں رہا

ریحانی کیا کیا یہ نویدِ بہار نے
صحنِ چمن میں شورِ عنادل نہیں رہا

سید حرمت الاکرام

بارہا کیفیت ایسی ان کی بھی پائی گئی
دل میں نشتر اور ہونٹوں پر ہنسی پائی گئی
اپنی محرومی کا عالم ہے زمانے سے جدا
خود انھیں کی بزم میں ان کی کمی پائی گئی
تجربہ یہ ہے کہ اکثر جلوہ گاہِ ناز میں
میرے ہی ذوقِ طلب کی چاندنی پائی گئی
حسن کی رنگینیاں تھیں دور سے کچھ اور ہی
پاس پہنچے تو بلا کی سادگی پائی گئی
کتنا طرفہ کار ہے وہ پیار بھی جس پیار میں
دل کی کاہش روح کی بالیدگی پائی گئی
ہم خفا ان سے ہوئے لیکن اسے کیا کیجئے
بے تعلق ہو کے بھی وابستگی پائی گئی
زندگی کے پیچ و خم کا ہو چکا جب تجربہ
آپ کی زلفوں میں بھی آشفتگی پائی گئی
نکتہ چیں مجھ پر رہی اک عمر تک رسمِ جنوں
بیخودی میں بھی وہ شانِ آگہی پائی گئی
کون حرمت کے سوا روئے گا اس انداز سے
چاندنی راتوں کے دامن پر نمی پائی گئی

ساحر بھوپالی

جب سے اسیرِ زلفِ شکن در شکن ہوں میں
آگاہ رازِ گمرہئ برہمن ہوں میں

بزمِ سخن شناس میں ہوں شاعر و ادیب
میدانِ کارزار میں شمشیر زن ہوں میں

جامِ حسن و عشق بھی ہوں فیضِ شوق سے
تارِ رگِ حیات پہ بھی زخمہ زن ہوں میں

دیر و حرم کی رونقیں میرے ہی دم سے ہیں
بُت گر کہیں ہوں اور کہیں بت شکن ہوں میں

لمحاتِ درد سے ہے مرے رقص میں حیات
پیغمبرِ بہار ہوں، جانِ چمن ہوں میں

اس وقت دیکھے کوئی غمِ عشق کا جمال
بحرِ تفکرات میں جب غوطہ زن ہوں میں

میرا کلام درد ہے پیغامِ اتحاد
دلدادۂ ستیا گنگ و جمن ہوں میں

مجھ سے لگے ہیں شعر کی عظمت کو چار چاند
مجھ پر سخن فدا ہے، فدائے سخن ہوں میں

کیا کچھ نہیں ہے مجھ میں جو بھٹکوں ادھر ادھر
ساحر خود اپنی ذات سے اک انجمن ہوں میں

عابداللہ غازی

ڈرتے ہو جو خلوت سے خوابوں ہی میں آجانا
ہم ہجر کے ماروں کو صورت تو دکھا جانا

اک عمر گزاری ہے دن رات سلگنے میں
اے بادِ صبا دل کے شعلوں کو جگا جانا

کچھ زیست میں لذت ہے آزارِ محبت سے
جینے کے سہارے کو لوگوں نے وفا جانا

رو رو کے گزاری ہیں گھڑیاں غمِ تنہا نے
جاگی ہوی راتوں کے خوابوں کو سلا جانا

اس رمزِ محبت کو کچھ اہلِ جنوں سمجھے
پاکر انھیں کھو جانا، کھو کر انھیں پا جانا

اس چشمِ غزالیں سے ہم پوچھنے جائیں گے
ملتے ہوے کترا کر نظروں کا بچا جانا

دل نذرِ بتاں کر کے اللہ کی یاد آئی
لوگو! کہیں عابد کی باتوں میں نہ آجانا

حسن یوسف زئی

کبھی جو صبحِ بہاراں کا ذکر نکلا ہے
صباحتِ رُخِ جاناں کا ذکر نکلا ہے

اسی بہانے سے زلفیں سنوار لو اپنی
ہمارے حالِ پریشاں کا ذکر نکلا ہے

کہیں نہ روزِ قیامت تمام ہو جائے
گناہگار کے ایماں کا ذکر نکلا ہے

سنبھل کے بیٹھیں ذرا اہلِ ہوش محفل میں
ہمارے جیب و گریباں کا ذکر نکلا ہے

حرم میں دیر میں دل میں شراب خانے میں
کہاں کہاں غمِ جاناں کا ذکر نکلا ہے

وہ دیکھ لیتے ہیں گھبرا کے اپنے دامن کو
کہیں جو خونِ شہیداں کا ذکر نکلا ہے

حسنؔ وہ پہلے سے آدابِ میکدہ نہ رہے
وہاں بھی تلخیٔ دوراں کا ذکر نکلا ہے

بلراج حیرتؔ

خاک تشریحِ واقعات کریں
آؤ بیٹھیں تو کوئی بات کریں

اے خدا تو جو ناگوار نہ ہو
کچھ ہمیں فکرِ کائنات کریں

حکم ہے پھونک کر نشیمنِ دل
اہتمامِ تجلیات کریں

کیا یہ دنیا کوئی جہنم ہے
کس لیے خواہشِ نجات کریں

زندگی خواب ہے بہت بہتر
آؤ اب اور کوئی بات کریں

اتنی فرصت ہمیں کہاں حیرتؔ
فکرِ مستقبلِ حیات کریں

جوہر سعیدی

سناٹا

آوازِ العطش نہ صدائے سبو سبو
سوناپڑا ہوا ہے خمستانِ آرزو
کھاتا ہوں میں فریب حقائق کے روبرو
خوش ہے ہوا و حرص کی پرچھائیوں میں تو
پھیلا ہوا ہے ایک اندھیرا سا چار سو
کیا منہ دکھا سکے گی اجالوں کی آبرو
آتا نہیں نظر ہی کوئی درد آشنا
اظہارِ حال درد کریں کس کے روبرو
ملتے نہیں نقوش کفِ پائے رہرواں
جنگل بنا ہوا ہے بیابانِ جستجو
گھبرا کے تجھ سے اپنا پتہ پوچھتا ہوں میں
مایوس ہو کے میری طرف دیکھتا ہے تو

در در کی خاک چھان رہی ہے خوشی خوشی
وہ غیرت انا نہ پھری تھی جو کو بہ کو
دلدار ہے کوئی نہ جگر دار ہے کوئی
شیشے کی آبرو ہے نہ پتھر کی آبرو
ہر صاحبِ ہنر نظر آتا ہے مطمئن
شاید دلوں کے چاک بھی ہونے لگے رفو
ان سے بھی جن کا سامنا کرتی نہیں اجل
کہتی ہے زندگی مرے سائے کو بھی نہ چھو
ہر غنچۂ طرب نے چٹک کر یہی کہا
اب جاگنے کا نام نہ لے خواہشِ نمو
انسان کی رگوں میں جو رہتا ہے موجزن
پانی ہے سرخ رنگ کا جوہر کہ ہے لہو؟

صبب

خاور نوری

بھکارن

(سانیٹ)

قسمت کی لکیریں جو کھا کر
کیوں بن گئیں جھریاں بدن کی؟
کیا بات ہے پھوٹتی کرن کی
گیسو چمک اٹھے نور پا کر
ماضی کی تلاش بے محل ہے
بینائی فرار ہو چکی ہے
سب گرمیٔ زیست کھو چکی ہے
رعشہ ہے کہ سردیٔ اجل ہیں

تھرّاتے لبوں پہ ہے دہائی
ہر سانس ہے واردات تازہ
غیرت کا لیے ہوئے جنازہ
ہاتھوں میں ہے کاسۂ گدائی

جب ڈال دیا کسی نے جوٹھا
شہزور بھکاریوں نے لوٹا

بدیع حسینی

سوغات

رات آئی
دل کی محفل جمی
پھر کسی پائل کے گھنگرو بج اٹھے
پھر کوئی آیا
لیے ہاتھوں میں مالا یاد کی
نرگس و لالہ
چنبیلی، جوہی، چمپا، موتیا
پھول اتنے
ترجمانی ایک کی
کہکشاں
انگڑائی لے کر جاگ اٹھی
موتیوں سے
بھر گیا دامن مرا

امین عارفی

حسین پلکیں حسین آنکھیں

یہ کالی کالی حسین پلکیں
اداس آنکھوں پہ یوں ہیں لرزاں
کہ یہ تمہاری حسین پلکیں نہیں ہیں بلکہ
تھکی ہوی ایک شب ہے رقصاں
تمہاری آنکھیں پہاڑی جھیلوں میں تیرتا اک حسیں کنول ہے
مچلتی لہروں کے دوش پر جو
تمام درد والم چھپائے رواں دواں ہو
تمہاری کالی حسین آنکھیں
جو غم کی شدت سے سرخ تر ہیں
تمہاری آنکھیں

تمہاری ویران زندگی کی
گزرتی تنہائیوں میں ایسی ہیں
جیسے سنسان رہگزر پر
اداس شب میں
کئی دیئے جھلملا رہے ہوں

رؤف خلش

تلاش

شبنم کا ہے نکھار، بہاروں کی دلکشی
پھولوں کا روپ ڈھل گیا تیرے بدن میں آج
ہونٹوں کے نرم نرم شگوفے یہ نیم وا
رعنائیاں سی کھل گئیں شرمیلے پن میں آج
مست انکھڑیوں میں ڈول رہی ہے شراب ناب
مدہوش بن رہے ہیں تیری انجمن میں آج

لمحے نشاطِ روح کے کچھ اور بھی تو ہیں
جو ہم نے تیرے ساتھ گزارے نہیں ابھی
اے جانِ انتظار! ترے حسن کی قسم
پیچ و خمِ حیات سنوارے نہیں ابھی
وہ اہلِ دل ہیں خیر ہو ذوقِ جمال کا
تنہائیوں میں جان سے ہارے نہیں ابھی

نظریں چرائے کوئی لگائے جگر کو ٹھیس
کہتا ہے کون اہلِ کرم کی تلاش ہے
جو رنج مسرتوں کے نہ اب راس آئیں گے
عشقِ ستم نصیب ہیں غم کی تلاش ہے
مائل ہر ایک رنگ پہ ہے وحشتِ جنوں
شاید کسی حسین صنم کی تلاش ہے!

گوردھن بھارتی
(ترجمہ)
رئیس احمد

(سندھی کہانی)

ریت کا کنول

وہ اچانک —— چونک کر اٹھ بیٹھا، اس نے اطمینانِ خاطر کے لیے گہری سانس لی، رابیل کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک —— اس کے دماغ پر چھانے لگی۔ کالے بالوں کی ایک نرم لٹ اس کی پلکوں کو چھوتی ہوئی اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔

"آج ضرور کوئی غیر معمولی حادثہ ہوگا" وہ دو چار مرتبہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔

باہر تیز آندھی کے ساتھ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اندر کمپارٹمنٹ میں مسافر چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے۔ گاڑی تیز ہوا کو چیرتی اور چیختی ہوئی دوڑ رہی تھی۔

"آج ضرور کوئی غیر معمولی حادثہ ہوگا" اس کو اس بات کا کامل یقین تھا۔ گزشتہ دس بارہ سال سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس میں کوئی ایسی 'غیبی طاقت' مدغم ہو گئی ہے کہ جس کی مدد سے اسے مستقبل کے انجانے واقعات کی مبہم سی آگاہی ہو جاتی ہے۔ اچانک اسے کچھ مبہم سے اشارات ملتے جن کا مطلب وہ بروقت نہیں سمجھ پاتا لیکن اس حادثہ کے رونما ہونے کے بعد اسے صحیح اندازہ ہو جاتا کہ مبہم اشارات کا کیا مطلب تھا۔

اچانک گاڑی کی رفتار قدرے کم ہوئی اور وہ ٹھہر گئی۔ اپنا مختصر سا بستر لپیٹ کر اس نے بغل میں دبایا اور اٹیچی ہاتھ میں لیے وہ گاڑی سے اتر پڑا۔ کوئی معمولی سا اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم پر ٹین شیڈ کے نیچے کھڑا ہو کر وہ سوچنے لگا —— میں یہاں کیوں اتر پڑا، مجھے تو آگے جانا ہے۔

ٹھیک اسی وقت ایک چنگاری سی تاریکی کو چیرتی ہوئی اس کے سامنے سے اڑ گئی —— ایک اور مبہم اشارہ —— اس کی ساری جوانی بھٹکتے ہوئے گزری تھی، اس کے من کی بھٹک اس کے تن کو بھی بھٹکا رہی تھی۔ ایک عجیب الجھن کی سالوں سے اسے مجروح کیے ہوئی تھی، اس کو گھلا رہی تھی۔ . . . اور آج وہ اسی الجھن میں بھٹکتے ہوئے اس انجان اسٹیشن پر اتر پڑا تھا۔

گاڑی چلی گئی، وہ سر جھکائے اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا! —— کنول کی کلی کی طرح معصوم اور سادہ بچپن . . . . . .

بچپن ہی سے اسے پھولوں سے محبت تھی خصوصاً کنول کے پھولوں سے۔ اور جوانی میں جب جیتی جاگتی کنولنی کو اس نے

دیکھا تو اس کو کئی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ اس کا پہلا پیار تھا۔ اس لیے اس پیار کی جڑیں بھی کنول کی طرح نازک اور گہری تھیں۔ چاندنی راتوں کے سائے میں اس پیار نے کئی وعدے کیے۔ ہمیشہ ساتھ نبھانے کے وعدے لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی اسے ہمیشہ ایک خدشہ سا رہتا۔ . . . . اور ساون کی ایک رات میں جب وہ کنولنی کو گھر تک پہنچا کر اپنے ہاسٹل کی طرف لوٹ رہا تھا تو راستے میں اچانک برسات ہو جانے کی وجہ سے اسے آج ہی کی طرح ایک ٹین شیڈ کے نیچے پناہ لینی پڑی تھی ـــــ وہاں کھڑے کھڑے اچانک اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے ایک کنول کا پھول تیز ہوا اور بارش کی پھواروں میں اڑتا ہوا اس کے ہاتھوں میں آ پڑا ہو لیکن جیسے ہی اس نے اس کنول کو مضبوطی سے اپنی مٹھیوں میں جکڑنے کی کوشش کی تو وہ کنول ریت کی طرح اس کی انگلیوں کے پوروں میں سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا ـــــ وہ سر پا ؤں تک کانپ اٹھا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ کنولنی بھی ریت ہی کی طرح اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔

کنولنی کے والد وکیل تھے۔ اسے وکیلوں سے نفرت تھی، پھر بھی دوسرے دن وہ ان سے ملنے گیا۔ ان سے اپنا تعارف کرایا ۔"میں رتیش ہوں، ایم اے (فائنل) میں پڑھتا ہوں، میرے والد ایک شریف اور عزت دار ماسٹر ہیں . . "

گفتگو بالکل مختصر ہوئی۔ اس نے وکیل صاحب کو اپنے دلی ارادے سے آگاہ کیا۔

"مجھے کنولنی سے محبت ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق حیات بننا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ رشتہ پسند ہے، کنولنی کو بھی یہ رشتہ پسند ہے۔"

"ہوں!" وکیل صاحب نے چشمے کے موٹے شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے کہا ۔" اچھا تو تمھیں یہ رشتہ پسند ہے لیکن جناب! مجھے یہ رشتہ قطعی پسند نہیں . . . . . بس اب آپ جا سکتے ہیں۔"

وہ ایک لمحہ تو بالکل گم صم وکیل صاحب کو تکتا رہا۔ پھر ایک پرانے مریض کی طرح آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ اسے پہلے ہی سے اس کا خدشہ تھا۔ ایک دن پہلے ہی اس کی غیبی طاقت نے ایک ایسا ہی اشارہ بھی کیا تھا ـــــ ایسا ہونا ہی تھا اور اب ہو ہی چکا ـــــ اس کے بعد کی کہانی نہایت درد انگیز ہے۔ اس نے پڑھائی نا مکمل چھوڑ دی اسے وہ شہر بھی چھوڑنا پڑا۔ رخصت ہوتے وقت اداس کنولنی نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلایا تھا ۔" مجھے صرف تم سے محبت ہے اور زندگی بھر صرف تمھیں سے محبت رہے گی، میں کسی اور سے محبت نہ کر سکوں گی۔" لیکن اسے کامل یقین ہو چکا تھا کہ وہ ریت کا کنول ہے وہ جتنے زور سے اسے اپنی مٹھی میں جکڑنے کی کوشش کرے گا وہ اتنے ہی زور سے اس کی انگلیوں کے پوروں میں سے نکل جائے گی۔

اس کے بعد رتیش نے کئی ملازمتیں اختیار کیں کئی ملازمتیں چھوڑیں، وہ مختلف شہروں اور دیہاتوں کی خاک چھانتا پھرا، بہت سے لوگوں سے ربط ضبط ہوا۔ اس کی زندگی کے اس دور میں کتنے ہی عجیب واقعات رونما ہوئے جن کے مبہم سے اشارات اسے پہلے ہی مل جاتے اور آج بھی . . . .

. . . . ایسے ہی اشارات کی وجہ سے وہ اس معمولی سے اسٹیشن پر رات کے اس غیر مناسب وقت میں اتر

پڑا تھا۔ کیوں؟ کس لیے؟ اس کا اسے بھی پتہ نہ تھا۔

سر کو ایک جھٹکا دے کر اس نے اٹیچی اور بستر اٹھایا اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر آ کھڑا ہوا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے بڑی لاپرواہی سے پوچھا "یہ کونسا اسٹیشن ہے؟"

اسٹیشن بابو نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "مدار اسٹیشن، آپ کو کس کے پاس جانا ہے؟"

"مدار" وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس نے یہ نام سنا تو تھا مگر کب؟ کہاں؟ اچانک اس کے متفکر چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی۔ رابیل کے پھولوں کی مہک اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ مبہم اشارات کا مطلب واضح ہو گیا۔ اس نے فوراً اس سے پوچھا "کچھ سال پہلے ڈاکٹر گوپال یہاں کے سینی ٹوریم میں ملازم تھے؟"

"وہ اب بھی سینی ٹوریم میں ملازم ہیں۔"

"سچ" اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ "ان کا بنگلہ"

"وہ سامنے . . . ریل کی پٹری کے اس پار . . ."

اٹیچی اور بستر اسٹیشن بابو کے کمرے میں چھوڑ کر وہ بنگلے کی جانب بڑھا۔ برسات اور آندھی نے بڑا بھیانک روپ اختیار کر رکھا تھا لیکن اسے جیسے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس کے دماغ پر صرف رابیل کے پھولوں کی خوشبو چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر گوپال کی تصویر۔

ڈاکٹر گوپال چار پانچ سال پہلے اسے بمبئی کی ایک لوکل ٹرین میں ملا تھا۔ دونوں کی یہ اتفاقیہ ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ دونوں کو پھولوں سے بے حد محبت تھی۔ ایک کو کنول کے پھولوں سے اور دوسرے کو رابیل کے پھولوں سے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ دونوں اس وقت اکیلے تھے۔ یا یوں کہئے کہ کنوارے تھے۔ دونوں ملازمت کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ گوپال حال حال میں کناڈا سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر کے بھارت لوٹا تھا۔ اس کے بھارت لوٹنے کی وجہ تھی اس کے والد کا اچانک انتقال۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ عرصہ بھارت میں رہ کر وہ واپس اسٹیٹس (کناڈا) چلا جائے گا لیکن حالات نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔ مجبوراً وہ بمبئی کے کسی معقول اسپتال میں ملازمت کے لیے تگ و دو کرنے لگا۔

دونوں ہی ہر شام گیٹ وے آف انڈیا گھومنے جاتے۔ گوپال ہر روز وہاں پر بیٹھی ہوئی بوڑھی مالن سے رابیل کے پھول خریدتا۔ ایک مرتبہ رمیش نے اس سے پوچھا "تمہیں رابیل کے پھولوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ وہ سفید ہیں، دودھ جیسے سفید . . ."

"سفید تو کنول کے پھول بھی ہوتے ہیں۔"

"لیکن ان میں رابیل جیسی بھینی بھینی مہک کہاں۔"

رمیش نے اس سلسلے میں زیادہ بحث مباحثہ نہ کیا۔ رابیل کی ٹھنڈی میٹھی خوشبو کا اسے بھی احساس تھا۔ کچھ عرصہ بعد رمیش

کو ایک ہوٹل میں کیشیر کی ملازمت مل گئی اور پھر جلد ہی گوپال بھی ملازمت کے سلسلے میں مدارا چلا آیا۔
کچھ عرصہ تک دونوں دوستوں کے درمیان سلسلۂ مراسلت قائم رہا۔ ایک دن گوپال نے رمیش کو ایک نہایت طویل اور ... خط لکھا جس کے آخر میں تحریر تھا "شاید میں جلد ہی شادی بھی کرلوں، اس موقعہ پر تو تمھیں آنا ہی پڑے گا۔"
اس جملے کی ابتدا میں لفظ "شاید" پڑھ کر رمیش اپنی ہنسی نہ روک سکا تھا۔ "بھلا شادی.... اور شاید....
لیکن گوپال کی شادی طے ہونے اور دعوت نامہ ملنے سے پہلے ہی رمیش اچانک بمبئی چھوڑ کر بنگلور چلا گیا۔ بنگلور سے وہ ناگپور گیا اور ناگپور سے گوالیار ــ اور اس کے بعد وہ جانے اور بہت سے شہروں میں بھٹکتا رہا۔ بالآخر سال بھر بعد وہ دلی کے ایک خانگی اسکول میں ماسٹر ہو گیا........ اور اب وہ ڈاکٹر گوپال کے بنگلے کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس کے بھیگے ہوئے کپڑوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

٭ ٭ ٭

باہر زور سے بادل گرج اور برس رہے تھے اور اندر ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر گوپال کے قہقہے گونج رہے تھے۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اس نے کہا "رمیش! تم بلاشک کسی دماغی مرض میں مبتلا ہو یا ایک بیہودہ وہم تمھارے دماغ پر چھا گیا ہے....."
بھیگی ہوئی قمیص اتارتے ہوئے رمیش نے لاپرواہی سے کہا "نہیں گوپال یہ نہ تو کوئی دماغی مرض ہے اور نہ کوئی بیہودہ وہم۔ یہ حقیقت ہے ایک ٹھوس حقیقت۔"
"اس کا مطلب ہے کہ آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا تمھیں پہلے ہی پتہ چل جاتا ہے۔"
"اکثر" رمیش کی آواز میں کامل یقین تھا "مسافروں سے بھرے ہوئے بند کمپارٹمنٹ میں اچانک رات کی پھولوں کی خوشبو کا احساس کیسے ہوا؟"
"کیا تمھیں پہلے یہ خیال نہ آیا تھا کہ تم مدار اسٹیشن کے قریب آ پہنچے ہو، اور میں یہاں کے سینی ٹوریم میں کام کر
"نہیں گوپال! مجھے نہ تو مدار اسٹیشن سے نزدیک ہونے کی خبر تھی اور نہ تمھاری یاد....."
"اگر ایسا ہی ہے تو بالوں کی لٹ اور راکھ ہوئی چنگاری سے تم کیا سمجھتے ہو؟"
"یہی تو مشکل ہے کہ ان اشارات کا مطلب بروقت سمجھ میں نہیں آتا۔"
اسی وقت باہر برآمدے میں کسی کے بھاری قدموں کی آہٹ ہوئی، اچانک دروازہ کھلا اور چپراسی ح کی ابیچی اور بستر لے کر کمرے میں داخل ہوا۔
"ڈاکٹر صاحب! قریبی اسٹیشن کے پاس گاڑی کا حادثہ ہو گیا ہے۔"
ڈاکٹر گوپال چونک پڑا، وہ معنی خیز نگاہوں سے رمیش کو دیکھنے لگا۔
"چنگاری کا مطلب شاید یہی تھا" رمیش بڑبڑایا۔

ڈرائینگ روم میں چند لمحوں کے لیے صرف آندھی اور برسات کی آواز گونجتی رہی۔

"ڈاکٹر تھامس نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔" حمید بولا۔

"سینی ٹوریم کا تمام اسٹاف ضروری سامان کے ساتھ جائے واردات پر پہنچنے کے لیے تیاری کر رہا ہے"

"تم چلو حمید، میں ابھی آتا ہوں" ڈاکٹر گوپال کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی۔

حمید کے جانے کے بعد وہ چند لمحے چپ چاپ رمیش کو گھورتا رہا۔ رمیش نے اٹیچی کھول کر کپڑے نکالے اور کپڑے بدل کر وہ بغیر کچھ کہے سنے آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر گوپال ڈرائنگ روم کے بغل والے کمرے میں گیا اور تقریباً دس منٹ میں تیار ہو کر واپس ڈرائینگ روم میں لوٹ آیا۔ بولا "معاف کرنا رمیش مجھے اچانک باہر جانا پڑ رہا ہے، مگر میں کوشش کر کے جلد واپس آجاؤں گا۔ یہاں تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ اگر تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بغیر کسی تکلف کے میری مسز سے مانگ لینا۔" یہ کہہ کر اس نے بڑے پیار بھرے انداز میں آواز دی "شیلو!"

ایک چھریرے بدن کی خوبصورت عورت ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی، رمیش نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا — یہ شیلو تو اس کی کنولنی تھی۔

"یہ ہیں میرے دوست رمیش اور یہ میری مسز" گوپال نے دونوں کو متعارف کراتے ہوئے کہا۔

نمسکار کے لیے دونوں کے ہاتھ اٹھے لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

باہر سے حمید کی آواز آئی "ڈاکٹر صاحب! . . ."

"دیکھو شیلو میرے دوست کو کسی شکایت کا موقع نہ ملنے پائے، میں کوشش کر کے جلد ہی لوٹ آؤں گا۔"

"اچھا رمیش . . . ." اور ڈاکٹر گوپال چلا گیا۔

. . . .

مسز شیلا گوپال . . . . نہیں کنولنی پتھر کی مورت کی طرح کھڑی رہی اور رمیش خاموشی سے اسے دیکھتا رہا — نرم بالوں کی لٹ اس کی آنکھوں کے سامنے جھولنے لگی اور وداع کے وقت کہے ہوئے الفاظ اسے یاد آئے — "مجھے صرف تم سے محبت ہے اور زندگی بھر صرف تمھیں سے محبت رہے گی، میں کسی اور سے محبت نہ کر سکوں گی۔"

رمیش کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ رابیل کے پھولوں کی خوشبو . . . . اڑتی ہوئی چنگاریں . . . . نرم بالوں کی لٹ . . . . . . سب حقیقت ہی تو ہیں۔ اس کی غیبی طاقت نے اسے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ وہ من ہی من ڈاکٹر گوپال کے الفاظ پر ہنسنے لگا — "اونھ، دماغی مرض . . . . . بیہودہ وہم . . . کیا ڈاکٹر گوپال سے یہ ملاقات، ریل کا حادثہ اور کنولنی کا اس کے سامنے موجود ہونا، بیہودہ وہم تھا، دماغی مرض تھا . . ."

اس نے ایک بار پھر کنولنی کو دیکھا — وہی کالج والی کنولنی تھی، اس میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہو پائی تھی، وہی قد، وہی جسم وہی رنگ، وہی روپ — ایک عجیب سا یقین اس کے دل میں جاگ اٹھا — مجھ میں واقعی کوئی غیبی طاقت ہے

جس سے میں مستقبل کی تاریکی میں جھانک سکتا ہوں لیکن وہ طاقت ابھی مکمل نہیں' اس کے اشارات بھی مبہم سے ہیں۔

"کنولنی۔۔۔۔"!

پتھر کی مورت میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔

"کنولنی۔۔۔۔"!

"آپ بہت تھکے ہوئے ہیں آرام فرمایئے۔" ہونٹوں کے ساتھ کنولنی کے قدموں میں بھی جنبش ہوئی اور وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رمیش اپنے دل میں ہنستے ہوئے بولا "میں سب جانتا ہوں کنولنی، یہ بے رُخی بناوٹی ہے۔" اس نے اٹھ کر ڈرائنگ روم کے برآمدے کا دروازہ بند کیا، اور پھر آرام کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگا۔۔۔ "آج کی رات کتنی پرفسوں ہے، سب کچھ عجیب، سب کچھ انوکھا۔"

"۔۔۔۔۔ اور کنولنی کی مجھ سے محبت۔" ۔۔۔ اس نے گویا اپنے آپ سے پوچھا۔ اس کی غیبی طاقت نے فوراً جواب دیا۔۔۔ "وہ تمھیں سے محبت کرتی تھی اور اب بھی تمھیں سے محبت کرتی ہے، وہ کسی اور سے محبت نہ کر سکے گی۔"

"تو پھر وہ اس طرح منہ پھیر کر کیوں چلی گئی؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ جلد ہی لوٹ آئے گی" اسے جواب ملا۔

وہ آنکھیں موند کر انتظار کرنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے ناامیدی کے بجائے اس کی امید بڑھتی گئی۔

"ہاں! اس کی غیبی طاقت کبھی غلطی نہیں کر سکتی، کنولنی کو اس کے پاس آنا ہی ہوگا۔"

گھڑی نے بارہ کے گھنٹے بجائے، اچانک ڈرائنگ روم اور اس کے بغل والے کمرے کے بیچ کا دروازہ کھلا اور کنولنی کی مضطرب آواز اس کو سنائی دی۔

"کیا آپ کو نیند نہیں آتی؟"

"آپ بھی تو ابھی تک جاگ رہی ہیں۔"

"براہ کرم بتی بجھا کر سو جایئے، آپ کو ضرور نیند آجائے گی۔"

"آپ کے کمرے کی بتی تو بجھی ہوئی ہے لیکن آپ کو نیند۔۔۔۔"

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی کنولنی نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ گودبایا۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا چھا گیا۔ کنولنی جس طرح یک بہ یک آئی تھی اسی طرح اچانک چلی گئی۔ بیچ کا دروازہ کھلا رہا۔ رمیش دل ہی دل میں ہنسا۔ کنولنی کو مضطرب دیکھ کر اسے دکھ نہیں بلکہ یک گونہ راحت کا احساس ہوا۔

"کنولنی کا اضطراب فطری ہے۔" وہ سوچنے لگا۔

"آج کئی سالوں بعد اس کا سویا ہوا پرانا پیار جاگ اٹھا ہے۔"

"اسے نیند کیسے آئے گی؟ وہ تو گویا آگ میں سے گزر رہی ہے۔ آگ جو اس اس سے دور ہے لیکن پھر بھی اس کی رگ رگ کو جلا رہی ہے۔ بیچاری کنولنی! نہ جانے کن مجبوریوں کے تحت اسے گوپال سے شادی کرنی پڑی ہوگی مگر کیا اس نے شادی کا سکھ حاصل کیا ہوگا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں قطعی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک اور بات ۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں ابھی اس کی گود بھری نہیں ۔ ۔ ۔ ایسا کیوں؟ اتنے سالوں کے بعد بھی ایسا کیوں؟ کیا ڈاکٹر گوپال کے ساتھ اس کی شادی محض ایک دکھاوا ہے؟"

اندھیرے میں آنکھیں موند کر رمیش نہ جانے کتنی دیر تک یوں ہی سوچتا رہا۔ پھر ایک دم وہ اٹھ کر کنولنی کے بغل والے کمرے کے دروازے تک گیا۔ دروازہ کھلا پڑا تھا۔ مگر وہ اندر نہ جا سکا۔ نہ جانے کیوں اس کے قدم وہیں جم گئے۔ وہ بالکل دم سادھ کر بڑے محتاط انداز میں کنولنی کے کمرے کی فضا کی آہٹ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے ایسا گمان ہوا کہ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہی ہے اور بہت گہرا سانس لے رہی ہے۔ ممکن ہے وہ گہری سانس نہ ہو اس کی دبی ہوئی سسکیاں ہوں، میں یہاں کیوں آیا؟" وہ اپنے آپ کو جھنکارنے لگا" ایک سکھی عورت کے آرام و آسائش میں مخل ہونے کا مجھے کیا حق ہے؟" لیکن اسی لمحہ اس کی غیبی طاقت اسے ڈھارس دینے لگی" اس میں تمہارا کیا قصور؟ یہ سب از خود ہوا ہے اور ایسا ہونا ہی تھا"

وہ واپس آرام کرسی پر لیٹ گیا ـــــ کنولنی کی پریشانی اور اضطراب کا خیال کرتے ہوئے اسے اپنے آپ اور اپنی پرانی محبت پر فخر ہونے لگا۔ کنولنی کی اضطرابی کیفیت کا وہ جتنا تصور کرتا تھا اتنی ہی اسے مسرت ہوتی تھی، ایک فاتحانہ مسرت۔

گھڑی نے چار گھنٹے بجائے وہ چونک اٹھا۔ باہر آندھی میں اب اتنا زور نہ تھا لیکن بارش مسلسل ہو رہی تھی اور ہوا کے جھونکے دبی دبی سی سسکیاں بھر رہے تھے۔

"کنولنی تڑپ تڑپ کر نڈھال ہوگئی ہے" اس کی غیبی طاقت نے آہستہ سے اس کے کانوں میں کہا" اب اس کی آنکھوں سے بے بسی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں"

رمیش مسکرایا ـــ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی بالوں کی ایک لٹ گویا اس کے رخساروں سے چھوگئی۔ اس کی نس نس میں ایک کسک سی پیدا ہوئی، ایک پریشان کرنے والی گدگدی سی ـــــ کنولنی کے آنسوؤں کے بارے میں سوچ کر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ آج کنولنی کے اضطراب کا ہر خیال اسے نئی راحت بخش رہا تھا۔

اس کے سوچنے کا سلسلہ جاری رہا ـــــ اب وہ تکیے میں منہ چھپا کر سسک رہی ہوگی، آہ! پیار کا دکھ بھی کتنا بھیانک دکھ ہے۔ دل کے نازک پردوں میں جیسے کانٹا سا الجھ گیا ہو، اور ہلکے سے کھنچاؤ پر سارا جسم بے چین مچھلی کی طرح تڑپ اٹھا ہو"۔ ۔

گھڑی نے پانچ کے گھنٹے بجائے۔ بارش اب ہلکی پڑ گئی تھی۔ اس نے پھر کنولنی کا تصور کیا۔ ایک تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مرجھایا ہوا چہرہ، بھیگی ہوئی آنکھیں، اداس اور الجھی ہوئی نگاہیں۔

کسی غیبی اثر کے تحت چلتا ہوا وہ پھر بغل والے کمرے کے دروازے تک آپہنچا۔ نہایت آہستگی سے دروازے پر لٹکا ہوا ریشمی پردہ ہٹا کر اس نے اندر جھانکا۔ کمرے کی بائیں طرف دیوار سے پیٹھ لگا کر وہ پلنگ پر بیٹھی تھی، قریبی کھڑکی سے صبح کی ۔ ۔ ۔ ۔ دھندلی روشنی اس کے اداس چہرے پر پڑ رہی تھی۔ پریشانی اور اضطراب کی وجہ سے وہ واقعی بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ اس کے رخساروں پر سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل ویسی ہی تصویر ۔ ۔ ۔ ۔ جس کا تصور کچھ لمحے پہلے اس نے کیا تھا۔

کمرے کے بیچ میں ایک گول تپائی پر ایک نہایت خوبصورت رنگین گلدستہ رکھا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے پھول اور پتے سجائے گئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ان پھولوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا بالکل ویسے جیسے کالج کے ایام میں وہ کنولنی کے نرم ہونٹوں کو چھوا کرتا تھا۔ اس نے گلدستہ کی نرم پتیوں پر اپنا ہاتھ پھیرا بالکل ویسے جیسے وہ کنولنی کے نرم بالوں پر پیار سے اپنا ہاتھ پھیرتا تھا۔

"کنولنی ۔ ۔ ۔ ۔"

کنولنی کانپ اٹھی۔

"کنولنی تمام رات اندھیرے کے سینے میں طوفان تڑپتا رہا ہے، فضا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو برستے رہے ہیں ۔ ۔ ۔"

وہ گم صم اس کا منہ تکتی رہی۔

"کنولنی! تمھارے سینے میں بھی تمام رات ایک طوفان مچلتا رہا، تمھاری آنکھوں سے بھی برسات ہوتی رہی"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

رمیش کو اچانک خیال آیا کہ گلدستہ میں سے ایک پھول نکال کر کنولنی کے بکھرے ہوئے بالوں میں لگا دے بائیں ہاتھ میں گلدستہ لے کر دائیں ہاتھ سے اس نے اس میں سے ایک خوبصورت پھول نکالا۔

"کنولنی میں تمام رات تمھیں نہ دیکھتے ہوئے بھی تمھیں دیکھتا رہا ہوں"

"کیا مطلب" بڑی مشکل سے کنولنی کے ہونٹ کھلے۔

"مجھ میں ایک غیبی طاقت ہے کنولنی" اس کی آواز میں یقین اور فخر تھا ۔ ۔ ۔ "جس کی مدد سے میں انجانے کو جان سکتا ہوں"

"میں کچھ بھی سمجھ نہ پائی"

"کیا یہ سچ نہیں کہ تم تمام رات ایک پل کے لیے بھی آنکھیں نہ جھپکا سکیں"

"سچ ہے"

"کیا یہ سچ نہیں کہ تم تمام رات بستر پر تڑپتی رہی ہو؟"
" بالکل سچ ہے"
"کیا یہ سچ نہیں کہ تم گزشتہ گھنٹے بھر سے بے بس ہو کر رو رہی ہو۔"
"سچ ہے، سب سچ ہے" کنولنی کی سسکیاں پھوٹ پڑیں " میں کیوں کر نہ جاگتی رہتی، میں کیوں نہ تڑپتی رہتی، میں کیوں نہ بے بس ہو کر روتی رہتی جب کہ ایسی تیز آندھی اور بارش میں مجھے تنہا چھوڑ کر میرا شوہر جانے واردات پر گیا ہوا ہے اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔۔۔"
رمیش سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ گلدستہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا اور اس کی ساری رنگینی چکنا چور ہو گئی۔

اتحادی کاشت ـ ایک طرزِ زندگی

غذائی پیداوار بڑھانے کی مہم میں اتحادی کاشت ایک اہم ہتیار ہے۔ یہ مقامی ذریعوں اور وسیلوں کو انتہائی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کرنے کے لیے مل جل کر کام کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

اتحادی کاشت کی ترقی کے لیے ریاست کے تیسرے پانچسالہ منصوبے میں (۴۰) لاکھ روپے کی گنجائش مہیا کی گئی ہے۔

اتحادی کاشت کی امداد باہمی انجمنیں حکومت سے حسب ذیل امدادیں حاصل کرنے کی مستحق ہیں۔

حکومت پائلٹ رقبوں میں قائم ہونے والی ہر انجمن کو سرمایہ حصص کے تحت (۲۰۰۰) روپے تک رقم فراہم کرتی ہے۔ گودام کی تعمیر کے لیے (۵۰۰۰) روپے کی امداد دی جاتی ہے۔

اتحادی کاشت، سوشلسٹ سماج کی منزل کی طرف آگے بڑھتا ہوا قدم ہے

جاری کردہ

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

اشتیاق پچھرایونی

پاگل

چھریرے جسم کی وہ ایک معمولی سے خط و خال کی لڑکی تھی۔ گندمی رنگ۔ اُلجھے اُلجھے پریشان سے بال اور بے نور سی آنکھیں، نہایت خالی خالی اور جذبات سے عاری، تصورات کے ہنگاموں سے پرے ایسی خاموش خاموش سی نظریں جن کی گہرائیوں میں جیسے کبھی کسی دلکش خواب نے انگڑائی نہ لی ہو۔ جانے کیوں پھر بھی اس کی وہ سونی سونی اور ویران سی آنکھیں اکثر میرے منجمد سے خیالات کو پگھلا دیتیں۔ برف پانی کی شکل اختیار کر لیتا اور وہی پانی مختلف زاویے بناتا ہوا مختلف لہروں کی شکل میں پہاڑی نالوں کے ذریعہ بہتا ہوا میدان کی ہموار سطح پر کسی قدر پُرسکون رفتار سے بہنے لگتا اور پھر ایک ـــــ ایسا بھی وقت آتا جب اس ندی کی زندگی آخری سانس لیتے لیتے بالکل ہی اپنی زندگی اور حیات کی ولولہ خیزیوں کو کسی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کے سپرد کر دیتی۔ اس کی وہی خموش خموش اور چپ سی نظریں اکثر مجھے خیالات کے گھنے سایوں میں الجھا دینے کے لیے کافی ہوتیں۔ آخر وہ ہماری کلاس فیلو ہوتے ہوئے بھی اسقدر ہم سب سے الگ تھلگ کیوں رہتی ہے۔ اسے قہقہے کیوں پسند نہیں؟ وہ زندگی کی اداس اور سنسان راہوں پر ابھریں لبوں کی شوخ مسکراہٹیں بکھیر کر دنیا سے پیار کیوں نہیں کرتی؟ تاکہ سونی سونی اور اداس راہیں مسکرا اٹھیں، گنگنا اٹھیں؟ آخر اس کی وجہ؟ اور آہستہ آہستہ یہی الجھن میرے دماغ اور شعور میں اپنا ایک مستقل بناتی چلی گئی۔

نینی جہاں سے اور جس طرف سے بھی گزرتی چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں اور پھر ان تمام چہ میگوئیوں کا سلسلہ ایک مختصر سے لفظ پر آ کر ختم ہو جاتا۔ "پاگل" ـــــ نہ جانے کیوں لوگ اس سے بات کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ بات چیت کرنے کے متمنی لوگ بھی اس سے بچتے اور کھوئے کھوئے نظر آتے۔ لڑکیاں اس سے کتراتیں ـــــ جیسے وہ انسانوں کی بستی میں انسانوں کا بھیس بدل کر کسی اور ہی دنیا سے یہاں آ بسی ہو۔

جمال شامتِ اعمال کا مارا ایک دن ہمت کر کے اس کے پاس پہنچ گیا۔ بڑی متانت اور سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔ لیکن یہ سلسلۂ کلام اسے راس نہیں آیا۔ اور نینی کے لہجہ نے طوفان کی سرکش موجوں کا روپ اختیار کر لیا۔

"آپ کو بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"بہتر یہی ہے کہ آگے بڑھ جاؤ۔"

اِدھر اُدھر خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں مصروف لڑکے لڑکیاں حیرت کا نشان بن گئے۔ اس مسئلہ کو مختلف انداز پر سوچنے

کے باوجود کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔ جب آدمی کی ذہنی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور اس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہوتا، تو پھر وہ ایسے ہی پست اور مہمل جوابات کے سائے میں اپنی خودی کی تسکین کے لیے پناہ ڈھونڈتا ہے جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا
چند بے ہنگم آوازیں فضا میں ابھریں۔
"پاگل ہے!"
اس دن کے واقعہ کو میں انتہائی کوشش کے باوجود اپنی ذہنی سطح سے مٹانے میں یکسر ناکام رہا ہوں۔ معمولی سی بات تھی۔ پروفیسر کچھ لیٹ ہو گئے تھے۔ چند طلبا کسی مسئلے پر الجھ پڑے تھے۔ بحث مباحثہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ دو ایک بار نینی نے انھیں دیکھا نگاہیں خالی تھیں۔ یہی ویران آنکھیں آہستہ آہستہ شعلہ بار ہو اٹھیں "سائیلنٹ پلیز اٹ از کلاس روم آئی تھنک"!
کچھ لمحوں کے لیے کلاس میں ایک زلزلہ سا آگیا اور فضا "پاگل" جیسی ہلکی سی بازگشت کے ساتھ پھر معمول پہ آگئی، مگر یہ واقعہ میرے احساس پر ضربیں لگانے کے لیے کافی تھا۔
اس دن حسن اتفاق سے میں کلاس میں نینی کی سیٹ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ ورما صاحب کا لکچر شروع ہو چکا تھا۔ مگر نینی اپنی ہی مصروفیات میں گم تھی۔ بے ترتیب سی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ نہ معلوم ان لکیروں کو وہ کس شکل میں ترتیب دینا چاہتی تھی۔ ان میں کس جانی پہچانی صورت کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی، اور پھر نہ جانے کیوں انھیں مٹا دیتی، فنا کر دیتی۔ اس کی فطرت کا وہ تخریبی پہلو نمایاں ہو اٹھتا جو غالباً اس کی زندگی میں اب پوری طرح رچ بس چکا تھا۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ نئی نئی تصویروں کے خاکے بنتے رہے مٹتے رہے ابھرتے رہے اور ڈوبتے رہے۔ لیکن شاید مجبور تھی وہ ان خاکوں میں اپنا خون جگر شامل کرنے سے۔ بہت ممکن ہے اس کی یہی مجبوری اسے لکیروں کو فنا کرنے پر اکساتی رہی ہو۔
نہ جانے کس پنہاں جذبے کے زیر اثر میں بھی اس کی محویت کا ساتھی اور شریک کار رہا۔ ورما صاحب کے لکچر کا ایک ایک لفظ میرے ذہن و شعور کی سرحدوں سے دور بھاگتا جا رہا تھا۔ میرے خیالات کا مرکز صرف نینی تھی۔ آخر وہ یہ سب کیوں کرتی ہے؟ کیا وہ موجودہ زندگی اور اس کی ہنگامہ آرائیوں سے پناہ چاہتی ہے؟ ان ہلچلوں اور ولولہ خیزیوں سے اپنے آپ کو علاحدہ رکھنے کے لیے کوشاں ہے؟ یہ مبہم مبہم بے ترتیب نقوش اور لکیریں آخر ہیں کیا؟ ماضی میں کیا اس نے بھی کسی کو اپنے دلی جذبہ کی پوری صداقت کے ساتھ چاہا تھا — کیا وہی ماضی اب اس کے لیے عذاب بن چکا ہے جس کی زد میں آکر وہ حال کو بھی فراموش کر بیٹھی ہے۔ وہ موجودہ رنگینیوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کر لیتی؟ اگر یہ سچ ہے تو مستقبل اور بھی زیادہ خوفناک ہوگا — اسی کشمکش میں پیریڈ ختم ہو گیا۔ مگر خیالوں کی آوارگی اسی طرح جوں کی توں قائم تھی۔
نہ جانے کیوں اس دن میرے ذہن میں بھی کسی چور دروازے سے ایک موہوم سے خیال نے انگڑائی لینا چاہی —
کونسا خیال؟ —— وہی اس خیال کے تانوں بانوں سے اکثر و بیشتر طلبا اور طالبات اپنے ذہن و دماغ کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچایا کرتے ہیں۔
نینی اپنی نیوی بلو شیور لیٹ میں آتی۔ کلاس اٹنڈ کرتی، اگر کوئی کتاب لینا ہوتی تو لائبریری کی مختصر سی راہ

طے کرتی ورنہ اس کی پھر وہی کار اور روانگی ـــــ یہ تھی اس کالج کی زندگی ـــــ نہ کالج میں کسی سے بات چیت اور نہ ہی کسی قسم کے تعلقات ـــ کوئی اس کی دوست تھی نہ غم گسار ـــــ سنا ہے چند سال پہلے وہ بھی بڑی سوشیل تھی، بڑی چنچل تھی۔ قہقہے اور وہ بھی بدمست قہقہے، چہلیں اور ہنسی مذاق اس کی زندگی تھی۔

مگر نہ معلوم اب وہ کیوں اس حد تک بدل چکی تھی۔ کاش کوئی بتا سکتا کہ اس تبدیلی کو لانے والا کون تھا؟ ہوسکتا ہے اب وہ کالج میں اس وجہ سے آتی ہو جیسے زندگی کی دور دراز مسافت بھی جلد اور بغیر کسی دلچسپی کے طے کرنا چاہتی ہو تاکہ زندگی اور دنیا کی خوشیاں کسی بھی عنوان سے اس کے دامن کو ملوث نہ کرسکیں۔ کون سمجھے ان تمام باتوں کو ـــ اور کس کے پاس وقت ہے یہ تمام باتیں جاننے کے لیے۔

اس دن وہ لائبریری میں بیٹھی ہوئی السٹریٹڈ ویکلی کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ چہرے کے مختلف اتار چڑھاؤ کے باعث اس کی صورت مختلف روپ دھار رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی پوری توجہ کے ساتھ کوئی چیز پڑھ رہی ہو میرے دل میں بھی ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کم از کم اس کے پیچھے سے جاکر یہ تو دیکھنا چاہیے کہ یہ کیا پڑھ رہی ہے۔ جذبہ کی شدت تیزی سے بڑھتی گئی اور اس حد کو عبور کرگئی کہ جہاں آدمی مجبور ہوجاتا ہے۔ میں نے دبے دبے قدموں سے چلتے ہوئے اس کی پشت کی جانب سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ عنوان تھا۔

"ORIGIN OF LOVE AND HATE"

اوہ تو یہ عنوان ہے جس نے غیر معمولی طور پر اس کی توجہ اپنے میں جذب کرلی ہے۔ میں واپس آکر چپ چاپ ذہن میں اندیشوں کا ہجوم لیے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کی حالت کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے ہاتھ اوراق کے سینے پر چلتے رہے۔ کبھی اس کی ویران آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک سی پیدا ہوجاتی جیسے شوق اور تحیر کے چراغ روشن ہوجائیں۔ کبھی نگاہوں کی مایوسی اس قدر شدید ہوجاتی جیسے کسی نے جلتی ہوئی قندیلوں کو پھونک مار کر بجھا دیا ہو، اور پھر ان میں سے ہلکی ہلکی ابھرتی ہوئی دھوئیں کی سرمئی لکیروں نے اجتماعی طور پر اس کے چہرے کو سیاہ کرنے کی ایک ناکام کوشش کی ہو۔

مضطرب دل، کمان کی لویں سرخ، آنکھیں اشک بار ـــ دھوئیں کی لکیریں ابھرتی رہیں اور ڈوبتی رہیں اور پھر جس طرح ان سرمئی سی لکیروں کے خاتمہ پر ماحول دوبارہ نکھر جاتا ہے کچھ اسی انداز میں اس کے چہرے پر پھر وہی کیفیت لوٹ آئی۔ مضمون غالباً ختم ہوچکا تھا کیوں کہ اس کے چہرے پر ایک نمایاں فرق دیکھا جاسکتا تھا۔ ہلکے ہلکے اس کے چہرے پر پھر وہی سنجیدگی کے لبادے پڑتے جارہے تھے۔ وہی اداس، ویران اور جذبات سے عاری آنکھیں یکایک اس کے ہاتھ رک گئے۔ غالباً پھر کسی عنوان کو اس نے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا تھا۔

اس کی سابقہ محویت پھر کسی ہولناک موڑ پر ٹھہر گئی۔ آنکھیں کسی قدر پھیلتی جارہی تھیں۔ چہرے کی تمتماہٹ بڑھتی جارہی تھی، آہستہ آہستہ اس کا جسم کانپنے لگا۔ سانسوں کی رفتار تیز سے تیز تر ہونے لگی۔

اور پھر ـــ لائبریری کی خاموش فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی. وہ ڈھیر ہوکر زمین پر آرہی. ایک ہلچل سی مچ گئی. تمام لوگ اس طرف کو بھاگے. میں بھی آہستہ آہستہ اس کی سیٹ کی جانب بڑھا. السٹریٹڈ ویکلی کھلا پڑا تھا اور اس کھلے ہوئے صفحہ پر جو نہ جانے کب سے نینی کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا. نئے شادی شدہ جوڑے مسکرا رہے تھے، اور ان میں سے ایک تصویر پر قلم سے آڑی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں. تصویر کسی نئے بیاہتا فوجی افسر کی تھی. نیچے نام لکھا تھا ـ راجندر! راجندر ـــ جو دو سال قبل اسی کالج سے ایم. اے کرکے فوج میں چلا گیا تھا. اور جس کے ساتھ اکثر و بیشتر نینی دیکھی جاتی رہی تھی.

ادھر ادھر سرگوشیاں ہو رہی تھیں.

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ آسیب زدہ ہے."

"میرا اندازہ غلط ہوا ہے کبھی. اب بھی کیا کسی کو اس کے پاگل ہونے میں شک ہے؟"

لیکن ـــ لیکن ـــ میرے ذہن اور شعور میں پاگل جیسے کسی لفظ کا دور دور تک گزر نہیں تھا ـــ صرف چند تصاویر کے لرزاں لرزاں سے نقوش اور نینی کے علاوہ کچھ نہ تھا ـــ!!!

ساجد اعظم

کشکول

سات سال کی عمر ہوگی۔

رنگ گورا گول سا چہرہ۔ چہرے پر تِل کے دھبے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئیں جن کے اندر بھوک کی پرچھائیاں اس کے تاریک مستقبل کا پتہ دیتی تھیں۔ بال خشک اور الجھے ہوئے ایک پتلی سی چوٹی جو ایک بوسیدہ میلی رِبن کے ساتھ گوندھی ہوئی۔ ہونٹ پتلے پتلے لیکن سوکھے ہوئے۔ میلا فراک، جگہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ پیروں پر دھول جمی ہوئی اور ننگی پنڈلیوں پر رِستے ہوئے پھوڑے۔

یہ اُس لڑکی کے خدوخال ہیں جو مجھے روزانہ چوراہے پر نظر آتی ہے۔ جو ہمیشہ ہر شخص کے آگے جس طرح ہاتھ پھیلا دیتی ہے اسی طرح میرے آگے بھی ہاتھ پھیلا دیتی ہے۔

ننھا مُنّا چھوٹا سا ہاتھ — یہ کہتے ہوئے۔

"اللہ آپ کو اچھا رکھینگا صاب۔ ایک روپیہ دے دو۔"

اور میرے آگے یہ پھیلا ہوا ہاتھ گویا کہہ رہا ہو۔

"بتاؤ بھوک کا خالق کون ہے۔ مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔ میں اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہوں۔"

اور جب میں ایک چھوٹا سا سکّہ اس ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہاتھ خاموش ہوگیا ہے۔ اور وہ اب کچھ نہیں کہے گا۔

دردمند لوگ اسے کچھ دے دیتے اور بے درد لوگ اسے دھتکار دیتے۔ وہ کبھی کبھی خاموشی سے فٹ پاتھ پر کھڑی ہو جاتی اور سڑک پر دوڑنے والی لمبی لمبی کاروں کو اس طرح کھڑی تکتی رہتی جیسے ان کاروں کو دیکھ کر وہ کوئی خواب بن رہی ہو۔ جیسے ان ساری لمبی کاروں کی مالک وہ خود ہو۔ کبھی کبھی وہ سجی سجائی دکانوں کے سامنے جاکر کھڑی ہو جاتی اور دکان کے اندر کی سجی ہوئی چیزوں کو بغور دیکھتی اور پھر اپنی مٹھی کھول کر اپنے پیسوں کو دیکھتی اور آگے بڑھ جاتی — اور پھر کسی راہ گیر کے آگے اس کا ہاتھ پھیل جاتا۔

"اللہ آپ کو اچھا رکھینگا صاب — ایک پیسہ دیدو۔"

اس معصوم اور ننھی سی لڑکی کو پیسوں کی کیا ضرورت ہے؟

چھوٹا سا یہ ہاتھ بھیک کے لیے کسی کے آگے کیوں پھیل جاتا ہے؟
یہ کیسی زندگی ہے اس کی۔
اس عمر میں تو اسے گڑیوں سے جی بہلانا چاہیے تھا۔!
رنگ برنگی تتلیوں کو دیکھ کر تالیاں بجانا چاہیے تھا!
کیا اسے کبھی گڑیوں کی خواہش نہیں ہوتی؟!
کیا اسے رنگین تتلیاں اچھی نہیں لگتیں؟!
کیا وہ یہ نہیں چاہتی کہ سلیٹ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر اپنی ماں کو دکھائے۔
اس نے ایسی زندگی کیوں اختیار کی۔؟ کیا اسے یہ زندگی بہت پیاری لگتی ہے؟!۔
کیا اس نے یہ زندگی خود اختیار کی ہے۔؟
اسے بھیک مانگنے کے لیے کس نے اکسایا ہے؟
اسے اپنی بھوک کا احساس کس نے دلایا ہے؟
اس کو اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں پر رونا کس نے سکھایا ہے؟
کیا اس کا کوئی باپ نہیں؟ کیا اس کی کوئی ماں نہیں؟
کیا وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔؟؟
اگر نہیں تو پھر ماں باپ نے کیوں اسے بھیک مانگنے پر مجبور کیا؟"

ایسے بہت سے سوالات اس لڑکی کو دیکھ کر میرے ذہن میں اٹھتے تھے لیکن میں نے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں پایا۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔

"کیوں بی بی تمھارے ماں باپ نہیں ہیں کیا؟"

تو اس نے جواب دیا۔

ہماری اماں ہے۔ ابا مر گئے۔۔۔ اتنا کہہ کر اس نے وہی اپنا چھوٹا سا ہاتھ میرے آگے پھیلا دیا اور وہی اپنا جملہ دُہرایا۔

"اللہ آپ کو اچھا رکھیگا صاب۔ ایک پیسہ دے دو۔"

اور میں اسے پیسہ دینے کے بعد سوچنے لگا۔

کیا کوئی ماں ایسی بھی ہوسکتی ہے جو اپنی لاڈلی کو بھیک مانگنے پر مجبور کرے۔

کیسی ماں ہوگی وہ۔۔۔ جو خود گھر میں رہتے ہوئے بچی سے بھیک منگواتی ہے اس لیے کہ وہ معصوم ہے اور معصوم کی فریاد ہر کوئی سنتا ہے۔ لیکن شاید اسے نہیں معلوم۔ فریاد کرتے ہوئے اس کی یہ معصوم سی جان کئی بار موٹروں کی زد میں آتی آتی بچی ہے شاید اسے نہیں معلوم کہ کئی بار لوگوں نے اس معصوم کو جھڑک کر پرے دھکیل دیا ہے اور وہ بلبلا کر روتے ہوئے انھیں رحم طلب

نظروں سے دیکھنے لگی ہے۔
کس قدر ظلم ہے اس کی ماں ـــ کیا وہ واقعی ظالم ہے ؟
یا حالات نے اسے ظالم بننے پر مجبور کر دیا ہے ؟
مغرب کا وقت تھا ـــ بارش کے آثار تھے۔ اور میں نزدیک سے نزدیک تر راستہ اختیار کرتا ہوا تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

رام نگر کی جھونپڑیوں میں سے جب میں گزرنے لگا تو ایک جھونپڑی کے آگے میرے قدم رک گئے۔
وہاں میں نے اس بھکاری لڑکی کو دیکھا جو مار کھاتی ہوئی کھڑی تھی، اور اسے مارنے والی ایک ایسی جوانی کی عمر سے ڈھلی ہوئی عورت تھی وہ جاذب نظر ضرور تھی لیکن چہرے پر عجیب قسم کا ڈراونا پن ضرور تھا۔
وہ اس کو بری طرح پیٹ رہی تھی اور کہہ رہی تھی ـــ
"جب تک چار آنے کما کر نہیں لائے گی ـــ تجھے کھانا نہیں ملے گا"
اور وہ صرف روئے جا رہی تھی۔
میرے جی میں آیا کہ جا کر اس عورت کے منہ پر طمانچہ مار دوں اور بچی کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لوں ـــ لیکن میں ایسا نہ کر سکا اتنے میں وہاں ایک ہٹا کٹا کالا مرد آ گیا جو نشے میں معلوم ہوتا تھا۔
میں اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گیا۔
اس نے آتے ہی عورت کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا
"اب جانے بھی دو جانِ من ـــ کیوں تنگ کرتی ہو بچی کو"
پھر عورت نے کہا۔
"ہاتھ چھوڑ دو شیر خاں آج تو میں اس کی جان لے کر ہی رہوں گی"
"نہیں . . . نہیں . . . . اب چھوڑ دو پیاری دیکھو میں تمہارے لیے دو روپے لایا ہوں ـــ کل تم نے کہا تھا ایک روپیہ دیتے ہو اور رات بھر تنگ کرتے ہو" اس نے بچی کا ہاتھ چھوڑ دیا ـــ اور شیر خاں کی طرف مڑ گئی۔ پھر جیسے سب کچھ بھول کر اس نے اپنے آپ کو شیر خاں کے سپرد کر دیا ـــ شیر خاں اس کا ہاتھ کھینچتا ہوا اسے جھونپڑی کے اندر لے جانے لگا۔ اور لے جاتے لے جاتے اس نے بچی سے کہا۔
"اب بھاگ جا یہاں سے اور سن جلدی سے جوان ہو جا پھر چار آنے روز کیا چار سو روز کمائیگی"
اور میں سارے بدن سے کانپ سا گیا۔ مجھے لگا جیسے ننھی سی یہ معصوم لڑکی اک دم جوان ہو گئی ہے۔
اور اس کا جسم کشکول بن کر درندہ اور بے درد انسانوں کے آگے پھیل گیا ہے !!!

محمد اسحٰق ایوبی

کاروباری اشتہارات

فوارے کا پانی اچھلتا کودتا اوپر اٹھتا ہے اور پھر پٹخنی کھا کر نیچے گر پڑتا ہے۔ اس کے بعد یہی پانی دوبارہ فولادی نلیوں کے دہانے سے بلند ہو کر "بہار بے خزاں" دکھلاتا ہوا نیچے آ رہتا ہے۔ اتار چڑھاؤ کا یہ دل فریب عمل گھنٹوں نظر نواز ہوتا ہے۔ اس طرح فوارے کی اٹکھیلیاں، خوش فعلیاں اور شوخیاں، پانی کی ترو تازگی کو بھی برقرار رکھتی ہیں۔ چھوٹے موٹے جوہڑ کے پانی میں چوں کہ حرکت نہیں ہوتی، اس لیے بہت جلد اس میں سڑاند آجاتی ہے۔ سماجی تعلقات، ذاتی شہرت اور کاروباری اشتہارات میں بھی فوارے کی مسلسل گردش ہی کا اصول کارفرما رہتا ہے، کیوں کہ جن اچھی بری چیزوں کا لگاتار اعادہ ہوتا رہتا ہے، وہ انسان کے دل و دماغ کو بے حد متاثر کرتی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو زندہ پائندہ اور تابندہ بنائے رکھنے میں مدد بھی دیتی ہیں۔

سماجی تعلقات عموماً سلام، کلام اور طعام کے علاوہ ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی!

اور ؎

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ ذاتی شہرت کے زرین اصول موقع و محل کے لحاظ سے "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو" "ہمچو ما دیگرے نیست" اور "خوشامد برکرا کردم خوش آمد" ہیں۔ رہے کاروباری اشتہارات تو ان کا ڈھانچہ "اپنے منہ میاں مٹھو" والی کہاوت "عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کی نفی اور ڈھنڈورا بھی دیتے ہیں کہ خود نبیرہ داستاں کے لیے کی نیو پر کھڑا ہے۔ جس طرح مائیں دوسروں کے سامنے عموماً اپنی اولاد کے گن گاتی رہتی ہیں، اسی طرح اشتہارات میں بھی اپنے مال کی اچھائیاں، امتیازی باتیں اور گاہکوں کے ان کے اپنے فائدے چھانٹ چھانٹ کر گنوائے جاتے ہیں ؎

قتل میں میرے قوانین سوچ رکھے ہیں کئی
غیر کی تسکین اپنی مشق، میرا امتحاں

انسان کو قدرت کا مقابلہ کرنے کے لیے چند فاضل چیزوں مثلاً کپڑے، مکان اور ادویہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرندے خود اپنی حفاظت اور بال بچوں کے بچاؤ کے ضمن میں گھونسلے کے محتاج ہوتے ہیں۔ نیز درندے اپنے تحفظ کے واسطے کھوہ اور بھٹ ہیں۔ اسی قاعدے کے مطابق کاروباری اشتہار بھی دلکشی، تاثیر اور کامیابی کے لیے عموماً مبالغہ آرائی کو حرفِ اول اور حرفِ آخر قرار دیتے ہیں۔ بازاری قسم کے اشتہارات اور خالص حقیقت نگاری میں تو سانپ اور نیولے کا سا بیر ہے۔

پچھلی سو اصدی میں اخبارات کی ترقی کے ساتھ ساتھ کاروباری اشتہاروں کی ضرورت، مقبولیت، اور افادیت بھی بڑھتی گئی جس طرح نوزائیدہ بچہ دودھ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح اخبار بھی اشتہارات کے بنا پنپ نہیں سکتے۔ لیکن اس کے برعکس اشتہار کی پوزیشن "سوسائٹی گرل" کی سی ہوتی ہے، جو کسی کی بن کر رہنا نہیں چاہتی۔ اشتہارات نہ صرف اخباروں میں چھپتے ہیں بلکہ ریڈیو، سینما اور بجلی کے قمقموں کے ذریعے بھی پرچار کا کام کرتے ہیں۔ محبوب تو عاشق کے پاس صرف اس وقت تک کراس وقت آتا ہے جب موخر الذکر کے برابر، سامنے یا پہلو میں کوئی دوسرا نہیں ہوتا" لیکن اشتہارات سے خدا کی پناہ! یہ تو شیطان کی مانند ہر جگہ حاضر، ناظر اور سار خاطر ہوتے ہیں۔ ع

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

آپ بازار میں سڑک پر یا کھلے میدان میں چل پھر رہے ہیں، مٹر گشت کر رہے ہیں یا چہل قدمی فرما رہے ہیں لیکن دائیں بائیں آگے پیچھے، اوپر نیچے، آڑے ترچھے ہر سمت میں اشتہارات آنے جانے والوں کو بڈھے کھوسٹ شوہر کی اوچھی کم سن بیوی کی طرح حسرت بھری نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ آخر کہیں تو کوئی جگہ خالی ہو ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

کاروباری اشتہار عمارتوں، دیواروں اور تختوں وغیرہ تک محدود نہیں ہوتے۔ سڑکوں پر چلتی پھرتی کاریاں بھی لاؤڈ اسپیکر لگائے، بیک وقت صورِ اسرافیل پھونکتی اور ہینڈبل بانٹتی پھرتی ہیں۔ فلمی گانوں کی آواز سن کر لڑکے بالے کھیلنا، کودنا، کھانا پینا اور لکھنا پڑھنا ـــــ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ ادھر کوئی راہ گیر سائیکل سوار یا موٹر ران بیڑی سگریٹ کے نمونے اور پرچیاں تقسیم کرتا جا رہا ہے۔ اس قسم کے "من و سلویٰ" کے لوٹنے والوں میں بھی بچے پیش پیش ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیاں اپنے اشتہارات ذرا زیادہ سلیقے سے پیش کرتی ہیں۔ یہ شہروں قصبوں، اور گاؤں میں اشتہاری فلمیں بھی دکھاتی پھرتی ہیں اور فلموں، پروجیکٹروں اور گاڑیوں وغیرہ کے پیسے "میاں کی جوتی میاں کا سر" کے مصداق گاہکوں کی جیب سے وصول کرتی ہیں، کیوں کہ اشتہاروں کی بدولت مال کی کھپت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ گویا بارش کا پانی ندی نالوں کے ذریعہ سمندر میں پہنچنے کے بعد بھاپ بن کر بادل کا روپ دھارتا اور دوبارہ مینہ برساتا ہے

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ آپ جب دفتر، سینما ہاؤس یا گھر میں ہوں تب بھی کاروباری اشتہارات

جاسوسی ناولوں، افسانوں اور فلموں کے مافوق الفطرت کرداروں کی مانند آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ آپ سکون کے ساتھ نیم مرلیٹے کی حالت میں ریڈیو کے ہلکے پھلکے گانوں کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں کہ یکایک کوئی آسمانی، نسوانی اور جانی پہچانی آواز اشتہاروں کا رس آپ کے کانوں میں گھولنے لگتی ہے۔ مانا کہ آپ "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتے اور اس طرح خود اپنی گوشمالی آپ کرتے ہیں۔ لیکن ان آنکھوں کا کیا کریں گے جو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔ وہ دیکھئے دیوار پر لٹکا ہوا خوبصورت سا کیلنڈر کسی حسین دوشیزہ کے نازو انداز، حسن و نزاکت اور شوخی و شرارت کی عکاسی کر رہا ہے۔ جیسے جغرافیہ کے نقشے خاص خاص مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ ویسے ہی ان کیلنڈروں سے بھی "چند تصویر بتاں" کے ساتھ تجارتی، صنعتی اور کاروباری اشتہاروں کی مقصد براری ہوتی ہے۔

پرچار کے انوکھے ہتھکنڈے صرف بڑی بڑی کمپنیاں، ممتاز و نمایاں صنعت کار اور رنگا رنگ قسم کے کارخانہ دار ہی نہیں برتتے، بلکہ اس کامیاب حربے کو بازاری حکیم وید اور ڈاکٹر بھی بروئے کار لاتے ہیں، ان کے تحریری اشتہارات کے لیے ریل کی پٹریوں کے ارد گرد کی یتیم دیواریں، غریبوں کے لاوارث علاقے اور عوامی طہارت خانے بہترین جگہ ثابت ہوئے ہیں۔ عملی دنیا میں تشہیر کے مختلف طریقوں کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ چالاک قسم کے بنئے، کتب فروش اور حلوائی بچوں کو مستقل گاہک بنانے کے لیے چند میٹھی گولیاں، پنسلیں اور شکر پارے مفت دے دیا کرتے ہیں۔ کاروبار کو چمکانے گاہکوں کا من موہنے اور مقبولیت حاصل کرنے کا ڈھنگ سینکڑوں سال سے برتا جا رہا ہے۔ آپ کو ہر محلے میں کچھ ایسے مرد یا عورتیں بلکہ بعض صورتوں میں مرد اور عورت دونوں مل جائیں گے جو نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ آپ جس چیز کی پبلسٹی چاہیں چلتے چلتے ان سے تذکرہ کر دیجئے۔ بس دوسرے ہی دن آپ دیکھیں گے اس کا ذکر ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہوگا۔ ایسے لوگ جس کی بدنامی کا بیڑہ اٹھائیں اس کو تحت الثریٰ تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ حسب نسب ذات پات اور گھرانے میں کیڑے نکالنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ فریق ثانی کی شخصیت، کردار اور خاندان کی تمام لغزشیاں، خامیاں اور نقائص انہیں مقدس دعاؤں کی طرح ازبر ہوتے ہیں۔ یہ لڑائی جھگڑے میں گڑے مردے اکھاڑتے ہیں۔ ان کا مزاج مرغ باد نما کی طرح ہوتا ہے جو ہوا کے ہلکے جھونکے سے بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر دور میں ہر مقام پر اور ہر قوم میں موجود ہوتے ہیں۔ جس طرح شاعر وہبی اور شعراء پیدائشی ہوتے ہیں، اسی طرح روپگنڈے کی ٹکنک ان افراد کو ان کی ولادت کے ساتھ ہی خاص طور پر خدا کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔

تشہیر، شہرت اور ناموری کا جذبہ کم و بیش ہر فرد بشر میں پایا جاتا ہے۔ مذہبی سربراہوں کی حرکات و سکنات ملبوسات اور طرز گفتگو پکار پکار کر تقاضا کرتی ہے کہ ہمیں دیکھو تو عزت و احترام کے ساتھ (جھک کر) سلام کرو۔ عام طور پر سوانگ میں کچھ اس طرح کا بھیس بھرتے ہیں کہ سماج کے اور لوگوں سے بالکل الگ مخلوق معلوم ہونے لگتے ہیں

بیوٹی کوئنز، اور ٹیڈی گرلز کے لباس، میک اپ اور طریق نشست و برخاست زبان حال سے کہتے ہیں کہ یہ . . . .

اینڈی بنیڈی مخلوق ”چیزے دیگر است“! محلوں کے لیڈر، پگاووں کے پنچ اور میونسپلٹیوں کے کئی ارکان بھی بات چیت حرکت وعمل اور طرز بود و باش سے اپنی حیثیت، اہمیت اور قدر وقیمت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ اسی طرح بعض پروفیسر مصنفین اور فن کار بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی اپنی شخصیت کا چلتا پھرتا اشتہار بن کر سامنے آتے ہیں ہم سماجی تقریبوں، ضیافتوں اور رسموں کو بھی ذاتی، خاندانی اور معاشرتی حیثیت کے اشتہار کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں اپنے آپ کو اصلی حیثیت سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ثابت کرنے کی دھن لگی رہتی ہے۔ ہمارے خاندان، ہمارا ماحول، ہماری تعلیم وتربیت، ہمارا ذہن، ہمارے خیالات وطرز فکر اور ہماری سماجی پوزیشن دراصل ہماری شخصیت کا تار و پود تیار کرتے ہیں۔ پھر ہم اپنی شخصیت کو ابھارنے کے لیے داڑھی مونچھ اور سر کے بال، انوکھی چال ڈھال اور کپڑے کی چستی اور جھول جھال سے مدد لیتے ہیں ــــ سچ پوچھئے تو گندے علاقے کی دکانیں، ہوٹل، اور سینما گھر ہم سے کہیں اچھے ہیں جو اپنے اپنے محلوں کا صحیح نقش، حقیقی تصویر اور اور اصلی اشتہار ہوتے ہیں۔

ساجدہ عابد

ہمارے ملنے والے

ملنے والوں کا حلقہ موجودہ زمانے میں پہلے کی بہ نسبت بہت وسیع ہوگیا ہے۔ پہلے ملنے والوں میں رشتہ دار اور پاس پڑوس والے ہوا کرتے تھے لیکن اب دوست احباب نے ان کی جگہ لے لی ہے

ملنا ملانا تو ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں رہا ہے۔ انسان ابتدا ہی سے مجبور رہا ہے کہ دوسروں سے ہنسے بولے۔ ملنے والوں کی بھی بہت ساری قسمیں ہیں۔ بعض باتونی، بعض خاموش، بعض ہنس مکھ اور بعض چڑچڑے قسم کے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف بولنا پسند کرتے ہیں، سننا پسند نہیں کرتے۔ بعض سنتے رہتے ہیں بالکل ایک پتھر کے بت کی طرح اور بولتے نہیں ہنسنے والے بولتے کم ہیں ہنستے زیادہ ہیں۔ غرض ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است۔

آج آفس میں کام بہت زیادہ تھا گھر دیر سے لوٹے۔ سوچا کہ سینما چلیں۔ پہلے ہی وقت کم تھا جلدی سے تیار ہوگئے اور اب نکلنے ہی والے تھے کہ آواز آئی۔ اسلام علیکم۔ آواز کیا تھی بٹاخہ تھی کہ کانوں کے پردے پھٹ گئے۔

"اچھا ہی ہوا کہ تم مل گئے، سوچا تھا کہ آج نہ ملو تو پھر کبھی نہ آؤں، آخر حد بھی ہے، جمعرات کے دن جیب کے ساتھ آیا تھا تو آپ غائب تھے۔ شاکر نے کہا تھا کہ کل چلو، مگر ہمیں فرصت کہاں۔ یقین مانو بعض وقت تو تمھارے پاس آنے کو طبیعت ہی نہیں چاہتی کوئی بات بھی ہے جناب کہ ہم ہی آپ کے گھر کے چکر کاٹا کریں اور صاحب بہادر کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ ہفتہ دو ہفتے میں ایک آدھ پھیرا ہی ہمارے گھر کا کر لیا کریں۔ اچھا شکوہ شکایت تو ہوتی رہیگی اور جواب بھی تم سوچ سمجھ کر دینا۔ اب آؤ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

انھوں نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ پانچ منٹ تک مسلسل کہتے ہی گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ آخر تیار بیٹھے ہیں تو کہیں جا رہے ہوں گے۔ غصہ کے گھونٹ پی کر اخلاقاً کہنا پڑا۔ "چلیے نا ڈرائینگ روم میں بیٹھیں۔" ڈرائینگ روم میں پورا آدھا گھنٹہ وہ بولتے چلے گئے اور ہم سنتے چلے گئے۔

ایک ماہ بعد تفریح کا جو پروگرام بنایا تھا یوں ختم ہوا۔ واپس جانے لگے تو مصافحہ کرتے کرتے سوٹ پر نظر پڑی۔ پوچھا "ارے یار گھر میں اتنا اچھا سوٹ پہنے بیٹھے ہو کہیں جانا تو نہیں ہے؟" پھر جب سنا کہ پکچر کا پروگرام تھا۔ تو کافی خفیف ہوئے اور معذرت چاہ کر چلے گئے۔

کسی انگریز مصنف کے بارے میں سنا تھا کہ محض وہ بولے جاتا اور سننے والے کے کوٹ کے بٹن پکڑ کر باتیں کیے جاتا یہاں تک کہ سننے والا بیزار ہو کر چلا جاتا، اور کوٹ کا بٹن اس کے ہاتھ میں رہ جاتا اور اسے خبر تک نہ ہوتی کہ سننے والا سامنے سے کبھی کا جا چکا ہے۔ اسی طرح کے ایک ہمارے ملنے والے بھی ہیں۔ ان سے راستے میں اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ ملتے ہی ان کی باتیں شروع ہو گئیں۔ "بھئی راستہ پر ٹرافک بہت زیادہ ہے۔ کیوں ہے نا" اور جواب میں ہم نے سر ہلا دیا۔ بھئی ٹرافک تو ہو گی ہی، راستہ جو ٹھیرا۔ موٹر، بس، ٹرام، بیل گاڑی، سیکل، ہر قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ کالے، گورے، موٹے، دبلے لمبے ایں قدر میں تو بس اسی لیے ہر شام یہاں چلا آتا ہوں اور سڑک کے کنارے کھڑا تماشہ دیکھتا ہوں۔ گھر میں دل بھی تو نہیں لگتا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا جاتی ہے۔" راستہ روک کر جو باتیں شروع کیں تو بس خدا کی پناہ۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ ہوا پر سوار تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ بچہ کی دوائی جو لے جانی تھی۔ آخر کہنا پڑا "ہاں ہاں راستہ پر خدا کی شان نظر آتی ہے۔ ہر قسم کے انسان دکھائی پڑتے ہیں۔ مگر دیکھئے نا مجھے بچہ کی دوائی لے جانی ہے۔"

"بچہ کی دوائی۔ کیا ہوا، (اور فرض کر لیا کہ بخار ہو گا) آج کل ملیریا بہت پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے پڑوس میں بھی ایک بچہ بیمار ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی کوئی کام نہیں دیتی آپ اسے" بات کاٹ کر کہنا پڑا "ملیریا نہیں، انفلوئنزا ہے"۔ "انفلوئنزا موسم جو بدل گیا۔ گرمی سے سردی، سردی سے گرمی، عجب حال ہو گیا ہے موسم کا۔ انفلوئنزا میں تو سردی سے بہت بچانا پڑتا ہے۔ بچہ کو گرم رکھو۔ ہوا نہ لگنے دو" "بہت خوب ایسا ہی کروں گا" بغیر آنکھیں ملائے ہم نے جواب دیا اور جو سیکل آگے بڑھانا چاہی تو دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ سے میری سیکل کو تھامے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا جناب اب اجازت دیجئے۔ انھوں نے سامنے کی دکان کی طرف اشارہ کیا اور بولے "وہاں جاؤ اور فلالین خرید لو، بہت سستا ہے اور نرم بھی۔ بار بار ایسا فلالین نہیں آنے کا، بچہ کے لیے ایک کوٹ کا کپڑا خرید لو۔" سیکل درا ملٹا تی تھی کہ پھر رکنا پڑا۔ گھڑی پر نظر کی تو پورا آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ ان سے ہم نے التماس کیا۔ ہاں ہاں فلالین سستا اور اچھا ہے مگر اس وقت پیسے ساتھ نہیں، پھر کبھی" پھر جو سیکل کے بڑھانے کا قصد کیا تو انھوں نے اپنی جیب سے روپے نکالے اور کہا "لیجئے مجھے پھر کبھی دے دینا، غریب تھوڑی ہے"— اب بھلا ایسے ہمدرد انسان کے ساتھ کون اخلاق نہ برتتے۔ دل میں شرمندہ ہوئے کہ ایسے خلوص والے انسان کم ملتے ہیں۔ ان سے بچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ساتھ ساتھ ہو لیے۔ دکان پہنچ کر انھوں نے نہ صرف کپڑا دلوایا بلکہ ایک سلا سلایا کوٹ بھی فوری ضرورت کے لیے دلوا دیا۔ شکریہ ادا کر کے رخصت ہونے کی اجازت مانگی تو کہنے لگے "چلو میں بھی ساتھ چلوں اور بچہ کو دیکھ لوں۔" بچہ کی بیماری کا حال سن کر اتنی تڑپ کا اظہار کیا کہ باپ ہوتے ہوئے ہمیں اپنی پدرانہ محبت پر رشک ہونے لگا۔

گھر پہنچے تو بیوی برس پڑیں، اور خالہ نے ڈانٹ پلائی "تمھیں تو بس دوستوں کی صحبت چاہیئے۔ بچہ بخار میں جلس رہا ہے۔ دوائی لانے میں پورے تین گھنٹے لگا دیئے۔ پچھلے زمانہ کے لوگ پہلے گھر کی سوچتے تھے اور پھر باہر کی، اور آج کل کے لڑکے دوست احباب میں ایسے گم کہ اپنے پرائے کا ہوش نہیں رہتا۔"

خدا خدا کرکے انھیں خاموش کیا دیر سے آنے کی وجہ بتائی، کوٹ دکھایا تب کہیں وہ خاموش ہوئیں۔ اس دن ہمارے مہربان نے رات کا کھانا ہمارے گھر ہی کھایا اور جاتے جاتے رات کے پورے بارہ بجا دیئے۔ مجھے تو شک ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ رات ہمارے ہاں ہی بسیرا نہ کریں۔

ہمارے ایک اور ملنے والے ہیں۔ ایسے فرشتہ صفت انسان بہت کم نظر آتے ہیں۔ بہت سنجیدہ، متین اور انتہائی خاموش کہ بعض وقت احساس ہوتا ہے کہ ہم باتیں کرکے بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں تھوڑی سی دیر کو چلے جایئے دیکھئے ہر طرف ایک سکوت طاری ہے اور اتنا گہرا سکوت کہ سوئی گرے تو آواز سنائی دے۔ بیوی بچے نوکر چاکر سب موجود ہیں۔ گھر اور گھر کا سارا کاروبار چل رہا ہے۔ اور صرف نہیں چلتی تو زبان۔ ہر ایک کل کے پتلے کی طرح کام کیے جا رہا ہے پہنچئے اسلام علیکم، وعلیکم السلام کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر خاموشی، ھونہ پر سامنے بیٹھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ کبھی سنتے سنتے ذرا سا مسکرا دیتے ورنہ پھر خاموش، ذرا سا سر ہلا دیا پھر خاموش۔ آخر میں ملنے والا اپنی حاضری کو غیر ضروری سمجھنے لگا اور اجازت چاہی۔ واپسی میں پھر سلاموں کا تبادلہ ہوا۔ وہ اپنے گھر کے اندر چلے گئے اور ہم اپنے گھر چلے آئے۔

یہ کون ہیں؟ اچھا آپ ہیں۔ گرجتے ہوئے بادل تو تھوڑی دیر کے لیے گرجتے ہیں مگر آپ گرجنے کے ساتھ ساتھ برس بھی پڑتے ہیں۔ اور خوب برستے ہیں۔ ادھر ہم نے سر ہلایا اور ادھر شروع ہونے لگی اولوں کی بوچھاڑ۔ ہم نے صرف اتنا ہی پوچھا "بہت دن بعد تشریف لائے اور بس زبان چلنے لگی قینچی کی طرح"۔ "میں کبھی وہ دن نہ بھولوں گا جب کہ تم نے میرے دوست کے سامنے سبکی کی تھی۔ حالانکہ میں تو تمھارا رشتہ دار تھا۔ تمھیں رشتہ کا بھی پاس نہ رہا۔ وہ تو کہو خون کے تعلق سے تمھارے یہاں آجاتا ہوں ورنہ کبھی نہ پھٹکتا۔" کیا سبکی کی تھی، بات کیا تھی، مذاق میں کیا حملہ کیا تھا؟ — انھوں نے آج تک نہیں بتلایا اور ہمیشہ یہی شکایت کہ تم یوں ملتے ہو، ووں ملتے ہو۔" ذرا سا عہدہ کیا ملا کہ بس دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ اگر پوچھا جائے "قبلہ آخر بات کیا تھی؟ کہیے نا، واقعی میں نے ایسی کوئی بات کہی تھی تو معافی چاہ لوں گا"۔ تو جواب ملتا ہے تم تو بس ہمیشہ تجاہل عارفانہ برتتے ہو۔ کیوں نہ ہو — زمانہ جو بدلتا ہے۔ تم جو ٹھہرے صاحب بہادر — ہم ہیں تمھارے غریب رشتہ دار۔ دوستوں کے ہاں موٹریں ہیں۔ بڑے بڑے بنگلے ہیں — اس لیے ان کی خوشامد کرتے پھرتے ہو۔ — یہ صرف تمھارا ہی حال نہیں، ہمارے سب بھائی بند ایسے ہی ہیں — بلکہ سارے خاندان کا یہی حال ہے۔ اسی لیے تو میں نے سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے، اور بس جتنا وقت ملے اللہ اللہ کرتا رہتا ہوں۔ گزشتہ عید میں بڑے ماموں صاحب سے ملنے گیا۔ انھوں نے بیٹھنے تک کو کرسی نہ دی۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ یہ تک نہ کہا۔ میاں یہ لو پنکھا اور اڑاؤ مکھیاں۔ باتیں تو کیں انھوں نے۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ دل صاف نہیں ہے۔ تمھارا بھی وہی عالم ہے بات یہ ہے کہ بیاہ کر لائے ہو بڑے گھرانے میں۔ بیوی کیا مل گئی ہے سارے جہاں کو فراموش کر بیٹھے ہو۔ خیر جانے دو آئندہ سے ہم آیا ہی نہ کریں گے۔"

ساری تعریف تو خدا کو سزاوار ہے اور اس کے بعد اگر کسی کو سزاوار ہے تو ہمارے ایک مہربان کو ——

لیجئے وہ پوچھ رہے ہیں۔
خیریت سے تو ہو ــ ؟
جی ہاں۔ آپ کی دعا کی برکت ہے۔
امی ابا اچھے ہیں ؟
جی ہاں سب بخیر ہیں۔
ماموں کیسے ہیں ؟ ـ
وہ بھی خیریت سے ہیں۔
ملازمین گھر میں ہیں یا نہیں ؟
جی ہاں ہیں
سوٹ تو بڑا زوردار ہے۔ کپڑا کہاں سے لیا ؟
سکندرآباد سے ــ
موٹے معلوم ہوتے ہو ــ ؟
جی ہاں ٹانک لے رہا ہوں۔
مگر تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو کیوں ؟
پھرتا پھراتا آرہا ہوں۔
موٹر میں آئے ہو ؟
موٹر بیچ دی سیکل پر آرہا ہوں۔
کیوں ــ ؟
قرض ہوگیا تھا۔
ایسا کتنا خرچ بڑھ گیا کہ قرض ہوگیا ــ ؟
ساری تفصیل بتلائی۔
تواضع کرنے لگے ــ چائے منگوادوں ؟
تکلیف کی ضرورت نہیں۔
بسکٹ، پیسٹری، لیمن، سوڈا ؟
جی نہیں شکریہ۔
کچھ مٹھائی ؟

اس کی بھی ضرورت نہیں۔

پان، پانی؟

ہاں منگوا دیجیے

پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ نظریں اٹھائیں۔ انھیں دیکھ کر دل دھڑکنے لگا پسینے چھوٹ گئے۔ بستر پر دراز سوچنے لگے کہ خرابی صحت کا بہانہ کر دیں۔ مگر وہ کہاں اتنی مہلت دیتے ہیں۔ وہ تو سر پر سوار ہو گئے۔

کیا کر رہے ہو؟

جی کچھ نہیں۔ آفس میں کام بہت ہے۔ تھکا تھکا یا آیا ہوں۔ کچھ ضروری فائلیں گھر لے آیا ہوں، اور اب دیکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ آپ آ گئے۔ پیش بندی کے طور پر اتنی ساری باتیں کہیں کہ وہ زیادہ دیر نہ بیٹھیں۔ مگر وہ کرسی کھینچ کر دراز ہو گئے۔

کام، کام، کام، جب دیکھو کام۔ میاں چھوڑو بھی کچھ دیر کے لیے کام، اور باتیں کرو۔

سوچا کہہ دوں۔ جناب آپ تھے وظیفہ یاب، میرے والد کے ساتھی۔ میں بھلا آپ سے کیا باتیں کروں۔ نا پڑا۔ ہاں آج کل کام بہت ہے۔ اس لیے سب سے ملنا ملانا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا ہوں۔ پھر بھی دیکھیے نا کوئی آتا ہی رہتا ہے۔ ملنا ہی پڑتا ہے۔ بہت سارا وقت تو بیکار نکل جاتا ہے۔

مگر پھر بھی حضرت نے رات کے گیارہ بجا دیئے اور جبراً و قہراً بیٹھنا ہی پڑا۔

تو یہ ہیں ہمارے ملنے والے لیکن یہ روداد سن کر آپ پست ہمت نہ ہو جائیں۔ حاشا وکلا ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ہم سے ملنا جلنا ترک کر دیں۔ ارے صاحب ملیے اور ضرور ملیے کہ ہم کو بھی آپ سے ملے بغیر چین نہیں پڑتا۔

حمایت اللہ حمایت

دکھنی رنگ

حمایت دکھنی شاعروں کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں یعنی جس پودے کو نذیر دہقانی نے لگایا تھا اور جس کی آبیاری غلام علی و اعجاز حسین کھٹا، سلمان خطیب اور سرور ڈنڈا نے کی اس میں نئے برگ و بار لانے والا آخری شاعر حمایت ہی ہے۔

حمایت ظرافت اور اداکاری کی اپنے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ فائن آرٹس اکیڈمی کو حیدرآباد گیر بلکہ ہندوستان گیر شہرت دلانے میں ان کا بڑا حصہ ہے لیکن ادھر حمایت اپنے مسائل زندگی میں کچھ اس طرح الجھ گئے ہیں کہ کم سے کم ان کی شاعری سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑا حزنیہ ہوگا — مرتب

(۱)

تری گلی میں ارمانوں کا کٹہ[1] لے کو آیا ہوں
لگانے سامنے گڑسی[2] میں کپہ[3] لے کو آیا ہوں

پچھانیگا[4] کوئی بھی نیں مجھے گھبراؤ مت[5] تم
فقیروں کا لگا کو بھیس چپہ[6] لے کو آیا ہوں

تمہیں پرسوں منگے تھے پان کا بیڑا ہمارے سے
میں بیڑوں سے ڈبیا ڈبچے[7] بھر کو لپہ لے کو آیا ہوں

قدر کرنے تمارے بال کٹے چھیتڑے[8] یہ سر کے
چنبیلی موتیا، گلنار چمپا لے کو آیا ہوں

تمارا نام لیتے ہی پٹاپٹ پڑ گئے دھولاں
پڑیں جس یو مجھے دھولاں وہ ٹوپہ[9] لے کو آیا ہوں

تنگ آ کو دشمنوں کی مہربانی سے یہ کرنا ہے
میں چٹھی لکھ کو خود اپنا ہی ٹپہ[10] لے کو آیا ہوں

---

۱ ڈھیر ۲ جھونپڑی ۳ سامان ۴ پہچانے گا ۵ مت ۶ کشکول ۷ اوپر تلے ۸ چیتھڑے ۹ ٹوپی ۱۰ ڈاک، خط

(۲)

ویدہ توکریں پنکی آتیں کی نیں آتیں کی — مھاڑیوں کوغم کے میرے ڈھاتیں کی نیں ڈھاتیں کی
انوں جلدی آنا کر کور کشا تو بھیجا یا ہوں — رکشا ہے ذرا چھوٹا ماتیں کی نیں ماتیں کی
چودہ کو قیامت ہے غفلے یہ غل مچا رہیں — انوں ڈر کو قیامت سے آتیں کی نیں آتیں کی
میں ننگے پاؤں سے بھاگا باوا سے ڈر کے ان کے — سنگات میرا جوتا لاتیں کی نیں لاتیں کی
بیڈل ہے میرے پاؤں میں ہینڈل ہے ان کے بس میں — ٹہرکاں پو محبت کے جاتیں کی نیں جاتیں کی
غصہ اتر نے ان کا عامل کے پاس جا کو — بڑا پڑا کو بھیجا کھاتیں کی نیں کھاتیں کی

گھر والے آج ان کو سب دیکھنے گیے ہیں
آنکھیاں سے ذرا ترپٹے بھاتیں کی نیں بھاتیں کی

(۳)

طبیعت ہماری چڑچخ بن گئی ہے — نظر اب تمہاری چرخ بن گئی ہے
ابھی کتے دیں گے غموں پو غماں تم — جگہ دل کی غم کی مشغ بن گئی ہے
تمیں جب ملے زندگی مور بن گئی — بچھڑ گئے تو غم کی بدخ بن گئی ہے
فراقوں میں رہنے سے یہ حال ہے اب — جھڑیں بال تالو سرخ بن گئی ہے

تمیں گھر کو جا کو بھلاویں آتا رد
برخ جا کو صورت ورخ بن گئی ہے

(۴)

میرے دل میں بس کو نکل کو چلے گئے — خوشی لوٹ کو غم انڈل کو چلے گئے
ہزاروں دلوں کو انگل کو چلے گئے — میرا بیگلا دل کھنڈل کو چلے گئے
میرے دوستاں میرے جیلم میں آ کو — پلاتے نہ روئے ننگل کو چلے گئے
زبانی تو ہمدردیاں سو بت تھے پن — میں گنڈوں کو پوچھا کل کو چلے گئے
ذرا ان کی سیلی کی تعاریف کر تیج — پنایا سو گجرا مسل کو چلے گئے

میں رویا تو آنسو سے ٹب بھر گیا تھا
انوں اس میں نہا کو نکل کو چلے گئے

---

۱ وعدہ ۲ لیکن ۳ وہ ۴ سانا ۵ احمق ۶ ساتھ ۷ بر ۸ پڑھا کر ۹ بھنگی ۱۰ چڑچڑی ۱۱ ٹیڑھی ۱۲ کتنے ۱۳ مثل ۱۴ بلخ ۱۵ فراق ۱۶ چندیا ۱۷ شرک ۱۸ (برق) تمتانا ۱۹ ورخ (درق) ست جانا ۲۰ انڈیل ۲۱ پھلانگ ۲۲ پریشاں ۲۳ ردد ۲۴ کھاکر ۲۵ بہت ۲۶ لیکن ۲۷ پیسے ۲۸ سہیلی ۲۹ تعریف ۳۰ کرتے ہی ۳۱ پہنایا ۳۲ نہاکر

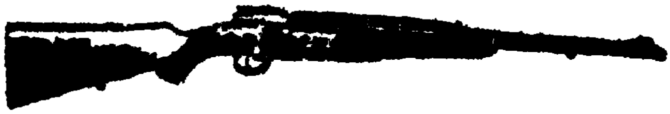
ایک انگلینڈ ریٹرینڈ دوست سے

تکبر[۱] کی ٹنگی ڈور یہ جو لے پومت جھو لو — یہ دنیا چار دن کی ہے تمیں[۲] اتے پومت پھولو
تمیں انگلینڈ رٹن ہوئینگے نور ھندلو[۳] کا ٹکوبل کھایں
کرینگا[۴] ولڈ رٹن[۵] اللہ تمارے کو یہ مت بھو لو

ٹیڈی بوائز

ایسی نازک چال اب ٹلتی کہ جب ٹلینے ناف — سب کٹمبہ[۶] یاں کا پنکی یاں کے فیشن کے خلاف
صورتاں ہیں بھونگیری[۷] پنکی امریکی ہے چال
آنگ[۸] پو پتلون[۹] جیسا تمبورے[۱۰] پو ہے غلاف

۱ ٹوٹے گی ۲ اس پر ۳ بہنے دو ۴ کیوں ۵ کرے گا ۶ ورلڈ (WORLD) ۷ کنبہ ۸ بھونگیر حیدرآباد کا ایک تعلقہ ۹ جسم ۱۰ پتلون ۱۱ تانپورہ



تبصرے

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

اُردو مثنویاں از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اردو مثنویات سے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ مثنوی اردو شاعری کی شاید سب سے زیادہ کارآمد صنف ہے۔ اس میں اتنی پنہائی ہے کہ زندگی کے طویل اور رنت نئے، روزافزوں مسائل بآسانی سما سکیں۔

ہمارے قدیم اور بزرگ شاعر مثنوی کی اس فراخدلی سے اچھی طرح باخبر تھے۔ چنانچہ اردو شاعری کی ابتدا ہی سے بلکہ جب سے اردو زبان اس قابل ہوئی کہ اس میں کسی خیال، جذبے یا احساس کو شاعرانہ طور پر نظم کیا جا سکے۔ ہمارے شعرا نے اسی میڈیم کا سہارا لیا۔ انھوں نے اسے مذہب اخلاق اور تصوف کے رموز و نکات کا آلۂ کار بھی بنایا اور حسن و عشق، معاشرت اور تہذیب کے مختلف النوع پہلوؤں کی عکاسی کا وسیلہ بھی۔ لیکن دکن سے شمالی ہند میں اردو زبان کا مرکز ثقل منتقل ہونے کے بعد اس صنف کی طرف وہ التفات نہ رہا جس کی یہ دکن میں مستحق سمجھی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ مثنوی کے دامن میں آبدار موتی شمالی ہند میں بھی جمع ہوتے رہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے، صنف غزل کی طرف ہمارے شاعروں کے اس شوق کا شکار ہوگئی جو سالہا سال تک جنون کی حد تک رہا، اور جب ہمارے نقادوں نے اردو شاعری پر مقامی رنگ و آہنگ سے عاری ہونے کا الزام لگایا تو کل شاعری کو غزل سمجھ لیا گیا۔ مثنوی کے سرمائے پر نظر پڑی مگر بہت اچٹتی ہوئی۔

ادھر کچھ دنوں سے قدیم ادب کے کچھ ایسے پارکھ تحقیق کے میدان میں آگئے ہیں، جن سے ہم بجا طور پر یہ امید کر سکتے ہیں کہ پروفیسر شیرانی کی روایت شاید اب اردو تحقیق میں اتنی ضعیف نہ رہے۔ جتنی کہ اب تک رہی ہے۔ قدیم ادب کو ماضی کے دھندلکوں اور تاریکیوں سے قلم و قرطاس تک لانے والوں میں اب تک ہمارے یہاں سالخوردہ اور صدہا باراں دیدہ قسم کے لوگ ہی ہوا کرتے تھے، لیکن گزشتہ دس پندرہ سال سے اس کارواں میں نو عمر مگر پختہ کار اہل قلم بھی شامل ہو گئے ہیں — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان میں سے ایک ہیں، اور زیر نظر کتاب کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انھیں امتیازی حیثیت بجا حاصل ہے۔

"ہندوستانی قصوں سے ماخوذ، اردو مثنویاں" میں اردو کی صرف ان مثنویوں سے بحث کی گئی ہے جن کا تعلق بلاواسطہ یا بالواسطہ، ہندوستانی معاشرت اور تہذیب سے رہا ہے۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے:-

شروع میں دس صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ ہے جس میں نفسِ مضمون کے متعلق تمام اشارے آجاتے ہیں۔ اس کے بعد پہلے حصے کی تقسیم یوں ہے:-

۱۔ پورانک قصے ۔ ۲۔ قدیم لوک کہانیاں ۔ ۳۔ نیم تاریخی قصے ۔ ۴۔ ہند ایرانی قصے ۔

دوسرا حصہ ایک ضخیم ضمیمے پر مشتمل ہے۔ افادیت کے باعث ضمیمے کی ضخامت ناگوار نہیں ہوتی۔ بلکہ کئی حیثیتوں سے ضمیمے کی افادیت پہلے حصے سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

قصے منظوم ہوں یا منثور، کسی معاشرے کی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ افسانوی ادب، اس کی تخلیق اور تنقید کے اصولوں کی آگہی نے ہمارے قصہ خوانی کے شوق میں وہ شدت باقی نہیں رکھی ہے، جو آج سے تین نسلیں پہلے تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت اب پہلے سے زیادہ روشن بھی ہے کہ قصوں میں ہمیں اپنی تہذیب اور تمدن کی جھلکیاں جس وضاحت سے نظر آتی ہیں، وہ کسی اور طرح ممکن نہیں۔ لہٰذا قصوں پر تحقیقی یا تنقیدی بات چیت کرنا دراصل تہذیب اور تمدن پر بات کرنا ہے ـــــ اور یہ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر نارنگ تحقیقی نقطے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب کے رشتوں اور عوامل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہند اسلامی تہذیب بھی اتنی ہی ہندوستانی ہے جتنی کہ ویدک تہذیب۔

دو بڑی تہذیبیں، ایک سرزمین میں "خالص" رہ بھی نہیں سکتیں۔ چنانچہ اسلامی تہذیب کے ہندوستان میں ورود کے کچھ ہی مدت بعد اسلامی اور ہندی تہذیب میں اثر اندازی اور اثر پذیری کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ دکن میں ہمیں اس عمل کی ادبی صورت اگرچہ فارسی کے مقابلے میں تاخیر سے ملتی ہے، لیکن اردو کے لحاظ سے یہ شرف دکن ہی کو حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر نارنگ:

"اتفاق کی بات ہے (اور کتنا مبارک ہے یہ اتفاق!" (ش۔۱) کہ اردو شاعری ابھی اپنے ارتقار کی منزلیں مذہب تصوف کے سہارے طے کر رہی تھی۔ اردو کی اولین مثنوی میں ایک ہندوستانی قصے کو موضوع بنایا گیا۔ یہ مثنوی بہمنی دور کے ایک شاعر نظامی سے منسوب کی جاتی ہے اور اس میں کدم راؤ پدم راؤ کا مقامی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی غالباً احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ ـــ ۸۶۷ھ) کے زمانے میں لکھی گئی۔" ص

اس کے بعد تو دونوں تہذیبوں کی روایات کے باہم ملنے کا سلسلہ اس قدر طویل اور تعجب خیز حد تک خوشگوار رہا کہ اکثر و بیشتر تو دونوں روایتوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ نے ایسے قصوں کا تاریخی اور تحقیقی تجزیہ کیا ہے۔ اور ہر اس واضح جگہ اشارہ کیا ہے، جہاں ان دونوں روایتوں کا سنگم نظر آیا ہے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ کام اور ہر تحقیقی کام، بڑی دماغ سوزی اور ریاضت چاہتا ہے۔ ڈاکٹر موصوف تحقیق کی اس اوگھٹ وادی سے بڑی سلامتی اور کامرانی سے گزرے ہیں۔ شائع شدہ مثنویات کے علاوہ ان کی پہنچ اُن تمام

ملکی و بیرونی ماخذوں تک رہی ہے جن تک پہنچے بغیر اس کام سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ اس سلسلے میں کتب خانہ شاہان اودھ، برٹش میوزیم، انڈیا آفس، باڈلین، کیمبرج، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کرزن کلکشن، بانکی پور، کتب خانہ سالار جنگ، عثمانیہ اور آصفیہ حیدر آباد کی وضاحتی فہرستیں ان کے مطالعے میں رہی ہیں جن سے انھوں نے تفحص اور تقابل کیا ہے۔ ان کی دقتِ نظری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کتاب کا کوئی صفحہ مفید مطلب اور متعلقہ حوالہ جات سے خالی نہیں حوالہ جات کا انبار بذات خود کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے لیکن زیر نظر کتاب میں حوالہ جات نہایت مناسب مواقع پر استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر تحقیقی کتابوں میں یہ چیز بڑی حد تک ناگزیر بھی ہے، اس لیے کہ یہاں کوئی بات ہوائی یا مفروضہ نہیں ہوسکتی۔ پیشۂ تحقیق میں ٹھوس اور مسلّم دلائل کا چراغ لے کر چلنا پڑتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے ہمارا یہ یقین اور محکم تر ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب ہمیشہ سے ایک ایسا سمندر رہی ہے جس میں مختلف فرقوں اور ملتوں کی ندیاں آکر ملتی رہی ہیں۔ ندیوں نے سمندر کو وسعت و عظمت دی ہے اور خود اس وسعت و عظمت میں شریک ہوگئی ہیں۔

پچھلی سطروں میں تہذیب و تمدن کا بار بار ذکر آیا ہے لیکن آخری تجزیے میں زیر تبصرہ کتاب تحقیق کی کتاب ہی رہتی ہے نہ کہ تہذیب و تمدن کی۔ اور تحقیق میں کوئی حرف حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ کتاب بھی سہو سے بری نہ ہو۔ کم از کم مجھے اس کی سہو سے برات کا دعویٰ نہیں۔ لیکن ایسا ہونے پر بھی اس کتاب کی افادیت پر اثر نہیں پڑتا۔ اس کتاب کے قاری کے لیے یہ مشکل ہوگا کہ وہ کتاب پڑھ چکنے کے بعد کتاب کے مصنف کے خلوص، انہماک، کاوش اور نظر کی دقت کا معترف نہ ہو، (خواہ وہ کتنا ہی سخت گیر کیوں نہ ہو) اور اس سے بھی زیادہ مشکل مستقبل کے اس محقق یا نقاد کے لیے ہوگا، جو مثنویوں پر ذمہ داری اور سنجیدگی سے بات کرنا چاہتا ہو، اور جس نے "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ (شریف احمد)

موجِ خوں

مجموعۂ کلام احمد ریاض۔ ناشر مجلس یادگار ریاض لائیلپور۔ قیمت ۵ روپے۔ صفحات ۲۴۰۔

احمد ریاض کا شعور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھا، اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز ٹھیٹ ترقی پسندانہ رہا۔ احمد ریاض کا شمار ہم ترقی پسندوں کی دوسری نسل میں کر سکتے ہیں میرا مطلب، سردار، مخدوم، مجاز کے بعد والی نسل سے ہے۔ "موجِ خوں" پڑھتے ہوئے سب سے پہلے جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہہ رہا ہے وہی کچھ سہہ بھی رہا ہے اور بڑے سے بڑے دکھ میں بھی وہ آنے والی "صبح" کے تصور سے مسکرا اٹھتا ہے دکھ درد سہنا اسے زمانے نے سکھایا اور ان پر مسکرانا ترقی پسندی کی دین ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ احمد ریاض کا شعور ترقی پسند فکر کے زیر سایہ پروان چڑھا اس لیے مسکراہٹ تصنع بناوٹ یا فارمولا نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس میں خلوص کی روشنی بھی جھلکتی ہے اور یہی روشنی احمد ریاض کے فن کو چمکا دیتی ہے۔

اگر احمد ریاض زندہ ہوتے تو پتہ نہیں ان کا رنگ کلام بدلتا یا وہ خود دوسروں کے رنگ کلام کو بدلنے پر قادر ہوتے لیکن اس وقت ہمیں ان کے اسی کلام پر نظر ڈالنی ہے جو "موجِ خوں" کے نام سے ہمارے سامنے آیا ہے اور شاید یہی ان کا کل سرمایہ حیات ہے۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کہی ہوئی نظموں پر آج رائے دینا بڑا مشکل ۔ ۔ ۔ ہے کیوں کہ اگر ہم آج کے تنقیدی معیارات کو پیشِ نظر رکھیں تو شاعر کے ساتھ انصاف نہ کرسکیں گے اور اگر آج سے پندرہ برس پہلے کے تنقیدی معیارات کو برتیں تو تنقید سے انصاف نہ ہوسکے گا لیکن اچھا ادب تو ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے۔ تو کیا ہم یہ مان لیں کہ "موجِ خوں" کی نظمیں غزلیں اچھا ادب نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس میں وقتی اور ہنگامی موضوعات مثلاً "دوسری دیوارِ چین" "قراردادِ مقاصد"، "قانون تحفظ جمہوریت" پر نظمیں شامل نہیں گو یہ بحث الگ ہے کہ وقتی نظموں کی ادب میں کیا اہمیت ہے پھر بھی ہم اس قسم کی نظموں کو نظر انداز کر کے دوسری نظموں اور غزلوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ "موجِ خوں" اپنے ایک حصہ کو کھو دینے کے بعد بھی قاری کے لیے اپنے اندر بہت کچھ رکھتی ہے۔

عقیدتوں کو بھی حالات ڈس گئے شاید	بہت دلوں سے وہ کم التفات رکھتے ہیں
دامن بھی چاک، دل بھی ہیں بے نغمہ و صدا	جوڑیں دلوں کے تار کہ دامن رفو کریں
مجھی سے رونقِ بزمِ حیات قائم ہے	رہِ حیات میں دامن بچا بچا کے نہ چل
وفا کے نام پہ جینے کی انتہا یہ ہے	کہ ایک دل ہے سو وہ بھی تباہ رکھتے ہیں

یہ اور اس قسم کے بہت سارے اشعار تو آج بھی اپنے اندر وہ سب کچھ رکھتے ہیں جو ایک اچھے شعر میں ہونا چاہیے اور یقیناً آئندہ بھی رکھیں گے کہ ادب کے بعض معیارات دائمی ہوتے ہیں۔

نظموں میں "میں اور تو" "بت جھڑ" "جگ بیتی" "میرے مغرور صنم" "شیشے کے صنم پتھر کے صنم" وغیرہ بھی مندرجہ بالا اشعار کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اتنا کام ایک شاعر کو اچھا شاعر ثابت کرنے کے لیے بڑی حد تک کافی ہے۔ احمد ریاض کا دعویٰ تھا کہ ؎

حسنِ بیاں سے پھول کھلائیں گے ہم ریاض
بزمِ سخن کو رشکِ گلستاں کریں گے ہم

اور ان کے اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ کچھ بے جا بھی معلوم ہوتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمانے نے انھیں مہلت نہ دی اور وہ ۱۹۵۳ء میں اس بزمِ جہاں سے رخصت ہوگئے اگر زندگی وفا کرتی تو یقین تھا کہ احمد ریاض کوئی اس سے بڑا کارنامہ انجام دیتے۔ (بشیر نواز)

۱۸۵۷ء

طویل نظم از راہی معصوم رضا۔ قیمت دس روپے۔ مجلد۔ صفحات (۲۹۶) ناشر۔ معصوم رضا

اردو میں خیر رزمیے ناپید ہیں ہی طویل تر نظموں کا ہونا بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ویسے کچھ خوش عقیدہ لوگ دبیر اور انیس کے مرثیوں کو رزمیے کا بدل کہتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ادب میں اعتقادات زیادہ اہم نہیں ہوتے

انیس کی عظمت کا منکر کا [illegible] لیکن انھوں نے رزمیے نہیں لکھے۔ خیر یہاں تو رونا طویل تر نظموں کا ہے۔ آج سے دس بارہ سال پہلے کچھ اس قسم کی نظموں کا سلسلہ چل نکلنے کے امکانات سردار جعفری نے پیدا کیے تھے لیکن وہ بھی "نئی دنیا کو سلام" کرکے محفل سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اور ان دنوں دفعتاً لوگوں کو احساس ہوا کہ اصل شاعری تو مختصر اور گنجلک نظم میں ہوتی ہے چنانچہ مختصر سے مختصر اور گنجلک سے گنجلک شاعری کرنے کی کوشش نے اکثر ناپختہ شہرت طلب ذہنوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیئے اور بعض شہرت کے لیے ہر دم "ہل من مزید" کا نعرہ لگانے والوں کی شاعری اپنی بیوی کے درد کا اشتہار بن کر رہ گئی۔ ایسے زمانے میں تین پونے تین سو صفحات کی نظم کہنا بذات خود قابل تعریف کام ہے اور ایسی صورت میں تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ نظم قومی تاریخ کے ایک اہم باب کی طرف اشارہ بھی کرتی ہو۔ راہی نے واقعی بڑا صبر آزما کام کیا ہے۔ دیباچہ میں کہیں کہیں انھوں نے اپنے اصولِ شاعری کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔ "شاعر کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کسی چیز کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کسی خاص چیز کے بیان میں کسی خاص صنفِ سخن اور بحر کا انتخاب کیوں کیا ہے . . . . شاعری کی بنیاد شعور پر ہے لاشعور پر نہیں۔ وجدان۔ شاعرانہ لہر اور اس قسم کی دوسری اصطلاحیں گمراہ کن ہیں اور انھیں وہی شعرا استعمال کرتے ہیں جو اپنے محرکات سے واقف نہیں ہوتے . . . ."

ممکن ہے یہ جملے راہی نے "ردِ کفر" کے طور پر استعمال کیے ہوں ورنہ اتنا تو وہ بھی جانتے ہوں گے کہ شاعری کی بنیاد لاشعور پر نہ سہی تحت شعوری کیفیات پر ضرور ہوتی ہے، نظم یا شعر کہتے وقت وہ واقعہ یا حادثہ جس نے شاعر کی اندرونی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہو اتنا واضح بھی نہیں ہوتا جتنا راہی سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو "ماورائی" قسم کی شاعری کا وجود ہی نہیں ہوتا . . . . ملار سے پر تو خیر نظم کہتے وقت کچھ جذب کی سی کیفیت طاری ہو ہی جاتی تھی انیس بھی (جن کی شاعری خارجی زیادہ ہے) حمام سے بغیر نہائے لوٹ آتے تھے اور سر پر نک چادر اوڑھ کر اس وقت تک کہتے رہے جب تک کہ وہ جذبہ خود ان کے دل میں ابھرا تھا جھاگ کی طرح۔ بیٹھ گیا اور وہ تحریر ان کے شاہکار مرثیے کے اسی بند تھے خیر مجھے تو راہی کی طویل نظم "۱۸۵۷ء" پر تنقید کرنی ہے ان کے نظریۂ شعر پر نہیں۔ یہ نظم جو شاعر کے سفر سے شروع ہوتی ہے اور اصل میں مولوی کی زبانی کہلوائے ہوئے اس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

زخموں سے لڑکھڑا رہا ہوں میں   پھر بھی لڑنے کو جا رہا ہوں میں

اپنے اندر ایک اچھی طویل نظم بننے کی بڑی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ اس میں منظر کشی بھی ہے میدانِ جنگ بھی، ماں کی ممتا بھی ہے اور خون کا فوارہ بھی۔ اس نظم میں کچھ تاریخی اور شاعر کے تخلیق کردہ کردار ابھرتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ بعض کردار جو ابھرنا چاہتے تھے شاعر کی بے توجہی کا شکار بن گئے۔ تاہم ہم اس نظم کے آئینے میں اس وقت کے ہندوستان کے کرب، بے چینی، مروت، نفرت، بہادری اور بزدلی کی تصاویر دیکھ سکتے ہیں اور یہ بات نظم کی کامیابی پر دلالت کرتی ہے۔ نظم کے بعض ٹکڑے اپنی ہندوستانی فضا اور شاعرانہ خلوص کی وجہ سے چمک اٹھے ہیں۔

گزر چکا ہوں میں اس راستے سے پہلے بھی
دو رویہ آم کے پیڑوں کے وہ گھنے سائے
فضا میں امبیوں کی وہ خوشگوار مہک
کہ جن کے ذکر سے فصلِ بہار آجائے

یا پھر یہ بند کتنے نازک احساسات اور شدید مشاہدے کا مظہر ہے۔

بنے ہوئے تو ہیں پنگھٹ پہ گاگروں کے نشاں
مگر گھروں کی وہ باتیں نظر نہیں آتیں
وہ چھوٹی چھوٹی سی خوشیاں تو وہ پہاڑ سے غم
گھروں سے عورتیں کیا اب ادھر نہیں آتیں

اس نظم میں انگریزوں کے مظالم بھی ہیں ان کی عدالتیں بھی ہیں اور ناانصافیاں بھی لیکن ایک خصوصیت یہ ہے کہ شاعر کہیں بھی یاس و ناکامی اور ان دشمنی کا شکار نہیں ہوتا (میں نے یہاں شکار ہونا استعمال کیا ہے مگر ہوتا نہیں) یہاں تک کہ گورے صاحبوں کو جب کشتیوں میں بٹھا کر باڑھ ماری جاتی ہے تو شاعر بقول خود اتنا بے قابو ہو جاتا ہے کہ بحروں کی پابندی کا خیال بھی نہیں رکھ سکتا۔ شاید یہ عمل راہی نے اس وقت کی بھاگم بھاگ اور انتشار کے اظہار کے لیے کیا ہے۔۔۔۔۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید اس بند کا تاثر کچھ اور بڑھ جاتا ہے اور اب جو کیفیت ہے کہ قاری کے سامنے انتشار مجسم آنے کی بجائے ذہن کے جھٹکے اسے بے حال کر دیتے ہیں اور وہ اس ورق ہی کو الٹ دیتا ہے۔ اتنی طویل نظم میں کچھ ٹکڑوں کا سپاٹ ہو جانا اس لیے بھی قابل توجہ نہیں ہے کہ اس سے نظم کے مجموعی تاثر پر اثر نہیں پڑتا اور راہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور یہ کام ہی اتنا ہے کہ راہی کا نام ان کی طرح۔۔ کے شاعروں ہی میں نہیں بلکہ ان کے ساتھی دوسرے شعرا میں بھی انہیں ممتاز کر سکتا ہے۔
اسرار کریمی پریس سے شائع کی جانے والی یہ کتاب مواد اور ہیئت دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہے۔ (بشر نواز)

دلِ ناداں

کرشن موہن ۔ قیمت: ۶ روپے ۔ ناشر: انڈین اکیڈمی۔

جدید شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس کا شاعر کیا کہنا چاہتا ہے خود بھی نہیں سمجھتا۔ ساتھ ہی یہ شکایت بھی سنائی دیتی ہے کہ آج کے شاعر زبان و بیان کے حسن سے بے نیاز ہیں ہی اس کے صحیح استعمال سے بھی واقف نہیں۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے اعتراضات یقیناً آج کے اکثر شعرا پر کیے جا سکتے ہیں لیکن کچھ مستثنیات کے ساتھ۔ اور انھیں مستثنیات میں "دلِ ناداں" کا شاعر کرشن موہن بھی آتا ہے۔

کرشن موہن کی مشقِ سخن کم و بیش بیس سال کی ہے اور اتنی مدت کسی شاعر کو بنانے بگاڑنے کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ ان بیس برسوں نے کرشن موہن کو بہت کچھ بنا دیا۔

اس کے لب ولہجہ کی انفرادیت، سجیلے کٹیلے اور ہلکے پھلکے الفاظ کا استعمال اور سب سے بڑی بات اردو فارسی اور ہندی الفاظ کا ذخیرہ ہی اسے دورِ حاضر کے ممتاز اور نمائندہ نوجوان شعرا میں ایک خاص مرتبہ عطا کرنے کے لیے بہت کافی تھا لیکن یہاں تو موضوعات کی جدت نے اس کے لیے مزید سامان اہمیت فراہم کر دیا ہے۔ اس کی نظمیں..... "مذہب"، "سپیرا" وغیرہ پڑھ کر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے نئی نظمیں ہیں۔ اردو شاعری کے نئے افق تلاش کرنے والے کے لیے کرشن موہن کا فن بڑی حد تک مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی روزمرہ کے معمولی موضوعات پر بھی کرشن موہن اپنی چھاپ ضرور لگا دیتا ہے "کسی سے پیار کرنا چاہتا ہوں" اپنے لہجے کی سادگی کی وجہ سے خوبصورت نظموں کے زمرہ میں آگئی ہے۔ "میں آج پھر فریبِ محبت میں آگیا"، "اے حسرتِ دل"، "روپ مایا" اور "مندر" اپنے اندازِ بیان کے بل بوتے پر نئی نظمیں اور اچھی نئی نظمیں کہلانے کی مستحق ہیں۔

کرشن موہن کہیں کہیں راشد سے متاثر نظر آتے ہیں، ویسے ایک دو نظموں میں میراجی کے اثرات نمایاں ہیں ایک نظم تو بطرزِ میراجی ہے وہی دوسری ایک نظم "کالا کلوٹا کلموا" اپنے الگ موضوع کے باوجود الفاظ کی وجہ سے میراجی کی نظم جس کا ایک مصرعہ ہے "کلموا کالا کلوٹا کوا" کی یاد دلاتی ہے۔

اپنے پیشروں سے متاثر ہونا کوئی بری بات بھی نہیں ادب میں تو چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اگر غالب اور حالی نہ ہوتے تو اقبال آج کے اقبال نہ ہوتے۔ اگر کرشن موہن راشد سے متاثر ہوں تو بری بات نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے راشد کی روایات سے کس حد تک فائدہ اٹھایا ہے اور یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اس روایت کا "ناجائز" استعمال نہیں کیا۔

تقدس کا بے رحم سایہ
ملاقات کی رات بھی مجھ سے لپٹا ہوا ہے
فقط روح کی تربیت باعثِ ارتقا ہے" (آسیب)

مرمریں قصر کا تابندہ طرب خیز ستون
محرمِ رازِ سکوں خالقِ احساسِ جنوں
ایک تعبیرِ طلسمِ افسوں (آج کی رات)

پڑھتے وقت راشد کی یاد تو آتی ہے لیکن یہ اور دوسری اس قسم کی نظمیں کچھ منفرد خصوصیات بھی رکھتی ہیں اور نہ صرف یہ کہ کرشن موہن کی کامیاب نظمیں ہیں بلکہ جدید شعری سرمایہ میں بھی خوشگوار اضافہ ہیں۔

نظموں کے علاوہ کرشن موہن نے غزلیں بھی کہی ہیں اور اس میدان میں بھی اپنی کچھ خصوصیات کی وجہ سے الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔

آج پھر مرے دل میں تیرا درد جاگ اٹھا — پھر خلش ترے غم کی آگئی ستانے کیوں
کیا مری مشتاق بانہیں آپ کی گردن میں آج — ہو نہیں سکتیں حائل ایک لمحے کے لیے

تڑپ رہے ہیں مرے دل میں عشق کے ارماں — جلا رہے ہیں فسونِ حیات کے شعلے
سکھ کی نیندیں زہر ہوئیں تیری نظریں قہر ہوئیں — اب کہ تماشا دیکھ چکا اب تو پھر ابھر آئے
لپٹ گئی ہیں تمہارے دل سے مری وفا کی حسین یادیں — جو بھول سکتے تو بھول جاتا جو بھول سکتے ہو بھول جاؤ

غزلوں میں کرشن موہن ردیف سے ایک خاص فضا کی تعمیر کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس میں کامیاب رہتے ہیں ان کے یہاں غزل نہ صرف لفظ جوڑنے کا کام ہے اور نہ صرف ردیف قافیہ کے کرتب دکھانے کا بلکہ انھوں نے غزل کو چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت خوبصورت جذبات وسانحات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

معنوی حسن کے ساتھ ساتھ "دلِ ناداں" کا ظاہری حسن بھی اردو کی کتابوں میں اسے ایک ممتاز درجہ عطا کرتا ہے۔ آفسیٹ کی چھپائی، بہترین کاغذ کے استعمال اور جابجا خوبصورت خاکوں نے اس کتاب کو اتنا جاذبِ نظر بنا دیا ہے کہ اس کے دیکھنے کے بعد اردو کی دوسری کتابوں پر نظر مشکل سے جمتی ہے۔ (بشر نواز)

سفینہ و ساحل

مصنف عزیز وارثی۔ ناشر: مکتبہ شانِ ہند دہلی ۲۰۔ قیمت: ۴ روپے

یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں بیک وقت کئی دھارے، کئی تحریکیں اور کئی رجحانات ایک ساتھ مل جاتے ہیں۔ جہاں مسلسل تجربوں سے اردو شاعری کا دامن بھرا ہوا ہے وہیں روایت اور قدیم وضع داریوں سے بھی آپ کی جھولی مالا مال ہے۔ اور شاید یہی بوقلمونی اور رنگا رنگی اردو شاعری کی مقبولیت کی ذمہ دار ہے۔ ہمارے زیرِ نظر ایک ایسے شاعر کا مجموعہ کلام ہے جسے ہم روایت، قدیم وضع داریوں اور اگلی شرافتوں کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ شاعر کی زندگی کا عکس اس کے اشعار میں بھی جھلکتا ہے لہٰذا وہ تمام صفات جو جناب عزیز وارثی سے منسوب ہیں ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہی روایت کا رکھ رکھاؤ، وہی لہجہ کا سنبھلا ہوا انداز، اپنے پیشروؤں اور بزرگوں سے وہی نیازمندی کا اظہار . . . . . عزیز صاحب نوح ناروی کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ ان کی زبان بہت صاف شستہ اور شیریں ہے۔

غزلوں، نظموں، خمسوں کے اس مجموعہ میں ہمیں نعت، عقیدتی نظمیں، وطنی نظمیں اور خوبصورت غزلیں مل جاتی ہیں نظمیں جذبۂ حب الوطنی سے پُر ہیں اور اپنے فنی محاسن کی وجہ سے خاصے کی چیز بن گئی ہیں۔ غزلوں میں ایک خاص تہذیب اور رکھ رکھاؤ محسوس ہوتا ہے۔ بندشیں چست الفاظ سجیلے اور لہجہ باوقار ہے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

مری نگاہ میں اس کا کوئی وقار نہیں — وہ اہلِ دل جو ابھی دل کے اختیار میں ہے
محبت کیا عقیدت کیا، طریقت کیا، شریعت کیا — ترا جلوہ تھا جس کو فطرتاً سجدہ کیا ہم نے
چارہ گر شام سے مغموم نظر آتے ہیں — آج کیا حال مرا ہوگا سحر ہونے تک

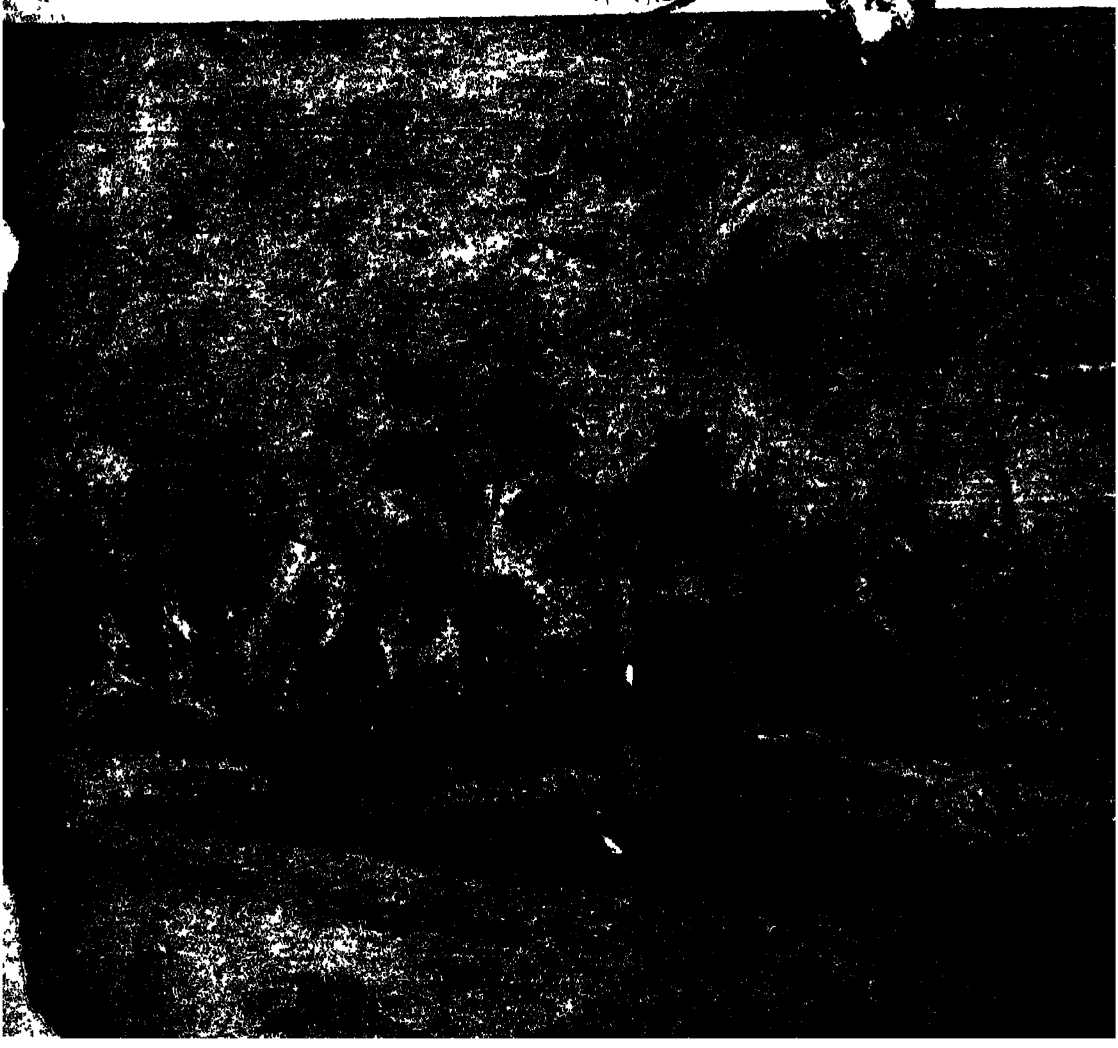
کہے گا وہ بار بار ہم سے سنائے جاؤ سنائے جاؤ
کچھ اس طرح اس کی انجمن میں حقیقتِ دل بیاں کریں گے

مجموعے میں ادگٹ شاہ وارثی، نوح ناروی، کلیم عبدالمجید گلزار دہلوی، کیفی دہلوی، نبار فتحپوری وغیرہ کی آرا شامل کر دی گئی ہیں۔

بہرحال عزیز وارثی کا مجموعۂ کلام "سفینہ و ساحل" پڑھ کر قاری کو وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو ایک اچھے مجموعہ کو پڑھ کر ہونی چاہیے اور یہی بات شاعر کی کامیابی کی دلیل ہے۔

عمدہ گٹ اپ، عمدہ کتابت وطباعت نے اس مجموعہ کی خوبیوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ دو سو صفحات کے اس مجموعے کی قیمت ۴ روپے کچھ ایسی گراں نہیں ہے۔ (بنده نواز)

R. N. 3461/57 SABA-MONTHLY REGD. NO. A 215



منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

مجلس مشاورت:-

حبیب الرحمن	فضل الرحمن
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم	رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر حفیظ قتیل	عالم خوندمیری
دلاور علی خاں	رضیہ بیگم
سعید بن محمد (آرٹسٹ)	

ایڈیٹر:-
سلیمان اریب

فون:- (۲۴۴۰۲)

کتابت:- محمد مظہر

زر سالانہ ہند و پاک سے	۱۰ روپے
ششماہی	۶ روپے
بیرون ہند سے	۲۰ شلنگ

دہلی آفس:-
۱۹۵۷، ترکمان گیٹ دہلی ۶

جلد	۹
شمارہ	۱۱
ماہ	نومبر
سنہ	۱۹۶۳ء
قیمت	ایک روپیہ

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:-
ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۴۰۲) کراچی ۲

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر سلیمان اریب ۵، ۱۱ مجردگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن ۵ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان



کیا آپ کسی سوچ میں گم ہیں؟
کافی
پیجیے
یہ وہی کافی جو آپ کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتی ہے ... کوئی چیز کافی سے بہتر نہیں ہوتی ... یعنی گرم اور اچھی کافی ہے۔ اسکی زبردست خوشبو ہی نہایت اطمینان بخش ہوتی ہے۔ ہمیشہ کافی ہی پیا کیجیے۔
کافی ہر حال میں اطمینان بخشتی ہے
اچھی کافی بڑی آسانی سے بن جاتی ہے۔ اس پر مفت کتابچہ ہم سے طلب کیجیے۔ اس زبان کا نام بھی لکھیے جو آپکو زیادہ پسند ہے۔
کافی بورڈ
بنگلور

اس شمارے میں

سرورق :- عروج مہر – عمل :- ایم۔ ایس منوہن دت

پہلے بات

ایک اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر کو جہاں اور بہت سے درد سر رہتے ہیں وہاں محکمۂ ڈاک سے بھی ہمیشہ جان ضیق میں رہتی ہے۔ خطوط، کتابوں اور رسالوں کا غائب ہونا (اگر وہ رجسٹری سے نہ آئیں یا نہ بھیجے جائیں) تو خیر روزمرہ میں ..... داخل ہے لیکن کبھی کبھی ازراہ تفنن رجسٹرڈ خطوط اور وی، پی بھی اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں تاہم محکمۂ ڈاک کی اس بات سے ضرور خوشی ہوئی کہ وہ اس باب میں مساوات کا قائل ہے اور اس کے نزدیک بڑے چھوٹے یا معروف وغیر معروف کی کوئی تخصیص نہیں۔ چنانچہ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام جولائی ۶۳ء میں بھیجے ہوئے ایک وی پی کی رقم نہ اب تک موصول ہوئی، اور نہ وی پی ہی واپس ہوا۔ وی پی بھیجنے کی تاریخ سے پورے ایک ماہ تک انتظار کرنے کے بعد بالآخر ہم نے ڈاک کے مقامی دفتر سے رجوع کیا اور درخواست دی لیکن تقریباً تین ماہ گزر جانے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چل سکا ہے کہ اس وی پی کا کیا حشر ہوا؟ جب ہم نے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور نادانی سے محکمۂ ڈاک کی کارکردگی پر تھوڑی سی تنقید کر دی تو جواب ملا "جناب! آپ تین ماہ کی مدت پر کیا چراغ پا ہو رہے ہیں۔ بعض صورتوں میں تو دو دو سال نکل جاتے ہیں اور تفتیش مکمل نہیں ہو پاتی لہذا ابھی توقف فرمایئے۔"

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد ہم فقیر کا غصہ فقیر کی جھولی پر کے مصداق اپنے دل کی بھڑاس اپنے رسالے ہی میں یہ چند سطریں لکھ کر نکال رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے محکمۂ ڈاک کے کان پر جوں بھی نہیں رینگے گی۔ اس کی اصلاح ہونا تو کجا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

"ہجو برج"

اورنگ آباد کالج کے اسٹاف کے لوگ اپنے پرنسپل بابائے اردو مولوی عبدالحق سے بہت محبت رکھتے تھے مولوی صاحب مرحوم ان کو اپنے خطوط میں یاراں اورنگ آباد کے نام سے یاد کرتے تھے اسٹاف میں بعض حضرات ایسے تھے جو انجمن کے لیے چندہ کر کے مولوی صاحب کو دلی سے اورنگ آباد بلاتے اور ان کی خدمت میں کیسہ زر پیش کرتے تھے ایک دفعہ مولوی صاحب اورنگ آباد آئے۔ ان دنوں وہاں جو تعلقدار تھے ان کو انجمن سے ہمدردی تھی مگر برج کے رسیا تھے کالج کے بعض اساتذہ ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اس کھیل کے انہماک سے خدا بچائے چنانچہ چندہ جمع نہ ہو سکا اور مولوی صاحب کی روانگی کے دن آ گئے۔ مولوی صاحب نے اس وقت مرزا رفیع سودا کا حربہ استعمال کیا اور برج پر ایک ہجویہ مثنوی لکھی جس میں اپنے احباب پر چوٹ کی۔ اتنا جتا دینا ضروری ہے کہ جن صاحب کو اس مثنوی میں نشانہ بنایا گیا ہے، ان سے مولوی صاحب کو بے حد محبت تھی اور وہ آخر تک ان کی قدر دل سے کرتے رہے بات یہ تھی کہ ان کو کام نکالنا تھا چنانچہ ان کا داؤں چل گیا اور فوراً چندہ جمع ہو گیا۔ مولوی صاحب نے یہ مثنوی منشی محمد علی صاحب کو دی تھی موصوف کے پاس ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مثنوی موجود ہے۔ یہ مثنوی یا مثنوی نما ہجو جو غالباً مولوی صاحب کی پہلی اور آخری شعری کوشش ہے اپنے اندر وہی شگفتگی اور روانی رکھتی ہے جو مولوی صاحب مرحوم کی نثر کی خصوصیت ہے اس "تبرک" کے لیے ہم جناب غلام ربانی صاحب کے ممنون ہیں۔ (اریب)

ہمارے اک محب رسیا برج کے
دوانے ہیں شب و روز اس کے پیچھے

نہ گھر کی کچھ خبر ہے اور نہ در کی
برج سے دل لگی آٹھوں پہر کی

اگر آئے کبھی گھر میں تو ایسے
مسافر آسرا میں اترے جیسے

ترستے رہتے ہیں صورت کو بچے
نہیں یہ چھوٹے منہ سے بات کرتے

رہی بیوی سو وہ ہے کون گنتیا
لگائے منہ سے کوئی بھلا کیا

بہت دن تک وہ دیکھا کی تماشا
کیا صبر اور کبھی ان کو نہ ٹوکا

چھلک ہی تو پڑا پیمانۂ صبر
کہاں تک کر سکے دل پر کوئی جبر

لگی کہنے کہ اے حضرت سلامت — ذرا آئینہ میں دیکھو تو صورت
رخ زیبا پہ زردی چھا رہی ہے — جوانی کی کلی مرجھا رہی ہے
تمہارے آج کل اچھے نہیں طور — کبھی اس پر کیا بھی آپ نے غور
نہیں بنتی ہماری اور برج کی — تو کیا سمجھا ہے مجھ کو لونڈی نج کی
نہ مانو گر برا تم تو کہوں میں — اب اس گھر میں رہے وہ یا رہوں میں
نہیں منظور اس کے ساتھ رہنا — چلی جاؤں گی گر مانا نہ کہنا
کہا شوہر نے سن . . . . . — پڑھاتی ہے یہ کس نے تجھ کو پٹی
برج کو چھوڑ دوں ممکن نہیں یہ — یہ رشتہ توڑ دوں ممکن نہیں یہ
برج ہے جان میری آن میری — برج سے ہے یہ ساری شان میری
برج کا راج ہے سارے جہاں میں — برج کا غلغلہ ہے لامکاں میں
برج سے منزل فرحت[1] چراغاں — برج ہے زندگی کا ساز و ساماں
برج ایمان و دین ابن آذر[2] — برج سرمایۂ عقبیٰ سراسر
برج پر میں فدا ہوں جان و دل سے — بنا ہوں میں اسی کے آب و گل سے
تمہیں جانا ہے بسم اللہ جاؤ — نہ یہ منحوس چہرہ پھر دکھاؤ
وہ یوں روتی ہوئی تب گھر سے نکلی — کہ جیسے خانماں برباد پگلی
خدا کی مار ایسے کھیل پر ہو — کہ جس سے یوں کوئی برباد گھر ہو
زن و فرزند سے جس نے چھڑایا — کیا دم بھر میں گھر بھر کا صفایا
نہ کھانا ہے نہ پینا ہے نہ سونا — برج ہے اور فرحت منزل[3] کا کونا
نہ یاروں سے رہی افسوس یاری — اگر کچھ ہے تو بس اک چار یاری

برج میں مبتلا ساری خدائی
دہائی دوستو، یارو دہائی

---

[1] فرحت صاحب . . . کا مکان [2] نام کی رعایت سے "ابن آذر" کہا گیا ہے۔
[3] فرحت صاحب کا مکان

ظ۔ انصاری

شامِ انتظار کا تنہا شاعر

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھیری ہے

"غزل" عمومیت اور رمز کی صنفِ سخن ہے۔ رودکیؔ کے زمانے سے لے کر اب تک ہزار سال سے اوپر ہوتے ہیں اور اس عرصے میں وسط ایشیا، ایران اور ہندوستان میں جہاں جہاں غزل کی صنف مقبول رہی شاعری اور زندگی نے بہت سے دور دیکھے ہیں لیکن "غزل" نے ہمیشہ استعاروں اور اشاروں کی زبان میں باتیں کی ہیں۔ اپنے ارد گرد کے حالات کے لیے خاص علامتیں تراشی ہیں اور ان پر خاص دعار رکھی ہے۔ اقبالؔ کے بعد فیضؔ پاکستان کا سب سے بڑا زندہ شاعر ہے جس نے "غزل" کی پرانی علامتوں کو نئے معنی دیے، اور نئے پیچیدہ تر حالات کے لیے نئے اشارے ایجاد کیے۔ اس کی شاعری گویا قدیم روایتی بادۂ سخن کا چار آتشہ ہے جسے تیار کرنے میں جدید ذہن اور آج کی تکنک سے پوری مدد لی گئی ہے۔

اوپر کا شعر ایک غزل کا آخری شعر ہے جو پاکستان کی دور افتادہ جیل میں اب سے ۵ سال پہلے کہی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیضؔ ایک فوجی بغاوت کی سازش کے ملزم کی حیثیت سے اپنے عزیز دوست سجاد ظہیر کے ساتھ لمبی سزا کاٹ رہے تھے اور جیل کی تپش میں ان کا سونا کندن ہو رہا تھا۔ ان کی سلگتی ہوئی غزلیں اونچی چار دیواری پھلانگ کر تمام اردو دنیا میں پہنچتی تھیں۔ جنگل کی آگ کی طرح ہندوستان اور پاکستان میں پھیل جاتی تھیں اور فیضؔ کی "طرزِ فغاں" شعر کی محفلوں میں طرزِ بیاں بن جاتی تھی۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھیری نہ بلبل کی زباں ٹھیری ہے

یہاں "قفس" جیل ہے "طرزِ فغاں" پروٹسٹ کرنے کا خاص انداز ہے "گلشن" سے مراد وطن اور اہلِ ذوق ہیں۔ "طرزِ بیاں" شاعری اور بیان کا نیا اسٹائل ہے۔ "صیاد" وہ بورژوا اور جاگیردار طبقہ جس نے پاکستان کو امریکی اجارہ داری کے قدموں میں ڈال دیا۔ "دستِ صیاد" اس کے جابرانہ اختیارات ہیں "گلچیں" جیل اور عدالت کا نظام ہے "کفِ گلچیں

ان کی کڑی پہرہ داری "بوئے گل" "وطن کی سچی آزادی و خود مختاری کا پاکیزہ جذبہ ہے جو شہروں اور جیلوں میں ہر جگہ یکساں اپنی لطافت قائم رکھتا ہے اور اسے بس مہکنے سے کام ہے" "بلبل" ہر وہ روشن فکر انسانیت دوست ہے جس نے "گل" کی محبت میں کانٹے چکھے ہیں اور "بوئے گل" پر جان قربان کی ہے۔ "بوئے گل" کی طرح "بلبل کی زبان" بھی کسی خوف یا لالچ سے "ٹھہرتا نہیں جاتی۔ اور یہ وہ مقام ہے۔ جہاں "صیاد" اور "گلچیں" دونوں کی تدبیریں اور بندشیں ناکام ہو جاتی ہیں۔

یہ الفاظ اردو زبان میں اس سے پہلے بھی تھے، ان کی اپنی ایک معنوی اہمیت اور باطنی صداقت اور اندرونی نغمگی بھی تھی لیکن فیض نے ان کو نیا ترنم دیا اور ان کی معنوی حدود کو پھیلایا ـــ ٹرانسمیٹر کی جو لہریں دلوں کو چھو کر گزرتی تھیں ان ہی میں اپنا پیغام نشر کیا، اور ان کی برقی قوت اور تیز کر دی۔ یہ ہے فیض کی شاعری کی دین، اور یہ ہے وہ شاعری جو ان کی اپنی زندگی کے تجربوں میں گھل پگھلا کر ایک خاص روپ میں سامنے آئی ہے۔

فیض احمد ۱۹۱۱ء میں مغربی پاکستان کے پرانے شہر سیالکوٹ میں ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے وہاں کی تعلیم مکمل کر کے پنجاب کی راجدھانی لاہور چلے آئے۔ یہ شہر شمال مغربی ہندوستان میں ادب، تعلیم، سیاست اور فلسفے اور مردانے زنانے فیشنوں کا سب سے بڑا اور زندہ مرکز تھا۔ لاہور کی سڑکوں، پارکوں اور کافی ہاؤسوں میں لمبے لمبے بے ترتیب بالوں اور موٹے فریم کے چشموں والے نوجوان عام طور سے اشتراکی سمجھے جاتے تھے اور اشتراکی سمجھا جانا فخر کی بات تھی۔ یہ شہر طالب علموں، استادوں، ادیبوں، اور اخبار نویسوں کا ایک جنگل تھا۔ جو علاقہ آج مغربی پاکستان میں شامل ہے اس کی زیادہ تر ذہنی فکری، مذہبی اور سیاسی تحریکیں اس کے بڑے بڑے شعرا، اہل قلم اور سماجی کارکن لاہور کی خاک سے اٹھے ہیں یا یہیں چمکے ہیں۔ فیض نے یہاں انگریزی اور عربی کی تعلیم مکمل کی۔ فارسی اور اردو کے اعلا ادبیات کے علاوہ انگریزی اور عربی کے ادبیات ہندوستانی اور عربی فلسفے اور آرٹ کا مطالعہ بھی یہیں کیا اور یہیں کے روشن خیال علمی اور ادبی حلقوں میں جو "زندہ دلان پنجاب" کہے جاتے تھے، شریک ہوئے۔

امرتسر کا ایم اے او (M.A.O) کالج دوسری جنگ عظیم سے پہلے پنجاب میں ترقی پسندوں کا ایک گڑھ بن گیا تھا۔ اس کے پرنسپل مشہور ہندوستانی کمیونسٹ محمود الظفر اور ان کی انقلابی بیوی رشیدہ جہاں (جن کی قبر کریملن کی دیوار کے نیچے ہے) ایسا مرکزی نقطہ تھے جن کے گرد ریڈیکل اہل علم کا ایک دائرہ کھنچا ہوا تھا۔ نوجوان فیض چار سال تک اس کالج میں انگریزی ادب کے لکچرر رہے۔ پھر لاہور کے مشہور تعلیمی ادارے ہیلی کالج میں آ گئے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند مصنفین کی بنیاد لکھنؤ میں رکھی جانے لگی تو فیض ایک خوش ذوق خوش پوش اور خوش گو نوجوان کی حیثیت سے شریک ہوئے لیکن اس وقت تک (جیسا کہ خود ایک بار فیض نے سنایا) نہ ان کے پاس مشاعرے میں اندر جانے کا ٹکٹ تھا، نہ دوسرے مشہور شعرا کے ساتھ اپنا کلام سنانے کا دعوت نامہ۔

فیض کی شہرت ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی جب ان کا پہلا مجموعہ "نقش فریادی" نکلا۔ "نقش فریادی" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے "فریاد" اور "فنکارانہ" "نقش" کا حسین امتزاج ہے۔ اس میں تازگی بھی ہے اور پختگی بھی۔

اسے ملک کے سامنے پیش کرتے ہوئے فیض نے ایک تھکن کا اعلان کیا تھا۔

"ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دست نگر رہتی ہے۔ اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے، یا ان کے اظہار کے لیے کوئی راستہ پیش نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے یا طریقہ اظہار کو ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورت حالات پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے، اہل محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے . . ."

(دیباچہ نقش فریادی ۱۹۳۹ء)

چنانچہ ۱۳ غزلوں، چند اشعار اور کوئی ۲۰ نظموں کا نہایت مختصر سا مجموعہ دینے کے بعد وہ اہل محفل کا شکریہ ادا کرنا اور شاعر کی حیثیت سے بالکل رخصت ہو جانا چاہتے تھے۔ لیکن ملک کی سیاسی اور سماجی تحریکوں میں ابال آیا۔ جنگ عظیم آئی اور نئی نسل میں ایک ہماہمی پیدا ہوئی۔ یہی وہ اسباب تھے جنھوں نے آئندہ کے شاعر اور سماجی رہنما کی شخصیت کے خدوخال تیار کیے۔

جنگ کا رخ فاشزم کے خلاف مڑ جانے کے بعد فیض بھی فوج کے شعبۂ اطلاعات میں ملازم ہو گئے۔ اتفاق سے یہاں بھی ان کو اپنے قریب اہل علم اور اہل ذوق کا اچھا ہوا مجمع ملا۔ یہیں وہ لفٹنٹ کرنل ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک فوج میں رہے۔

وہ شخص جو ارد گرد کے جابرانہ نظام، محنت کشوں کے بھیانک استحصال اور زندگی کے بدصورت مناظر سے تنگ آکر یہ نیت رکھتا تھا۔

. . . " لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دلآویز خطوط !
آپ ہی کہیے، کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے ؟

اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں "

وہی شاعر جو بھیانک حقیقت اور دلکش رومان کے دوراہے پر خود کو بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔

. . . " اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت، مری محبوب نہ مانگ"

ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ۱۹۴۷ء خود فیض کے لفظوں میں ایک:

"داغ داغ اجالا" اور "شب گزیدہ سحر"

تھی جس نے تھکے ہوئے ذہنوں کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا اور جاگتے ہوؤں کو چونکا دیا۔ جس فیض کی آواز اور جس کے قلم کی ہر جنبش آج پاکستان اور ہندوستان کے ایک ایک گوشہ میں سنائی دیتی ہے، یہ دراصل وہی فیض ہے جو ۱۹۴۲ء کے بعد نئی امنگ کے ساتھ چونکا اور نئے موڑ پر روانہ ہوا۔

۱۹۴۸ء سے انھوں نے پاکستان کے سب سے ترقی پسند انگریزی روزنامے کو چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے عروج دیا اور اردو کے بیباک روزنامے "امروز" کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ ایک طرف انہیں ملک کی اخباری دنیا میں ایک لائق اور بیباک جرنلسٹ تسلیم کیا گیا، دوسری طرف پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر چنے گئے اور مزدوروں کے جلسے میں "وصل کی راحت کے سوا" "دوسری" راحتوں کا مطالبہ کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کے قلم نے ڈٹ کر پاکستان کے لیے ایک آزاد جمہوری نظام اور آزاد خارجہ پالیسی کا مطالبہ کیا۔ امن عالم کی ہر تجویز کی کھلم کھلا تائید کی۔ ان کی یہ اخباری اور سماجی شخصیت اونچے سیاسی حلقوں میں کافی گونجی اس پر فیض نے ایک لطیفہ سنایا۔

پاکستان سے اس زمانے میں ایک پارلیمنٹری وفد چین گیا تھا۔ اس کے لیڈر مشہور سیاست داں ایوب کھوڑو تھے۔ چین کی یونیورسٹی میں بعض طالب علموں نے ان سے پاکستان کے موجودہ شاعروں کے بارے میں دریافت کیا اور ان کی زبانی فیض کا نام نہ سن کر چینی طالب علموں نے خاص طور پر فیض کی شاعری پر سوال کیے۔ وفد کے لیڈر ایوب کھوڑو حواس باختہ ہو گئے اور بولے:

"ہم تو فیض کو ایک لائق ایڈیٹر اور ایک خاص پالیسی کے نقیب سمجھتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم وہ شاعر بھی ہیں۔"

بعد میں جب کراچی میں فیض سے ملے تو انھوں نے یہ واقعہ سنایا اور کہا۔

"بھائی، یونیورسٹیوں کے طالب علم اس قسم کے سوال کرتے ہیں، تم اپنی شاعری کے متعلق بھی ہمیں بتاؤ تاکہ ان سوالوں کے جواب کے لیے بھی ہم تیار رہا کریں۔"

۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو وہ ایک فوجی بغاوت کی سازش (راولپنڈی کانسپریسی) کے الزام میں گرفتار ہو گئے اور چار برس مختلف جیلوں اور ہسپتالوں میں رہے۔ یہی وہ گوشۂ تنہائی تھا جس نے انھیں اپنے فن کو صیقل کرنے کا جذباتی شدت کے لیے نئے طریق اظہار اختیار کرنے کا جبری موقع دیا۔ آنکھیں جب تاریکی سے مانوس ہو گئیں تو انھوں نے "روزنِ دیوار" کی ایک کرن کو پیار کیا اور صبا کے ایک ایک جھونکے کے ہاتھ پیغام کہلوائے۔ اپنے شہر کی گلیوں اور اپنی محبتوں کی دوری نے زندگی کی حسین نعمتوں، لطیف یادوں، پُر کیف لذتوں کو دھندلا اور کمزور نہیں کیا انھیں خواب و خیال کا ایک ہالہ دے کر اور حسین و دلآویز بنا دیا۔"

شاعر اپنے وطن سے کہتا ہے

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

لاہور جیل کی دیواروں پر شہر کی روشنیوں کا عکس پڑ رہا ہے اور وہ پکارتا ہے:

اے روشنیوں کے شہر!
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو

افریقہ کے دبے کچلے عوام آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے اٹھتے ہیں یا ایرانی طالب علموں پر سڑکوں پر گولیاں چلتی ہیں تو وہ جیل میں کراہتا ہے اور نہایت خوبصورت نظموں کی صورت میں لبیک کہتا ہے۔

یہاں پہنچ کر "شہر" اس کی "روشنیاں" اور اس کی "لیلائیں" ان کی "ارمانوں کی رو" سیاہ افریقہ اور گندمی ایران سب ایک ہو گئے۔ یہ انسانی محبت کا وہ گہرا سمندر ہے جس کی اونچی نیچی موجوں میں اپنے شبستان، اور اپنی سڑکیں اپنے بیوی بچے، گھر احباب، اپنے خستہ حال عوام اور اپنی خوش اندام حسینائیں، آزادیٔ وطن کے شہید اور قوم کی خوشحالی اور سربلندی فرد اور سماج کا تصور سب گھل مل کر یکجاں ہو گئے ہیں ؎

"دو عشق"

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی، رسوا سرِ بازار

یا نظم "دریچے"

گڑ جے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

(دستِ صبا) اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل   ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

جیلوں میں جو ادب مختلف زبانوں اور مختلف زمینوں میں پیدا ہوا ہے اس میں فیض کی شاعری کے اس مختصر سے مجموعے "زنداں نامہ" کو غالباً ایک لافانی مقام ملے گا کیوں کہ اس کی دھیمی اور مترنم آواز، اس کا دل سوز لہجہ، حیات و کائنات کا ایک گہرا درد اور سادگی اور روحانی لذتوں کی تلاش ایسی صفات ہیں جو پڑھنے والے میں ہر قسم کی جیل اور قید و بند سے سخت نفرت اور ہر قسم کی آزادی اور مسرت سے جاندار محبت پیدا کرتی ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ملک کے عام الکشنوں میں با اقتدار جماعت مسلم لیگ کو شکست ہوئی مشرقی پاکستان (بنگال) کے کسانوں مزدوروں اور طالب علموں کی متحدہ کوششوں نے ایک لبرل اور جمہوری پارٹی عوامی لیگ کو مرکز اور صوبوں میں اقتدار سونپا تو

فیض اور ان کے ہمدم جیل سے آزاد ہوئے ۔ اور پھر "پاکستان ٹائمز" کی ایڈیٹری پر لاہور واپس ہو گئے ۔

۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان کی امن کونسل کے جنرل سکریٹری چنے جا چکے تھے ۔ جنیوا میں انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے اجلاس میں پاکستان ٹریڈ یونین کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہو چکے تھے ۔ اب وہ صحافی اور امن عالم کے حامی کی حیثیت سے انٹرنیشنل جلسوں میں اور کھل کر حصہ لینے لگے ۔ ۱۹۵۸ء میں تاشقند میں جب افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہوئی اس میں فیض نے بعض ہندوستانی نمائندوں سے بھی زیادہ دلیری کے ساتھ نوآبادیات کے خاتمے کے سوال پر افریقی نمائندوں کا ساتھ دیا ۔ اسٹاک ہوم کی کانفرنس میں ان کی تقریریں خاص کر گونجیں ۔

مجھے وہ رات یاد آ رہی ہے جب ، ۷ نومبر ۱۹۵۸ء کا تہوار ہم نے اپنے ہندوستانی رواج کے مطابق ماسکو میں "رتجگا" کر کے منایا ۔ پاکستان کے سیاسی حالات دو دن پہلے زیر و زبر ہو گئے تھے ۔ صبح ہوتے ہی میں نے ان کی رائے طلب کی تو انہوں نے کہا ۔ ابھی چند گھنٹے اور انتظار کرو ۔ ابھی ایک زبردست تبدیلی اور ہوگی اور وہ یوں ہوگی ۔ تین چار دن بعد پاکستان ریڈیو نے اس تبدیلی کی بھی اطلاع دے دی ۔ نئی فوجی حکومت بن گئی اور مارشل لا قائم ہو گیا ۔ فیض کے گول چہرے پر جیل کی بے رنگ زندگی کا سایہ گہرا تھا لیکن ان کے ہونٹوں کا تبسم ، آنکھوں میں ٹھہری ہوئی جھیل کی سی گہرائی اور سکون اور ان کے بازوؤں کی صلابت قائم تھی ۔ ان کے بعض اہم خیر خواہوں نے ماسکو میں کچھ دن ٹھہر جانے اور آرام کر لینے کا مشورہ دیا ۔ کہنے لگے یہی امتحان کا وقت ہے ۔ میں جاؤں گا تو شاید ہوائی اڈے سے گھر تک نہ پہنچ سکوں ، لیکن اسی وقت پہنچنا چاہیے ۔ وہ چلے گئے اور بعینہٖ یہی واقعہ پیش آیا ۔

"پاکستان ٹائمز" اور اس سے متعلق تمام اخبار اور رسالے نئی فوجی ڈکٹیٹرشپ نے بحق سرکار ضبط کر لیے ۔ اور فیض جب کچھ دنوں بعد رہا ہوئے تو جرنلزم کا خلعت ان کے بدن سے اتر چکا تھا ۔ تمام سیاسی پارٹیاں خلاف قانون قرار دی جا چکی تھیں ۔ ایک فلم "جاگو ہوا سویرا" جس کی کہانی اور سینریو فیض کا لکھا ہوا تھا ۔ اس کی نمائش پاکستان میں روک دی گئی تھی ۔ ان کی زبان اور قلم کے لیے سارے پلیٹ فارم بند تھے ۔ ارباب اقتدار میں ان کے ذاتی دوستوں نے کوشش کر کے پاکستان آرٹ کونسل کا ایک اعلیٰ عہدہ (ڈپٹی ڈائرکٹری) انھیں پیش کیا ، اور وہ رضامند ہو گئے ۔ آج کل وہیں پر ہیں ۔ (جب یہ مضمون اشاعت کے لیے اردو میں بھیجا جا رہا ہے ، فیض تقریباً ڈیڑھ سال سے لندن میں ہیں اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کرنے کی سوچ رہے ہیں)

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

. . . .

فیض کی روزمرہ کی زندگی بھی قابلِ رشک ہے۔ حسن و لطافت سے ان کی دلبستگی محض خیالی نہیں، انھیں ہر زمانے میں اپنے ملک کے بہترین ذہنوں سے قریب اور ہمسفروں میں نمایاں رہنے کا موقع ملا ہے، اور ہر زمانے میں نوجوان ترقی پسند نسل میں ان کی شخصیت ایک مرکزی نقطے کی سی رہی ہے۔ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کے ادارے، ایک ایسے مرکز تھے جہاں اردو اور انگریزی کے ترقی پسند، ہر دلعزیز اہلِ قلم جمع رہتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں مجھے لاہور سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ سی آئی ڈی والے سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہے۔ بڑی بے چینی تھی کہ ان لوگوں کا دیدار کرتا چلوں جو اپنی زبان اور قوم کے سچے سپوت ہیں۔ ان کے دفتر پہنچا، بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ فیض اور ان کے عزیز دوست اردو کے ترقی پسند حقیقت نگار افسانہ نویس اور پُرگو شاعر احمد ندیم قاسمی (جن کا انتخاب روسی زبان میں ترجمہ ہو کر چھپ چکا ہے) وہاں موجود تھے۔ سبطِ حسن اور حمید اختر تھے اور چھوٹے بڑے ستاروں کا ایک جھرمٹ تھا۔ وہاں سے ہم فیض کے صاف ستھرے کشادہ مکان پر گئے اور دیکھا کہ ان کے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں آرٹ اور فلسفے کی جدید ترین کتابیں کہیں کہیں سے کھلی رکھی تھیں۔ وہ اکثر رات گئے تک مطالعہ کرتے ہیں۔ اور ان کی خوبصورت شائستہ انگریزی بیوی اور بچیاں، جو سب اعلیٰ درجے کی اردو بولتے ہیں، فیض کی اس اعلیٰ شاعرانہ زندگی میں صبح اور رات کی خوشگواری کا اضافہ کرتے ہیں۔

فیض کی اس زندگی کی جھلک اور اس کی نرم آنچ بھی ان کی شاعری اور ان کے برتاؤ میں شامل ہے۔ غصے اور جھنجلاہٹ نفرت اور کینے اور چیخ پکار کا دور دور تک گزر نہیں ہے۔ یہی کیفیت ان کے تنقیدی اور سیاسی مضامین میں بھی عام ہے۔ "رقیب سے" ان کی ایک نہایت خوبصورت نظم ہے۔ وہ اپنے رقیب کو محبت میں اپنا حریف نہیں، شریکِ جان کر اس طرح دل کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی محبوب سے کرتا ہے؎

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے
جُز ترے، اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

محبوب ان کے لیے نہ محض خیالی پیکر ہے نہ کوئی ذاتی ملکیت، وہ خوشبو، خیال، وجود اور سائے کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ میں جب انھیں اپنے محبوب سے شکایتیں کرتے دیکھتا ہوں، مثلاً:

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

تو مجھے بے اختیار شکن کی وہ نظم یاد آتی ہے جو اس مصرعے پر ختم ہوتی ہے ؎

جس نزاکت سے لگن سے تجھے چاہا میں نے

ایسے ہی اور بھی چاہے کوئی، اللہ کرے

اور بلینسکی کے وہ الفاظ

"۔۔۔ وہ وقت آئے گا جب اسے روس میں کلاسکی شاعر شمار کیا جائے گا۔ اور اس کی تخلیقات صرف جمالیاتی شعور کی تربیت کا نہیں بلکہ اخلاقی تربیت کا بھی ذریعہ بنیں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(بلینسکی۔ منتخبات، جلد اول)

. . . .

فیض کی شاعری میں انتظار کی کیفیت، تنہائی کا احساس اور شام کا درد یہ تین عناصر شروع سے آج تک بہت رہے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے انتظار، تنہائی اور شام کے الفاظ، ان کے رنگا رنگ استعارے، ان کے باریک سے باریک پہلو اور نازک رنگ بھی جا بجا ملتے ہیں۔ جن لوگوں نے گرم مشرقی ملکوں کی بیمار شاموں کی نبض دیکھی ہے، وہ مانیں گے کہ شاید ہی دنیا کے ادبی مشاہیر میں شام اور تنہائی کے احساس کو کسی نے ایسے اپنے سینے میں سمیٹا اور بیان کیا ہوگا۔ جیسے فیض نے۔ میں فیض کی آواز اور اس کے تمام انداز اگر ایک جملے میں کہنا چاہوں تو اسے "شام انتظار کا تنہا شاعر" کہوں گا۔ ان کے تھوڑے سے کلام میں اس کی کس قدر پے در پے مثالیں ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

پھر کوئی آیا، دل زار، نہیں کوئی نہیں۔۔۔

"تنہائی" (ص۷۹ نقش فریادی)

"موضوع سخن" گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام

(ص۹۷ نقش فریادی)

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟

حسرت دید ناتمام رہے؟ (نقش فریادی ص۴۳)

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں

اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گزر بھی نہیں

(نقش فریادی ص۴۳)

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم   (نقشِ فریادی صـ۸۳)

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے"

"ہم لوگ"   دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے

"اے دلِ بیتاب ٹھہر!"   تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے   (صـ۱۴ دستِ صبا)

"طوق و دار کا موسم"   روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم   (صـ۳۵ دستِ صبا)
شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے   (صـ۴۹ دستِ صبا)

"دو عشق"
تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا   کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو   ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں
(صـ۹۰ دستِ صبا)

"زنداں کی ایک شام"   شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات   (صـ۱۰۴ دستِ صبا)

"یاد"   دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں   تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں   (صـ۱۱۵ دستِ صبا)

شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی   (صـ۲۵ زنداں نامہ)

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے   (صـ۲۷ زنداں نامہ)

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
(ص ۹۵ زنداں نامہ)

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
(ص ۹۰ زنداں نامہ)

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم

"شہریاراں"
اے صبا شاہد تمہارے ساتھ، یہ خوں رنگ شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہر یاراں کی طرف
(ص ۹۵ زنداں نامہ)

یہ محض الفاظ نہیں ہیں بلکہ زندہ رہنے اور زندگی کو برتنے کے ایک خاص انداز کا اظہار ہوتا ہے ان سے شام کے دل و دماغ کی ایسی کیفیت ان میں کھلتی ہے جو ہزار مصروفیتوں اور تبدیلیوں کے باوجود زیریں لہر کی طرح قائم اور متحرک رہا کرتی ہے۔ کس کا انتظار رہا ہے فیض کو۔ یہ کیسی شام ہے کہ اُترنے کا نام نہیں لیتی؟ یہ کہاں کی تنہائی ہے جس کا مداوا نہیں ملتا؟ کیا اس کا جواب صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ شاعر کے حساس قلب و دماغ اور پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کا تصادم ان الفاظ کے پس پردہ چھپا ہوا ہے؟ نہیں ـــ یہ تو محض ایک پہلو ہے حقیقت کا۔ تنہائی کا احساس شام کا وقت اور انتظار کی کیفیت، یہ سب ایک ہی پُرسوز تصویر کی کلر اسکیم ہے فیض اپنوں میں ہو یا بیگانوں میں، اخبار کے دفتر میں ہو یا جیل کی کوٹھری میں وہ دھیمی آنچ کا شاعر ہے، جس سے نہ شعلہ اٹھتا ہے، نہ دھوئیں کی لپٹیں نکلتی ہیں۔ اس کی فکر متحرک اور باخبر ہونے کے باوجود دردمند مزاج کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ اور فکر و فن کے سوز و ساز کا یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر فن کار اپنے زمانے کے بہت بعد تک دلوں کو گرماتا رہتا ہے، بہت دلوں تک 'نشاطِ غم' کا سامان مہیا کرتا رہتا ہے۔

فیض آج کل شعر کے کچھ نئے تجربوں میں معروف ہیں اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اُن کے یہ تجربے، اب تک کی شاعری کے زیرِلب انداز کو اور ابھار کر سامنے لے آئیں گے، وہ اپنی اس روش سے بیگانہ نہیں ہوں گے۔

رنگِ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
(فیض)

کوثر چاندپوری

حامد بھوپالی کا آہنگِ غزل

شاعری کا جذبہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی، انسان شروع ہی سے اس فطری ملکہ کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ رنج و الم کی آنچ نے پہلی بار اس کی شمعِ احساس میں گداز پیدا کیا تو اس نے نظم ہی میں اپنے محسوساتِ غم کا اظہار کیا، اس کے بعد شاعری قانونِ ارتقا کے مطابق ابتدائی سانچے بدلتی رہی، آگے چل کر اس کی اصناف متعین ہوئیں اور اس برقِ تپاں کو فن کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا، اس پابندی سے فکر، جذبہ اور خیال کی تربیت ضرور ہوئی۔ لیکن جس طرح نسیمِ صبح گاہی کو غنچے کھلانے کے آداب سکھانے غیر ضروری ہیں اور جس طرح آبشار کو روانی کی تعلیم دینا مضحکہ خیز ہے، اسی طرح فطری جذبات پر کوئی قید و بند عائد نہیں کی جا سکتی، جذبۂ فکر اور خیال کی بلندی و پستی، شدت اور گہرائی سب وہبی چیزیں ہیں، اسی لیے اکثر اوقات افکار و خیالات کے تیز و تند طوفان ان دیواروں کے اوپر سے گزر گئے جن میں انھیں اسیر کرنے کی کوشش کی گئی تھی، تاہم اصول و قواعد نے اُن کی سرکشی کو کمزور کر دیا۔ اسی کے ساتھ وحشیانہ خصوصیات کو تہذیب و شائستگی میں بدل دیا، غزل اصنافِ شاعری میں سب سے زیادہ محبوب اور مقبول ہے، یہ داخلی جذبات کا بیان رمز و اشارہ کی زبان میں کرتی ہے، اور فن کار کی شخصیت سے شدید طور سے متاثر ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غزل میں جن داخلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے ان میں بیرونی عناصر کی اہمیت نہیں ہوتی، درحقیقت داخلیت کا سرا خارجیت کے ساتھ شدت سے مربوط ہے تاثرات کی رَو باہر کی دنیا سے اندر کی دنیا میں پہنچتی ہے اور اپنے ساتھ خام مواد بھی لے جاتی ہے اسی کو داخلیت اپنی مدھم آنچ پر آہستہ آہستہ پکا کر تخلیق کی ایک متعین شکل دے دیتی ہے۔ فنکار داخلیت کی اندھیری کوٹھری میں بیٹھ کر تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کا ذہن و شعور کھڑکیوں سے ہر وقت بیرونی دنیا میں جھانکتا رہتا ہے اور تاثرات کی لہریں لگاتار پہنچتی رہتی ہیں اور پھر پال میں دبے ہوئے پھل کی طرح وہ کسی حسین و جمیل فن پارے کی شکل میں ڈھل جاتی ہیں، ضروری نہیں کہ داخلی شعور باہر سے جو تاثرات جذب کرے انھیں فوراً ہی تخلیق میں منتقل کر دے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ جذبہ جو کسی خارجی اثر سے پیدا ہوتا ہے وہ برسوں دماغی فضاؤں میں محوِ پرواز رہتا ہے اور بتدریج اندرونی گرمی سے پگھلتا رہتا ہے آخرکار ادب پارہ بن جاتا ہے اس کی مثال تنور کی کی اس روٹی کی سی ہے جس کی ہر چیز بیرونی ماحول سے مہیا ہوتی ہے اور تنور کی آگ ایک خاص درجۂ حرارت پر پکا کر اسے

یاذالقہ نئی تاثیر اور نیا رنگ روپ بخش دیتی ہے تخلیق کے مختلف مدارج اور فنکارانہ باریکیوں کو سمجھنے کے لیے جنین اور بطن اور کو بھی ذہن میں رکھا جا سکتا ہے۔ بہرکیف اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ غزل میں داخلیت کی بڑی کارفرمائی ہوتی ہے اور وہ ایجاز و اختصار، اور رمزیت و اشاریت کی طالب ہے ابتدا میں غزل کا جو انداز بھی رہا ہو میں اس سے بحث نہیں کروں گا صرف یہ بتاؤں گا کہ گزشتہ صدی میں اس نے حیرت انگیز صلاحیت کا ثبوت دیا ہے وہ ناسخ اور شاہ نصیر کی صنعت کاریوں کے طلسم سے آزاد ہو کر غالب، حالی، اور اقبال کی ذہنی فضاؤں میں فلک پیمائی کی مشق کرتی رہی ہے۔ اس نے اظہار و بیان کے نئے ڈھنگ اپنائے ہیں۔ لب و لہجہ میں متانت اور سنجیدگی پیدا کی ہے، اور حسن و عشق کی نزاکتوں کے لیے وقف رہ کر بھی سماجی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی مسائل کی گرہ کشائی میں حصہ لیا ہے، غزل کے لیے محبت بنیادی عنصر ہے وہ محبت ہی کی فضا میں پیدا ہوئی اسی کی زبان میں بولنا سیکھا، محبت ہزار شیوہ ہے، غزل نے اس کی ترجمانی کے لیے اپنی تمام شیوا بیانیوں سے کام لیا، اور اس ہنگامہ کو دبا دیا جو اس کے "شیش محل" پر سنگ باری کرنے کے لیے اٹھا تھا، موجودہ دور میں وہ اپنے مخصوص لب و لہجہ اور آہنگ کے ساتھ زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کر رہی ہے۔ فکر و خیال کی بے اعتدالیوں کو غزل اپنے دامن سے جھٹک چکی ہے اس کا سانچہ وہی ہے لیکن لب و لہجہ بدل چکا ہے، قدیم تشبیہات و استعارات کو نئے معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے اور اس طرح غزل کی پرانی رگوں میں نیا خون داخل کیا جا رہا ہے جس میں نئے ولولے اور نئے ہنگامے تڑپ رہے ہیں اس میں حسن و عشق کی چنگاریاں بھی ہیں اور غم روزگار کے آنسو بھی، ایک کامیاب غزل کی تخلیق فن کار کی شخصیت پر منحصر ہے۔ وہ جس قدر بلند، ہمہ گیر، اور غیر معمولی ہوگی جذبہ فکر اور خیال میں اتنی ہی رفعت، گرمی اور گہرائی ہوگی۔ غزل صحیح معنی میں ایسی پل صراط ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے یہی وجہ ہے کہ وہ جس قدر عام ہے اچھے غزل گو شاعروں کی تعداد اتنی ہی محدود ہے۔ ایران اور ہندوستان سے غزل کو تاریخی مناسبت رہی ہے۔ ایران سے غالباً اسی لیے کہ وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے "یوسفستان" کا درجہ رکھتا ہے۔ اور ہندوستان حسن و رومان کی سرزمین ہے اس کی آغوش میں محبت کی نہایت حسین یادگاریں موجود ہیں۔ غزل ہندوستان کے اسی مزاج کا پرتو ہے۔ بھوپال ہندوستان ہی کا ایک حصہ ہے جو اپنی آب و ہوا کے لحاظ سے غزل کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ یہاں قدرتی مناظر کا حسن ہمیشہ زلف و گیسو کی خوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ رہا ہے اسی ہم آہنگی نے اسے احساس جمال کی نزاکتیں دی ہیں، حامد بھوپالی اپنی غزل میں جہاں ان خصوصیات کی ترجمانی کرتے ہیں وہیں بھوپال کی غزل گوئی کے روایتی قالب کو عصری رجحانات کے مطابق بناتے اور اسے موجودہ معیار غزل سرائی کے برابر لانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے متعلق یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ ان کا اصل رجحان غزل کی طرف ہے دوسری اصناف شاعری سے حامد کو صرف اتنا ہی تعلق ہے جتنا ہر موزوں طبع شاعر کو ہو سکتا ہے۔ غزل جیسا کہ میں بتا چکا ہوں محبت کی زبان میں اظہار جذبات کرتی ہے، حامد کی زبان بھی یہی ہے ان کے لب و لہجہ میں وہی نرمی، وہی لوچ، اور وہی یقین ہے جو صرف محبت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اور اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ شخصیت کا ایک تعمیری عنصر بن جاتی ہے پھر بھی انہیں صرف "حسن و عشق" کا شاعر نہیں کہا جا سکتا ان چیزوں سے زیادہ ان کی نگاہ حیات انسانی کے ان گوشوں تک پہنچتی ہے جن کا شعور فنی اور

زندگی کے تجربات سے بتدریج انھیں حاصل ہوا ہے۔ حامد کی غزل کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں سطحی رومانیت کا شائبہ تک نہیں، وہ زندگی اور اس کے تقاضوں سے انحراف بھی نہیں کرتے۔ حامد کی غزل میں جگہ جگہ انقلابی رومان کی گرمی محسوس ہوتی ہے ان سب سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ حامد انسان کی عظمت اور سربلندی کا اعتراف کرتے ہیں، اور اس کے عزائم کی بے پایاں حدود کا احساس رکھتے ہیں، وہ عالم امکاں کو اس کی تگ و تاز کے لیے محدود خیال کرتے ہیں اور اس کے مستقبل کو حسین سے حسین تر دیکھنے کی تمنا میں سرشار نظر آتے ہیں۔ انھیں انسان کی کوششوں پر پورا اعتماد ہے وہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں اور ان کی مساعی کو جاری رکھنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ حامد زندگی کے قافلے کی سست روی کو پسند نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے سماج کی وسعت اور زندگی کے تجربات کی بنا پر عرفی شیرازی سے بھی ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں جس نے ذوق نغمہ کو بڑھانے اور محمل کی گراں باری کا احساس گھٹانے کے لیے تلخ نوائی اور حدی خوانی کی لے بلند کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

حامد جانتے ہیں کہ زندگی کا سفر طویل اور منزل دور ہے، راستہ میں بے شمار نشیب و فراز ہیں اسی احساس کے تحت وہ میر کارواں سے تیز گامی کا مطالبہ کرتے ہوئے پکار کر کہتے ہیں۔

تیز ترک گام زن !

ان کا یہ مطالبہ رجز، ترانہ، نوا اور نازیانہ کے باہمی امتیاز کو نظر انداز کر دیتا ہے اور پورا اعتبار قافلہ سالار کو سونپ دیتا ہے۔

کوئی رجز ہو کہ ترانہ کوئی نوا ہو کہ تازیانہ

جو قافلے بڑھ رہے ہیں ان کو کسی طرح تیز گام کر دو

حامد انسان کے ارادوں اور اس کی مساعی پر یقین رکھتے ہیں ان کے سامنے بھی اس کی نگاہ میں نہیں وہ چاہتے ہیں کہ آدمی صحیح طریقے سے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائے، اپنا سفر جاری رکھے اور آرام و راحت کی خواہش کو ملامتِ جستجو کی کرنی پر غالب نہ آنے دے۔ اس طرح اس نقطۂ عروج پر پہنچنے کے لیے جس کا ابھی صحیح تعین بھی نہیں ہو لگاتا رہا [illegible] ہے، ان کے خیال میں اگر اس سفر کی کوئی منزل ہے تو وہ انسانیت کا حسین و جمیل مستقبل ہے جس میں حیات کے پژمردہ رخسار اگر گوں نظر آنے لگیں، اور زندگی کے زلف و گیسو آپ ہی آپ سلجھ جائیں، کہیں کہیں وہ اس سعی و کاوش کے انجام کی نشاندہی کرتے ہوئے ایسے ہی بلند مقامات کی جانب اشارے تو مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جا بجا ایسے اشعار سامنے ہیں جن میں سعیِ پیہم کی تلقین اور جمود و تعطل سے بیزاری کا اعلان موجود ہے۔

میں کہاں اور یہ سکونِ ذوقِ بے حاصل کہاں

چیختی رہتی ہے منزل اور گزر جاتا ہوں میں

تو اٹھ تو سہی تابع کیے عزم ہے دنیا امروز میں گنجائشِ فردا نہ رہے گی

ہتی دستاں ساغر سیکڑوں پر کراں ہوں گے   چھلک جائے گا جس دن بادۂ ناخوشگوار اپنا

اے جہد مستقل وہ مل جائیں اب کے شاید
اک جان رہ گئی ہے اس کی بھی ایک بازی

کسی ایجاد سے پہلے اس کا تصور انسانی ذہن میں آتا ہے یہ تصور ہی اسے عالم وجود میں لاتا ہے زندگی کے نئے گوشوں، نئی دنیاؤں اور مستقبل کے حسن و جمال کا تصور سائنسداں بھی کرتا ہے ادیب اور شاعر بھی دونوں کا انداز جداگانہ ہوتا ہے شاعر جمالیاتی نقطہ نظر کا پابند ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ جس سرزمین امن و محبت پر خلائی تسخیر اور چاند اور مریخ پر کمندیں پھینکنے کے منصوبے بنائے گئے وہاں کے سائنسدانوں کا انداز فکر کیا تھا لیکن حامد ایک دانشور کی حیثیت سے انسان کو بلند پروازی اور فلک پیمائی کا حوصلہ دیتے ہیں، ذیل کے اشعار کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مخاطب وہ خلائی مسافر ہے جو آسمانوں کو روندڈالنے کے ارادے سے روانہ ہوا ہے ؎

اسرار حقیقت میں ابھی تشنۂ مستی   ساغر بکف اس گنبد مینا سے گزر جا
یہ بھی نہیں آرا اگر رہرو الفت
بے سانس لیے سایۂ طوبیٰ سے گزر جا

محبت کی کیفیات نہایت گوناگوں ہیں، محبوب کے شیوۂ بے نام کو شمار کرنا بھی مشکل ہے، اس کا ہر شیوہ، ہر انداز تاثرات کے لحاظ سے بے پایاں ہوتا ہے۔ شاعروں نے اور مختلف صورتوں سے محبت اور اس کی تاثیرات کی توضیح کی ہے۔ کسی نے اس کو سینے کی آگ سے تشبیہ دی ہے اور کسی نے نگاہ و دل کے تصادم کی ہنگامہ سامانیوں کو صرف اضطراب دل ہی سے تعبیر کیا ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں ؎

محبت کا کیا پوچھتے ہو اثر   نظر مل گئی دل دھڑکنے لگا

حامد اس کا اعتراف تو نہیں کرتے کہ انھوں نے کبھی محبت کی ہے لیکن تاثیرات عشق کے متعلق ان کی پیشین گوئی سے تجربہ کی پختگی بلکہ تلخی کا اظہار ہوتا ہے وہ اکبر کے ہمنوا نظر آتے ہیں

حسن کافر سے تصادم ہو گیا حامد اگر
دل کی اور بجلی کی حالت ایک سی ہو جائیگی

. . . .

آنسو بظاہر پانی کی بے حقیقت سی بوندیں ہیں لیکن ان سے جن جذبات کا پتہ چلتا ہے ان کی نوعیت مختلف ہے قطرات اشک آنکھوں سے ٹپک جائیں یا پلکوں پر لرزتے رہیں دونوں حالتوں میں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ دشوار ہے۔

غالبؔ آنکھوں کے ان قطروں کو موتیوں سے بھی قیمتی خیال کرتے ہیں اور انھیں بلند ہمتی کا نشان قرار دیتے ہیں۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

دوسری جگہ وہ اس خون ناب کو بھی حقیر سمجھتے ہیں جو صرف شریانوں ہی میں گردش کرتا رہے اور آنسو بن کر آنکھ سے نہ ٹپک جائے۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

حامد دیدۂ شوق کے چھلکے ہوئے ان پیالوں کو اور زیادہ اہم خیال کرتے ہیں جن سے آنسو ٹپک چکے ہیں۔

حاصل صد جام کوثر حسرت صد میکدہ
دیدہ ہائے شوق کے چھلکے ہوئے جام اے سبو

ایک جگہ اسی بات کو دوسرے اسلوب سے کہتے ہیں ؎

جہانِ عشق و محبت میں کچھ نہیں حامدؔ
دلِ خراب اگر چشم خونچکاں میں نہیں

تنہائی کے لمحات میں جب کوئی پاس نہ ہو شاعر محبوب کو اپنے تصور میں کھینچ لاتا ہے مومنؔ کا مشہور شعر ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حامد کائنات کے تمام ہنگاموں کی موجودگی میں دوست کا اتنا مکمل تصور کرتے ہیں کہ ان کی ذات دنیا ہی سے الگ ہو جاتی ہے اور جلوت سے خلوت کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

بزم جہاں میں دور ہیں بزم جہاں سے ہم　　تیرا جمال تیرا تصور ترا خیال

حامدؔ کا شاعرانہ نقطۂ نظر اتنا ہی وسیع ہے جتنا ایک آفاقی شاعر کا ہو سکتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ عظمت انسانیت کی ہے، قوم و مذہب اور ملک و ملت کا امتیاز نہیں، محبت اور انسان دوستی ہی سب کچھ ہے، یہی ان کا ملک ہے اور یہی مذہب۔

محبت ماورائے رسم ہائے دہر ہوتی ہے　　بھلا ہم اور روا ملی ہوں حدودِ کفر و ایماں میں

اسی کا نتیجہ ہے کہ بت خانہ بھی ان کی جستجو کرتا ہے اور کعبہ بھی۔

دیکھنا یہ عظمت گم گشتگی راہِ شوق　　ڈھونڈتے پھرتے ہیں مجھ کو کعبہ و بت خانہ آج

اور یہی گم گشتگی ہے جس نے ہر جادے کو ان کے نقوش پا کا آئینہ بنا دیا ہے۔

ڈھونڈیں ہزار خضر مگر پائیں گے کہاں
وہ راستہ کہ جس پہ مرا نقشِ پا نہ ہو

حامد بھوپالی نے غزل کی قدیم روایات کو نہایت احتیاط سے برتا ہے اور صرف انھیں روایات کے پابند رہے ہیں

با زندگی کے آثار ہیں اور فرسودگی پیدا نہیں ہوئی۔ ان کے مختصر سے دیوان میں مختلف رنگ کے اشعار مل جائیں گے
آواز منفرد اور بلند ہے اس میں خلوص اور سچائی بھی ہے۔

حامد کے کلام پر نظر ڈالنے کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ محبت انسانیت کے جمال اس کی زندگی کے حسن اور مستقبل کی رعنائی
در کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، شاعر کا محبوب وہی ہے جو ایسی جگہ رہتا ہو جسے جنت دنیا بھی کہا جا سکے اس کے پیچھے
ں کا ہجوم نہ ہو بلکہ زندگی کا ماحول ہو۔ اسی کے ساتھ وہ زندگی کے تسلسل کی کڑی ہو اور حیات انسانی کے ربط برقرار
ں معاون ہو۔ حامد اسی قسم کے محبوب کو پسند کرتے ہیں، وہ خود بھی زنجیر حیات کی کڑی ہیں۔ انھوں نے اپنی
شعری روایت اور فن کا حسن و شباب آئندہ نسل کے حوالے کر دیا ہے اور آپ ماضی کے دھندلکوں میں یوں روپوش
، ہیں جیسے آفتاب اپنا سفر پورا کر کے افق مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور نجوم و اختر کی تابانیاں اس کی جگہ حاصل کر لیتی
حامد آفتاب تھے، ڈوب گئے لیکن جہاں وہ غروب ہوئے اگر غور سے دیکھئے تو وہاں دو ستارے جھلملاتے دکھائی
گے جن میں شمس و قمر بن جانے کی صلاحیت ہے، اور حامد زبان حال سے کہتے سنائی دیں گے:

آب و رنگ تازۂ دانش سخن را دادہ ایم
سبزۂ می غلطد بخون لالہ در گلزار ما

(دانش مشہدی)

ختر سعید اور اظہر سعید جو وکیل ہونے کے باوجود حامد کی میراث شعری کے حامل ہیں اور دونوں نئی نسل کے ممتاز شاعروں کی صف میں شامل ہیں
(کوثر)



حامد سعید خاں (مرحوم)

دنیا کی وسعتیں اب دیتی نہیں پناہیں
کیا سوچ کر اٹھا تھا ظالم کے آستاں سے

وہیں سے نیند آجاتی ہے حامد سننے والوں کو
جہاں سے داستاں سننے کے قابل ہوتی جاتی ہے

اسرار حقیقت ہیں ابھی تشنۂ ہستی
ساغر بکف اس گنبد مینا سے گزر جا

میں کہاں اور یہ دنیائے صد آلام کہاں
دیکھنا تھا فقط اک خواب پریشاں مجھ کو

کچھ پھول لے کے دامن ارماں فروز میں
آزاد ہیں نظام بہار و خزاں سے ہم

ان کی محفل میں یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے
یعنی ہم ہیں کہ نہیں بزم جہاں ہے کہ نہیں

دل سے پوچھوں تو سہی اک نگہ لطف کے بعد
آج بھی کچھ خلش درد نہاں ہے کہ نہیں

نظر ملتے ہی دونوں اک تماشہ بن کے رہ جائیں
وہ مجھ پر کچھ فسوں کر دیں میں ان پر کچھ فسوں کر دوں

یا تو حقیقتاً کلیم محو جمال ہو گئے
یا یہ ہوا کہ عشق نے حسن کا دل بڑھا دیا

ادھر آئیں سنواروں میں کروں مشاطگی ان کی
کہ ان زلفوں سے نسبت ہے مرے حال پریشاں کو

اڑنے والے تو قفس توڑ کے اڑ جاتے ہیں
ان کو پروائے نگہبانی صیاد نہیں

ہمارا لمحہ لمحہ اعتبار حسرت دل ہے
سحر کیا چھین سکی ہے مآل انتظار اپنا

ہجوم حشر میں رسوائے حشر ہیں وہ لوگ
جہاں میں جن کو ترے غم سے واسطہ کم تھا

مرے سامنے سے یارب وہ اٹھے تو یہ ہوا کیا
کہ نظر سے لے کے دل تک کہیں روشنی نہیں ہے

ہم پہ گزرا ہے محبت کا زمانہ حامد
ہم نے دیکھا ہے جفاؤں کا وفا ہو جانا

دل میں یارب ایک بھی موج سکون دل نہیں
زندگی طوفاں ہی طوفاں ہے ساحل نہیں

مستی لب پہ تصدق چشم میگوں پہ نثار
اہل ایماں کیا متاع دین و ایماں دیکھتے

جب سامنے آجائے اک شاہد بے پردہ
الجھے کوئی کیوں آخر راز مہ و اختر میں

لرز کے ٹوٹ گئے ہیں جہاں پر جبریل
وہاں مذاق اڑاتی ہے خاک کی پرواز

حقیقتوں کے دھڑکتے ہوئے دلوں سے سنو
کہ کس مقام پہ ہیں آج رہروان مجاز!

بھٹک رہا ہوں غم بیکسی کی راہوں میں
یہ زندگی ہے الٰہی کہ عمر خضر دراز

تسلیم حسن دوست کی رعنائیاں مگر
نشو و نمائے دل کو زمانہ برا ملا

حرم کے لاکھوں طواف واعظ بجا ہیں لیکن یہ میکدہ ہے
یہاں کی تہذیب ہے کہ سب کچھ نثارِ تقدیسِ جام کر دو

خدا ہی خیر کرے رازِ کائنات کی اب
تمام عمر میں دیوانہ مسکرا آیا ہے

حریمِ حسن میں اب آفتابہ لے جاؤ
کہ آئینہ تو بہت شرمسار آیا ہے

چمن میں موسمِ دیوانہ گر آنے تو دے ہمدم
اگر تجھکو نہ رہ جائے مجھے دیوارِ زنداں کی

عطائے غم میں مساوات کیوں نہیں یارب
یہ کیوں بہار کی دیوانگی خزاں میں نہیں

یہ چمن پرور ہوائیں اور یہ کنجِ قفس
دل میں اک طوفان سا اٹھتا ہے لیکن کیا کریں

جی چاہتا ہے ان کو کلیجے میں دیکھنا
جن بجلیوں سے آنکھ ملانا محال ہے

اصطلاحِ عاشقی میں خون کے قطرے کا نام
رفتہ رفتہ کچھ عجب ترکیب سے دل ہو گیا

میں انجمنِ ناز میں ہوتا تو ہوں لیکن
اس طرح سے ہوتا ہوں کہ ہوتا ہوں کہیں اور

مذاق نشہ ہے بے کیف بے خودی بے رنگ
بقائے ہوش کی تلخی ابھی شراب میں ہے

دلِ مجروح کو پردوں ہی میں رکھا ہم نے
حسنِ معصوم کو آئینہ دکھایا نہ گیا

اب ہے فقط خدا ہی خدا اہلِ حشر کا
وہ آ گئے نگاہِ پشیماں لیے ہوئے

اتفاقاً جو تری یاد سے بچ جائیں گے
وہی لمحات بُرے وقت پہ کام آئیں گے

کانٹوں پہ نیند آ گئی اربابِ درد کو
کس درجہ دل پذیر کہانی چمن کی ہے

انوارِ تجلّی میں کھڑا سوچ رہا ہوں
دیکھا بھی ہے یا جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

اعترافِ الفت میں اک سکوت طاری ہے
نجد کی فضاؤں تک خوابگاہِ لیلیٰ سے

شبیہِ حضرتِ یوسف ملائی جائے گی تم سے
ضرورت تو نہیں لیکن ذرا تم بھی سنور جانا

ترا کرم گہرافشاں سہی مگر یارب
متاعِ دردِ محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں

میں ہوں کہ جب اٹھی تو تجھی پر نظر اٹھی
تو ہے کہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتا مجھے

ہائے وہ دامانِ رنگیں وہ نگاہوں کا ادب
چشمِ پُرنم کے سب آنسو چشمِ پرنم میں رہے

یہ دنیا ختم ہونے کو تو ہو ہی جائے گی اک دن
فرشتے مدتوں دہرائیں گے تاریخ انساں کی

دیکھنا اس وقت اس کونین کی پسماندگی
لے اڑے جس وقت موجِ مستیٔ صہبا مجھے

جہاں تک وہ نگاہِ ناز اپنا کام کرتی ہے
وہیں تک زندگی پائندہ معلوم ہوتی ہے

فضائے شامِ اسیری میں رنگ بھرتا ہے
قفس میں لا کے جلاتا ہے آشیاں مجھ کو

یہ رنگِ زمانہ یہ بے باک باتیں
حقیقت میں استقبال دار ہیں ہم

یوں لٹا ہے دلِ خراب کہ اب
صرف باقی ہے اک خدا کا نام

دورِ غم کی مصیبتیں توبہ
موت بدنام زندگی بدنام

محبت ایک وہ تصویرِ زندگی ہے جسے
چھپا بھی لیں جو اِدھر تو اُدھر نہیں چھپتی

میں کس طرح سے چھپاؤں کسی کے آنے کو
فضائے رونقِ دیوار و در نہیں چھپتی

چھپا رہی ہیں سرِ حشر رحمتیں حسا مد
مگر لطافتِ دامانِ تر نہیں چھپتی

رخِ جمیل کی جاگی ہوئی سی صبحِ ازل
خمارِ چشم کہ سوئے ہوئے سے میخانے

سکونِ دل نہ تھا جب تک تو سارے پھول کانٹے تھے
دلِ بے تاب جب ٹھہرا تو ہر کانٹا گلستاں تھا

غرق ہو کر آج رکھ لی میں نے خودداری کی شرم
موجِ دریا جانتی تھی تشنۂ ساحل مجھے

یہ سارے انقلاباتِ جہاں خود ہی سہی لیکن
جہاں یہ ذکر آیا ہے تمہارا نام آیا ہے

وہ ہر مقامِ جنوں دیکھنے کے قابل ہے
جہاں رکا ہوں جہاں سے گزر گیا ہوں میں

بربادِ نشیمن کیا ڈرتے بجلی کی پرانی چشمک سے
یہ سوختہ جاں تو خود بڑھ کر بجلی کو اشارہ کرتے ہیں

یہ دنیا کیوں ابھی سے حشر میں تبدیل ہوتی ہے
نہ وہ میرے مقابل ہیں نہ میں ان کے مقابل ہوں

ٹھہریے اور گیسوئے مشکیں کو بڑھنے دیجیے
آپ کی ہونی ہے دنیا آپ کی ہو جائے گی

یہ ممکن ہے کہ آگے چل کے وہ کچھ اور سمجھا دیں
ابھی تک تو ہم اپنے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں

پیرِ میخانہ نے مستوں کو کہاں پہنچا دیا
زاہد خود بیں مگر اب تک خرابِ ہوش ہے

فضائے بے وطنی ہو کہ سرزمینِ وطن
مذاقِ راہ روی سے ہیں راستے روشن

خرد ہزار شگوفے کھلائے گی پھر بھی
جنوں کے ہاتھ رہے گا بہار کا دامن

اللہ اللہ اعتبارِ جہانِ رنگ و بو
موت تک رہتی ہے دل کو زندگی کی آرزو

ہر ارادہ آسماں پرواز تھا
اعتبارات جوانی کیا کہیں

ڈھونڈیں ہزار خضر مگر پائیں گے کہاں
وہ راستہ کہ جس پہ مرا نقشِ پا نہ ہو

یہ کس آواز سے تم نے پکارا
کہ دنیا جاگ اٹھی خوابِ گراں سے

مقدرات کا کس کس طرح کرم نہ رہا
جو غم میں بھی مجھے لذت ملی تو غم نہ رہا

اختر سعید

فروغِ صبح کی تا صبح گفتگو تو رہے
رہیں نہ ہم مگر اک شمعِ آرزو تو رہے

پسِ بہارِ نظارہ مرا لہو تو رہے
بلا سے میں نہ رہوں گل کی آبرو تو رہے

نظر فریبیٔ گلہائے نقشِ پا، معلوم
تمام عمر مگر تیری جستجو تو رہے

نصیبِ عشق نہیں نازِ آرزو نہ سہی
نصیبِ دل مگر اک زخمِ آرزو تو رہے

یہ میکدہ ہے یہاں جرمِ زندگی ہے سکوت
نہیں ہے مے نہ سہی شورِ ہاؤ ہو تو رہے

ہوا نہ کوئی بھی پرسانِ گریۂ شبنم
ہوا پرست گرفتارِ رنگ و بو تو رہے

کچھ اس ادائے کرم سے مٹایئے دل کو
کہ یہ غریب زمانہ میں سرخرو تو رہے

خیالِ زلف کو زنجیرِ پا بنا نہ سکے
خیالِ زلف میں آوارہ کو بہ کو تو رہے

خورشید احمد جامی

اونچا کچھ اور فکر کا معیار کیا کریں
روشن کوئی چراغ سرِ دار کیا کریں

زخموں کے مول تول نہ پھولوں کے تذکرے
سونے پڑے ہیں وقت کے بازار کیا کریں

دھر کے شہر یہ حسین و دل آویز ہیں۔ مگر
انجان بستیوں میں کہیں پیار کیا کریں

اپنا سمجھ کے اور لہو مانگتا ہے فن
ہم بھی یہ سوچتے ہیں کہ انکار کیا کریں

ہر واقعہ نگاہ سے اوجھل ہے آج بھی
ہر سو کہانیوں کی ہے دیوار کیا کریں

یادوں کی مشعلیں ہیں نہ خوابوں کے راستے
ٹھہری ہوئی ہے ایک شبِ تار کیا کریں

جامی غمِ حیات کے اس ریگ زار میں
ہم آرزوئے کوچۂ دلدار کیا کریں

انوار ظہوری

ہر ورق دیکھا خدا نے دفتر اعمال کا
جب نظر آئیں مری غزلیں تو پڑھ کر ہنس پڑا

ناوک احساس غم با تیر آرام و فا !!
جس طرح دامان دل خود بھی ہو دشت کربلا

ظلم کرتے جائیے آہستہ آہستہ ہی
رفتہ رفتہ آپ کو ہو جائے گی مشق جفا

درد کی لپٹیں بڑھا دیتی ہیں احساس تپش
یا کوئی آتشکدہ سینے میں ہے دہکا ہوا

یوں کسی کی یاد آئی ذہن کے آغوش میں
جس طرح دم توڑتی اک دور افتادہ صدا

کر گئی بیدار کتنی خواہشوں کو اک نظر
ابتدا یہ ہے تو پھر اللہ جانے انتہا!

میرے نغموں سے جو پیدا ہو گئی تھی ہجر میں
بوجھ ہے اس گونج کا اب تک سر دوش صبا

چھوڑ دے ہر شخص اب چاہت کا دامن چھوڑ دے
دیکھ لے دنیا کہ میں نے عشق میں کیا پا لیا

کارواں میں کیسے کیسے لوگ شامل ہیں مگر
کوئی دل سارا ہرن دیکھا نہ دل سا رہنما

یوں اکیلا خاک افتادہ ہوں راہ زیست میں
جیسے بن میں کوئی تنہا پھول مرجھایا ہوا

اے گزرتے وقت اے تبدیل ہوتی زندگی
وہ تبسم زیر لب کس طرح بھولا جائے گا

سامنا کل ہو گیا ان سے تو وہ کہنے لگے
آپ کا چہرہ مجھے لگتا ہے پہچانا ہوا

دفعتاً منہ پھیر لیتے ہیں جو مجھ کو دیکھ کر
تھا کبھی ان کا بھی میرے پاس اٹھنا بیٹھنا

عقل سمجھاتی رہی کیا کیا بہ پاس مصلحت!
رزم گاہ عشق سے دل فاتحانہ لے چلا

ہے چمن میں جوشش فطرت پر اساس رنگ و بو
جشن گل پر منحصر ہے بلبلوں کا چہچہا

صرف شوخی ہے کہ یہ بھی ہے قرین مصلحت
مجھ سے طوفاں کی طبیعت پوچھتا ہے ناخدا

درد کی لپٹوں نے اٹھو اٹھ کر دل بے تاب میں
غم کی بے ترتیب زلفوں کو سنوارا بارہا

رفتگاں میں کیسے کیسے لوگ شامل ہو گئے
ڈھونڈتا پھرتا ہے کس کس کو یہ سوفا برقضا

کون سنتا ہے کسی کی جب غرض ہو درمیاں
آ گیا سب کو یقیں! میں نے کہا تم نے سنا

یوں خوشامد میں لگے رہتے ہیں ارباب قلم
جیسے فنکاروں کے ہوں اس دور میں ناشر خدا

دیکھنے ہم بھی گئے تھے ان کا انصاف ادب
جن سے تھی کچھ واقفیت ان کو تمغہ دے دیا

ذہن پر ڈاکہ نہ مارا فکر کو رسوا نہیں
کچھ رسائل نے مری غزلیں نہیں چھاپیں تو کیا

فکر ہے انوارؔ کی تازہ بہ تازہ نو بہ نو
عصر حاضر میں غزل کا ہے وہ تنہا آشنا

احمد رئیس

درد کے شہر میں

موسمِ جبر میں
درد کے شہر میں
ظلم کی چھاؤں میں
سولیوں کی گزرگاہ سے
کتنے ہی راہرو
کتنے ہی قافلے
سوئے منزل چلے

سوئے منزل چلے
کتنے ہی راہرو ـــــ
جن کے چہروں پہ تھا عزم کا بانکپن
اک نئی سرخوشی
اک نئی زندگی
جن کے ہونٹوں پہ تھی حسن کی داستاں
پیار کا تذکرہ!
جن کی نظروں کی شمعیں ضیا بار تھیں
کیف و مستی سے سرشار تھیں
جن کے دل کے نگر میں تھی پھیلی ہوئی
چاندنی ـ خلق و ایثار کی

جن کے زیرِ قدم
فصلِ گل، نو بہارِ چمن
انقلابِ زمن
جن کے ہاتھوں نے جب مل کے یلغار کی
ڈھا دیئے قصرِ ظلماتِ شب!!

وہ جری سورما
منچلے راہرو
سرفروشی کے دل میں تمنا لیے
روشنی کا مبارک ارادہ کیے
جب بھی آگے بڑھے
تیرگی میں افق در افق چھا گئے
رنگ چھلکا گئے
نور برسا گئے
زندگی کا لہو نذر کرتے ہوئے
احمریں صبح کے جام بھرتے ہوئے
خود نہ جانے کہاں کھو گئے
درد کے شہر میں
ظلم کی چھاؤں میں
سولیوں کی گزرگاہ پر . . . .

زیدی جعفر رضا

گونگی بھکارن

صبح کی پہلی کرن بن کر
گلی کی موڑ سے
داخل ہوئی گونگی بھکارن
گونگے لہجے میں ہی کچھ کہتی ہوئی
جیسے کوئی معصوم بچہ
گود سے ماں کی لپٹ کر
دودھ پینے کے لیے
گونگی زباں میں کہہ رہا ہو
آں ــــ اواں ــــ آں
آں ــــ اواں ــــ آں
جاگ اٹھے اہل محلہ
اور کوٹھوں کے دریچے کھول کر
کچھ لڑکیاں بھی
آگئیں ملتی ہوئی آنکھیں
بھکارن کی صدا پر
کیا اثر ہے جانے اس گونگی زباں میں
جھن جھنا جھن
جھن جھنا جھن
تانبے اور چاندی کے پیسے
لوگ اس پر پھینکتے ہیں

کوئی اس سے
اس کا مذہب نام اور اس کی سکونت
پوچھنے والا نہیں ہے
جیسے اس کا
کوئی مذہب نام اور کوئی سکونت ہی نہ ہو
آج تو سب ایک ہو کر
بھیک اس کو دے رہے ہیں
کیوں نہیں کہتا کوئی ہندو ہے یہ
میں بھیک اسے ہرگز نہ دوں گا
کیوں نہیں کہتا کوئی یہ ہے مسلماں
اور بھیک اس کو دینا
پاپ ہے
اپنا ئے سب
کیا زباں کی مختلف شکلوں نے ہی
یہ تفرقوں کی آہنی زنجیر
انساں کے گلے میں ڈال دی ہے
اور یہ گونگی بھکارن
بے زباں
معصوم
سارے تفرقوں سے دور ہے!

آزاد گلابی

چلتے پھرتے حسن کے پتلے کتنے پیارے پیارے ہیں
لیکن سچی بات جو پوچھو سب شہکار ہمارے ہیں

تیرے غم کی آگ سے کتنے دیپ جلے ہیں راہوں میں
تیرے غم کی آگ کے شعلے کتنے بڑے سہارے ہیں

پیار کے ساگر کے تیراکو! عمر کٹے گی طوفانوں میں
بار بار کیوں پوچھ رہے ہو کتنی دور کنارے ہیں

یہ ویران بہاریں یہ مسکاتی پت جھڑ کا موسم
اصل میں تیری چشم کرم کے دو موہوم اشارے ہیں

اُن کو کھو کر غم کی دولت فن کی عظمت پائی ہے
سوچ رہے ہیں پیار کی بازی جیتے ہیں یا ہارے ہیں

یہ آہیں غماز ہیں دل کے بہت پرانے زخموں کی
صدیوں کی تاریخِ غم ہیں یہ جو اشک ہمارے ہیں

ذہن و تخیل کی دنیا میں کیوں نہ درخشاں ہو آزاد
دل کے آئینے میں اس نے حسن کے عکس اتارے ہیں

خیرات ندیم

اداس راتوں کی تیرگی میں حسین تاروں سے بات کر لو
غموں کے پیہم تھپیڑے تھکے ہیں تو غمگساروں سے بات کر لو

نہ کوئی مقتل نہ سنگ باری نہ شورشیں ہیں نہ بیقراری
ستم کا وہ حوصلہ کہاں ہے ستم شعاروں سے بات کر لو

بدل گیا آرزو کا موسم گزر گئے مرحلے خزاں کے
سحر کے زخموں کی روشنی میں ذرا بہاروں سے بات کر لو

حسین پھولوں کی دلکشی ہے فقط امیدوں کا ایک دھوکا
جو زندگانی کی بات سمجھو تو خارزاروں سے بات کر لو

سمٹ گئے فاصلے شیوں کے نکھر گیا خواب زندگانی
نئی امنگوں کا ہے تقاضا نئے اشاروں سے بات کر لو

وفا کے دل کی طرح ابھی تک جو ظلمتوں میں دھڑک رہے ہیں
اگر کہیں رک سکو رفیقو تو ان ستاروں سے بات کر لو

نشاط کی دلفریب راہو بہار کی چارہ گر نگاہو
جو غم کا مطلب سمجھ لیا ہے تو غم کے تاروں سے بات کر لو

جو اپنے معیارِ آرزو کا ابھی سہارا نہ بن سکیں گے
ندیم کچھ دیر زندگانی کے ان سہاروں سے بات کر لو

زاہد کمال

وہ آنکھ بنی جب سے مسیحا مرے دل کی
کچھ اور ہوی جاتی ہے دنیا مرے دل کی

اے شہرِ نگاراں تری ایک ایک گلی میں
اٹھوائی گئیں قیمتیں کیا کیا مرے دل کی

طاؤس اداؤں کی للت چال کے صدقے
نغمات سے معمور ہے دنیا مرے دل کی

سنولا دیا برسوں کی کڑی دھوپ نے جس کو
دنیا کو وہ تصویر دکھانا مرے دل کی

اس کارگہِ مصلحت اندیش میں زاہد
سمجھے گا بھلا کون تمنا مرے دل کی

لوگ حالات سے سمجھوتہ کیے بیٹھے ہیں
کتنے جی دار ہیں کیا زہر پیے بیٹھے ہیں

نذر کرنے تجھے اے حسنِ گریزاں کب سے
دل میں زخموں کا چمن زار لیے بیٹھے ہیں

ہم شہیدانِ وفا، حسبِ روایاتِ وفا
صبر کی آگ تمنا کو دیے بیٹھے ہیں

تیز رو وقت سے آہنگ و تخیل لے کر
اپنی غزلوں کو نیا موڑ دیے بیٹھے ہیں

تیرے دیوانوں کی شائستہ مزاجی کے نثار
دل سلگتا ہے مگر ہونٹ سیے بیٹھے ہیں

وہ نہ آئیں گے نہ گزریں گے تو پھر اے زاہد
اجنبی راہ میں ہم کس کے لیے بیٹھے ہیں

جوگندر پال

قید و بند

دارالخلافہ کے نواح میں مرکزی جیل خانہ اپنی چاردیواری کے اندر رات کے گھٹے گھٹے اندھیرے میں اوندھا پڑا تھا۔ اور اُس کی روح سنگینوں سے بچ بچ کر بیرونی دروازے کی طرف آ رہی تھی، کچھ اس طرح چھپی چھپی، پیروں کو روئی کے ادھ جلے گالوں کی مانند اٹھا اٹھا کر کہ نہ دکھائی دیتی تھی نہ کھٹکے کا خیال ہوتا تھا۔ لیکن یہاں گیٹ پر پہنچ کر اس اندھی اندھی روشنی میں وہ صاف نظر آنے لگی، پکڑی گئی، اس کی فرار کی نیت نے اس کی پرچھائیں بن کر اس کے پیچھے چھپ جانا چاہا، مگر روشنی میں تو سب سے پہلے سیاہ پرچھائیں پر ہی نظر پڑتی ہے۔

"رجباسالا دوجی بار پکڑا گیا ہے بھرادار!"

دوسرے دن دو قیدی جیل کی عقبی دیوار پر ایک تازہ شگاف کی مرمت کر رہے تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر ایک گارڈ ان کی جانب پیٹھ کیے گنا چوس رہا تھا۔

"تو کیا ہوا؟" بھرادر کا اصلی نام سلطان تھا لیکن چونکہ وہ ہر چھوٹے بڑے کو 'برادر' کہہ کر بلاتا تھا اس لیے خود بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ "اگر پاک پروردگار نہ پکڑے برادر تو انسانوں کی پکڑ دھکڑ سے کیا ہوتا ہے؟"

"کیا ہوتا ہے!؟" کرتارے نے دیوار کے سوراخ میں ایک اینٹ جوڑتے ہوئے باہر کی طرف جھانکا۔ جہاں اس کا سایہ سوراخ کے عین سامنے دیوار کے سائے میں گری ہوئی دھوپ میں بند تھا۔ "بندی کے بیل، بچے اور بیوی — سب باہر والے ہڑپ کر جاندے ہیں۔"

داڑھی مونچھ میں چھپا چھپا کرتارے کا خوفناک منہ اس طرح دکھائی دینے لگا گویا سرخ زمین پر میلی میلی گھاس سے ڈھکا ہوا سانپوں کا بل۔ "پر فکر نہ کرو بھرادر، سالا کو دے کھا لیسے کو اک بار باہر پونچ لینے دے پھر دیکھنا۔" کرتارے نے ایک اینٹ کو دوسری پر زور سے دے مارا اور دونوں کو توڑ پھوڑ کر ہنسنے لگا۔

برادر بھی اس کی ہنسی میں کھل کر شریک ہوا، اور پھر وہ دونوں جیسے اپنی آواز کو سن کر ڈر سے گئے۔ گارڈ اپنا گنا پھینک کر ان کی جانب دوڑا۔

"کیوں برادر، کوئی پھڈا کھڑا کرنے کا کیال ہے؟" گمار دنے اپنا دایاں ہاتھ پیچھے کرکے ڈنڈا چوتڑوں پہ ٹکالیا تاکہ برادر کو غصہ نہ آجائے۔

"ہاں، برادر" برادر ہنسا تو اس طرح لگا جیسے اس کا سارا چہرہ اپنے بائیں گال پہ چاقو کے پھلتے ہوئے گہرے نشان کی طرف دیکھ دیکھ کر خوف سے بھاگ جانے کی سوچ رہا ہے "یہاں اس سوراخ سے باہر فسادو دیوانہ وار ناچ ناچ کر اودھم مچا رہا تھا اور ہم دونوں اسے روک کر آرام سے کھڑے ہونے کو کہہ رہے تھے ــ لا، ایک سگریٹ دے۔"

گمار دنے اپنی جیب سے سگریٹ کا ایک ٹکڑا نکال کر اسے دیا۔ "برادر، تم ہمورے گھر آتے ہو، اسی لیے تھوڑی سیوا کرتے ہیں، کل ہم بھی تمورے گھر آئیں گے اور خوب دودھ لسی پیں گے۔"

"ہاں، ہاں، خوب" برادر ماچس لینے کے لیے کھڑا ہونے لگا تو اس کے کپڑوں کے اندر لوہے کی بیڑیوں نے ذرا سی کھڑکھڑ کی "اور جب تم ہمارے گھر آؤگے برادر، تو ہم تمہیں ان سے بھی موٹی موٹی بیڑیوں میں ڈال دیں گے۔"

"اس میں ہمورا کیا دوش برادر؟ ہم تو خود تاش کے اگیارہویں پتے ہیں۔"

"پر دروگے، تم باہر جا کے کوئی اور کام وام کیوں نہیں کرتے، ایدھر جیل میں"

"سردارا، "گمار دنے کرتارے کو جواب دیا "باہر مرتے ورکھت جیبیں نہ چھوڑی ہو تو باہر بھی جیل سے کم نہیں۔"

پھر وہ اچانک چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا "جلدی جلدی اینٹیں لگاؤ سردار جی ــ اور برادر، تم ابھی تک سگریٹ پی رہے ہو، جیلر صاب دیکھ لے گا تو سالی موری سامت آجائے گی۔"

"تو تم کبھی اپنے گھر بھی جاندا ہے دروگے؟" کرتارے نے دیوار کے شگاف میں ایک اور اینٹ جوڑی تو برادر بھی مصروف نظر آنے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ہاں ہر سال جاتا ہوں سردار جی۔ سال میں اگیارہ ماس جیل اور ایک ماس گھر۔" وہ خوش ہو ہو کر انھیں بتانے لگا "میری لگائی بڑے مجے کی اورت ہے۔ میں گھر کی چوکھٹ میں کدم رکھتا ہوں تو چورا چورا چلانے لگتی ہے اور میرے گلے لگ کر جیبوں سے اگیارہ ماس کی کمائی لوٹ لیتی ہے اور موہے بہت اچھی لگتی ہے ــ اینٹیں لگاؤ! ــ اینٹیں لگاؤ سردار جی" اس نے گویا یکبارگی اپنے گھر سے آواز دی پھر بھاگا بھاگا ان کے پاس آگیا، اور ان کی جانب دیکھ کر کہنے لگا "ارے کیا گجب کرتا ہے برادر! جلدی جلدی کام ختم کرو، سالی چھٹی ہو۔ تو ہے تو ادھر کا پورا بجر باہے۔ وہ ہمارا کالا بھوت جیلر ساب"

کرتارے نے غصے سے جیلر کی خیالی شکل پر تھوکا تو اس کی ڈاڑھی لتھڑ گئی۔

"ہمارے یار رجب کا کیا حال ہے برادر؟"

"تمورے یار کی آج سالم تین گھنٹے پٹائی ہوتی رہی" گمار دنے غیر شعوری طور پر اپنا ڈنڈا چوتڑوں سے ہٹا لیا اور گویا رجب کا درد محسوس کرنے کے لیے اسے زور سے اپنی دائیں ران پہ مار لیا "اتنی پٹائی ہوئی کہ تمورے یار کی

کم از کم دس ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں گی۔ جندہ رہا تو کید کے باکی دن چپ چاپ گزار دے گا۔"

کرتارے نے دو اور اینٹیں زور سے ٹکرا کر توڑ پھوڑ دیں۔

اوسگار خوفزدہ مسکراہٹ سے کہنے لگا۔ "برادر کسو دن تمورے یار سردارے کی بھی وہی دشا ہوگی جو آج رجب کی ہوئی ہے۔"

"جا، جا، اپنا کام کر، دردو گے نیں تو۔"

"میں تو اپنا کام ہی کر رہا ہوں سردارا۔" گارو کو یاد آیا کر وہ اپنا گتا پھینک کر ادھر چلا آیا تھا۔ "تمورے پچانڈ کی بات کہی ہے۔ کیوں برادر؟" وہ گتا چوسنے کے لیے پھر اپنی پہلی جگہ کی طرف مڑ گیا لیکن راستے میں رک کر پھر گویا ہوا۔ "تو تھوڑے جیلر صاب کو کوب جانتا ہے سردارا، بگڑے ہوئے کیدی کو نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔ کوئی گڑبڑی کی تو جیسے دار کندا آپ ہی ہو گئے۔ مجھ پر الجام نہ دینا۔ رجب کی مُشکیں کسوا کر جیلر نے کال کوٹھری میں پھنکوا دیا ہے۔ اور وہاں کال کوٹھری میں ایک سندوک رکھا ہوا ہے جس میں دو کالے ناگ پھنکار پھنکار کر بار رکھائے ہوئے ہر آدمی کے دماگ کو کاٹتے رہتے ہیں۔ کیوں برادر؟ —" اس نے آگے بڑھ کر اپنا گتا اٹھا لیا۔

برادر کرتارے کو ٹھنڈا کرنے لگا۔ "اس بے چارے پر غصہ کرنا لاحاصل ہے برادر۔"

"نئیں بھرادر اپنے سالے رجب کا ہال سن کر مجھے جرا چکر آ گیا تھا۔" کرتارا اپنے سر پر جوڑا کھول کر اسے پھر کس کر باندھنے لگا۔ "آؤ اب جلدی جلدی یہ اینٹیں جوڑ لیں۔"

"ہاں، آؤ۔"

چند لمحات وہ چپ چاپ کام میں جٹے رہے۔

"بھرادر۔"

"ہاں برادر۔"

"رجب ادھر سے باگ کر نکلتا تو سیدھا کیدھر جاندا؟"

"جہاں بھی جاتا برادر، وہ اسے یہیں لے آتے۔ تم لوگ خواہ مخواہ جوانی کے جوش میں اپنے دوزخ کا بھی ستیاناس کر لیتے ہو۔"

"نہیں بھرادر، ستیاناس کا سوا ستیاناس کر کے ہی چین آندا ہے۔ میں اگر جیل سے باگ جاؤں تو سب سے پہلوں الیسرٹوار کے پتر کے ٹوٹے کر دوں، جس نے میری بی بی کے سنگ چھیڑ کھانی کی تھی۔ پھر اپنی بی بی کے ٹوٹے کروں جو میری کید پر مگرمچھاں دے ہنجو بہاتی رہی، پر چھ ماس بھی نہ گجرے کہ میرے بیل، میرے بچھڑے لے کے اپنے اسی یار کے گھر جا بسی۔"

"میں تو چور آدمی ہوں برادر۔" برادر خدائی خدا کی ہے، اس لیے میرا پترا اصول کر اندھیرے میں جو شئے ہاتھ لگے خدا کی دین سمجھ کر چپکے سے استعمال کر لو۔ یہی خدا کی مرضی ہے — لو، یہ اینٹ بھی جوڑ دو۔"

چند ثانیے وہ پھر چپ چاپ کام کرتے رہے۔

"ہاں سچ برادر" کرتارے نے سر اٹھایا تو اب ٹھنڈا ہو کر مسکرا رہا تھا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہیرا تیر سب نری بکواس ہے۔ جرا جیل سے نکل جاؤں، پھر میں بھی چین سے تمہاری ترال چوہی بنوں گا۔"

"مسکی رہو گے — لو اب یہ آخری اینٹ بھی لگا دو۔" برادر کے لہجے میں بڑے بھائی کی شفقت تھی۔ "یہاں آؤ برادر تو باہر کی دنیا کو اپنے آپ پر بند کر لو اور باہر جاؤ تو یہاں کی دنیا کو ذہن سے خارج کر دو۔ اس طرح یہاں آنا جانا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ نہ آنے کا قلق، نہ جانے کی بے صبری۔"

"رجے نے بلا تبل اپنی ہڈیاں تڑوالیں۔" کام سے فارغ ہو کر کرتارے نے دیوار سے منہ موڑ لیا۔

"قید بھگتنے کا سلیقہ آتے آتے ہی آتا ہے برادر۔" برادر نے اُسے بتایا۔ "اور تو اور جب مجھے بھی پہلی بار جیل ہوئی تھی تو ایک ایک دن عمر قید کی طرح لمبا معلوم ہوتا تھا۔ روز تڑکے نیا جنم، روز رات کو نئی موت۔ لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اے برادر تو مسلمان ہے، بار بار مرنے اور پیدا ہونے کا کفر اپنے سر لے گا تو اگلے جہاں میں بھی یہی جہنم ہوگا اور تو — لو برادر، میرا یہ سوچنا تھا کہ اُس پاک پروردگار کی رضا سے اس جہنم کی صعوبتوں نے میری طرف سے از خود منہ موڑ لیا۔"

کرتارے نے برادر کے آخری فقرے سے الجھن محسوس کر کے سوچا کہ چنگے سے چنگا مُسلا بھی اپنی ارب ہجارسی جانے سے باج نہیں آندا۔ "پر سچ برادر، میں اپنے رجے کی بات کر رہا تھا۔ جیلر سالا بڑا جالم ہے۔ شتیان کا تُکم اے۔"

"برادر، ہر جہنم —" برادر کرتارے کی الجھن دور کرنے کے لیے جہنم کا ترجمہ کرنے کے لیے رک گیا۔ "نرک کا رکھوالا ہمیشہ شیطان کا تخم ہی ہوتا ہے۔"

اسی دوران میں دوپہر کے کھانے سے پہلے دعا کی وارننگ بیل سن کر گارڈ فوراً ان کے پاس چلا آیا۔

"چلو برادر، رب کی حاجری بھرنے۔"

گزشتہ سال جب صوبے کے ڈائرکٹر جنرل فار جیلز ڈیل فیئر نے اس جیل کا دورہ کیا تھا تو اس نے اپنے محکمے کے ہومیوپیتھسٹ وزیر کے ایما پر یہ تجویز کیا تھا کہ سماج کے ان پھوڑوں کا علاج اپریشن نہیں ہومیوپیتھی ہے۔ انھیں میٹھی میٹھی گولیاں دے کر ہمیں ان کا خون صاف کرنا چاہیے۔ ڈائرکٹر جنرل نے اپنے وزیر کے لب و لہجہ میں جیلر کو ہدایت کرنے کے انداز میں یہ سوال کیا تھا کیا ان بدقسمت مجرموں کی اہم ترین ضرورت یہ نہیں کہ ان کی آتمائیں بول بول کر نیک بننے کی خواہش کریں۔ اس نے تجویز کیا تھا کہ جیلر ہر روز دوپہر کے کھانے سے پیشتر قیدیوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کر کے ان سے ایک ایسی پرارتھنا بلوائے جو ہر مذہب کے قیدی کے لیے سودمند ہو۔

"لیکن میں یہ پسند کروں گا۔" جیلر نے اجازت طلب کرنے کے لیے کہا تھا۔ "کہ دعا کے وقت قیدیوں کے ارد گرد میری کل گارد موجود ہو۔"

"ہاں یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" ڈائرکٹر جنرل نے ہنس کر جواب دیا تھا۔ "یہ تو قانون ہے کہ مجرم پھانسی سے پہلے اپنی آخری پرارتھنا بھی کر رہا ہو تو اس کے سر پر گارد موجود رہنی چاہیے۔"

برادر اور کرتارا سر جھکائے گارد کے آگے آگے چل رہے تھے۔

کرتارے کا تصور اسے اپنے گاؤں کے تین میل کے گوردوارے میں لے گیا تھا جہاں دربار صاحب کا بھوگ پڑھ کے وہ اپنے دل میں بہ آواز بلند للکارا تھا۔ "راج کرے گا کھالسہ، آکی رہے نہ کو ـــ آکی رہے نہ کو ـــ آکی رہے نہ کو" اس نے جھلا کر برادر کی طرف سر اٹھا لیا ـــ "سردار، کھالسہ بے چارا تو جیل میں گل سڑ رہا ہے ـــ تو بھی دھرم ایمان والا پرش ہے، ذرا سوچ کر بتا کہ دھرم کرم کی پستکیں جھوٹھ کیوں بول دی ہیں؟"

"آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے الفاظ جھوٹ نہیں بولتے برادر" برادر کا ایمان گویا ہوا۔

"جھوٹ ہماری زبان بولتی ہے۔ میری زبان ابھی توتلی تھی جب میرے ابا نے مجھے قرآن پاک حفظ کروائی تھی۔ اس وقت میرے پڑھنے کا انداز بڑا غلط تھا، مجھے ان الفاظ کے معنی بھی معلوم نہ تھے مگر لکھے ہوئے الفاظ کا کرشمہ دیکھو کہ میرا ننھا منا ایمان دل نورِ اسلام سے معمور تھا ـــ پھر کیا ہوا برادر؟ ـــ میری زبان پختہ ہوتی گئی، عربی شریف کا تلفظ نہایت شستہ ہوتا گیا" یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ اب برادر کرتارے کی موجودگی سے غافل ہو کر خود کلامی کرنے لگا ہے "لیکن نورِ دین میرے دل و دماغ پر مدھم پڑتا گیا ـــ اور پھر کیا ہوا برادر؟ ـــ میں چور بن گیا، پانچوں وقت نماز پڑھتا ہوں لیکن ہوں چور ـ اپنا چور سب کا چور" اب یوں لگ رہا تھا کہ شیطان نے اس کی مشکیں کسوا کر اسے رجب کی طرح کال کوٹھری میں پھنکوا دیا ہے اور اس کے قریب ہی کال کوٹھری میں کالے ناگ پھنکار رہے ہیں "برادر، اب کے جیل سے چھٹی ہوئی تو میں چوری وو ری ترک کر دوں گا ـــ صرف ایک بار چوری کروں گا، صرف ایک بار، تاکہ کسی طرح حج کی رقم بن جائے اور حضور کے روبرو توبہ کراؤں کہ آئندہ کبھی چوری نہ کروں گا ـــ نہیں برادر، میں ایک بار بھی چوری نہیں کروں گا۔ چوری کی رقم سے حج کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ میں یہیں قبلہ کی طرف منہ کر کے جی ہی جی میں اپنے سب گناہ بخشوا لوں گا"

کرتارا کچھ سمجھتے ہوئے، کچھ نہ سمجھتے ہوئے برادر کے منہ کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا "تم تو ہمارے پنڈ کے مولبی سے بھی اچھا لیکچر کر لیندے ہو سردار"

"نہیں برادر، اب میں جیل میں کبھی نہیں آؤں گا، شیطان کی پناہ کبھی نہیں لوں گا ـــ کبھی چوری نہ کروں گا ـــ توبہ!"

برادر نے اپنے دونوں کانوں کی لویں پکڑ کر تین بار توبہ کا کلمہ پڑھا "استغفر اللہ ربی من کل ذنب"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں سردار، مجھے بتاؤ میں کیا کہوں"

"تم بھی اپنے کانوں کو پکڑ کر تین بار توبہ کہو"

"توبا ـــ توبا! ـــ توبا! ـــ"

اور سردار خوش ہو گیا اور اپنے گاؤں کے گرنتھی کی طرح بڑے وشواس سے گانے لگا۔

"راج کرے گا کھالسہ، آکی رہے نہ کو" اس کا ایمان لوٹ آیا تھا۔

وہ ہیڈ فیلڈ میں داخل ہوئے تو وارننگ بیل کے بعد دوسری گھنٹی بجنے میں صرف دو ایک منٹ باقی تھے۔ میدان کے

درمیان سب قیدی جمع ہو چکے تھے اور ان کے ارد گرد مسلح گارد صف آرا تھی۔ وہ دونوں بھی اپنی نوع کے قیدیوں کی قطار میں گھس آئے۔ برادر نے اپنے ہمسایہ کے کان میں نہ جانے کیا ذرا سی بات کی کہ ایک سینئر گارد نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بڑی درشتی سے بولا — "ایک تو تم تاخیر سے یہاں پہنچے ہو، اور پھر صف میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہو" — اور اس سے پہلے کہ برادر کوئی جواب دے پاتا، سینئر گارد نے اپنی مٹھی اس کے گریبان سے ہٹا کر ٹھوڑی کے نچلے حصہ پر جڑ دی۔

برادر کے دانتوں سے خون بہنے لگا اور وہ اپنے آپ پر قابو پا کر صبر کی آیت دہرانے لگا۔

"وَتَوَاصَوا بالصبرِ"

"تو مجھے اپنی عربی میں گالی دیتا ہے؟ سینئر گارد کے منہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔" ہیں؟ گالی — ؟ یہ لے ایک اور!" اس نے برادر کی ٹھوڑی پر زور سے ایک اور جھٹکا دیا۔

کرتارا اپنے یار برادر کو ناحق پٹتا دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور بلاتامل آگے بڑھ کر سینئر گارد کے منہ پر دو تین کے مکے جڑ دیے "تو میرے یار بھرادر کو بے پھول مار رہا ہے؟ اب بتا! بتا اب!"

قیدیوں میں خوف و ہراس کی دبی دبی آوازیں اٹھنے لگیں۔ ساری گارد نے سنگینیں تان لیں اور اسی اثنا میں دیو ہیکل جیلر اور اس کی کاربن کاپی، اسسٹنٹ جیلر پستول، پیٹی اور پالش شدہ بید سے لیس ہو کر دعا کے لیے پلیٹ فارم پر وارد ہوئے۔ ان کے چہروں پر جھلاہٹ کا غلبہ تھا، اور انہیں دیکھ کر قیدیوں کو آنے والے لمحات کی ہیبت سے دعا کے الفاظ بھولتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

جیلر کی پھٹی پھٹی دھمکی آمیز آواز سے سکوت تھرتھرا اٹھا۔ "ان دونوں اپرادھیوں کو یہاں پلیٹ فارم کی ایک طرف کھڑا کر دو۔"

اور دعا شروع ہو گئی۔

"اے زمین و آسمان کے مالک! ہم بُرے ہیں، ہمیں نیک بننے کی توفیق عطا کر!"

"زور سے کہو!" جیلر نے قیدیوں کو چابک مارنے کے انداز میں کہا۔ "زور سے!"

اور اپنے آقا کا حکم منوانے کے لیے کل گارد نے اپنی آنکھوں کی دونالی بندوقوں سے گولیوں کی بارش شروع کر دی

"اے زمین و آسمان کے مالک — !"

خدا کو محسوس ہو رہا ہو گا کہ سوا اسٹک سٹین گنوں کا نشانہ بنی ہوئی یہودی قیدیوں کی بھولی بھٹکی کچی کچی روحیں آخر آسمان کے دروازوں پر آ پہنچی ہیں۔

"اے زمین و آسمان کے مالک!"

اس دوزخ کی گناہ آلود فضا میں خدا کا نام اس طرح گونج رہا تھا جیسے کسی حاملہ کتیا کے پیٹ میں اوندھے پڑے ہوئے پلوں کی فریاد، جو اپنی قید کی میعاد گزرنے سے پہلے کسی صورت اپنے کرب سے نجات نہیں پائیں گے۔

صبا

"اے ہمارے باپ! ہمارے دلوں میں آزاد انسانوں کی سمجھ بوجھ پیدا کر اے" اس کے بعد قیدیوں کے ہونٹ نہ جانے کیا کیا بولتے رہے لیکن اُن کے دلوں سے یہی صدا بلند ہوتی رہی ــ "آزاد! ــــ آزاد! ــــ آزاد! ــــ"

اور پھر جیلر نے انھیں کڑک کر حکم دیا ــ "خاموش!"

اور اس طرح سب قیدیوں کو پتہ چلا کر دعا ختم ہوئی ہے۔

"جاؤ! ــــ تم ٹھہر جاؤ!" جیلر نے کرتارے اور برادر کو وہیں رکا رہنے کو کہا۔

اور وہ سنیئر گارڈ بھی وہیں رکا رہا جسے کرتارے نے ابھی ابھی پیٹا تھا اور باقی سب جیل برڈ دانہ دنکا چگنے کے لیے جیل کے میس کی جانب ہو لیے۔

"سرکار!" سنیئر گارڈ نے جیلر کو مخاطب کر کے اپنی رام کہانی شروع کی: "برادر اور کرتارا برابر تھا شروع ہونے سے صرف آدھ منٹ پہلے یہاں پہنچے اور برادر نے آتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ جب میں ـــ"

جب وہ اپنی کتھا سنا چکا تو جیلر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بید کو دہرا کر کے گویا دل ہی دل میں ان دونوں کو دہرا لیا اور اپنے لہجے میں ان کی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز پیدا کر کے سنیئر گارڈ کو حکم سنایا: "انھیں سیل میں ڈال دو، کھانا وانا بھی نہ دو، اور جب میں کھانے سے فارغ ہو کر سہ پہر کو دفتر آؤں تو انھیں سزا کے لیے پیش کرو۔ ڈسمس!"

اور سنیئر گارڈ نے سیلوٹ کر کے ان دونوں کو حوالات کی طرف ہانک لیا۔

"بھرادار!"

سہ پہر کو وہ دونوں حوالات میں بیٹھے اپنی پیشی کا انتظار کر رہے تھے۔

"ہاں، برادر؟"

"شیطان کا تھم ہمیں کیا سزا سنائے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ ہتھکڑیاں کسوا کر رجب کے ساتھ کال کوٹھری میں پھنکوا دے گا، اور کیا؟"

برادر کی ٹھوڑی اور گال پر چابک کا نشان کسی چور کی چھری کی بجائے زیتون کی ٹہنی کی مانند اس کے چہرے پر لہرا رہا تھا: "اس پاک پروردگار پر بھروسہ رکھو۔ اسی بہانے اپنے برادر کی خیر و عافیت معلوم ہو جائے گی۔"

"بھرادار، سچے نے ٹھیک ہی کیتا، اگر پکڑا نہ جاندا تو اس نرک سے تو بچ جاندا۔"

"ہاں برادر، لیکن ہم نے برے اعمال کیے ہیں تو اسی حساب سے ہماری دوزخ سے رہائی ہوگی۔"

"نہیں۔ تو چاہے ہاں کہہ، چاہے نہیں۔ رجب کو کال کوٹھری سے نکل لینے دے پھر ہم تینوں ادھر سے بھاگ نکلاں گے۔ تو لے نہ بھی کیتی بھرادار، تو میں تجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کے لے بھاگوں گا" ــــ کچھ توقف کے بعد کرتارا گنگنانے لگا۔

"راج کرے گا خالصہ، آکی رہے نہ کوئے"

"چلو نکلو!" دفعتاً ایک گارڈ نے قفل میں چابی گھماتے ہوئے سلاخوں کے باہر سے بڑی کرخت آواز میں پکارا۔
اور رجب وہ جیلر کے دفتر کے کھلے دروازے پہنچے تو وہ انہی کا منتظر بیٹھا تھا۔
"آجاؤ" جیلر نے انھیں اندر بلالیا۔ "اور تم جاؤ" اس نے گارڈ سے کہا۔
"تم جانتے ہو" جیلر نے اپنی کال کوٹھری کے صندوق کے کپاوتی ناگوں کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا، "کہ میں تمھیں کیا سزا سنا رہا ہوں؟"
وہ دونوں چپ چاپ اس کا منہ تکتے رہے۔
"بولو!"
"ہمیں کیا معلوم، برادر ـــــ حضور؟"
"برادر حضور رکھیے، کام تو تم نے ایسا کیا ہے کہ تمھیں کال کوٹھری میں پھینکوادوں، لیکن ـــ" کالے ناگ کا تنا ہوا پھن ڈھیلا پڑ کر، اچانک غائب ہوگیا ـــ "لیکن میں تمھیں معاف کر رہا ہوں!"
دونوں ابرادھیوں نے تعجب سے جیلر کے چہرے کی ڈھیلی ڈھیلی رنگت پر نگاہ جمالی۔
"ایک شرط پر" ناگ کا پھن پھر تن گیا۔ "اس کاغذ پر تم دونوں دستخط کر دو۔"
ان کا تعجب سرتاپا سوال بن گیا۔
"رجب مرگیا ہے!"
یہ سن کر اُن کی گردنیں کندھوں سے اچھل کر پھر اپنی جگہوں پر لوٹ آئیں۔
"اور میں یہ کیس تیار کر رہا ہوں کہ اس کا مرجانا ہی بہتر تھا۔ قانون بھگوڑے قیدی کو پوری سزا نہیں دیتا اس لیے اسے قانون کے حوالے کرنے سے پہلے میں جی کھول کر اپنی گرمی نکال لیتا ہوں، خواہ قیدی کی جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔"
برادر اور کرتار رجب کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے اور ان کے جسم لاشوں کی مانند جیلر کے سامنے ساکن ایستادہ تھے۔
"لیکن اس کے لیے کاغذی کارروائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر تم میری بات مان لوگے تو میں بھی تمھارا خیال رکھوں گا۔ نہیں مانوگے تو کوئی اور موجود ہیں ـــ" اپنی بات چیت کے ردعمل کا مطالعہ کرنے کے لیے وہ ان کی جانب بغور دیکھنے "تم دونوں رجب کے دوست ہو۔ میں نے اس کاغذ پر تمھاری طرف سے تحریر کیا ہے کہ وہ بڑا خطرناک قیدی تھا۔ تم سب کو ہمیشہ بغاوت کی ترغیب دیا کرتا تھا، یہاں سے بھاگ جانے کے لیے اکسایا کرتا تھا۔"
یکبارگی برادر کی چور نظروں نے جھپک کر محسوس کیا کہ جیلر کے پاؤں کے قریب سیاہ رسہ سا ہل رہا ہے اور چشم زدن میں اس نے جھک کر سیاہ رسے کا پتلا کنارہ پکڑ لیا اور اسے زور سے ہوا میں گھما کر دروازے کے باہر دے مارا۔
جیلر کی کال کوٹھری کے صندوق کا ایک کالا ناگ دفتر کے سامنے گارڈن میں گر کر تیز تیز کہیں غائب ہوگیا۔

جیلر ہانپنے لگا اور پھولے پھولے سانس سے اپنی کرسی سے اٹھ کر برادر کے قریب آگیا۔

"مہربانی برادر۔"

اپنے آپ کو کھڑا رکھنے کا نااہل پاکر وہ دیوار کے قریب رکھی ہوئی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اس وقت تم جاؤ۔ میں اپنی بات کل صبح پوری کر لوں گا۔"

جیلر نے خوف کے غلبے سے آنکھیں بند کر لیں اور برادر کرارا اس کے دفتر سے باہر آگئے۔

"تو نے اس شیطان کی جان کیوں بچائی بھرادار؟ کیوں بچائی؟" کرنارے کو برادر پر غصہ آرہا تھا۔

"میں کون بچانے والا ہوں برادر؟ اللہ نے آپ ہی بچالیا کہ شیطان اپنے جہنم کی آگ میں سلگتا رہے۔"

تھوڑی دیر وہ خاموشی سے اپنے وارڈ کے راستے پر چلتے رہے، پھر برادر نے ذرا رک کر کرتا رسے کہا: "ظلم کی حد یہ ہے برادر کہ ظالم آدمی اپنے بدن کو بھی ایک جیل ہی بنا لیتا ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو بھرادار؟"

"اس ظالم جیلر کی، اور کس کی؟ اس کا جسم اس کے لیے جیل خانہ ہی تو ہے — اور کتنا تنگ جیل خانہ!" برادر پھر چلتے چلتے رک گیا — "بس اس کی پوری ماپ کا ایک تابوت — اور ذرا غور کرو برادر، کہ خدا نے سزا کیا دی ہے۔ مرنے تک اسے اپنا یہ سالم جیل خانہ اٹھا اٹھا کر چلنا پڑے گا۔ ذرا سوچو برادر، یہ عمر قید نہیں؟"

"مجھے تو بار بار اپنے بچے کا خیال آرہا ہے۔"

"وہ بے چارہ تو تمہاری قیدی برادر، تیری میری طرح۔ خدا نے رحمت کی ہے کہ پوری قید بھگتنے سے پہلے ہی رہائی پا گیا ہے!"

محافظ حیدر

ڈوبتے ابھرتے تنکے

ایک ٹرک دندناتی چلی گئی۔ سمنٹ کی سڑک پر اس کے پہیوں کی تیز رفتاری پھڑپھڑاہٹ سے سرسراہٹ میں بدلنے لگی اور اس کے تعاقب میں دوڑنے والے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی زور ہوتی چلی گئیں۔ بہت سے کوّے جو اس خلل سے چڑھ سے گئے تھے بہت شور مچا رہے تھے۔ کہیں قریب ہی بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ برابر کی کوٹھری میں کسی کی زنجیروں کو حرکت ہوئی لیکن وہ ان سب آوازوں سے بے خبر چپ چاپ، اور گم سم بیٹھا تھا۔ کیوں کہ اس کی دنیا میں موت کا سناٹا تھا۔

اس نے ایک دفعہ اور گھٹنوں سے اپنا سر اٹھایا اور بھیگی آنکھوں سے خلا میں تکنے لگا۔ اس کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ اس کی سانسوں میں موت لہرا رہی تھی۔ اس کی موت کو تھوڑی دیر اور تھی۔ اس کی زندگی تھوڑی دیر اور تھی پھر ایک مقررہ وقت پر اور مخصوص لمحے میں اس کی زندگی کے تنگ ڈربے کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا جائے گا۔ اسی مخصوص لمحے کے انتظار میں اس نے صدیاں گزار دی تھیں۔ مگر دلی تمنا یہ تھی کہ وہ لمحہ نہ آئے اور وہ صدیوں جیتا رہے۔

ویسے اسے انتظار کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ انتظار نہ بھی کرتا تو اس لمحے کو آنا ہی تھا اور وہ آ ہی رہا تھا اور جیسے جیسے اس کا فاصلہ کم ہو رہا تھا اس لمحے کی ایک خوفناک شکل بنتی اور واضح ہوتی چلی گئی۔ ایک ایسی شکل جسے وہ خود بھی بیان نہ کر سکتا تھا لیکن سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی وہ اسے صاف دیکھتا رہتا تھا۔ اس سے کسی طرح بھی اس کا پیچھا چھوٹتا ہی نہ تھا۔ کرب اور بے چینی سے وہ اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا جو اسے موت سے زیادہ تکلیف پہنچا رہا تھا۔

موت ناگزیر ہے۔ شاید اس لیے کہ موت زندگی کی سزا ہے۔ لوگ حادثوں سے مرتے ہیں، بیماریوں سے مرتے ہیں، خودکشی سے مرتے ہیں، لیکن کسی کو ایسی اذیت نہ ہوتی ہو گی جو پھانسی سے مرنے والے کو ہوتی ہے اور وہ بھی ایسے شخص کی پھانسی جو اس کا سزاوار ہی نہ ہو۔ اس کو پھانسی کی سزا اس لیے دی جا رہی تھی کہ مبینہ قتل کے بارے میں ساری شہادتیں شدید طور پر اس کے خلاف تھیں جو جھوٹی اور ناقابل اعتبار ثابت نہ کی جا سکیں اور ان کی بنا پر اس کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اپیلیں بھی مسترد کر دی گئیں۔ قانون تو اندھا ہوتا ہی ہے بے گناہ بھی اس کی گرفت میں آ ہی جاتے ہیں۔

وہ ایسا آدمی ہی نہیں تھا جو کسی کا خون کر سکے۔ وہ تو ان لاکھوں اور کروڑوں انسانوں میں سے تھا جو انسانوں کی نہیں جانوروں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن کے سونے جاگنے، کام اور آرام کے اوقات بندھے بندھائے ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ جن کے لیے سب سے بڑی راحت اس میں ہوتی ہے کہ کوئی نوکری کر لیں اور گھر کا خرچ چلتا رہے۔ جن کی دنیا صرف دو ستونوں پر قائم ہوتی ہے، گھر اور دفتر۔ اور جن کا مزاج بہت ہی صلح پسند ہوتا ہے۔ کسی کا ایک چانٹا کھا کر وہ اپنا دوسرا رخسار بھی پیش کر دیتے ہیں، اور جو اپنے ذریعہ آمدنی اور مستقبل کے تحفظ کے لیے اپنی عزت نفس کو جذام میں مبتلا کر دیتے ہیں جن کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ دنیا کیا ہے، اور کب سے ہے، کس کے لیے ہے، کیا ہوتا رہا ہے۔ وہ اگر کبھی اخبار دیکھتے بھی ہیں تو صرف سنسنی خیز خبریں پڑھ لیتے ہیں۔ ان کی زندگی کسی حساس مفکر کے نزدیک کوئی زندگی ہی نہیں، نہ سہی مگر ان کے اپنے لیے تو آخر زندگی ہی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کو بھی پھانسی کی سزا مل سکتی ہے اور ملتی ہے چاہے سزا پانے والا بے گناہ ہی کیوں نہ ہو۔

اسے صرف یہی فکر نہیں تھی کہ اس کی زندگی اب ختم ہونے ہی کو ہے جس کے خیال سے بار بار اسے اپنے حلق سے بگولے اٹھ کر ذہن کی طرف بلند ہوتے محسوس ہونے لگتے۔ بلکہ اس فکر سے پیدا ہونے والی اور بہت سی فکریں بھی تھیں۔ اس کی بیوی کا کیا ہوگا جس سے وہ بہت پیار کرتا ہے اور جو اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کے ان دو بچوں کا کیا ہوگا جن میں ایک ڈھائی سال کا ہے اور ایک دس مہینے کا ہے اس کے باپ کا کیا ہوگا جو بڑھاپے کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکتا، اور اس کی ماں کا انجام کیا ہوگا جو کسی نہ کسی بیماری میں ہمیشہ مبتلا رہتی ہے۔ ان سارے مسائل کا حل اس کی زندگی سے وابستہ تھا اور اپنی زندگی سے ایک طویل عرصہ تک وابستہ رہنے کا کوئی امکان اسے دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کے تصور کے پیش منظر میں ایک بڑا سا مہیب پھانسی کا پھندا تھا جس کے حلقے میں اسے پانچ چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی بیوی، دونوں بچے اور ماں باپ۔ اس نے سوچا کہ یہ پانچوں اس کے بعد مر رہے ہوں گے۔ ان سب کی زندگی ہمیشہ موت کے ایک طویل اور مسلسل عمل کے دباؤ میں رہے گی۔ پہلے تو خود اسے یہ سزا نہیں ملنی چاہیے اور اگر ضروری ہے تو صرف اسے ہی ملے۔ ان پانچوں کو بھی اس کے ذریعہ سے کس جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے پانچ اور سب کے سب ایسے افراد کو جو خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے زندہ رکھے ہوئے تھا اور زندہ رکھنے کی جدوجہد کرتا ہوا اپنا سماجی اور اخلاقی فرض کامیابی سے ادا کر رہا تھا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں یہ فرض کس پر عائد ہوتا ہے یا ہونا چاہیے؟

جو کچھ بھی وہ سوچ رہا تھا تو موت کے مقررہ وقت کے علم نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر اسے یہ علم نہ ہوتا اگر وہ پھانسی سے مرنے والا نہ ہوتا بلکہ کسی حادثے سے اس کی فوری ہلاکت ہو جاتی تو اس حادثے سے پہلے وہ کیا سوچتا ہوتا؟ وہ ہرگز یہ نہ سوچتا کہ اگر میں اچانک مر جاؤں تو میری بیوی، میرے بچوں اور میرے ماں باپ کا کیا ہوگا۔ اس کے اچانک مرنے سے اس کے متعلقین کا جو حال ہوتا وہی اس کے غیر اچانک طور پر مرنے سے ہوگا۔ کوئی مرے، کسی طرح مرے کبھی مر

کسی کے مرنے سے دنیا کا، کسی ریاست کا، کسی سماج کا، کسی خاندان کا کوئی کاروبار نہیں رکتا۔ نئی راہیں نکلتی رہتی ہیں اور نئے سفر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اسے یہ سوچنے اور سمجھنے کا شعور ہی کہاں تھا اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اسے یہ شعور ہوتا بھی تو اس کی نظروں کے سامنے اس کی بیوی کا اداس چہرہ اس کے بچوں کی معصوم شکلیں اور اس کے ماں باپ کی غمگین صورتیں مجسم سوال بنی اسے تکتی رہتیں۔ کیوں کہ شعور اور جذبات میں ہمیشہ رقابت رہی ہے اور جب زندگی اور موت کے درمیان چند ہی لمحوں، چند ہی قدموں اور چند ہی سانسوں کا فاصلہ رہ جائے تو شعور کی موت پہلے ہی واقع ہو جاتی ہے۔

اپنے خاندان کے مستقبل کو تاریک دیکھ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ پیچھے ہی اس کا ماضی کھڑا تھا وہ بھی تاریکی میں تھا اس نے زندگی میں پہلی دفعہ اس وقت اپنی ساری زندگی کا جائزہ لیا جب کہ اس کی زندگی تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کی زندگی سپاٹ تھی بے مزہ اور پھیکی تھی۔ اس میں کہیں بھی کوئی رنگ نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے سے یوں گزرتا چلا گیا جیسے گھڑی کی سوئیاں اپنے نشانوں پر سے گزر جاتی ہیں۔ اس میں زندگی کا ولولہ کبھی نہیں تھا۔ وہ ایک ان دیکھی اور انجان راہ پر سر جھکائے چلتا رہا نہ اس نے اپنی کوئی منزل معین کی تھی اور نہ اس منزل کی اس نے کبھی افق میں جستجو کی تھی کیونکہ وہ اس قسم کا انسان ہی نہ تھا۔ وہ ایسے پیدا ہوا جیسے کہ عام طور پر بچے پیدا ہوتے ہی ہیں۔ اس کی پیدائش میں کوئی غیر معمولی اہمیت نہ تھی۔ اور اس کی پرورش بھی اسی طرح ہوئی جیسے نچلے متوسط طبقے کے بچوں کی ہوتی ہے۔ نہ تو اس کی خاص طور پر تربیت کی گئی نہ کوئی اسے اعلیٰ تعلیم ہی ملی۔ اس نے جیسے تیسے میٹرک پاس کیا۔ پھر اسے ایک معمولی سی نوکری مل گئی۔ اس کے بعد ماں باپ نے اپنی حیثیت برابر گھرانے کی لڑکی پسند کر کے اس کی شادی کر دی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزارنے لگا۔ پھر اس کے ہاں دو بچے بھی پیدا ہو گئے۔ وقت کے بہاؤ میں واقعات نمودار ہوتے رہے اور ان واقعات کے ساتھ وہ بھی بہتا چلا گیا۔ اسے زندگی بھر میں صرف دو تین دفعہ انتہائی مسرت ہوئی تھی اور تینوں دفعہ اس نے اپنے آپ کو ایک بڑا اور ذمہ دار انسان محسوس کیا تھا۔ ایک دفعہ تو جب اس کا میٹرک کا نتیجہ نکلا تھا، دوسری دفعہ جب کہ اس کی شادی ہوئی تھی، اور تیسری دفعہ جب کہ اس کا پہلا لڑکا پیدا ہوا تھا (اس کے ماں باپ کو بھی اس کے پیدا ہونے پر اسی طرح بڑی خوشی ہوئی ہوگی۔ لیکن اب وہ کتنے دکھ کے ساتھ اس کی لاش جیل سے لے جائیں گے۔ یہ اس کے ضعیف باپ اور بیمار ماں کی مشترکہ سوانح حیات ہے۔)

یہ تین سنگ میل بتاتے ہیں کہ اس کی زندگی کتنی طویل یا مختصر تھی۔ اگر یہ پیدائش وقت کے لحاظ سے کی جائے تو اس نے ایک ہندوستانی کی اوسط عمر کا نشان طے کر لیا تھا لیکن کسی حصول کے لحاظ سے کی جائے تو وہ ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور زندہ رہنے کے لیے مراجا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے تو ابھی دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں، کیا ہی نہیں، اور اگلا جنم بھگوان جانے ہے بھی کہ نہیں، پہلے جو اسے جنم جنم کے چکر پر اعتقاد تھا وہ اب اٹھنے لگا تھا۔ ایک جیوتشی جی نے اسے بہت دن ہوئے بتایا تھا کہ پچھلے جنم میں اس نے اس ناجائز نوزائیدہ کو جو

ن کی محبوبہ کو ہوا تھا، گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس بات پر اس نے فوراً یقین کر لیا تھا اور اس پر وہ ہمیشہ افسوس کیا رتا تھا۔ اس لیے پوجا پاٹ اور دھرم کرم کے معاملات میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتا۔ اور جب اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی اسے خیال ہوا تھا کہ یہ اصل میں اس خون کی نہیں بلکہ اس خون کی سزا تھی۔ مگر اب اسے اس بات پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ اغ پر بہت زور دینے کے باوجود اسے اپنے پچھلے جنم کا وہ واقعہ یاد نہیں آ رہا تھا جس کی سزا وہ اب بھگتنے والا ہے اید اس کے سوچنے کا مطلب یہ تھا کہ پچھلے ہی جنم میں اسے سزا مل جاتی تو سزا کا مقصد پورا ہوتا یا اسی جنم میں سزا ملنی تھی ہ بھی ایک ناجائز نوزائیدہ ہوتا اور اس کی ماں کا یار اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

ایک تو اس کا ماضی، اور پھر اس کے ماضی کا بھی ماضی، اور نہ جانے یہ سلسلہ کہاں تک جاتا ہے اس سلسلہ کی جستجو حاصل ہے کیوں کہ ابھی ابھی جس ماضی کی تشکیل ہوئی ہے وہ ایک ناقابل گرفت حقیقت سے قابل فراموش فریب میں بدل چکا ہے ر فریب کی رسی تھام کر تاریکیوں میں جتنی دور چاہے کوئی چلتا چلا جائے وہ اپنے آپ سے فریب کے سوا کچھ نہیں۔

ماضی کے تمام گم شدہ لمحوں کو اس نے چن چن کر ایک جگہ سلسلہ وار جوڑا اور ایک کے ساتھ اس کی تفصیل ملا کر رکھ دی ران پر نظر ڈالی مگر وہ آنے والا آخری لمحہ جب کہ وہ آخری سانس لے گا۔ اس کی خلا میں متحرک نظر سے لٹک رہا تھا اور اس کے درمیان ب آجانے کی وجہ سے اسے کوئی بازیافتہ لمحہ صاف صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔

جیسے اس کے ماضی، حال اور مستقبل سبھی نے موت سے سازش کر رکھی تھی۔

ماضی میں اس نے جنم ضرور لیا تھا لیکن ماضی نے اسے ایسی کوئی نعمت اور موقع نہیں دیا تھا جس سے وہ زندگی کو سمجھ سکتا ندگی کو سنوارتا، اور زندگی کا مزہ اٹھاتا۔ صحیح معنوں میں اس نے اب تک زندگی بسر ہی نہیں کی تھی بلکہ جیتا چلا آیا تھا۔

حال کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے موت کی طرف ایک ایک قدم تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ صرف رواں دواں لمحہ ہی اصل زندگی ہے لن جو تھوڑی ہی دیر کے بعد مرنے والا ہو اور مرنے کے انتظار میں ہو اس کا ہر گزرنے والا لمحہ بھی موت ہے۔

اس کا مستقبل جو اسے دکھائی دیتے ہوئے بھی دکھائی نہ دے رہا تھا کہیں آس پاس ہی تھا جس سے اسے اپنے ن کی بو آ رہی تھی۔

بھگوان پر سے بھی اس کا ایمان اٹھنے لگا کیوں کہ جس دنیا میں انصاف نہیں ہے ایسی دنیا کسی بھگوان کی بنائی ہوئی ہیں ہو سکتی، اور جس دنیا میں اتنی برائیاں بھری ہوئی ہوں اس دنیا کا کوئی بھگوان نہیں ہے۔

وہ بے گناہ تھا، اور موت کی سزا پانے والا تھا۔ یہ سزا پوری ہو کر ہی رہے گی اور اسے مرنا ہی ہوگا۔ اس وت سے وہ بچ سکتا تھا نہ کوئی اسے بچا سکتا تھا۔

کسی مہلک حادثے یا لاعلاج کی حد تک خطرناک بیماری کے مریض کو آخر وقت تک رتی برابر امید پیدا ہوتی ہے کہ شاید یسی کوئی بات بن جائے گی جس کی بدولت وہ نہیں مرے گا۔ لیکن پھانسی پانے سے پہلے پھانسی پانے والے کے پاس یہ امید بھٹکتی ہی نہیں کیوں کہ فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، تاریخ مقرر ہو جاتی ہے اور مقررہ وقت جوں جوں قریب ہونے لگتا ہے

تصور میں پھندا واضح اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور پتہ تک نہیں چلتا کہ اصلی پھندے نے اس کی جگہ کب لی ہے۔

جیسے جیسے صبح کا اجالا پھیلنے لگا اس کی آنکھوں میں تاریکی بڑھنے لگی اور اس تاریکی کو چیر کر ڈپٹی جیلر چند سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ ان کو دیکھتا ہی تھا کہ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا اور اپنے گلے میں اسے کوئی چیز پھنستی اور اٹکتی سی محسوس ہوئی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں اتنی نم ہو گئیں کہ ڈپٹی جیلر اور سپاہی اسے نظر آتے تھے۔ لیکن نمی میں ابھرتے ہوئے ان کے خاکے بہت سے پھندوں کی شکل میں جھولنے لگے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ انسان سے یکایک وہ پتھر کا بت بن گیا ہے جو خود سے حرکت نہیں کر سکتا۔ بس اب سپاہی اسے اٹھانے کے لیے بڑھتے ہی ہوں گے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آنسوؤں کی دھاریں اس کے پچکے ہوئے گالوں پر سے بہنے لگیں۔ کچھ دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی تنہائی کے سوا، وہاں کوئی نہ تھا۔

اسے بڑی حیرت بھی ہوئی اور مایوسی بھی۔ وہ جھنجلا گیا۔ اس طرح بار بار مرنا اسے گوارا نہ ہوا۔ وہ یکایک شدت سے یہ تمنا کرنے لگا کہ اسے فوراً وہاں سے لے جایا جائے اور موت کے حوالے کر دیا جائے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو ایک مرد کی موت مرے نہ کہ اس کتے کی طرح جسے زہر دینے کے لیے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ گویا بے ولولہ زندگی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس نے مرنے کا حوصلہ پیدا کر لیا۔ آستینوں سے اس نے آنسو پونچھ لیے اور ہتھیلیوں سے چہرے کا پسینہ صاف کیا ٹھنڈی سانس لی اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ سپاہیوں کا انتظار کرنے ہی لگا تھا کہ ڈپٹی جیلر چند سپاہیوں کے ساتھ سلاخوں والے دروازے پر آیا اور کہنے لگا۔

"تمھاری پھانسی ملتوی کر دی گئی ہے۔"

اس کے چہرے پر حیرت کا ویسا ہی تاثر پیدا ہوا جیسا سیشن کورٹ کے فیصلے کو سن کر ہوا تھا جس کی بنا پر وہ مجرم قرار دیا گیا تھا، اور اس کے لیے موت کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ اس کے کان سنسنانے لگے۔ اس نے جو کچھ سنا تھا اس پر اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہیں یہ بھی تصور کا کھیل نہ ہو۔

"اصل میں ہوا یہ" ڈپٹی جیلر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کہ جس خون کے لیے تم کو سزا دی جانے والی تھی وہ کسی اور نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ کل رات وہ دونوں آپس میں لڑ بیٹھے اور قاتل کے دوست نے پولیس کو جا کر سارا آنکھوں دیکھا حال بیان کر دیا، اور سرکاری گواہ بن گیا ہے۔ قاتل گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب یہ مقدمہ پھر سے چلے گا اور اس کے فیصلے تک تمھاری سزا ملتوی کر دی گئی ہے۔ سوچو تو سہی جب تمھارے گھر والے تمھاری لاش لینے کے لیے آئیں گے اور انھیں پتہ چلے گا کہ تمھیں پھانسی نہیں ہوئی ہے تو ان کی خوشی کا کیا حال ہوگا۔ ۔ ۔"

اور ڈپٹی جیلر نہ جانے کیا کیا کہتا رہا ہے۔ بڑی امیدیں دلاتا رہا۔ مبارک باد دی۔ مگر وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ سوچ میں گم ہو گیا تھا، وہ بھی شاید یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر والے آتے ہوں گے، اور ان کا اب کیا حال ہوگا ——

اس کے گھر والے باہر جمع تھے۔ اس کی بیوی کا چہرہ اداس نہ تھا، اس کے بچوں کی معصوم شکلیں اور بھی معصوم لگ رہی تھیں۔ اس کا باپ خمیدہ کمر ہونے کے باوجود سینہ تانے ہوئے تھا۔ اس کے تیور کہہ رہے تھے یہ تو میں پہلے ہی کہتا تھا میرا بیٹا خونی ہو ہی نہیں سکتا۔

بات یہ تھی کہ اس کی پھانسی کی سزا ملتوی ہونے کی خبر جیل کے احاطے میں ہر طرف ناچ رہی تھی۔ اور ایک ہرہ دار نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ بس دوبارہ مقدمہ ختم ہوتے ہی وہ چھوٹ جائے گا۔ مگر اس کے گھر والے قانونی ابطے کا یہ چکر سمجھ نہ پاتے تھے۔ ان کا سیدھا سادا سوال تھا کہ جب وہ خونی نہیں اور اصل قاتل گرفتار کر لیا گیا ہے ا سے کیوں رہا نہیں کیا جاتا۔

ابھی وہ پہرہ دار سے بحث کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی اندر سے نکل آیا، اور اس طور سے ان کی طرف نے لگا جیسے وہ ان کا اپنا ہی کوئی آدمی ہو۔ اور بولا "پھانسی کی سزا ملتوی ہونے کی خبر سن کر وہ اتنا خوش ہوا کہ لیا۔ اس کی لاش لے جانے کا بندوبست کرو۔"

قدیرالزماں

جہانِ گزراں

ابھی ابھی کی بات ہے۔
ماں کہہ رہی تھی۔
"تم نے دیکھا نہیں بہن۔ میرا مختار جب پیدا ہوا تو کدو کا کدو تھا۔ پتھر جیسا جسم ــــ لاڈلی آپا کی نظر لو
نوک بے گیا تھا۔ سال بھر کا ہوا تو اسے گود میں لینا مشکل ہو گیا۔ اسے اٹھا کر تو اس کی دادی کی سانس ۔۔۔"
ماں یہ کہتی رہی اور میں بستہ پہلو میں دبائے اسکول کے لیے بھاگ نکلا۔
دوپہر کا وقفہ بھی کتنا طویل ہوتا ہے کہ ڈھیر کے ڈھیر کام کر لو اور کلاس میں آکر بیٹھو تو گھنٹی ہے کہ بجتی ہی نہیں۔ لیکن
کلاس سے دوسری کلاس۔ ایک سال سے دوسرا سال کوئی وقفہ ہی نہ تھا۔

چاندی کا گیارہواں چھلا بن کر آیا اور سفید سفید چھلا صندل اور سہرے کی خوشبو میں بسا کر پرانے دس چھلوں
ڈی میں پرو دیا گیا تو گھر گھر سوجی بانٹنے دلاری کے ساتھ میں بھی گیا۔ پھر نانی اماں نے میری ماں سے کہا۔
"اگلے سال بارہ ہو جائیں گے تو انھیں وزن کر کے اس کی قیمت کا پیسہ خیرات کر دینا۔"
پھر نانی نے میری بلائیں لیں۔ اپنا سیدھا ہاتھ میرے چہرے پر پھیرا اور پانچوں انگلیوں کو ملا کر اس کا پیار لیا۔
"خدا تیرے نانا، نانی کو تیری بارہویں سالگرہ دیکھنا نصیب کرے۔"

بارہویں دفعہ دودھ جیسا چاندی کا چھلا بن کر آیا تو گھر میں سبھی تھے۔ دادا، دادی، پھوپھیاں، چچا، ماموں، خالائیں
ا، ابا، بھائی بہن۔ نانا آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ صرف نانی کی کمی تھی۔ ابھی تک تو ہر سال ہار پہنانے کی رسم نانی ہی
ادا کرتی تھیں۔ اس دفعہ خالہ نے انجام دی۔ ہار پہناتے پہناتے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔
"آخری بار تمھاری نانی کے نصیب میں نہ تھا کہ تمھیں ہار پہنائیں۔"

یہ سنا تھا کہ چاروں طرف آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔
جھلکتی آنکھوں سے سب کو تکتے ہوئے میں بھی رو پڑا۔
پھر پلک جھپکتے لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ کوئی خالہ اپنے ننھے کو دودھ پلا رہی تھی۔ کوئی پھوپی اپنی بیٹی کے منہ میں نوالے بنا کر دے رہی تھی۔
بات نانی سے شروع ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ گھر میں کئی بار دادی لاچی لیکن یکے بعد دیگرے بالیاں نکلتی رہیں۔ جوان میکے سے سسرال جاتے رہے اور بوڑھوں نے اپنے میکے کی راہ لی۔
یہ سب آنکھیں کھلتے اور بند ہوتے ہوتا رہا۔

"ہائیں تمھیں یہ کیا ہوگیا ہے سویرے سویرے تم کہاں چلے گئے تھے —— مختار کی ماں دیکھو تو اس کے کپڑے خون میں رنگے ہیں۔
آٹا بھگوتی ہوئی ماں جو گھبرا کر اٹھی تو اس نے سارا آٹا پانی پانی کر دیا۔
"میرے بیٹے، میرے مختار۔"
کپڑوں پر اتنے خون کے دھبے نہ تھے جتنے کو وہ خیال کر کے دوڑی تھی۔ میرے ہاتھ میں گوند دیکھ کر اس نے ماسٹر جی کو کوسنے دیئے۔
"خدا بھلا کرے ماسٹر جی کا۔ بچوں سے گوند منگوانے لگے۔ چپراسیوں کا ناس ہو۔ میرا بیٹا خون خون ہوگیا۔"
"ببول کے پیڑوں پر چڑھنے یونہی گیا تھا۔ ننگے سر ننگے پاؤں"۔ باپ نے کہا۔
دیکھو دیکھو یہ ابھی ابھی ہوا ہے۔ میرے جسم میں ببول کے کانٹوں کی یہ چبھن ابھی بھی محسوس ہوتی ہے۔ میری ماں انہیں دانتوں سے نکال رہی ہے۔ میرا باپ میرے زخموں کی مرہم پٹی کر رہا ہے۔ بھائی بہن ٹکٹکی باندھے تک رہے ہیں —— اور کتنا طویل عرصہ لگا ان زخموں کے مندمل ہونے میں۔

یہ بڑی عمر کی لڑکیاں مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھتی ہیں میں انھیں نہیں چھیڑتا تو یہ قریب آتی ہیں ——
ارے کتنی جلدی میری مسیں بھیگ گئیں۔ اب لڑکیاں مجھ سے شرماتی کیوں ہیں؟ اور ہاں قدسیہ مجھ سے بات کرتے تمھارے چہرے پر حیا کی یہ لہر کیوں دوڑ گئی۔ ایک بار تم نے آنکھیں ملائیں تو تمھارے مکھڑے پر جیسے شبنم برس پڑی۔

ارے . . . . یہ سب کچھ ہوگیا۔ وقت نے ایک کروٹ بھی نہ بدلی، ایک انگڑائی بھی نہ لی۔ اس کی کسی جھرجھری کا احساس تک نہ ہوا۔ اور ہاں ابھی ابھی تو کمرا میں آئینہ دیکھ رہا تھا یہ سفید بال میری کنپٹی میں کہاں سے آگیا۔ یہ میرے

ہاتھ کیوں نہیں لگتا۔ کتنی دیر سے میں کوشش کر رہا ہوں! اُف یہ گھڑیاں کتنی صبر آزما بن گئیں۔ کئی سکنڈ کا یہ طویل عرصہ۔ اب تو میرے سر میں سارے بال سیاہ ہیں نا! ارے یہ کیا ایک لمحہ بھی تو نہ گزرا۔ ابھی تو میں نے آئینہ دیکھا تھا سارے بال سیاہ تھے۔ پھر ابھی دیکھ رہا ہوں تو سینکڑوں بال سفید ہو گئے۔ کتنوں کو نوچ کر پھینکوں۔ وقت کھڑا ہی رہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا لیکن میرے یہ سارے بال سفید ہو گئے۔

” اے مالن تو کہاں ہے۔ پھولوں کے ان گملوں کو پانی کیوں نہیں دیتی۔ مجھے ڈر ہے کہیں تو انھیں اجاڑ نہ دے۔ میری ماں جب تک زندہ تھی ان کی بڑی دیکھ بھال کرتی تھی۔ تو تو انھیں کی پالی ہوئی ہے —— دیکھ تو ان کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ بیگم صاحبہ اور بچوں کو تو ان کی فکر ہی نہیں۔“

میں نے تو ابھی ابھی یہ ہدایت دی تھی۔ لیکن اب تو وہ مالن بھی نہیں۔ ارے —— میرے یہ شناسا چہرے کہاں کھو گئے انھوں نے مجھے بہت کچھ دیا لیکن یہ مجھ سے کچھ لیے بغیر ہی اوجھل ہو گئے۔ اے وقت تو رکتا ہی نہیں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہرتا۔ لیکن تو چلتا بھی کب ہے۔ رکنا یا چلنا تو تیری عادت ہی نہیں۔ لیکن یہ کیا کہ جنگل کی یہ خوبصورت ہرنیاں چوکڑیاں بھرتی ایک لمحہ کے لیے رک کر اور گردنوں کو موڑ کر تیری طرف جھانکتی ہیں تو تو انھیں اپنی گولی کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ ارے ہاں یہ لمحہ بھی تو ہمارے احساس کا ایک حادثہ ہے۔

ارے رے۔ یہ بچے کتنی جلدی بڑے ہو گئے۔ ابھی ابھی تو یہ میری گود میں کھیل رہے تھے۔ اے آیا۔ دُردانہ بہو سے کہو کہ ان کا ہونے والا داماد آیا ہے۔ جمال میرے بہادر نواسے ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ بہو تمھاری دلہن کو لے کر ابھی آئیں گی۔

ارے۔ آج میرے سینے میں یہ درد سا کیوں ہے؟ بڑی بہو تم یہاں آؤ۔ قدسیہ کے بعد تو تم نے میری بڑی خدمت کی ہے —— ہاں آج رئیس اور انیس کو تار کر دینا کہ ایک بار مجھے دیکھ جائیں۔ میں اب چند دنوں کا تو مہمان ہوں۔ اپنی نند زلیخا اور ارشد میاں کو بھی اطلاع دے دینا۔ بھائی بہنوں میں تو اب کوئی نہیں رہا۔ آخری دنوں میرا گھر بھرا رہے۔ بس یہی ایک آرزو ہے۔ یہ وقت بڑا طویل ہے بہو۔ جیسے چلتے چلتے رک گیا ہو —— اسے بلاؤ بہو۔ فرحت سویرے سویرے تم کہاں جا رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے ماسٹر صاحب کے لیے تمھیں گوند لے جانا ہے۔ دیکھو فرحت میری ایک بات نہ بھولو۔ تم اپنے استادوں کا کہنا ضرور مانو۔ لیکن گوند لانے کے لیے ببول کے بن جاؤ تو ننگے سر، ننگے پاؤں ہرگز نہ جانا۔ اس کے کانٹے بڑے تیز تیز ہوتے ہیں۔ بہو تم جاؤ۔ صبح سے ان گملوں کو کسی نے پانی نہیں دیا ہے۔ دیکھنا میری آنکھوں کے سامنے یہ ہرے بھرے رہیں، اور ہاں بچوں کو اطلاع کرنے میں دیر نہ کرو۔

میرے بچو ـــــ تم سب یہاں آؤ ـــــ میرے قریب آؤ۔ دیکھو یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ تم لوگ میری آواز سن رہے ہو نا؟ ذرا دانہ ہو تم ذرا میرے پیر تو دیکھو۔ یہ ٹھنڈے ہو گئے ہیں کیا۔ یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ رئیس بیٹے تم ذرا گھڑی دیکھنا۔ کیا وقت ہے اب۔ ارے یہ رک کیوں گئی۔ ٹک ٹک کیوں نہیں کرتی ـــــ ارے یہ میری لو کیا ہو گیا ہے ـــــ دھندلا دھندلا سا کیوں دکھائی دے رہا ہے ـــــ یہ تارے کیوں ناچ رہے ہیں۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ کوئی گھونٹ دو گھونٹ پانی تو دو۔ کتنی لمبی اور کٹھن گھڑی ہے یہ ـــــ بیٹی تم آگئیں ـــــ آؤ، میری آنکھوں کے سامنے آؤ ـــــ زلیخا تم اپنے میکے آگئیں۔ کرو بیٹی اب مجھے اپنے میکے بھیجنے کا بندوبست کرو۔ اب دیر نہ کرو اور بڑی مہو ـــــ تم تم ہارے۔ بہت احسان۔ میرے۔ میرے گم گلوں. . . . ہاں ہاں . . . . .

جاوید لطیفی

کاروبار

جب کریا نے مجھے دو روپے واپس لاکر دیئے تو مجھے بہت حیرت ہوئی، یہ دو روپے میں نے اُسے اس کے ایک عزیز کی موت پر کفن دفن کے لیے چندہ میں دیئے تھے۔ دو روپے لوٹاتے وقت کریا کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جو خوشی کی ہی ہو سکتی تھی۔ مجھے تعجب تھا کہ اس کے گھر میں کسی کے مرجانے پر بھی اس کی ایسی کیفیت کیوں ہے. اور اس نے میرے روپے واپس کیوں لوٹا دیئے ہیں — شاید وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا، ہنستے ہوئے کہنے لگا.

بابو صاحب میں خوشی سے یہ روپے لوٹا رہا ہوں آپ ناراض نہ ہوں اس میں کوئی برائی نہیں ہے.

لیکن کریا — میں نے یہ روپے اچھے مقصد کے لیے دیئے تھے اور تم انھیں واپس کر کے میری نیکیوں کو گھٹا رہے ہو.

اجی کہاں کا مقصد بابو صاحب. . . بس رہنے دیجئے. کریا نے تلخی آمیز انداز سے ہنستے ہوئے کہا. والا

یہ کیا کہہ رہے ہو تم — کسی غریب کی میت عزت سے ٹھکانے لگوانا اچھا مقصد نہیں ہے کیا، اور پھر مرنے والا تمہارا اپنا رشتہ دار بھی تو تھا — میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا.

پیسے دیئے تھے لیکن . . . . لیکن . . . . !

اور یہ کہتے کہتے کریا کچھ ہچکچا گیا، نہ جانے کیا سوچ کر اس نے جملہ پورا نہیں کیا۔

کیا بات ہے آخر کہو نا صاف صاف. یقیناً تم ایسے آدمی نہیں ہو کہ اس میت کے سلسلے میں کچھ گول مال کر سکو، کیا وہ . . . . . وہ . . . . .

اور کریا نے بیچ ہی میں میری بات کاٹتے ہوئے کہا

اسی لیے تو بابو جی میں وہ . . . دو روپے لوٹا رہا ہوں، رہی میت تو وہ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، چادر اٹھا کر نعش کا معائنہ میں نے ہی کروایا تھا حالانکہ آپ اس کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن نعش کا معائنہ کرنے کے اصرار میں ایک راز یہ بھی تھا کہ آپ کے ساتھ دوسرے لوگ بھی اچھی طرح مردے کو دیکھ لیں، اور تسلی کر لیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میت کے متعلق کوئی گول مال نہیں تھا۔

صہ

تو پھر آخر کیا بات ہے —— کیا میرے روپے اس لائق نہیں تھے کہ وہ کسی کی موت مٹی میں لگائے جا سکیں آخر بات کیا ہے —؟؟

کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے بابو جی لیکن سردست میں اس کی وضاحت نہیں کرنا چاہتا — یہ کہہ کر اور میرے سا دو روپے رکھ کر کریا تیزی سے چلا گیا۔

کریا کا اصلی نام کریم ہوگا، عبدالکریم، سید کریم یا شاید کریم خاں لیکن لوگ اسے کریا ہی پکارتے تھے اور وہ اپنا بھی نام بتاتا تھا۔ وہ مفلوک الحال اور بے حد غریب آدمی تھا میری وساطت سے اسے کہیں عارضی ملازمت مل جایا کرتی تھی نہ جانے کیوں مجھے اس سے ہمدردی سی تھی، گو مجھے اس کا صحیح نام اور اس کا اتا پتا تک نہیں معلوم تھا۔ تاہم علم ضرور تھا کہ وہ درگاہ شریف کے پیچھے کئی بے گھر لوگوں کے ساتھ کسی ایک جھونپڑے میں رہتا ہے اس کے لواحقین کون کون تھے اور کیا کرتے تھے مجھے کچھ خبر نہ تھی —— کریا نے سر راہ ایک دن مجھ سے بھیک مانگی تھی تو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ کوئی کام کیوں تلاش نہیں کرتے بھیک مانگنا ٹھیک نہیں ——— میرے کہنے پر اس نے بھیک میں دیے ہوئے پانچ پیسے کا سکہ فوراً لوٹا دیا تھا اور کہا تھا کہ بابو صاحب آپ ہی مجھے کوئی کام دلا دیجیے میں خود بھیک مانگنا پسند نہیں کرتا اور اس کی یہ حرکت مجھے بھلی معلوم ہوئی تھی، جب میں نے استفسار کیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ لکھا پڑھا نہیں ہے اور صحت جسمانی کے اعتبار سے وہ فوج یا پولیس میں بھرتی ہونے کے قابل بھی نہیں ہے، ہنر اسے کچھ آتا جاتا نہ تھا واقعی وہ کرتا تو کیا کرتا، پھر میں نے کچھ سوچ کر اسے ایک خط کے ساتھ اپنے ایک دوست کے پاس بھیج دیا تھا جو گورنمنٹ امپلائمنٹ ایکسچینج میں ملازم تھا، خط میں میں نے یہی سفارش کی تھی کہ وہ اس غریب آدمی کے لیے روزگار کی کوئی سبیل نکالے۔ چنانچہ میرا دوست جب بھی موقع ملتا اور کریا کے لائق کوئی کام نکلتا ضرور اس کا خیال رکھتا تھا اور اس کا نام لسٹ میں شریک کروا کر اسے کہیں نہ کہیں ملازمت دلوایا کرتا تھا۔ گو یہ نوکری عارضی ہوتی تھی لیکن اس سے کچھ عرصہ کے لیے کریا کی بیروزگاری دور ہو جایا کرتی تھی۔

شاید ادھر بہت عرصہ سے کریا کو کوئی نوکری نہیں ملی تھی ایک دو بار حالت پریشانی میں وہ مجھ سے ملا تھا اور میرے پوچھنے پر اس نے یہ بتلایا تھا کہ وہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر اکثر جاتا ہے لیکن ادھر بہت دنوں سے اس کے لائق کوئی کام نہیں نکل سکا ہاں، اس کارڈ کی وقت پر تجدید ہو جایا کرتی تھی اور بس . . .

کریا ایسی صورت میں یقیناً بھیک پر گزارہ کرتا ہوگا لیکن اس نے مجھ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا جب بھی مجھے وہ دور و نزدیک دکھائی دیا پریشان ہی نظر آیا۔

صبح جب میں بازار سے گزر رہا تھا تو نٹ پاتھ کی ایک طرف میں نے کچھ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اپنا بائیسکل روک لیا تھا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا بات ہے قریب گیا تھا۔ وہاں میں نے کریا کو رونی صورت بنائے بیٹھا دیکھا تھا اور کچھ لوگ ایک طرف رکھے ہوئے مردے کے کفن دفن کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے مجھے دیکھ کر کریا

فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور قریب آکر کہنے لگا تھا۔

بابو صاحب میرے ایک بوڑھے عزیز چل بسے ہیں، ہمارے ہوتے ہوئے بھی لاش لاوارث ہے اس لیے کہ وارثوں میں نعش ٹھکانے لگانے کی سکت ہی نہیں ہے، کھانے کے لیے ہی کچھ نہیں تو کفن دفن کیسے ہوسکے گا۔ ہم خود زندہ لاشیں ہیں اور اپنے مردہ عزیز کو بازار میں لے آئے ہیں اور چندہ کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

کریما کے کہنے پر میں نے فوراً دو روپے جیب میں سے نکالے تھے اور جو صاحب روپے اکٹھا کر رہے تھے انھوں نے میرے ہاتھ میں سے روپے لے کر ایک تھالی میں ڈال لیے تھے اور چندہ دہندگان کی فہرست میں میرا نام شریک کر لیا تھا۔ نام نوٹ کرتے کرتے انھوں نے کریما سے کہا تھا ——

— کریما —— بابو جی کو میت دکھا دو ——

میں نے میت کا دیدار کرنے سے انکار کیا تھا لیکن کریما کے مجبور کرنے پر اور کئی لوگوں کے ساتھ میں نے بھی میت دیکھی نعش ایک بوڑھے کی تھی شاید بے چارہ کوئی طویل اور جانکاہ بیماری کاٹنے کے بعد انتقال کر گیا تھا ... افسوس ...

صبح کے اس واقعے کے بعد سہ پہر کے وقت کریما نے مجھے گھر پر میرے دان دھرم میں دیئے ہوئے دو روپے واپس کر دیئے تھے، اور مجھے حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ آخر وہ کیا بات ہوگی جس کی وضاحت کرنے سے کریما نے انکار کر دیا تھا . . . . . . اسی تشویش میں کچھ دیر مبتلا رہ کر پھر میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گیا۔

رات کو حسب معمول جب میں ایرانی کی ہوٹل سے چائے پی کر اور دوستوں سے گپ شپ کر کے گھر واپس ہو رہا تھا تو یتیم خانہ کے چوراہے کے پاس مجھے کچھ دور ایک آدمی نشہ میں بہک کر لڑکھڑاتا اور بڑبڑاتا دکھائی دیا —— نہ جانے وہ کسے گالیاں دے رہا تھا۔

جب میں قریب پہنچا تو توقع نہیں تھی کہ وہ کریما ہوگا جو اس قدر گندے کردار کا آدمی ثابت ہوگا — میں نے سوچا کہ شاید پہلی بار میں نے اسے اس عالم میں دیکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ پرانا شرابی ہو، اور میرے مشاہدے میں پہلی بار اس کی یہ حرکت آئی ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ نہ جانے کیوں وہ مجھے جب بھی ملتا تھا ایک اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس سے ملنے کا پہلا اتفاق ہی میرے لیے انشا انگیز ثابت ہوا تھا، اس نے میری بھیک کے پیسے لوٹا دیئے تھے اور کوئی جائز کام یا محنت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میرے اپلائنٹ کے دفتر والے دوست کی رائے بھی اس کے متعلق اچھی ہی تھی، کریما جہاں کہیں کام کرنے جاتا تھا ایک اچھا ریکارڈ چھوڑ کر آتا تھا لیکن آج . . . . . اس وقت . . . . . وہ ہاتھ بھٹی کی ارزاں شراب پی کر بہکا ہوا پھر رہا تھا . . . . اس کے تعلق سے میرا اعتبار مجروح ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہو، میں نے سوچا — بہت سے لوگوں کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ —— بعض لوگ اپنے چہروں کی معصومیت کے باوجود بڑے کمینے ثابت ہوتے ہیں بعض ہوتے ہی نالائق ہیں لیکن اپنے آپ کو شرافت کے جھوٹے لبادے میں چھپائے

سہتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے اس وقت میرے سامنے کریا ظاہر ہو گیا تھا۔

میں نے اس سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی، لیکن جہاں کریا کھڑا تھا وہاں سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبے تھے اور اتنے حصے میں سڑک اور فٹ پاتھ پر خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے گزرتے ہوئے اس نے دیکھ ہی لیا۔

بابوجی۔۔ بابو صاحب۔۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔ صرف ایک منٹ۔۔۔۔

کریا نے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں مجھ سے کہا، اور میرے پاس آگیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے، سڑک پر سوائے آنے جانے والوں کے، خواہ مخواہ رکنے اور تماشا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا، اگر یہی شام کا وقت ہوتا تو آس پاس کے رہنے بسنے والوں آباد سڑکوں پر گزرنے والوں کا ہجوم سا ہو جاتا لیکن اس وقت ایسا ہجوم نہیں ہو سکتا تھا، ورنہ ایک بہکے ہوئے شرابی کے ساتھ میرا بھی ایک تماشا ہی بن جاتا ـــ

کیا ہے کریا ـــ جاؤ گھر جا کر سو جاؤ، اس وقت مجھے بھی جلدی ہے۔۔۔۔

میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔

میں۔۔۔۔۔ میں بابوجی۔۔۔۔۔۔ آپ کا زیادہ وقت۔۔۔۔۔ نہیں لوں گا۔۔۔۔۔ میری بات سن لیجئے۔۔۔۔۔ آپ کے دو روپے والی بات۔۔۔۔۔۔

اس کے یہ کہنے پر واقعی مجھے برک سا لگ گیا، آخر وہ بات کیا ہوگی، میری تشویش جو سو گئی تھی پھر جاگ اٹھی، میت کے چندے کا راز جاننے کی جستجو اور بھی تیز ہو گئی۔

تو آؤ ذرا اس طرف چلیں وہ سامنے بند دکان کا چبوترا ہے اس پر جا بیٹھیں گے ـــ

بابوجی۔۔۔ بڑی مہربانی ہوگی۔۔۔۔ چلیے۔۔۔۔۔۔

ہم دونوں کچھ قدموں کے فاصلے پر ذرا اندھیرے میں چبوترے پر جا بیٹھے کریا اپنے جس دشمن کو گالیاں دے رہا تھا اور بک بک کر رہا تھا مجھے دیکھتے ہی چپ ہو گیا تھا میرے سامنے وہ ہمیشہ باادب بننے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اس وقت بھی اس کی نیت ایسی ہی تھی لیکن دارو کی وجہ سے اس سے بن نہیں پڑ رہا تھا قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور زبان لغزش کھا رہی تھی ـــ اور اب وہ میرے برابر نہیں بیٹھا بلکہ چبوترے کی ایک سیڑھی پر میرے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ میں نے منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانا اور ٹھیک ہوں بابوجی۔۔۔ ٹھیک ہوں بابوجی۔۔۔ کہتا ہوا پیروں میں بیٹھ گیا تھا۔۔۔۔

اور اس طرح تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا ـــ اس ایک گھنٹے کے عرصہ میں اس نے مجھے بڑی عجیب و غریب باتیں بتائیں ایسی باتیں جنھیں سن کر میں حیران رہ گیا۔

کریا اس وقت بجو دادا سے خوب پٹ کر آ رہا تھا۔ بجو دادا فقیروں کی ایک ٹولی کا سردار تھا جو خود بھیک مانگتا تھا اس نے فقیروں کا ایک گروہ بنا لیا تھا، یوں تو کریا نے بجو دادا کے کئی قصے بیان کیے کہ کس طرح فقیروں سے مختلف کام

لیتا ہے۔ اس کے منہ چڑھے اور خوشامدی فقیر اچھی اچھی نیازوں کی دعوت میں اچھے کھانوں کے لیے بھیجے جاتے ہیں جہاں انھیں نقد نذر بھی ملتی ہے جس میں بجو دادا کا بھی حصہ ہوتا ہے، اس سے نظر ملانے والے یا نذر دینے والے فقیر غریب اور کمتر لوگوں کی دعوتوں میں بھیجے جانے کے لیے منتخب کیے جاتے تھے جہاں انھیں چرائی یعنی نذرانہ ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا بھی تو آنوں اور پیسوں کی صورت میں . . . . اور نہ جانے کیا کیا قصے بیان کیے تھے کریما نے لیکن جس بات پر بجو دادا نے اسے شراب پلا کر خوب پیٹا تھا وہ آج صبح کی میت سے ہی متعلق تھی۔

دراصل صبح والی میت سے کریما کا کوئی واسطہ نہیں تھا، وہ مرنے والا بوڑھا اس کا رشتہ دار بھی نہیں تھا بلکہ اس کے پڑوس میں رہنے والی ایک غریب عورت کا باپ تھا جس نے ایک لمبی اور اکتا دینے والی بیماری سے جان دی تھی۔ بجو دادا اور اس کی کمپنی کو بوڑھے کے مرنے کی خبر ہو چکی تھی۔

دادا اس قدر کمینہ تھا کہ وہ مرنے والوں کے نام پر بھی کمائی کرنے سے نہیں چوکتا تھا، کریما غریب تھا، حاجت مند تھا، لیکن میت کی بے حرمتی اور کسی مردے کی کمائی وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ بجو دادا کی ٹولی میں شریک نہیں تھا۔ لیکن پہلے اسی مفلسی، تنگ دستی اور مجبوریوں سے عاجز آ کر بجو دادا کے کچھ کام کر چکا تھا۔ وہ کچھ عرصہ اس کے ساتھ مزدور رہا تھا لیکن دادا کے اور اس کے نظریات میں عظیم فرق تھا، ایک دو بار اس نے دادا کو وارننگ بھی دی تھی کہ دیکھو دادا تم سب کچھ کرنا مگر کسی میت کی بے حرمتی مت کرنا ورنہ میں سارا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔

آج صبح جب وہ تلاش معاش میں گھر سے باہر چلا گیا تھا تو بجو دادا نے اس کی غیر حاضری میں اس غریب عورت کو دس روپے دے کر دو گھنٹوں کے لیے مرنے والے کی نعش کرائے پر حاصل کر لی تھی۔

دادا کے لوگ نعش کو فوراً بازار کے چوراستے پر لے آئے تھے اور فٹ پاتھ کے ایک سرے پر کفن دفن کے نام سے لاوارث میت کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے۔

جب وہ اپنے جھونپڑے میں واپس آیا تھا تو اسے پتہ چلا تھا کہ بوڑھے کی میت کاروبار کرنے کے لیے بجو دادا مردہ لے گیا ہے، وہ غصہ کے مارے بجو دادا سے نپٹنے کے لیے بازار میں پہنچا تھا جہاں دادا اپنے کام میں مصروف تھا۔

کریما کو معلوم تھا کہ بجو دادا کو اس دھندے میں اچھا خاصا نفع ہو جاتا ہے، کوئی اللہ کا لال اسے چالیس پچاس روپے بھی دے دیتا ہے اور تھوڑا تھوڑا چندہ جو جمع ہوتا ہے وہ الگ پھر اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے جن صاحب خیر حضرات کی فہرست بجو دادا کے پاس رہتی ہے ان سے الگ چندے آتے ہیں غرض کہ تھوڑی دوڑ دھوپ میں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی، کریما کو دادا کی اس آمدنی سے حسد نہیں تھا بلکہ اس انسانیت سوز اور ناپاک طریقہ کار سے نفرت تھی۔

جب وہ میت کی جگہ پہنچا تھا تو ہوشیار دادا نے کریما کے تیور پہچان لیے تھے اور فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے گیا تھا۔ اور بڑی لجاجت سے کریما سے معافی مانگ کر کہا تھا کہ۔

"بھائی بس یہ آخری دھندہ ہے، آئندہ میری توبہ، مل تو بھی چل سنا ہے کہ تو بہت پریشان ہے، چل اللہ نے کرم کر دیا ہے تجھے بھی

کچھ مل جائے گا۔"

کریا کیا کر سکتا تھا وہ غصہ میں چیختا چلاتا ضرور لیکن اس وقت دادا کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ ہو گیا اس نے دادا کی بات کو سچ مان لیا تھا کہ ملو اب یہ آخری بار ہے، دادا نے معافی بھی مانگی ہے، معاملہ ختم ہو جانا چاہیے۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ دادا اس سے اس قدر دب گیا ہے اور معافی مانگنے پہ اتر آیا ہے اور اس طرح بادل نخواستہ۔۔۔۔ اس کاروبار میں شریک ہو گیا تھا

جب چندہ کی وصولی کا کام ختم ہو چکا تو دوپہر کے وقت کریا نے دادا سے حساب طلب کیا تھا جس پر دادا نے حساب تو نہیں بتایا البتہ پانچ روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے اور کہا تھا۔

لے بھیا پانچ روپے لے جا۔ تو حساب کتاب کے پھیر میں کیوں پڑتا ہے۔

اس پر کریا نے کہا تھا

دادا مجھے پانچ روپے منظور ہیں مگر اس شرط پر کہ تم آئندہ یہ دھندہ نہیں کرو گے۔

ابے چھوڑ بڑا آیا نصیحت کرنے والا۔

دادا نے اسے ڈانٹ پلائی تھی، جس پر کریا نے بھی طیش میں آکر دادا کو سخت سست کہا تھا اور پانچ روپے میں سے تین روپے دادا کے منہ پر مار کر اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ وہ اس کی خبر پولیس میں کر دے گا۔۔۔ اس نے جو دو روپے لیے وہ مجھے لا کر واپس کر دیئے تھے اور خدا کا شکر بھی ادا کیا تھا کہ اس بار اس نے مردے کی کمائی کا ایک نیا پیسہ بھی اپنے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔

لیکن شام کے وقت بجو دادا کے لوگ اسے بہلا پھسلا کر پھر بجو دادا کے پاس لے گئے تھے، انھیں خوف تھا کہ واقعی کریا کہیں گڑبڑ نہ کر دے اور بجو دادا نے پھر اس کی خوشامد کر کے زبردستی اس کی دعوت کر ڈالی، اس کے انکار پر بھی اسے دیسی شراب پلائی گئی تھی اور خوب پلائی گئی تھی اور اس کے بعد۔۔۔۔

اس کے بعد بجو دادا اور اس کے ساتھیوں نے خوب زد و کوب کیا تھا اس کی اچھی مرمت کر ڈالی تھی اور اسے خبردار کیا تھا کہ اگر تو ہمارے معاملات کے بیچ آیا تو یاد رکھ تیری خیر نہیں کتے کی موت مارا جائے گا۔۔۔۔

پھر اسے راستے پر لا کر پھینک دیا تھا۔

اس وقت سے وہ بھٹک رہا تھا اور اپنے دشمنوں کو گالیاں دے رہا تھا۔

اور جب میں آدھی رات کے قریب کریا کے دل کی بھڑاس سن کر اپنے گھر واپس جانے لگا تو میں نے سوچا کہ یہ دنیا شاید ایک کالا بازار ہے جس میں زندگی کا سودا بھی ہوتا ہے اور موت کا کاروبار بھی۔

نور پرکار

روپے کی موت

کاکی کو اس کے شوہر کے مرنے کی خبر تین روز بعد ملی۔ لوگوں کا خیال تھا اگر یہ خبر اسے پہلے ملتی تو کاکی بھی اپنے شوہر کے ساتھ چل دیتی۔ تیسرے دن پتہ چلنے کے بعد بھی اس کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ کاکی اپنا سر پیٹتی، سینہ کوبی کرتی اور آٹھ آٹھ آنسو روتی اور اس کے دونوں بچے اور ایک بچی اپنی ماں کو روتا دیکھ رو لیتے جیسے ایک بھیڑیے کے پیچھے سارے بھیڑیے چھلانگ لگا جاتے ہیں یا ایک بندر کے ٹوپی پھینکتے ہی سارے بندر اپنے سروں کی ٹوپیاں پھینک دیتے ہیں۔ بس اسی طرح سے سارا گھر اور گھر کی وجہ سے محلہ اور محلہ کی وجہ سے سارا گاؤں پریشان تھا۔ پریشانی صرف کاکی کی تھی اور کاکی کی پریشانی سب کی پریشانی تھی!

ایک ایک کر کے سبھی چٹائی پر بیٹھ گئے زائچے ملانا شروع کیے۔ پر کہانی ادھوری ہی رہ جاتی تھی۔ کسی کا سلسلہ شاہ کی درگاہ تک پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا اور کوئی بھاٹ کی دکان تک پہنچ کر چپ ہو جاتا تھا، تو کوئی گاؤں کے قاضی کی دوستی کی بات چھیڑ کر کچھ سوچنے میں محو ہو جاتا۔ کاکی رو رو کر آدھی رہ گئی تھی۔ محلہ بھر کی بوڑھیاں فرش پر بیٹھی پان کی پیکیں تھوک رہی تھیں۔ ایک بار اس نے اپنا پلو ہٹا کر دیکھا تو ڈھیر سارے لوگوں کو جمع دیکھ کر پھر سے رونا شروع کیا۔ اُسے چپ کرانے میں کپڑے کے ٹکڑے نکل گئے۔ پر کاکی چپ نہ ہوئی۔ تب کہیں سے ایک نے کہا۔ کاکی ان کی عمر کیا ہوگی؟ تو دوسری نے کہا۔ یہ اچانک موت کیسے واقع ہوئی؟ بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ ابھی کئی سال اور جی سکتے تھے مگر کاکی منہ سے نہیں پھوٹتی تھی۔ سب خاموش ہو گئے۔ سسکیوں کی آواز مدھم سی پڑ گئی۔ اب عورتیں جان گئیں کاکی کی آنکھوں کے آنسو سوکھ گئے ہیں۔ اب وہ کچھ نہ کچھ کہہ کر رہے گی۔ کاکی بھوتنی بھی تو ابتدا سے۔ لوگ تو صرف وجہ جاننا چاہتے تھے۔ جب اس کی زبان کھلی تو جان پڑا۔ کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے!

"وہ موسیٰ کی دکان میں نوکری کرتے تھے، اور مہینے کے آخر میں ساٹھ روپے پاتے تھے۔ ہم دونوں اس میں خوش تھے مگر ایک روز ایک بچے نے دوسرے سال دوسرے نے اور تیسرے سال تیسرے نے جنم لیا تو ساٹھ روپے میں گزارہ مشکل ہو گیا۔ پھر ہم نے دکان چھوڑی اور تمہارے گاؤں چلے آئے۔ کہاں مہاراشٹر اور کہاں سوراشٹر۔ مہاراشٹر تو ابھی بنا۔ اس کے پہلے نہ جانے کیا نام تھا۔ نام کوئی بھی ہو، کوئی بھی تو راشٹر تھا، اور جب راشٹر ہوتا ہے تو قانون ہوتا ہے اور قانون صرف

غریبوں کے لیے ہوتا ہے امیروں کے لیے نہیں! پھر ہم نے شاہ کی درگاہ کے سامنے دکان کھولی۔ سال میں وہ ایک بار عرس کرتے۔ شاہ کی مرضی سے ان کو روپیہ ملتا رہا۔ گاؤں کا قاضی پکا مسلمان تھا۔ یہ بھی کٹر مذہبی تھے۔ دونوں میں بے حد دوستی تھی قاضی کی مہربانیاں بڑھ گئیں اور انھوں نے اپنے پاس بلالیا، اور ایک مکان رہنے کے لیے اور ایک دکان کے لیے دے کر اپنا فرض پورا کیا۔ کرایہ ہر سال لیتے رہے۔ چاہے دوستی کسی سے بھی ہو۔ دھندے کی بات ہر جگہ ہوتی ہے۔ آج کل محبت بھی تو بنا سودا اور سودے کے نہیں ہوتی۔ دھندہ آخر دھندہ ہے، کبھی مہنگا کبھی سستا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ عجب ریت ہے اور اس ریت میں کوئی گناہ نہیں ہے۔! اتنے میں پڑوسن نے پان کی پیک دیوار پر زور سے تھوک دی، اور ایک چھینک کے آتے ہی پتہ چلا۔ اب کاکی آگے نہیں کہے گی۔ مگر اس نے بھی تمباکو کو چونے کے ساتھ ملا کر کھالیا اور بات جاری رکھی۔ جیسے مشین کو چلنے کے لیے تیل لگتا ہے ویسے ہی کاکی کی زبان چلنے کے لیے چونا اور تمباکو بے حد ضروری ہے۔ کاکی نے تمباکو، چونے کے ساتھ نگل لیا۔ جیسے کہانی کا دوسرا موڑ پیش کر رہی ہو۔ واقعی وہ نئے موڑ پر آپہنچی تھی!"

"پھر میں نے اپنے دونوں بچوں کی شادیاں کیں۔" پڑوسن بول اٹھی۔ پھر وہ بچے کہاں رہے — ؟ کاکی زور سے چلائی۔ بھاگ پھوٹ جائیں تیرے۔ کتنے بھی بڑے ہوں، آخر وہ میرے لیے بچے ہی ہیں۔" اتنے میں نانی بول اٹھی — ارے کاکی تو آگے بول — پڑوسن کی ٹرانے کی عادت پرانی ہے۔ بیچاری کھسیانی بلی کھمبا نوچے تو کیوں کر — ؟ ہاں تو دونوں بیٹوں کی شادیوں میں بے حد روپیہ خرچ ہوگیا اور جب روپیہ خرچ ہوتا ہے تو واپس نہیں آتا۔ جیسے بات منہ سے نکل کر واپس نہیں آتی۔ شاہ کے بازو کی دکان کو بڑے بیٹے کے نام کیا اور قاضی جی کے گھر والی دکان کو چھوٹے بیٹے کے سپرد کیا۔ دن گزرتے رہے۔ شاہ کا عرس ہوتا رہا، اور روپیہ افراط سے آتا گیا۔ . . . . پر بی بی جی جب روپیہ آتا ہے تو لینا بھی چاہیے چھپر پھاڑ کے دینے والا دیتا ہے تو جھجک کا ہے کی! — اور اگر دینا ہی بند کر دے تو؟ پڑوسن چیخ اٹھی — . . . .

. . . تیرے منہ میں مٹی پڑے، تیرے بچے بالے مٹی پھانکیں۔" کاکی نے بیساختہ کہا۔ اسے اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے مرنے والے کی کہانی کے ٹکڑوں کو ترتیب دے رہی ہے۔ اور لوگ کہتے ہیں جب شوہر مرتا ہے تو دنیا اندھیری ہو جاتی ہے زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ پر کاکی کے نزدیک شوہر کا مرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مرتے وقت شوہر کے پاس زیادہ روپیہ ہونا بڑی اور بڑی بات تھی۔ اگر شوہر روپیہ کماتا ہے تو اس کی موت دردناک ہے۔ اگر وہ بچوں کی کمائی پر جیتا ہے تو اس کی موت ہزار درجہ بہتر ہے جینے سے! یہی سیدھا سا اصول کاکی کا تھا۔ کاکی کا شوہر کماتے کماتے مرگیا تھا اس لیے اسے بہت دکھ تھا۔ پھر بھی وہ مرنے پر کئی ہزار پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اتنا جتنا کاکی کے اگلے دو جنموں کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ اسی لیے کاکی زیادہ دکھی نہیں تھی، صرف اپنے غم کا ڈھونڈرا پیٹ رہی تھی۔

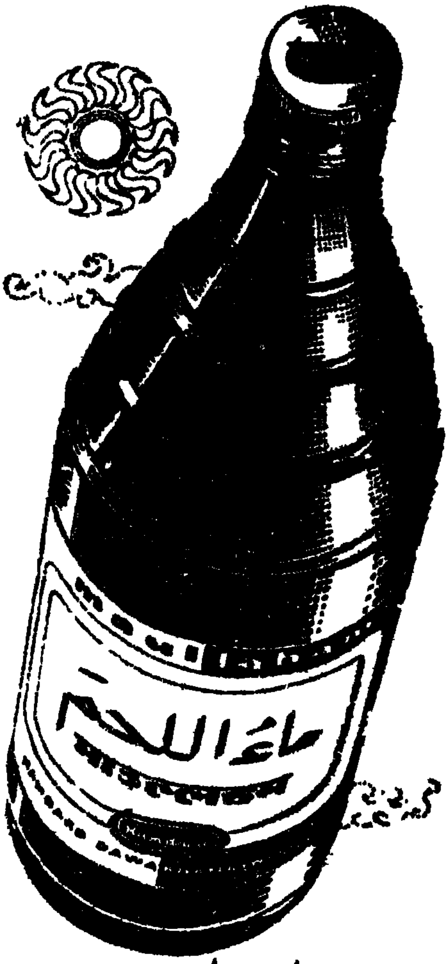
"پھر انھیں شاہ ایک روز خواب میں ملے، اور کہا۔ ایک بڑی دکان پہاڑ میں بھی کھولو۔ شاہ کی بات کون ٹالے۔ شاہ کے کہنے پر دو دکانیں ہو گئی تھیں۔ اب تیسری کی باری تھی۔ . . . . میں اپنی چھوٹی بچی کے ساتھ نئی دکان کی ابتدا کے دن پہاڑ چلی گئی اور وہیں بس گئی۔ انھوں نے بچوں سے کہا تھا۔ ہفتے میں ایک بار آیا کروں گا۔ یہ پہلے ہفتے

ہی کی بات ہے: ہفتے بھر میں شاہ کی دعا سے تیس ہزار کا فائدہ ہو گیا تھا۔ ان کا اندازہ تھا سال بھر میں ان تینوں دکانوں سے ۱۴ لاکھ کا فائدہ ہو گا۔ پھر اسی منافع سے شاہ کی دعا سے انھیں اور کہیں دکان کھولنی تھی۔ بس اسی فکر میں وہ اپنے بیٹوں سے ملنے گھر گئے۔ رات کے دو بجے تک اسی مسئلہ پر بحث ہوتی رہی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ وہ رات بھر سو نہیں پائے۔ کہنے والے کہتے ہیں وہ رات انھوں نے روپیوں کی نذر کی۔ انھوں نے اپنے چاروں طرف روپیہ دیکھا۔ اپنے آگے اور پیچھے، سامنے اور اوپر اور وہاں تک جہاں تک ان کی نظر پہنچتی تھی صرف روپیہ ہی روپیہ تھا۔ روپیوں کے ڈھیر تھے اور وہ تھے . . . . صبح ہوتے ہوتے انھوں نے دوبارہ میرا نام لیا۔ میرے نام کے ساتھ دکان کو یاد کیا۔ اور صرف اتنا کہہ پائے "کاش میں کچھ دنوں دکان اور چلا سکتا" بس اتنا کہنے کے بعد ان کا جی ہلکا ہو گیا اور چھوٹے بیٹے نے ان کے منہ پر سفید چادر ڈال دی۔ اور بڑے نے زور زور سے دعائیں مانگنا شروع کیں۔ ابھی جنازہ بھی نہیں اٹھا تھا کہ دونوں بیٹوں نے اپنا اپنا حصہ لے لیا۔ مجھے اپنے حصے کی ضرورت نہیں۔ وہ کچھ دن اور ہوتے۔ ان کی حسرتیں دل میں رہیں ـــ ورنہ سال بھر میں چودہ لاکھ ملتا۔

اتنے میں پڑوسن بول اٹھی۔ چودہ لاکھ کیا ہوتا ہے؟ تو کیا سوئی تھی ـــ چودہ لاکھ روپیہ ہوتا ہے ـــ انسان مرتا ہے مگر روپے کی موت کبھی نہیں ہوتی ـــ! آگے تم جانتے ہی ہو ـ ان کے مرنے کی خبر مجھے تین روز بعد ملی۔ اور کاکی نے پھر سے رونا شروع کیا۔ بیٹی اور بیٹے پھر ماں کے ساتھ رونے میں محو ہو گئے۔

رام داس بوڑھا اپنی چلم بھرنے کاکی کی رام کہانی سن رہا تھا۔ اس نے بہت سارا فلسفہ پڑھا تھا۔ اس لیے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ لوگ اسے پاگل سمجھتے تھے۔ گھر میں کہرام برپا تھا ـــ اتنے میں رام داس ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا عورتوں کی بھری محفل میں داخل ہو کر چلا آیا ـــ کاکی ـــ تیرا شوہر روپئے کی موت مرا ہے۔ سب پر سناٹا چھا گیا۔ عورتوں نے دانتوں میں انگلیاں دے لیں۔ اور دوسرے لمحے رام داس کو باہر نکالنے کے لیے شور کرنے لگیں۔

رام داس جاتے جاتے پھر ایک بار چلا آیا۔ کاکی تیرا شوہر روپے کی موت مر گیا ـــ ایک انسان روپے کی موت مر گیا ـــ زور سے چلاتا اور ہنستا ہوا رام داس گھر سے نکل گیا ـــ اور کاکی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ یہ روپے کی موت کیا بلا ہے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا ـــ اتنے میں رام داس پھر ایک بار گھر میں داخل ہو کر چلانے لگا۔ کاکی تو بھی روپے کی موت مرے گی۔ جیسے یکبارگی سکتہ چھا گیا ـــ اور آج کاکی روپے کی موت کی فکر میں مری جا رہی ہے۔ وہ مر بھی جائے گی تو بھی پتہ نہ چلے گا ـــ روپے کی موت کونسی موت ہوتی ہے؟ اور کبھی کبھی رام داس اپنے پاگل پن میں یہ بھی کہہ جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی آدمی یہ جان نہیں سکے گا کہ روپے کی موت کیا ہوتی ہے . . . . . . !


ماء اللحم

مادھوراؤ انوری
(وائس پریسیڈنٹ نیشنل کوآپریٹیو یونین آف انڈیا)

ہندستان میں کوآپریٹیو تحریک کی ترقی

چند تجاویز اور مشورے

حصول آزادی کے بعد سے ہماری قومی حکومت قوم کی اقتصادی و سماجی ترقی میں کوآپریٹیوز کی افادیت اور ان کے اہم حصے پر برابر زور دیتی آرہی ہے۔ اس طرح امداد باہمی کا تصور صرف اپنے کاروباری پہلو تک ہی محدود نہیں بلکہ اب ایک طریقۂ زندگی کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس کو متفقہ زندگی کا روپ دے دیا گیا ہے۔ ان حالات میں آج ہم کوآپریٹیوز پر ملک کی ترقی کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوگئی ہیں۔

اب یہ تحریک انسانی زندگی و سرگرمی کے ہر شعبے میں داخل ہوگئی ہے، ہر پیشہ میں خواہ وہ زراعت سے تعلق رکھتا ہو یا صنعت سے، امداد باہمی کا تھوڑا بہت عنصر ضرور موجود رہتا ہے۔ تحریک امداد باہمی کا سب سے پرکشش پہلو جو اسے دیگر تمام معاشی تحریکات سے ممتاز بناتا ہے یہ ہے کہ اس کے ذریعے فرد ہمیشہ سرگرم اور متحرک رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی ہر خوشی اور غم میں ساتھی کارکنوں کو بھی حصہ دار بناتا ہے۔ اس طرح ایک زیادہ سرگرم اور ذہین شخص کسی بھی کوآپریٹیو سوسائٹی کو جہاں اپنی صلاحیت سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے وہیں خود بھی اس سے زیادہ بہتر طریقے پر مستفید ہو سکتا ہے، اور اس سوسائٹی میں اپنے ساتھیوں کو اجتماعی و انفرادی طور پر زیادہ مفید بنا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کوآپریٹیوز کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوگئی ہے۔ کسی بھی قوم کی زندگی میں کوآپریٹیوز ایک اہم اور ممتاز حصہ ادا کرتی ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں خانگی اور عوامی شعبے کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کوآپریٹیو شعبہ بھی اب قومی زندگی میں ایک اہم مقام کا حامل بن گیا ہے۔ عوامی شعبہ یقیناً زیادہ سے زیادہ دفتری نظم و نسق اور کنٹرول کو فروغ دیتا اور اجتماعی نظم و نسق کا خاتمہ کرتا ہے، جب کہ خانگی شعبہ محنت کش طبقہ کو اپنی محنت سے حاصل ہونے والے فوائد سے پوری طرح مستفید ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ کوآپریٹیو شعبہ ہی ان لوگوں کے لیے سب سے موزوں پلیٹ فارم ہے جو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنے منافع میں دوسروں کو حصہ دار بنانا چاہتے ہیں۔

ملک میں گزشتہ (۲۰) برسوں کے دوران کوآپریٹیو تحریک کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے بعد اب ہماری قومی

صب

حکومت اس قطعی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دیہی علاقوں میں قرضہ جات ان ہی کوآپریٹیو سوسائیٹیوں کے ذریعہ دیئے جانے چاہئیں اور کسی دوسرے ادارے کو دیہی قرضے کے کاروبار میں مداخلت نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی طرح گھریلو دیہی صنعتوں کو بھی حکومت کی جانب سے فراخدلانہ امداد ملنی چاہیئے بشرطیکہ وہ کوآپریٹیو بنیاد پر قائم کی جائیں مزدوروں پر بھی زور دیا جارہا ہے کہ وہ اپنی کوآپریٹیوز قائم کریں اور تعمیراتی کاموں کے لیے حکومت سے ٹھیکے حاصل کریں۔ اسی طرح جنگلاتی مزدوروں کو بھی منظم کیا جارہا ہے۔ گنا اگانے والے کاشتکار بھی کوآپریٹیو شوگر فیکٹریاں قائم کرکے شکر تیار کررہے ہیں۔ بافندے بھی اب درمیانی افراد کو ختم کرکے خود اپنی محنت کے مالک اور اس کے پھل کے حقدار بن گئے ہیں۔ زیادہ موثر کارکردگی کے لیے تقریباً ہر سطح پر کوآپریٹیوز اور پنچایتوں کے درمیان ربط و تعاون پیدا کیا جارہا ہے۔ ریزرو بنک آف انڈیا دیہی قرضہ کے لیے کثیر رقومات فراہم کررہا ہے یہاں تک لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا بھی کوآپریٹیو زمین گروی بنکوں کی جانب سے جاری کردہ طویل مدتی ڈبینچرز کو قبول کررہا ہے۔ تیاری پیداوار اور فروخت کے لیے کوآپریٹیوز کی ہمت افزائی کی جارہی ہے۔ انھیں گودام یا ویرہاوز تعمیر کرنے کے لیے رقومات بھی فراہم کی جارہی ہیں۔

صارفین کی تحریک پر بھی اب مرکزی حکومت کی رہنمائی میں زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی جارہی ہے۔ سارے ملک کے تمام شہروں میں صارفین کی کوآپریٹیوز قائم کی گئی ہیں اور حکومت ہند نہ صرف ان کی ابتدائی کارکردگی کے لیے رقم فراہم کرتی ہے بلکہ نظم و نسق کے لیے اپنے عہدیداروں کی خدمات بھی عارضی طور ان کے حوالے کرتی ہے اس طریقہ کار کی وجہ سے اشیائے مایحتاج کی ذخیرہ اندوزی اور قیمتوں میں من مانے اتار چڑھاؤ کی لعنت پر یقیناً بڑی حد تک قابو پایا جاسکے گا۔ کوآپریٹیو تحریک اب ملک کے ہر شعبۂ زندگی میں اپنا مقام پیدا کرچکی ہے اور حکومت کی جانب سے اب اس کی ہر طرح ہمت افزائی کی جارہی ہے۔ اب تمام کوآپریٹیو تحریک کے قائدین کا فرض ہے کہ وہ حکومت سے ہر طرح تعاون کریں اور ملک میں کوآپریٹیو تحریک کی پر خلوص خدمت انجام دیں، اس تحریک میں اب نوجوان طبقہ زیادہ تعداد میں حصہ لے رہا ہے ان کی تربیت کے لیے حکومت ہند نے ریاستی کوآپریٹیو یونینوں کے ذریعہ مختلف سطح پر تربیت کے انتظامات کیے ہیں۔ دیہی علاقوں میں کوآپریٹیوز کے ارکان، مینجنگ کمیٹی کے ارکان اور دیگر عہدیداروں کو اپنی سوسائیٹیوں کے کاروبار خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے ضروری تربیت دی جاتی ہے۔ کوآپریٹیو تحریک سے تعلق رکھنے والے تقریباً ہر شخص نے اب اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ ماضی میں اس تحریک کی ناکامیاں زیادہ تر خود اس کے ارکان اور ان کی اس ناقص کارکردگی کا نتیجہ تھیں۔ یہ ناکامیاں زیادہ تر ایسی کوآپریٹیوز سے تعلق رکھتی ہیں جن کے انتظام کے لیے تربیت یافتہ افراد فراہم نہیں ہوسکے۔ کوآپریٹیوز چلانے والے افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے ریاستوں میں مختلف سطح پر ٹریننگ کالجس قائم کیے جارہے ہیں، کوآپریٹیو قوانین کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق بنانے کے لیے ان پر نظرثانی کی جارہی ہے اور ان میں ضروری ردوبدل کیا جارہا ہے اگرچہ ہمارے محبوب وزیراعظم ہر موقع پر اس بات کو دہراتے ہیں کہ کوآپریٹیوز پر سرکاری کنٹرول برائے نام ہونا چاہیئے اور جہاں کہیں بہت زیادہ سرکاری کنٹرول ہے اسے ختم کیا جانا چاہیئے اس کے باوجود ریاستی حکومتوں کا عام رجحان یہ ہے کہ کوآپریٹیوز پر حتیٰ کہ ان کے روزمرہ کے

نظم ونسق پر زیادہ سے زیادہ راست یا بالواسطہ کنٹرول رہے۔ مثال کے طور پر جب سرمایہ حصص میں ریاستی حکومت بھی شریک ہوتی ہے یا کوئی امداد یا قرضہ دیا جاتا ہے تو ایسی سوسائٹیوں کے بورڈ میں نمائندگی کا حکومت مطالبہ کرتی ہے اب تک رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز بھی نہایت با اثر اور وسیع اختیارات کے حامل ہوا کرتی تھیں لیکن ریاستی حکومتوں نے رجسٹرار کو حکومت کے فیصلوں پر عملدرآمد کا آلہ کار بنالیا جہاں حکومت کو کوئی اختیارات حاصل نہیں تھے وہاں اختیارات حکومت کو دیئے گئے اور ریاستی حکومت کے فیصلوں کو قطعی قرار دیا گیا یہ سب کچھ ہمارے وزیر اعظم کے جمہوری انداز فکر اور امداد باہمی کے اصولوں کے منافی ہے ہمارے وزیر اعظم چاہتے ہیں کہ کوآپریٹیوز کو نشو ونما اور کام کرنے کی مکمل آزادی حاصل رہے۔

کوآپریٹیو تحریک جس قدر تیزی سے ترقی کر رہی ہے ہمیں بھی اس کے ساتھ ہی اپنے موقف کو مستحکم بنانا چاہئیے۔ جہاں تک ممکن ہوسکے ہمہ وقتی افراد کو کوآپریٹیوز کے شعبہ میں آگے آنا چاہیئے اور کوآپریٹیوز کو سیاسی سرگرمیوں میں الجھنے سے احتراز کرنا چاہیئے تمام کوآپریٹیوز کی ذیلی دفعات میں ہمہ وقتی غیر سرکاری ارکان کو خاطر خواہ الونس یا معاوضہ دینے کا انتظام کرنا چاہیئے تاکہ وہ سوسائٹی کے کام پر پورا وقت دے سکیں۔ ہر سال ہر سوسائٹی کے حسابات کی آڈٹ کا لازمی طور پر انتظام کروایا جانا چاہیئے محکمہ کوآپریٹیوز کو کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے روزمرہ کے کاروبار میں مداخلت کرکے اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اس اہم کام کی ذمہ داری قبول کرنا چاہیئے۔ غیر سرکاری کارکنوں کو اپنے آپ پر بعض پابندیاں اور شرائط عائد کرلینا چاہیئے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ وقت واحد میں دو سے زائد عہدوں پر کام نہیں کریں گے زیادہ سے زیادہ ذمہ دارانہ عہدے قبول کرنا چند سال پہلے تک اچھی بات تھی جبکہ ہمارے پاس اچھے کارکنوں کی کمی تھی۔ کسی بھی فرد کے کسی بھی سوسائٹی کا رکن بننے پر اس وقت تک کوئی پابندی عائد نہیں کی جانی چاہیئے جب تک کہ اس کی رکنیت کسی مخصوص سوسائٹی کے مفادات کے لیے مضر رساں نہ سمجھی جائے اس سلسلہ میں دستوری اور قانونی طور پر پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ کوآپریٹیو سوسائٹیز کے کارکنوں کی مدت و شرائط ملازمت میں کسی نہ کسی حد تک یکسانیت ہونی بھی ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ تمام ملازمین کے لیے یکساں شرح تنخواہ مقرر کرنا ممکن نہیں اور لازمی طور پر سوسائٹی کی گنجائش وصلاحیت کے مطابق اس میں رد و بدل بھی ہوسکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود حالات ملازمت یعنی پنشن یا پراویڈنٹ فنڈ، رخصت، سبکدوش ہونے پر دی جانے والی گریجوٹی لونس وغیرہ کی سہولتوں پر یکساں طریقہ سے عمل کیا جاسکتا ہے۔ ہر ریاست میں کوآپریٹیو کیڈر اور سروس کمیشن قائم کرنے کی تجویز بھی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہر ریاست کو اپنے قواعد مرتب کرنے سے قبل ہی ریاست کی اہم کوآپریٹیوز سے بھی صلاح ومشورہ کرلینا چاہیئے ملک میں کوآپریٹیو تحریک کو موثر طور پر ترقی دینے کا یہ ایک نہایت اہم پروگرام ہے۔ ملازمین کو بھی، اتنا ہی حق حاصل ہونا چاہیئے جتنا کہ کسی فرد کو کسی سوسائٹی کا رکن بننے کا حق حاصل ہے۔ ملازمین کے ساتھ بھی بالکلیہ وہی سلوک کیا جانا چاہیئے جو کہ کسی رکن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

احمد علی خاں

حکیم عبدالحمید صاحب

(ایک شخصیت ایک انسٹی ٹیوشن)

ہمدرد دواخانہ کو کون نہیں جانتا ہندوستان میں شمال سے جنوب تک چلے جایئے ہر اچھے مقام پر ہمدرد کی ایجنسیاں یا اسٹاکسٹ یونانی مرکبات کو نفیس پیکنگوں میں پیش کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ایسے مقامات بھی آپ کو ملیں گے جہاں کی مقامی زبانوں میں ہمدرد کا لٹریچر اس وقت نہیں ہے مگر ہمدرد کی یونانی مرکبات فروخت ہو رہی ہیں اور عوام کے افادیت کی تعریف کر رہے ہیں۔ ہمدرد کے فروغ اور ترقی کو اب سب ہی محسوس کر رہے ہیں اور اس ادارہ کا سیل اب کروڑوں میں ہے۔ یہ طب یونانی کی مقبولیت کا ثبوت نہیں تو کیا ہے۔ ہمدرد کا مقصد صرف منافع کمانا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے منافع سے طلبا کے تعلیمی وظائف اور سماجی بہبودی کے کاموں کے لیے ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ دہلی کی جامعہ طبیہ کو ہر سال ۷۰ ہزار روپے کی مالی امداد اس ادارہ کی جانب سے دی جاتی ہے۔ دہلی میونسپل کارپوریشن کی مختلف یونانی ڈسپنسریوں کو ہزاروں روپے کی ادویہ ہمدرد کی جانب سے مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال ادارہ تاریخ و تحقیق طب کے ابتدائی کام کے لیے ۱۴ لاکھ روپے کی مالی امداد ہمدرد نے دی ہے جس کا سنگ بنیاد ہمارے ملک کے ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں رکھا گیا ہے۔ ہمدرد وقف اس طرح مختلف ذرائع سے قوم کی خدمت میں اپنا حصہ ادا کرتا رہا ہے۔ اس ادارہ کو اپنی ملکیت سے قومی وقف بنانے والا ہستی حکیم عبدالحمید صاحب کی ہے جو ہمدرد دواخانہ کی گرانبار ذمہ داریوں کے علاوہ یونانی طبی کانفرنس کے نہ صرف صدر ہیں بلکہ اس کے روح رواں بھی۔ آپ ہی کی وجہ سے عوام یونانی علاج کی خوبیوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور طب یونانی کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں۔

حکیم صاحب سے پہلی ملاقات کا ذکر اس موقع پر یاد آ رہا ہے۔ حکیم صاحب نے ملاقات کے لیے مجھے پانچ بجے کا وقت دیا تھا میں ہمدرد لائبریری میں بیٹھا ہوا وقت گزاری کے لیے ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا ایک صاحب درمیانہ قد اور سادہ سوتی شیروانی پہنے ہوئے آئے انھوں نے مجھے غور سے دیکھا اور میں نے بھی انھیں غور سے دیکھا وہ مسکراتے ہوئے بلا کچھ کہے ایک کتاب لے کر چلے گئے وقت مقررہ پر منیجر صاحب ہمدرد دواخانہ سے میں نے کہا میرا تعارف حکیم صاحب سے کروا دیں۔ ان کے اس جواب سے انتہائی تعجب ہوا کہ حکیم صاحب نے میری تعریف کی کہ کام کے آدمی معلوم ہوتے ہیں اور سب مطالبات منظور کر لیے گئے اور حکیم صاحب سے خود ملاقات

کرنے کے لیے کہا گیا۔ جوں ہی میں حکیم صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے وہی مسکراتا ہوا چہرہ اور خندہ پیشانی نظر آئی جو میں نے لائبریری میں دیکھی تھی ۔۔۔۔۔ حکیم عبدالحمید صاحب کسی بات پر بھی ناراض ہونا یا غصہ میں آنا نہیں جانتے اور نہ کام کے انبار سے گھبرانا ان کی عادت ہے بلکہ متانت اور سنجیدگی سے اوقات مقررہ پر اپنے کام کو کیے جاتے ہیں

دوسرا واقعہ حکیم صاحب کے بلند اخلاق کے ضمن میں مجھے یاد آ رہا ہے آپ پہلی دفعہ حیدرآباد میں اپنے برادر حکیم محمد سعید صاحب کے ساتھ تشریف لائے تھے اور میری درخواست پر میرے غریب خانے پر ہی ٹھیرے تھے اس وقت میں آپ کی طبیعت سے واقف نہیں تھا آپ کے لیے چائے بھیجی گئی حکیم محمد سعید صاحب نے آپ کی جانب تعجب سے دیکھا۔ عبدالحمید صاحب نے مسکراتے ہوے کہا کہ ہم چائے نہیں پیتے مگر احمد صاحب کے گھر سے آئی ہوئی چائے لوٹائی نہیں جائے گی نصف پیالی چائے بنا کر خود نوش فرمائی ۔ اور اپنے برادر محمد سعید صاحب سے کہا کہ وہ چائے نہ پیتے ہوں تو دودھ پی لیں اس واقعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب چائے، سگریٹ یا پان استعمال نہیں کرتے آپ کی سادگی اور منکسر المزاجی کی وجہ سے کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ ہمدرد کے وسیع ترین کاروبار کو چلانے والی یہی ہستی ہے ۔

آپ صرف تیرہ سال کے تھے کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر والدہ صاحبہ کی رہنمائی میں اس کم عمری سے ہی نہایت محنت، دیانت اور توجہ سے دواخانے کے کام کو آگے بڑھاتے رہے جس کا نتیجہ اس عظیم ادارہ کی صورت میں ہمیں نظر آ رہا ہے ۔

آپ صبح چار بجے بیدار ہونے کے عادی ہیں ۔ ہر روز علی الصباح کئی میل کی پیدل ہوا خوری کرتے ہیں ۔ نو بجے مطب میں آ جاتے ہیں جہاں ہر قوم و ملت کے مریض بے چینی سے منتظر رہتے ہیں ۔ آتے ہی مریضوں کی تشخیص و معائنہ میں انتہائی دلچسپی و ہمدردی سے مشغول ہو جاتے ہیں ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے دواسازی کی نگرانی بھی ہوتی ہے اور دوافروشی کی بھی ـــ باہر کی ڈاک بھی دیکھتے ہیں دواخانے کے انتظامات بھی، آپ ہمدرد کی خدمت ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ فن طب کی خدمت کرنے میں بھی نمایاں رول ادا کر رہے ہیں اور اطبا یونانی کی گرتی ہوئی ہمتوں کا سہارا بن گئے ہیں ۔

تصحیح | "صبا" کے پچھلے نمبر میں حکیم یوسف حسین خاں کی نظم "قید" کے تیسرے بند میں یہ مصرعہ رہ گیا۔

"گنگناتی سلاسل کا مردا میں" اصل بند یوں ہے

قید ہے جام جم   سحاب کا سرخ سیارۂ آتشیں   گنگناتی سلاسل کا مردا میں   جادۂ واپسیں میں ارم قید ہے

اسی طرح بدیع حسینی کی نظم "سوغات" کی دوسری لائن بھی غلط شائع ہو گئی ۔

"دل کی محفل جمی" کی بجائے "دل کی محفل پھر جمی" ہونا چاہیے تھا ۔

(ادارہ)

بازگشت

بمبئی

سکندر علی وجد پر جو میرا مضمون ہے وہ کسی ایک کتاب پر نہیں، پوری وجد کی شاعری پر ہے۔ "ستیا" میں سمجھو کہ محض اس کا خلاصہ گیا ہے۔ اب تم کو مکمل اور مفصل بھیج رہا ہوں۔ تو گویا اب تمھارے پاس میرے ۳ مضمون پہنچے۔ ظفر گورکھپوری والے مضمون کا عنوان "نیا شاعر" ہونا چاہیئے۔ اسے جلدی سے چھاپا ہوتا۔ غلطی سے کوئی مضمون نہیں بھیجا۔ "سرتیا" والے پیسے دیتے ہیں لیکن وہ جو انکساری اہل علم اور اہل قلم کی ہے اس کی لذت یا آداب سے آگاہ نہیں معلوم ہوتے۔ میں نے اٹھا کر وہ تمھاری نذر کر دیا۔

یہ جو نئی کتابوں پر مضامین لکھ رہا ہوں، یہ دراصل شعری مسائل کو اٹھانے اور اہل شعر کو متوجہ کرنے کا ایک بہانہ ہے، تم دیکھو گے میرے بھائی کہ بعض ایسے الفاظ اور تراکیب بعض ایسے موضوعات اور طرز بیاں پر صاحب نظر لوگ بحث کریں گے جن کو ان مضامین میں چھیڑا گیا ہے۔

وجد والے مضمون کی داد مجھے کیا دیتے ہو، دراصل وجد صاحب کو دو، دل گردے کی بات ہے میاں، کہ ہم نے لکھا، ان کو پڑھوایا، ان کی رایوں سے اختلاف کیا اور پھر وجد صاحب کے کہنے پر ہی تم کو اور "سویرا" کو بھیجا۔ ان سے جو میری محبت اور دوستی پندرہ برس سے چلی آئی ہے، وہ جوں کی توں قائم ہے۔ تو کیسے اس مضمون کی داد ملنی چاہیے؟

"نیا شاعر" مضمون مجھے تو سب سے زیادہ جچا۔ اب تم چاہے اسے مضمون بناؤ چاہے تبصرہ۔ اچھا ہوتا اگر بطور مضامین شائع ہوتا۔ نئے لوگوں پر جن میں ذرا جان ہے خوب زور و شور سے لکھنا چاہتا ہوں۔

کیسے کیسے خود کو سنبھال کر، دم دلاسا دے کر روپے اور عہدے کی ترغیبوں سے نکال کر صرف لکھنا پڑھنا مقصود ہے، مگر یہ کیوں کر ہو؟ رسالے کہاں ہیں ہمارے ملک میں؟ کس کے لیے لکھیں؟ کون تقاضے کرے؟[1]

ادیب، دیکھو غالب کے اپنے ایسے شعر میرا کلیجہ کھرچ رہے ہیں جو زبانی یاد تھے مگر کچھ جچتے نہیں تھے، مثلاً

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

بیس دن سے پہلے پر مضمون لکھنے کی تیاری جاری تھی، کل شام شمعیں روشن کر کے سر میز بیٹھ گیا کہ آج لکھ ڈالتا ہوں

[1] "صبا" جو ہے۔ عندلیبان گلشن نا آفریدہ کے لیے لکھو۔ میں کروں گا تقاضے۔ (ادیب)

ویل مضمون ہوگا، ۲۰، ۲۵ صفحے کا۔ بہت ہمت کر کے بیٹھا تھا، سارا دن طبیعت کو یکسو کرنے میں گزر گیا۔ مگر قلم اٹھایا تھا کہ
ہ قیامت دل پر گزر گئی جس کا ذکر اس شعر سے بہتر شاید کہیں ہوا ہو ؎

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

مہینوں سے آتشِ فراق میں جل رہا ہوں، سلگ رہا ہوں۔ دھواں سا گھٹا رہتا ہے سینے میں۔ وہاں سے چلتے وقت
ی میرا عالم یہ تھا ؎

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا !

خدا کی قسم، یہ شعر لفاظی نہیں، قافیہ پیمائی نہیں۔ جب تک جگر کٹ نہ گیا ہو، یہ باتیں ایسے کہی نہیں جاتیں۔ تبھی وہ
ہتا تھا ؎

این کہ افتادند و تم گیرند مشقے بیش نیست
وین کہ خود خوں گردد و ریزد گدازے بودہ است

۱۹۵۶ کی بات ہے، 'گداز' کے لفظ پر ایک ادبی محفل میں جہاں فیض، ملک راج آنند، بیدی، اور دوسرے حضرات موجود تھے
بنے بھائی سے بحثا بحثی ہوگئی، وہ کہتے تھے کہ سوز و گداز مہمل لفظ ہیں، ان کا اچھی شاعری سے کیا تعلق! تم بھی کیا فرسودہ
ہن لیے پھرتے ہو ظ انصاری۔ میں تڑپ اٹھا۔ میں نے عرض کیا، اچھی شاعری کیا شے ہے، صاحب، کوئی بھی آرٹ کاریگری
ی حد سے آگے نہیں بڑھتا اگر اس میں سوز و گداز نہ ہو ــــ یا گداز کے ٹمپریچر پر نہ گزارا گیا ہو۔
کئی دن اس پر میں اُن سے الجھا رہا۔ بنے بھائی نہیں مانے۔ پھر میں نے اپنا جائزہ لیا، کہ کہیں واقعی، میں ہی غلط نہ
ہوں۔ (یہ اکثر ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی صداقت کا احترام ہے دل میں، ان سے بحثنے کے بعد خود اپنا محاسبہ کرتا ہوں)۔
وہ ایسے دن تھے اریب کہ عشق کے مورفیانے زندگی کے ہر خوب و زشت کو گوارا اور درد و راحت سے غافل بنا رکھا
تھا۔ میں نے سوچا، کیا عجب ہے جو سوز و گداز محض ایک قنوطی روایت ہمارے ہاں چلی آرہی ہو۔ لیکن جوں ہی وہ نشہ، کہ
ہر نشے سے مقدس، ہر نشے سے ایک روحانی اور بامعنی ہے اُترا، مجھ پر سوز و گداز کے معنی پھر سے کھلنے شروع ہوئے اور میں
پھر اپنی رائے پر واپس آگیا ہوں۔ تم دیکھو گے کہ سوز و گداز کو ہی عنوان بنا کر ایک مضمون لکھوں گا اور پھر بنے بھائی
سے اس سوال پر بات کروں گا۔
وحید کی شاعری پر جو میرا تبصرہ ہے وہ ذرا اس روشنی میں دیکھو، تم پر بھی اس کی صداقت کھلے گی۔
بہت کوشش کرتا ہوں، پر کچھ ہو نہیں رہا ہے مجھ سے۔ ہاتھ پاؤں خاکستر کے معلوم ہوتے ہیں۔ دماغ منجمد سا۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

کوئی بدبخت ایڈیٹر بھی ایسا نہیں جو میسر ہو جائے، باندھ رکھے اور لکھواتے جائے۔ لکھنے کو بہت ہے۔ ایک
ہفتہ وار بلٹز نکلا، سو اس نے بے کہے سُنے میرا بائیکاٹ کر دیا۔ ایک پرائیویٹ لمیٹڈ ہے۔ اُسی کے حصہ دار، اُسی
کے ڈائرکٹر اور خزانچی وغیرہ۔

" دورِ حیات" والے گروپ نے خاص کر ؔجد نے اصرار کیا۔ میں ان کی زلف کا اسیر ہوں (یہ نہ سمجھنا کہ تیر ہوں) پھسل
پڑا۔ اور اس کا سالگرہ نمبر ایڈیٹ کر رہا ہوں مگر یہ بھی کیا کام ہوا کہ سوت نہ کپاس، کولھی سے لٹھم لٹھا۔ ایڈیٹ کرنا وزارت
عظمیٰ کی ذمہ داری سنبھالنا ہے۔ اس کو اختیارات، منشیری، خزانے کی چابی، اچھے رفیق، سب کچھ درکار ہے ورنہ چلی چھڑی
بغور کر رہ جاؤں گا۔ یہی ہوتا نظر آتا ہے فی الحال۔ فقط ظ۔ انصاری

کراچی

آج تمھارا صبا ماہ ستمبر ۶۳ء نظر نواز ہوا۔ تمھارا اداریہ " پہلی بات" دیکھا ـــــ اگر اردو
کے ادیبوں کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم نہ کرو تو اچھا ہے، اس طرح کسی ایک مرکز پر تو اتحاد ممکن ہوگا ورنہ جو
صورت حالات ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔
" بازگشت" کے تحت اسدالزماں (کلکتہ) نے بہ یک وقت کئی مدیرانِ رسائل کو شخصیت پرستی کے سلسلہ میں
نشانۂ ملامت بنایا ہے ـــــ انھیں اس کا حق ہے لیکن " افکار" شمارہ (۱۴۲) بابتہ ماہ جون ۶۳ء کا غلط
حوالہ دینے کا انھیں کسی طرح حق نہیں اس میں کہیں " رزدق" نہیں لکھا ہے بلکہ آخری شعر پر میں نے " درد" لکھ کر فیض صاحب
کی غلطی کو درست کیا تھا۔ امید کہ اسدالزماں صاحب جون کا شمارہ دوبارہ دیکھ کر اپنا اطمینان کرلیں گے۔

زیادہ والسلام۔ تمھارا
صہبا لکھنوی

کراچی

ستمبر کے شمارہ میں پہلی بات پسند نہیں آئی۔ تمھاری شکایت بجا ہو سکتی ہے لیکن اسے دوسرے طریقے سے لکھا جا سکتا
تھا۔ میرے خیال میں مرعوبیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خوبصورت اور دیدہ زیب رسائل میں ہر ایک کا جی لکھنے کو
چاہتا ہے۔ کاش تمھارے پاس بھی اتنا روپیہ ہوتا کہ " صبا" کو دیدہ زیب بنا سکتے۔ فقط
تمھارا۔ ضیائی (مسلم ضیائی)

مرزاپور (یوپی)

صبا کا ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا ـــ ہندوستانی ادیب پاکستان کے رسائل میں اپنی تخلیقات کی اشاعت کو ترجیح
دیتے ہیں یا اپنے لیے باعثِ عزت تصور کرتے ہیں اس موضوع پر آپ سے قبل بھی دو ایک جرائد ادارےیے سپردِ قلم کر چکے ہیں لیکن
افسوس ہے کہ اس کا کوئی خاطر خواہ اثر ہوتا نظر نہیں آتا۔ دوسری کئی بدعتوں کی طرح اس بدعت کے ذمہ دار بھی ہمارے بڑے
شعرا و ادبا ہیں اس کے لیے باقاعدہ ایک تحریک کی ضرورت ہے کیوں کہ اہلِ اردو میں احساس کا مادہ یوں بھی کم
ہے۔ فقط آپ کا
حرمت الاکرام

1461/57 SABA-MONTHLY REGD. NO. A 215

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل

مخدوم محی الدین کا دوسرا مجموعۂ کلام

گلِ تر

قیمت :- ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

ناشر :-

مکتبۂ صبا

۱۷ امجردگاہ

حیدرآباد

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے

اقبال متین کا پہلا افسانوی مجموعہ

اُجلی پرچھائیاں

قیمت :- چار روپے ۵۰ نئے پیسے

ناشر

مکتبۂ صبا

۱۷ امجردگاہ

حیدرآباد

جواں سال شاعر

راشد آذر کا پہلا مجموعۂ کلام

نقشِ آذر

شائع ہو چکا ہے

قیمت :- دو روپے

ناشر :- مکتبۂ صبا

۱۷ امجردگاہ حیدرآباد دکن

نئی نسل کے مقبول اور

ذہین شاعر

زبیر رضوی کی نظموں غزلوں اور

گیتوں کا انتخاب

لہر لہر ندیا گہری

زیرِ طبع

ناشر :- مکتبۂ صبا - ۱۷ امجردگاہ حیدرآباد

چاروں مجموعے مکتبۂ صبا ، امجردگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد اے پی کے علاوہ اپنے شہر کے بڑے تاجرانِ کتب سے طلب